

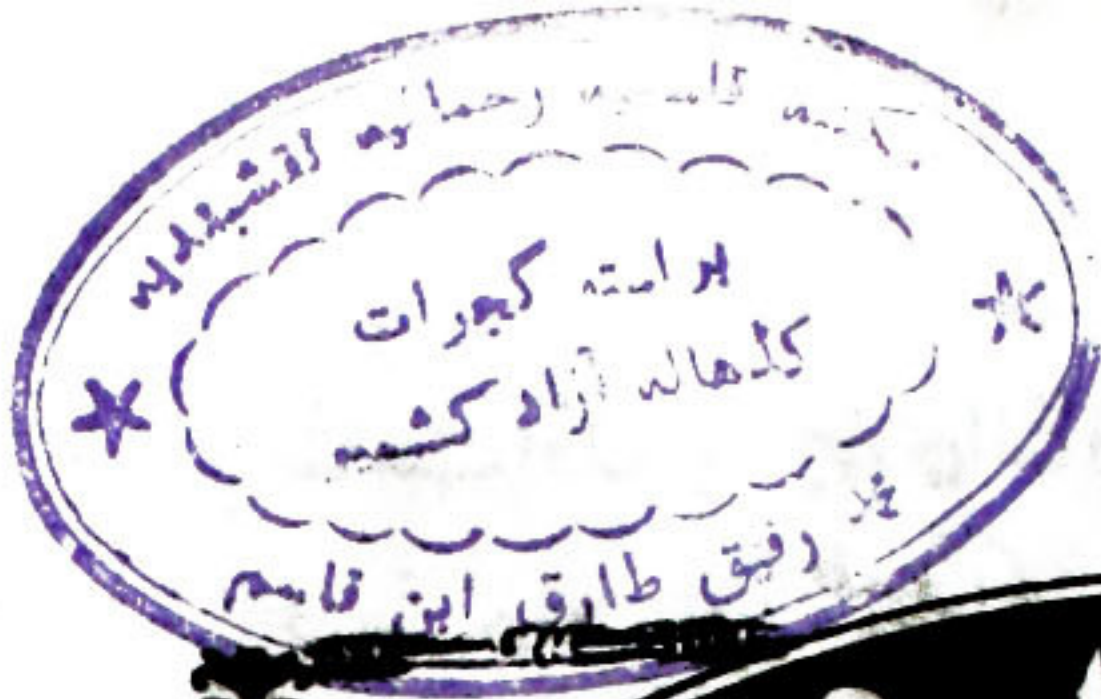
شیخ ابوالفتح الفقیہی

مجلس علم پاکستان

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

کے فقہی مسائل و مسائل کا مجموعہ

مکتبہ اذکار العلوم مرکز کراچی



جواہر الفقہ

Book Series ^{فقہ}

Serial No. ^{جلد ۱}

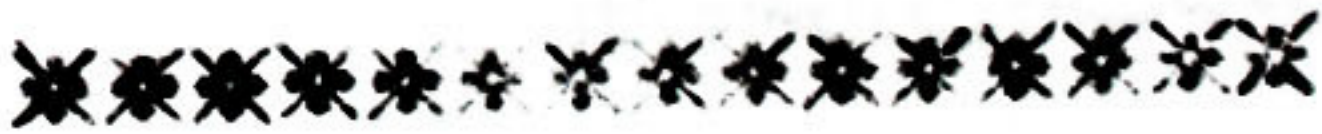
Price 45/-

Date 15/2/85

مفتی اعظم پاکستان

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

کے چوبیس برس فقہی رسائل و مقالات کا نامہ مجموعہ



مکتبہ دارالعلوم کراچی-۱۲

اشاعت اول : جمادی الثانی ۱۳۰۳ھ
تعداد : طبع ایک ہزار
طباعت : مشہور پریس، کراچی
باعتنام : نایم کتبہ دارالعلوم کراچی

توقیت: مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی نائب مفتی، دارالعلوم کراچی

ملنے کے پتے

مکتبہ دارالعلوم دوک خانہ دارالعلوم کراچی

ادارۃ المعارف ڈاک خانہ دارالعلوم کراچی

دارالاشاعت و مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی

ادارۃ اسلامیات نمبر ۱۹ انارکلی لاہور

فہرست مضامین جو اہر الفیقہ (جلد اول)

۵۸	ایک شبہ کا ازالہ۔	۱۷	۱۔ تکفیر اصول۔
۵۹	عقائد روافض و شیعہ۔	۱۹	حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ
۶۰	الجواب۔		کی رائے گرامی۔
۶۳	عبارت امداد الفتاویٰ جلد سادس۔	۲۳	سوال و جواب۔
۶۴	الحکم الحنفی فی الحرب الآف غان۔	۲۴	ایمان و ارتداد کی تعریف۔
"	استفتاء۔	۳۰	ایک شبہ کا جواب۔
۶۶	طریقہ نماز یا اصول دعا تعلیم کردہ آغا خان۔	۳۶	ضابطہ تکفیر۔
۶۷	الجواب۔	"	تنبیہ ضروری۔
۷۱	۲۔ قرآن کریم کا رسم الخط اور اسکے احکام	۳۷	تتمہ مسئلہ از امداد الفتاویٰ۔
۷۳	سوال۔	۳۸	مشورہ۔
۷۴	جواب۔		سوال درم
۸۵	ایک شبہ کا ازالہ۔	۳۹	فوتہ چکری الویہ کے جفتائے۔
۸۸	سوال و جواب۔	۴۰	منقول از برہان الفرقان علی صلوة القرآن۔
۸۹	تنبیہ۔	۴۱	عقائد فقہیہ ہذا۔
۹۱	تصدیقات علماء۔	۴۲	الجواب۔
۹۵	۳۔ کیا قرآن کریم کا صرف ترجمہ شائع کیا جاسکتا	۴۸	فوتہ مرزائی کے عقائد۔
۹۷	استفتاء۔	"	اروین مرزائی کے عقائد۔
"	الجواب۔	۴۹	قادیانی پارٹی کے عقائد۔
۱۱۰	تنبیہ۔	۵۰	لاہوری پارٹی کے عقائد۔
			الجواب۔

۱۳۹	۶۔ فتویٰ متعلقہ جماعت اسلامی	۱۱۸	تنبیہ دوم۔
۱۴۰	سوال۔	۱۱۹	نقل فتویٰ حکیم الامت حضرت تھلوی رح
۱۴۰	جواب۔	۱۱۹	۲۔ مسئلہ تقلید شخصی
۱۴۵	۷۔ پیرو مرید کا فقہی اختلاف	۱۳۱	مسئلہ تقلید پر چند سوالات و جوابات۔
۱۴۵	مثالی بحث و تنقید۔	۱۳۶	تقلید شخصی کے وجوب کی ایک واضح مثال
۱۴۸	۸۔ دست بوسی اور قدم بوسی	۱۳۷	خلافت راشدہ کے عہد میں۔
۱۴۸	تخصیص مقالہ حضرت شیخ محمد باہر سندھی۔	۱۳۹	ایک مسئلہ فقہیہ۔
۱۴۵	تقبیل شفقت۔	۱۳۹	تقلید شخصی کب سے شروع ہونی اور کیوں ہونی۔
۱۴۵	تقبیل تعلیم۔	۱۳۳	سوال نمبر ۴ اور جواب۔
۱۴۵	روایات حدیث متعلقہ تقبیل تعلیم۔	۱۳۳	مسئلہ تقلید پر حضرت قاسم العلوم و الخیرات کا محققانہ تبصرو۔
۱۹۳	اقوال فقہاء۔	۱۳۷	امام اعظم کے متعلق حفاظ حدیث اور ائمہ
۱۹۹	سوال دوم۔	۱۳۷	سدام کے چند اقوال۔
۲۰۰	جواب۔	۱۳۳	تعلیہ شخصی کے متعلق حضرت مولانا رشید احمد
۲۰۰	سوال سوم۔	۱۳۳	کنوہی کا ایک محققانہ مکتوب گرامی۔
۱۰۱	جواب۔	۱۵۰	تعلیہ شخصی کا ثبوت صحابہ کرام کے تعامل سے
۲۰۱	خلاصہ کلام۔	۱۵۱	تقلید شخصی کی حقیقت۔
۲۰۱	تقبیل اور معالقبہ و مصافحہ میں شامل ہونے والے مسکرات۔	۱۵۴	ابن مرینہ کا تعامل، زید بن ثابت کی تقلید شخصی
۲۰۵	۹۔ مروجہ سیرت کھنسی اور اسکی شرعی حیثیت	۱۵۵	تنبیہ۔
		۱۵۷	۵۔ دور سیرت پر فتویٰ دینے کے حوالہ

۲۷۸	حق تعالیٰ کی کیا قسمیں حدیث میں مذکور ہیں؟	۲۷۵	سوال
۲۷۹	ایک حدیث میں چار غلطیاں	۲۷۵	جواب
۲۸۰	کب سے سورت کی سمت کی تعیین میں غلطی	۲۷۹	مولانا سید کا محنت گزری
۲۸۱	تاریخی غلطی	۲۸۱	۱۰۔ مرد و عورتوں کے شرعی حیثیت
۲۸۲	سمت قبلہ کی تعیین کا مشہور طریقہ	۲۸۱	استفسار
۲۸۳	امام رازی کا طریقہ تعیین	۲۸۳	جواب
۲۸۴	نجوم اور ہمت کیا ایک ہیں؟	۲۸۴	تہیہ
۱۱	بے بنیاد دعویٰ	۲۸۴	بسمداد مشہور
۲۸۶	غلط سمتیں	۲۸۶	۱۱۔ مساجد کی نئی شکلیں اور ان کے مقاصد
۲۸۷	سطحی نقشہ سے تعیین سمت کی	۲۸۷	استفسار
۱۱	سطحی غلطی	۲۸۷	جواب
۱۱	سمتوں کی تعیین میں سمت غلطیاں	۲۹۰	۱۲۔ سمت قبلہ
۲۹۱	سمت قبلہ کی تعریف اور اس کے معلوم	۲۹۱	تہیہ
۱۱	کرنے کا طریقہ سے ناواقفیت	۲۹۱	مقدمہ
۲۹۲	ہندوستان کے مختلف مقامات کے سمت	۲۹۲	استفسار و جواب
۱۱	قبلہ کا اختلاف	۲۹۲	سمت قبلہ معلوم کرنے کا طریقہ
۲۹۳	ہندوستانی شہروں کی سمت قبلہ کا نقشہ	۲۹۳	استفسار و جواب
۲۹۴	سمت قبلہ معلوم کرنے کا طریقہ	۲۹۴	ضمیمہ رسالہ نمبر ۱
۲۹۹	امام رازی کے دلائل سمت قبلہ	۲۹۹	لطیفہ عجیبہ
۱۱	استخراج سمت قبلہ کا قاعدہ	۲۹۹	شرقی اور سمت قبلہ
۳۰۰	نیم ستران کا نمونہ	۳۰۰	
۳۰۱	ایک خوش اعتقادی	۳۰۱	
۳۰۲	سمت قبلہ معلوم کرنے کے طریقوں اور آلات کا ناواقفیت	۳۰۲	

۳۳۱	ضابطہ معتقدین۔	۳۰۴	سمت قبل معلوم کرنے کا ایک اور آسان طریقہ۔
۳۳۲	مذہب معتقدین کے موافق النسخ یا	۳۰۵	شرقی صاحب کے نقشہ کی غلطیاں۔
"	غیر قاری کا حکم۔	"	ایک پر لطف تجویز۔
۳۳۵	ضابطہ متاخرین۔	۳۰۶	کیا مسجد کی قدامت اس کی سمت قبلہ کی
۳۳۶	قول مختار یا عدل الاقاریل۔		صحت کی دلیل ہے۔
۳۳۸	خلاصہ فتویٰ۔	۳۰۹	۱۳۔ آواہت کے وقت مقتدی کب کھڑے ہوں
۳۳۹	تنبیہ۔		
۳۴۰	تصدیق و تتمہ از حضرت مولانا اشرف علی	۳۱۱	سوال۔
	تھانوی رح۔	۳۱۲	الجواب۔
۳۴۲	تقریظ و تصدیق از حضرت مولانا سید	۳۱۵	تابع نشت خلفاء راشدین کا تعامل۔
	امیر حسین صاحب۔	۳۱۶	مذہب فقہاء۔
	تحریر جناب قاری عبدالواصف صاحب۔	۳۲۰	ایک تنبیہ۔
	فناوی از حضرت مولانا رشید احمد	۳۲۱	خلاصہ۔
	صاحب گنگوہی رح۔	۳۲۳	خلاصہ کلام۔
		۳۲۴	تنبیہ۔
۳۴۶	۱۵۔ خطبہ جمعہ عربی زبان میں		
	کیوں ہے؟	۳۲۵	۱۴۔ حرف ضاد کا صحیح مخرج
۳۴۹	استفتاء و جواب۔		اور اس کے احکام۔
۳۵۰	خطبہ کے ارکان و آداب۔	۳۲۶	منقہ بغداد علامہ آلوسی کا فتویٰ
۳۵۱	خطبہ کی اصل حقیقت ذکر ہے،		متعلقہ حرف ضاد۔
	و عطف و تذکیر اس کا رکن نہیں۔	۳۲۹	رفع التضاد عن احکام الضاد۔
۳۵۲	خطبہ جمعہ غیر عربی میں جائز نہیں۔	"	سوال۔
۳۵۴	اس شبہ کا جواب کہ مخاطب سمجھتے نہیں۔	۳۳۰	جواب۔

۳۸۱	سحری۔	۳۸۱	زبہی کا اثر معاشرت و اخلاق اور عقل و دین پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔
"	انطاری۔		
"	تراویح۔	۳۶۱	ہندوستان میں زبہن انگریزی کی ترویج اور اس کا سیاسی مقصد۔
۳۸۲	اعتکاف۔	"	عربی زبان کی بعض خصوصیات۔
۳۸۳	شب قدر۔		
۳۸۴	ترکیب نماز عید۔	۳۶۲	نماز، اذان اور خطبہ وغیرہ کو خاص عربی زبان میں رکھنا اسلام کا ایک اہم مذہبی و سیاسی مقصد ہے۔
"	مسائل زکوٰۃ۔		
۳۸۷	۱۸۔ حیلہ اسقاط کی شرعی حیثیت	۳۶۵	خطبہ جمعہ و عیدین میں فرق۔
۳۸۸	۱۹۔ مسائل فقہیہ نماز و روزہ وغیرہ	۳۶۶	خلاصہ احکام الخطبہ۔
۳۸۹	استقار۔	۳۶۸	تقریظ از حضرت مولانا اثرت علی تھانی
۳۹۰	الجواب۔		
۳۹۲	مسائل فقہیہ نماز و روزہ وغیرہ۔	۳۷۱	۱۴۔ فنون نازلہ
۳۹۵	۱۹۔ رویت ہلال کے شرعی احکام۔		دعا کا طریقہ اور متعلقہ مسائل۔
۳۹۶	رویت ہلال کے شرعی احکام۔	۳۷۷	۱۷۔ احکام رمضان المبارک و مسائل زکوٰۃ
۳۹۸	خبر صادق اور شہادت میں فرق۔	۳۷۸	روزہ کی نیت۔
۳۹۹	ہلال عید کے متعلق شرعی ضابطہ شہادت۔	۳۷۸	جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔
۴۰۰	شہادت علی الرویۃ۔	۳۷۹	و چیزیں جن سے روزہ نہیں ٹوٹتا مگر جو خافیا ہے
"	شہادت علی الشہادۃ۔		و چیزیں جن سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور کوہی نہیں ہوتا۔
۴۰۱	شہادت علی القصار۔	۳۸۰	و بعد جن سے رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہوتی ہے۔
۴۰۵	۲۰۔ اوزان شرعیہ	۳۸۱	روزہ کی قضا۔

۴۴۸	قربانی کے دن۔	۴۰۸	اوزان شرعیہ کے مسلمہ اصول
۴۴۸	قربانی کے بدلے میں صدقہ و خیرات۔	۴۱۰	قدیم علمائے ہند کی تحقیقات۔
۴۴۹	قربانی کا وقت۔	۴۲۰	اطبائے ہند کی تحقیقات
"	قربانی کے جالوز۔	۴۲۱	اہل لغت کی تحقیق۔
۴۵۰	قربانی کا مسنون طریقہ۔	۴۲۲	مکاتیل العرب و اوزانہا۔
"	آداب قربانی۔	۴۲۳	چاندی سونے کا صحیح نصاب
۴۵۱	متفرق مسائل۔	۴۲۴	عماع کا وزن اور صدقہ الفطر کی صحیح تعداد
"	قربانی کا گوشت۔	۴۲۷	تنبیہ۔
۴۵۲	قربانی کی کھال۔	۴۲۸	نقشہ رائج الوقت اوزان کے مطابق۔
		۴۲۹	خاتمہ۔
۴۵۳	۲۲۔ چرم قربانی کے احکام۔	۴۳۰	ضمیمہ مساحات شرعیہ در پیمانہ بکے ہندیہ۔
"	سوال۔	۴۳۲	انگریزی میل اور شرعی میل میں فرق۔
"	جواب۔	۴۳۵	مسافت سفر کی تحقیق۔
۴۵۷	خلاصہ جواب۔	۴۳۸	خلاصہ ضمیمہ بصورت جدول۔
		۴۳۹	تصدیقات علمائے کرام۔
۴۵۹	۲۳۔ مواقت احرام اور ان کے مسائل	۴۴۵	۲۱۔ احکام عید الاضحیٰ و قربانی
۴۶۱	مواقت احرام کا مسئلہ۔		عشرہ ذی الحجہ کے فضائل۔
۴۶۳	اصطلاحی الفاظ کی تشریح۔	۴۴۶	تجیر تشریحی۔
"	مواقت حج کی تعیین۔	"	تنبیہ۔
۴۶۵	مواقت خمسہ کی ضروری تشریح۔	"	نماز عید۔
۴۶۸	مواقت خمسہ کے احکام۔	۴۴۷	ستر بانی۔
۴۷۰	محاذات میقات کس طرح معلوم کی جائے	"	ستر بانی کس پر واجب ہوتی ہے۔
۴۷۳	محاذات کی ایک دوسری تفسیر۔	۴۴۸	

۴۹۵	۲۴ - حج بدل اور اس کے احکام	۴۷۴	ہندو پاکستان اور مشرقی ممالک سے آنے والوں کا میقات۔
۴۹۸	حج بدل فرض کے احکام۔	۴۷۶	جہدہ سے اجرام باندھنے کا مسئلہ۔
۴۹۹	حج سے عاجز و معذور قرار دینے کی شرائط۔	۴۸۰	میقات یلملم کے فاصلہ میں اختلاف کی وجہ۔
۵۰۰	حج بدل کی شرائط۔	۴۸۱	میقات جہدہ کے متعلق علماء کا اختلاف۔
۵۰۵	خلاصہ شرائط۔	۴۸۱	علماء عصر کی مجلس میں اس مسئلہ پر بحث۔
۵۰۶	یہ سب شرائط فرض حج بدل کے لئے ہیں۔	۴۸۲	حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نجدی کی رائے۔
۵۰۷	جس نے اپنا حج نہیں کیا اس سے حج کرانا۔	۴۸۲	مولانا مفتی رشید احمد صاحب کی رائے۔
۵۰۸	آمر کے وطن سے حج بدل کرنے کا مسئلہ۔	۴۸۹	عوام کے لئے۔
۵۱۳	حج بدل میں قرآن اور تمتع۔	۴۹۰	حدِ موافقت کے اندر رہنے والے۔
۵۱۶	خلاصہ تحقیق۔	۴۹۲	حدِ حرم کے اندر رہنے والے۔
۵۱۶	خلاصہ فتویٰ۔		
۵۱۶	حج بدل کے مصارف اور نفع۔		



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تعارف

بقلم مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی، نائب مفتی دارالعلوم کراچی

ایسے رسائل کی تصنیف کا سلسلہ زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے جن میں کسی ایک مسئلہ کی تحقیق اس انداز میں کی گئی ہو کہ اس کے جملہ متعلقات کا ضروری مواد مرتب شکل میں جمع ہو جائے۔ ایسی تصنیف کو محدثین کی اصطلاح میں ”جزرہ“ اور عام علمی اصطلاح میں ”رسالہ“ کہا جاتا ہے۔

ایسے رسائل کی ابتدائی مثالیں عہد رسالت اور عہد صحابہؓ میں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب الصدقہ جو آپ نے عالموں کو بھیجنے کے لئے آخر حیات میں لکھوائی تھی اور بعد میں وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما کے پاس محفوظ رہی۔ اس میں زکوٰۃ کی شرحیں اور نصابوں کی تفصیلات درج تھیں (ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ ص ۲۱۸ تا ۲۲۰ ج ۱) اسی طرح کا ایک رسالہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بحرین بھیجنے وقت لکھ کر دیا تھا۔ یہ بھی زکوٰۃ ہی کی تفصیلات پر مشتمل تھا۔ صحیح بخاری میں اس کے اقتباسات کئی جگہ آئے ہیں (مثلاً ص ۱۹۴ تا ۱۹۶ ج ۱ کتاب الزکوٰۃ)

عہد صحابہؓ کے بعد نئے حالات کی وجہ سے ایسے رسالوں کی ضرورت میں اضافہ ہوتا گیا اور اس ضرورت کو پورا کرنے والے مردانِ علم و فضل بھی ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہے اس طرح مختلف فقہی مسائل پر ہر دور میں بے شمار مستقل رسالے لکھے گئے اور بعض فقہاء کے ایسے رسائل کے متعدد مجموعے مرتب کر کے شائع کئے گئے جو بعد کے اہل علم کے لئے نہایت مفید ثابت

ہوتے، رسائل ابن نجیم، رسائل ابن علیہین اور رسائل مولانا عبدالحی لکھنوی بھی اسی سلسلہ کی اہم کڑیاں ہیں۔

اس قسم کے رسالے اس لحاظ سے نہایت گراں قدر اور مفید ہوتے ہیں کہ ان میں مسنت ذہنی جیسوی کے ساتھ صرف ایک مسئلہ کو اپنی تحقیق کا محور بنانا اور امکان حد تک ان تمام کتابوں کو گنجانا ہے جن میں متعلقہ مواد ملنے کا ادنیٰ احتمال بھی نظر آئے وہ اپنی پوری تحقیقی صلاحیت اور نظر و فکر کے تمام اسلوب بروئے کار لاکر اپنی کاوش کا پھوڑا مختصر رسالہ میں جمع کر دیتا ہے۔

اس نئے دور میں انگلستان کے صنعتی انقلاب اور فرانس کے سیاسی انقلاب نے جو گہرے اثرات پوری دنیا پر مرتب کئے پھر جدید فلسفہ نئے نظام تجارت و معیشت، مغربی سیاست و قانون اور تہذیب جدید نے جن نئے نئے رجحانوں کو جنم دیا، نئے نئے فرقوں کی پیدائش اور طرح طرح کی گراہیوں کے پھیلنے سے جو مسائل پیدا ہوئے ان کا اسلامی حل پیش کرنا علماء عصر کی زک و ذمہ داری بن گئی تھی۔ ماضی کی طرح اللہ تعالیٰ نے ایسے علماء و فقہار اس دور بھی پیدا فرمادیے جنہوں نے اپنی تحقیق و تصنیف کے ذریعہ عصری پیچیدگیوں کو ضروری حد تک سمجھایا اور ثابت کر دیا کہ دین اسلام آج بھی وہ واحد دین ہے جو ہر زمانہ کی ہر مشکل کا حل پیش کر سکتا ہے، اور انتہائی بدلے ہوئے حالات میں بھی اس کے احکام نہ صرف قابل عمل بلکہ دنیا و آخرت کی فلاح کے ضامن ہیں۔

اس صدی کے جن نامور محققین علماء و فقہانے یہ خدمت انجام دی ان میں سرفہرست حکیم الامت، مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہ کا نام گرامی ہے، جن کی تقریباً ایک ہزار تصانیف اس صدی کا عظیم ترین علمی سرمایہ ہیں۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہم کی تصانیف

والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی ذات گرامی بھی اس صدی کے ان خوش بخت علماء کرام میں ممتاز مقام رکھتی ہے، جنہوں نے

اس نازک کام میں بھرپور حصہ لیا۔ آپ کی دوسرے قریب تصانیف جو تفسیر، حدیث، عقائد، فقہ، تصوف، تاریخ، سیاست، ادب، لغت، وعظ و ارشاد، غرض ہر دینی شعبے سے متعلق ہیں ان سب کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں عصرِ جدید کے ایسے مسائل کو خاص طور سے موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جن کے بارے میں سلف کی کتابوں میں تفصیلی مباحث نہیں ملتے۔ یہ تصانیف علوم و معارف کا بیش بہا خزانہ ہونے کے علاوہ ایک لحاظ سے بڑے صغیر پاک و ہند کے ان تمام نظریاتی، سیاسی اور معاشرتی رجحانات کی تاریخ بھی ہیں جو پچھلے پچاس برس میں امت کے مختلف طبقات میں پیدا ہوئے، کیونکہ اس پوری مدت میں جو نیا مسئلہ پیدا ہوا، یا جس نئے فتنے نے علمی راہ سے ذہنوں کو مسموم کرنے کی کوشش کی حضرت والد ماجد مدظلہم نے اس میں اپنے فتاویٰ، تصانیف، تحقیقی مضامین و مقالات اور رسائل سے امت کی بروقت رہنمائی فرمائی۔ اس طرح دین کے ہر شعبہ میں موصوف کی کئی کئی تصانیف وجود میں آگئیں، صرف فقہ پر آپ کی پچاس نوے (۹۵) تصانیف ہیں۔ جن میں سے بعض اگر صرف سات آٹھ صفحات پر مشتمل ہیں تو بعض کی ضخامت نو سو (۹۰۰) تک پہنچی ہوئی ہے مثلاً فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (اردو) اور احکام القرآن (عربی)۔

ان فقہی تصانیف کی ایک خاص اہمیت یہ ہے کہ یہ فقہی تحقیقات کے سلسلے کی ایک ناگزیر کڑی کی حیثیت رکھتی ہیں، ان سے قطع نظر کر کے موجودہ بہت سے مسائل کا شرعی حل اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے، ان تصانیف کو اگر بیچ سے نکال دیا جائے تو ماضی اور مستقبل کے درمیان ایسا خلا پیدا ہو جائے گا جسے پُر کرنا مستقبل کے اہل فتویٰ کے لئے انتہائی کمٹن مرحلہ ہوگا۔

والد ماجد مدظلہم کی ان فقہی تصانیف و رسائل کی ایک بڑی تعداد تو مستقل کتابی شکل میں شائع ہوتی رہی ہے جن میں سے اکثر کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ نیز سات رسائل فقہیہ احکام القرآن (عربی) کا جز بن کر طبع ہوئے ہیں جن کا اردو ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے، نہ معلوم یہ سعادت اللہ تعالیٰ نے کس کے نصیب میں لکھی ہے۔ نیز اکٹھا (۱۸) فقہی رسائل فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کا جز بن کر شائع ہو چکے ہیں، ان سب

تصانیف کا مختصر مختصر تعارف اس کتاب کے آخر میں قارئین کو ملے گا۔

جواہر الفتنہ

پینتالیس (۲۵) فقہی رسائل ایسے تھے جو یا تو اب تک طبع ہی نہیں ہو سکے تھے، یا محض کسی ماہنامہ وغیرہ میں ایک مضمون کی حیثیت سے شائع ہوئے تھے، یا طبع ہو کر نایاب ہو گئے تھے، یا نایاب بھی نہیں ہوئے تھے مگر ضخامت بہت کم ہونے کے باعث ان کا الگ الگ محفوظ رکھنا، اور بروقت، ان سے استفادہ آسان نہ تھا، باذوق اہل علم کا عرصہ سے اصرار تھا کہ ایسے سب رسائل کو ایک مجموعے کی شکل میں شائع کر دیا جائے تاکہ ان سے استفادہ آسان ہو، اور یہ عظیم علمی سرمایہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی محفوظ ہو جائے، خصوصاً شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی قدس سرہ، جو والد ماجد کی تصانیف کے بجا طور پر بہت مداح اور قدر شناس تھے اور ہر تصنیف کا ہر ایڈیشن حاصل کرنے کا اہتمام فرمایا کرتے تھے ان کا تو ہمیشہ ہی یہ اصرار رہتا تھا۔

میرے برادر بزرگوار جناب مولانا محمد زکی صاحب کیفی رحمۃ اللہ علیہ جن کو آج "رحمۃ اللہ علیہ" لکھتے ہوئے جگر پاش پاش ہوا جاتا ہے اور جو ابھی اٹھارہ روز قبل اچانک اس دارِ فانی سے کوچ فرما گئے، انھوں نے پچھلے سال لاہور میں اس کام کا آغاز نہایت اہتمام سے فرمایا، ایسے رسائل کو بمشکل تمام مختلف جگہوں سے حاصل کیا، بعد ازاں کراچی میں کچھ اور رسائل و مقالات حضرت والد صاحب مدظلہم کے مسودات میں، اور کچھ ماہنامہ القاسم دیوبند، ماہنامہ المفتی دیوبند، اور ماہنامہ "البلانح" کراچی کے پُرانے فائلوں میں دستیاب ہو گئے اور جوں جوں تلاش جاری رہی ایسے رسائل ملتے چلے گئے، یہ گراں مایہ رسائل جس انداز میں نایاب، منتشر یا مخفی ہو گئے تھے خطرہ تھا کہ کچھ عرصہ بعد ضائع ہی ہو جاتے، غرض ان تمام رسائل کو جمع کر کے حضرت والد ماجد مدظلہم کی اجازت سے مرتب کیا گیا، ہر سالہ کی تاریخ و مقام تصنیف اور مختصر تعارف ہر سالہ کے شروع میں لکھ دیا گیا، اسی شمار میں بعض رسائل پر حضرت والد ماجد مدظلہم نے نظر ثانی بھی فرمائی، اس طرح فقہی رسائل کا یہ عظیم الشان مجموعہ

بمجاہد اللہ تیار ہو گیا، برادر بزرگوار جناب مولانا محمد زکی صاحب کیفی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مجموعہ کا نام "جواہر الفقه" تجویز کیا تھا جسے والد ماجد مدظلہم نے پسند فرمایا اور اب اسی نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔

میرن خوش نصیبی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مجمع و ترتیب میں اہمیت کو بھی کچھ وقت صرف کرنے کی توفیق عطا فرمائی، مگر افسوس ہے کہ اس کی تکمیل آج اس وقت ہو رہی ہے جب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی اور برادر بزرگوار جناب بھائی جان رحمۃ اللہ علیہما اس دنیا میں اتنے دیکھنے کے لئے موجود نہیں، ان دونوں حضرات کو اس مجموعے سے سب سے زیادہ دلچسپی تھی وہی اس کے سب سے پہلے محرک تھے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے اور جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ سے نوازے۔ آمین۔

اس مجموعہ کی خصوصیات

۱۔ اس مجموعہ میں حضرت والد ماجد مدظلہم کے صرف فقہی رسائل شامل کئے گئے ہیں۔

دوسرے دینی موفہومات پر ایسے رسائل کا مجموعہ الگ زیر ترتیب ہے۔

۲۔ اس مجموعہ میں فقہی رسائل بھی صرف وہ شامل کئے گئے ہیں جو

(الف) اب تک طبع نہیں ہوئے یا

(ب) کسی ماہنامہ وغیرہ میں مضمون کی حیثیت سے شائع ہوئے الگ کتابی

شکل میں نہ آئے تھے یا

(ج) طبع ہو کر عرصے سے نایاب ہو گئے تھے یا

(د) نایاب بھی نہ تھے مگر فصاحت بہت کم ہونے کے باعث ان کا الگ الگ محفوظ

رکھنا اور بروقت ان سے استفادہ آسان نہ تھا۔

۳۔ اس مجموعہ میں رسائل کی باہمی ترتیب امکانی حد تک ابواب فقہیہ کی ترتیب کے مطابق رکھی

گئی ہے، مثلاً نماز سے تعلق رکھنے والے رسائل کو ان رسائل پر مقدم کیا گیا ہے جن کا

تعلق روزہ اور رمضان سے ہے۔ اسی طرح آخر تک ہے۔

۳۔ ہر سال کے شروع میں اس کا مختصر تعارف اور اس کی تصنیف کا پس منظر بیان کر دیا گیا ہے۔

۵۔ اس مجموعہ کے بعض رسائل علوم کے لئے آسان زبان میں لکھے گئے تھے اور اکثر کا اسلوب تحریر تحقیقی و اصطلاحی ہے کیونکہ وہ خاص اہل علم کے لئے لکھے گئے تھے۔

۶۔ تمام رسائل کی مفصل فہرست مضامین مجموعہ کے بالکل شروع میں ترتیب وار درج کر دی گئی ہے۔

۷۔ اکثر رسائل میں عنوانات خود حضرت والد ماجد مدظلہم کے قائم کردہ ہیں صرف تین رسالوں (۱) عائلی قوانین پر مختصر تبصرو (۲) ملکی سیاست میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل کی حدود و شریعہ (۳) یتیم پوتے کی میراث میں عنوانات احقر نے قائم کئے ہیں۔

۸۔ یہ سب کام مؤلف مدظلہم کے ایجاز و اجازت سے کیا گیا ہے۔

۹۔ ان میں سے کئی رسائل پر حضرت مؤلف مدظلہم نے حال ہی میں نظر ثانی فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ مشکل مسائل میں یہ عظیم مجموعہ عرصہ دراز تک اُمت کی رہنمائی کرے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔ والصلوة والسلام

علی سیدنا محمد خاتم النبیین، وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

الی یوم الدین

محمد رفیع عثمانی

نائب مفتی دارالعلوم کراچی۔ ۱۴۰

۲۸ محرم الحرام ۱۳۹۵ھ

وصول الافکار

الی

اصول الاکفار

تتقییر کے اصول

اوم

آغا خانى مشرقى حاکم

تاریخ تالیف _____ رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ
 مقام تالیف _____ دیوبند ضلع سہارنپور
 طبع اول _____ دارالاشاعت دیوبند ۱۳۵۱ھ

”کفر اور اسلام کا معیار کیا ہے؟ کسی مسلمان
 کو کس وجہ سے مرتد یا خارج از اسلام کہا جا
 سکتا ہے؟ اور کونسی گرامہیاں انسان کو
 کفر تک پہنچا دیتی ہیں؟ ان سوالات کا جواب اس مقالہ
 کا موضوع ہے، اور اس ضمن میں چکڑالوی، مرزائی
 اور آغا خانی فرقوں کی صحیح حیثیت بھی واضح کی
 گئی ہے۔“

سیدی حضرت حکیم الامتہ تھانوی قدس سرہ کی رائے گرامی

رسالہ وصول الافکار الی اصول الکفار کے متعلق

مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی کے ایک مفصل خط پر تنقید کے آخر میں حضرت تھانویؒ نے مندرجہ ذیل جملے تحریر فرمائے ہیں۔ یہ خط ۷ شعبان ۱۳۵۱ھ کا تحریر فرمودہ ہے اور ماہنامہ ”النور“ تھانہ بھون ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوا تھا اور پھر امداد الفتاویٰ مہتاب کی جلد چہارم ص ۵۳۹ پر شائع ہوا ہے۔ وہ جملے یہ ہیں۔

”مولوی محمد شفیع صاحب نے اصول تکفیر میں ایک مختصر اور جامع مانع اور نافع رسالہ لکھا ہے۔ بعض اجزا میں میں بھی اُلجھا تھا، مگر ان کی تقریر و تحریر سے قریب قریب مسئلہ صاف ہو گیا۔ وہ عنقریب چھپ جاوے گا میں نے اس کا نام رکھا ہے وصول الافکار الی اصول الکفار۔“ شعبان ۱۳۵۱ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى 'خصوصاً سيدنا محمد المجتبیٰ ومن بهداه هتدے
اٰمَّا بَعْدُ

کسی مسلمان کو کافر یا کافر کو مسلمان کہنا دونوں جانب سے نہایت ہی سخت معاملہ ہے۔ قرآن کریم نے دونوں صورتوں پر شدید تکفیر فرمائی ہے۔ مسلمان کو کافر کہنے کے متعلق ارشاد ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ آتَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ كُنْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ مَعَالِمٌ كَثِيرَةٌ ۚ كَذَلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ مِمَّنْ أَتَىٰ عَلَىٰكُمْ فَتَبَيَّنُوا إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا - (نساء: ۹۴)

اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام کو تحقیق کر کے کیا کرو اور ایسے شخص کو جو کہ تمہارے سامنے اطاعت ظاہر کرے دنیوی زندگی کے سامان کی خواہش میں یوں مت کہہ دیا کرو کہ تو مسلمان نہیں کیونکہ خدا کے پاس بہت غنیمت کے مال ہیں پہلے تم بھی ایسے ہی تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا سو غور کرو بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (یعنی

جب تم اول مسلمان ہوئے تھے اگر تمہیں بھی یہی کہہ دیا جاتا کہ تم مسلمان نہیں تو تم کیا کرتے، الغرض اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص اپنا اسلام ظاہر کرے تو جب تک اس کے کفر کی پوری تحقیق نہ ہو جائے اس کو کافر کہنا ناجائز اور وبال عظیم ہے اسی طرح اس کے مقابل یعنی کافر کو مسلمان کہنے کی ممانعت اس آیت میں ہے۔

أَتُرِيدُونَ أَنْ تَهْتَدُوا وَمَنْ أَضَلَّ اللَّهُ وَمَنْ يُضِلِّ اللَّهُ فَمَا لَهُ سَبِيلًا (نساء: ۸۸)

کیا تم لوگ اس کا ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے لوگوں کو ہدایت کرو جن کو اللہ تعالیٰ نے گمراہی میں ڈال رکھا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں اس کے لئے کوئی سبیل نہ پاؤ گے۔

سلف صالح صحابہ و تابعین اور مابعد کے ائمہ مجتہدین نے اس بارہ میں بڑی احتیاط سے کام لینے کی ہدایتیں فرمائی ہیں جن حضرات متکلمین اور فقہاء نے اس باب کو نہایت اہم اور دشوار گزار سمجھا ہے۔ اور اس میں داخل ہونے والوں کے لئے بہت زیادہ تعقیب و بیداری کی تلقین فرمائی ہے۔

چنانچہ حضرت علامہ قاریؒ نے شرح شفاء فصل تحقیق القول فی اکفار المتأولین، میں فرمایا ہے :-

ادخال کا قدر فی الملة الاسلامیة کسی کافر کو اسلام میں داخل سمجھنا یا مسلمان
او اخراج مسلمہ عنہا عظیم فی الدین کو اسلام سے خارج سمجھنا (دونوں چیزیں)
شرح شفاء ص ۵۰۰ ج ۲ سخت ہیں۔

لیکن آج کل اس کے برعکس یہ دونوں معاملے اس قدر سہل سمجھ لئے گئے ہیں کہ کفر و اسلام اور ایمان و ارتداد کا کوئی معیار اور اصول ہی نہ رہا۔

ایک جماعت ہے جس نے تکفیر بازی کو ہی مشغلہ بنا رکھا ہے۔ ذرا سی خلاف شرع بلکہ خلاف طبع کوئی بات کسی سے سرزد ہوئی اور ان کی طرف سے کفر کا فتویٰ لگا ادنیٰ ادنیٰ فرعی باتوں پر مسلمانوں کو اسلام سے خارج کہنے لگتے ہیں۔ ادھر ان کے مقابل دوسری جماعت ہے جن کے نزدیک اسلام و ایمان کوئی حقیقت محصلہ نہیں رکھتے بلکہ وہ ہر اس شخص کو مسلمان کہتے ہیں جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے خواہ تمام قرآن و حدیث اور احکام اسلام کا انکار اور توہین کرتا رہے ان کے نزدیک اسلام کے مفہوم میں ہر قسم کا کفر کھپ سکتا ہے۔ انھوں نے ہندوؤں اور دوسرے مذاہب باطلہ کی طرح اسلام کو بھی محض ایک قومی لقب بنا دیا ہے کہ عقائد جو چاہے رکھے اقوال و اعمال میں جس طرح چاہے آزاد رہے۔ وہ بہر حال مسلمان ہے۔ اور اس کو اپنے نزدیک وسعت خیال اور وسعت حوصلہ سے تعبیر کرتے ہیں اور تمام سیاسی مصالح کا محور و مدار اسی کو بنا رکھا ہے۔

لیکن یاد رہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس کی کجروی اور افراط و

تفریط کے دونوں پہلوؤں سے سخت بیزاریں۔ اسلام نے اپنے پیروں کے لئے ایک آسانی قانون پیش کیا ہے جو شخص اُس کو ٹھنڈے دل سے تسلیم کرے اور کوئی تنگی اپنے دل میں اُس کے ماننے سے محسوس نہ کرے وہ مسلمان ہے اور جو اس قانونِ الہی کے کسی ادنیٰ حکم کا انکار کر بیٹھے وہ بلاشبہ و بلا تردد دائرہ اسلام سے خارج ہے اُس کے دائرہ اسلام میں داخل رکھنے سے اسلام بیزار ہے اور اُس کے ذریعہ اسلامی برادری کی مردم شماری بڑھانے سے اسلام اور مسلمانوں کو غیرت ہے۔ اور ان چند لوگوں کے داخل اسلام ماننے سے ہزاروں مسلمانوں کے خارج از اسلام ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے جیسا کہ بہت دفعہ اس کا تجربہ اور مشاہدہ ہو چکا ہے۔

آریہ ایک مضرت ایسی ہے کہ اگر فی الواقع ہزاروں مصالح بھی اس کے مقابلہ میں موجود ہوں تو وہ کسی مذہب دوست مسلمان کے لئے ہرگز قابل التفات نہیں ہو سکتیں بالخصوص جب کہ وہ مصالح بھی محض موموم اور خیالی ہوں

الغرض ابنائے زمانہ کی اس انحراف و تفریط اور کفر و اسلام کے معاملہ میں بے احتیاطی کو دیکھ مدت سے خیال ہوتا تھا کہ اس بحث پر ایک مختصر جامع رسالہ لکھا جائے جس میں کفر و اسلام کا معیار ہو۔

اور اصولی طور پر یہ بات واضح کر دی جا کہ وہ کون سے عقائد یا اقوال و افعال ہیں جن کی بنا پر کوئی مسلمان اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اسی اشارہ میں ذیل کے سوال کا جواب لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ تو اسی کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھ دیا گیا جس سے علاوہ اصول تکفیر معلوم ہونے کے بعض فرقوں کا حکم بھی واضح ہو گیا۔ اور مرتد کے بعض احکام بھی معلوم ہو گئے اور اس مجموعہ کا نام ”وصول الافرار الی اصول الکفار رکھا گیا ہے۔

هَمَّا تَوْفِيقِي الْاِيَّاهُ اللهُ الْعَلِيِّ الْعَطِيْمِي ۝

۱۔ یہ رسالہ حضرت مولانا محمد عظیم اللہ صاحب مدظلہ العالی نے لکھا تھا تو ہی دامت برکاتہم نے باسستغاب ملاحظہ فرمایا اور بہت سی اصلاحات سے مزین فرمایا۔ اور اس کا نام ”وصول الافرار الی اصول الکفار تجویز فرمایا۔

سوالِ اوّل

کفر و اسلام کا معیار کیا ہے اور کس وجہ سے کسی مسلمان کو مرتد یا خارج از اسلام کہا جا سکتا ہے؟

الجواب!

ارتداد کے معنی لغت میں پھر جانے اور لوٹ جانے کے ہیں۔ اور اصطلاح شریعت میں ایمان و اسلام سے پھر جانے کو ارتداد اور پھرنے والے کو مرتد کہتے ہیں۔ اور ارتداد کی صورتیں دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی کم بخت صاف طور پر تبدیل مذہب کر کے اسلام سے پھر جائے۔ جیسے عیسائی، یہودی، آریہ سماجی وغیرہ مذہب اختیار کرے یا خداوندِ عالم کے وجود یا توحید کا منکر ہو جائے۔ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر دے (والعیاذ باللہ تعالیٰ)۔

دوسرے یہ کہ اس طرح صاف طور پر تبدیل مذہب اور توحید و رسالت سے انکار نہ کرے۔ لیکن کچھ اعمال یا اقوال یا عقائد ایسے اختیار کرے جو انکار قرآن مجید یا انکار رسالت کے مراد و ہم معنی ہیں۔ مثلاً اسلام کے کسی ایسے ضروری و قطعی حکم کا انکار کر بیٹھے جس کا ثبوت قرآن مجید کی نص صریح سے ہو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق تو اتر ثابت ہوا ہو۔ یہ صورت بھی باجماع اُمت ارتداد میں داخل ہے اگرچہ اس ایک حکم کے سوا تمام احکام اسلامیہ پر شدت کے ساتھ پابند ہو۔

ارتداد کی اس دوسری صورت میں اکثر مسلمان غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اور یہ اگرچہ بظاہر ایک سطحی اور معمولی غلطی ہے۔ لیکن اگر اس کے ہوتا ک نتائج پر نظر کی جائے تو اسلام اور مسلمان کے لئے اس سے زیادہ کوئی چیز مضر نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں کفر و اسلام کے حدود ممتاز نہیں رہتے کافر و مومن میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ اسلام کے چالاک دشمن اسلامی برادری کے ارکان بن کر مسلمانوں کے لئے

”مار آستین“ بن سکتے ہیں۔ اور دوستی کے لباس میں دشمنی کی ہر قرارداد کو مسلمانوں میں نافذ کر سکتے ہیں۔

اُس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس سورت ارتداد کی توضیح کسی قدر تفصیل کے ساتھ کر دی جائے اور چونکہ ارتداد کی صحیح حقیقت ایمان کے مقابلہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے اس لئے پہلے اجمالاً ایمان کی تعریف اور پھر ارتداد کی حقیقت لکھی جاتی ہے۔

ایمان کی تعریف مشہور و معروف ہے جس کے اہم جزو دو ہیں۔ ایک حق سبحانہ و تعالیٰ پر ایمان لانا۔ دوسرے

ایمان و ارتداد کی تعریف

اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ لیکن جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ پر ایمان کے یہ معنی نہیں کہ صرف اُس کے وجود کا قائل ہو جائے بلکہ اُس کی تمام صفات کا ملکہ علم، سمیع، بصیر، قدرت وغیرہ کو اُسی شان کے ساتھ ماننا ضروری ہے جو قرآن و حدیث میں بتلائی ہیں۔ ورنہ یوں تو ہر مذہب و ملت کا آدمی خدا کے وجود و صفات کو مانتا ہے۔ یہودی، نصرانی، مجوسی، ہندو سب ہی اس پر متفق ہیں۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا بھی یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ آپ کے وجود کو مان لے کہ آپ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تریسٹھ سال عمر ہوئی فلاں فلاں کام کئے۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی حقیقت وہ ہے جو قرآن مجید نے بالفاظِ ذیل بتلائی ہے:-

فَلَا وَرَيْكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ
يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ
لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

قسم ہے آپ کے رب کی کہ یہ لوگ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ آپ کو اپنے تمام نزاعات و اختلافات میں حکم نہ بناویں اور پھر جو فیصلہ آپ فرماویں اُس سے اپنے دلوں میں کوئی ٹکلی

محسوس نہ کریں اور اُس کو پوری طرح تسلیم نہ کریں۔

روح المعانی میں اسی آیت کی تفسیر سلف سے اس طرح نقل فرمائی ہے:-

فقد روى عن الصادق رضى الله عنه
حضرت جعفر صادق رضى الله عنه منقول ہے کہ اگر کوئی

عنه انه قال لو ان قوما عبدوا الله تعالى واقاموا الصلوة واتوا الزكوة وصاموا رمضان وحجوا البيت ثم قالوا لئن كنا نعلم ان رسول الله صلى الله عليه وسلم الا صنع خلاف ما صنع اوجدوا في انفسهم حججا لكانوا مشركين ثم تلا هذه الآية

قوم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور نماز کی پابندی کرے۔ اور زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے اور بیت اللہ کے حج کرے مگر پھر کسی ایسے فعل کو جس کا ذکر حضور سے ثابت ہو یوں کہے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا اس کے خلاف کیوں نہ کیا۔ اور اُس کے ماننے سے اپنے دل میں تنگی محسوس کرے تو یہ قوم مشرکین میں سے ہے۔

(روح المعانی ص ۶۵ ج ۵)

آیت مذکورہ اور اُس کی تفسیر سے واضح ہو گیا کہ رسالت پر ایمان لانے کی حقیقت یہ ہے کہ رسول کے تمام احکام کو ٹھنڈے دل سے تسلیم کیا جائے اور اس میں کسی قسم کا پس و پیش یا تردد نہ کیا جائے۔

اور جب ایمان کی حقیقت معلوم ہو گئی تو کفر و ارتداد کی صورت بھی واضح ہو گئی کیونکہ جس چیز کے ماننے اور تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے۔ اُسی کے نہ ماننے اور انکار کرنے کا نام کفر و ارتداد ہے (صرح برفی شرح المقاصد) اور ایمان و کفر کی مذکورہ تعریف سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ کفر صرف اسی کا نام نہیں کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سرے سے نہ مانے۔ بلکہ یہ بھی اُسی درجہ کا کفر اور نہ ماننے کا ایک شعبہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام قطعی و یقینی طور پر ثابت ہیں اُن میں سے کسی ایک حکم کے تسلیم کرنے سے یہ سمجھتے ہوئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے، انکار کر دیا جائے اگرچہ باقی سب احکام کو تسلیم کرے اور پورے اہتمام سے سب پر عمل بھی ہو۔

اور وجہ یہ ہے کہ کفر و ارتداد حضرت مالک الملک و المملکت کی بغاوت کا نام ہے اور سب جانتے ہیں کہ بغاوت جس طرح بادشاہ کے تمام احکام کی نافرمانی اور مقابلہ پر کھڑے ہو جانے کو کہتے ہیں اسی طرح یہ بھی بغاوت ہی سمجھی جاتی ہے کہ کسی ایک قانون

شاہی کی قانون شکنی کی بجائے اگرچہ باقی سب احکام کو تسلیم کر لے۔
شیطان ابلیس جو دنیا میں سب سے بڑا کافر اور کافر ہے اُس کا کفر بھی اسی دوسری
قسم کا کفر ہے کیونکہ اُس نے بھی نہ تبدیل مذہب کیا نہ خدا تعالیٰ کے وجود قدرت وغیرہ
کا انکار کیا نہ ربوبیت سے منکر ہوا صرف ایک حکم سے سرتابی کی جس کی وجہ سے ابد الآباد
کے لئے مطرود و ملعون ہو گیا۔

حافظ ابن تیمیہ الصارم المسلمون ص ۲۶ میں فرماتے ہیں:-

کما ان الردة تجرد عن السب
فكنت تجرد عن قصد تبديل
الدين واردة التکذيب بالرسالة
كما تجرد كفر ابليس عن قصد
التكذيب بالربوبية -

بسیا کہ ارتداد بغیر اس کے بھی ہو سکتا ہے کہ
حق تعالیٰ یا اُس کے رسول کی شان میں سب و شتم
سے پیش آوے اسکا طرح بغیر اس کے بھی ارتداد
محقق ہو سکتا ہے کہ آدمی تبدیل مذہب کا یا تکذیب
رسول کا قصد کرے جیسا کہ ابلیس لعین کا کفر تکذیب

ربوبیت سے خالی ہے۔

الغرض ارتداد صرف اسی کو نہیں کہتے کہ کوئی شخص اپنا مذہب بدل دے یا صاف
طور پر خدا و رسول کا منکر ہو جائے بلکہ ضروریات دین کا انکار کرنا اور قطعی الثبوت والذات
احکام میں سے کسی ایک کا بعد علم انکار کر دینا بھی اسی درجہ کا ارتداد اور کفر ہے۔

ہاں اس جگہ دو باتیں قابل خیال ہیں۔ اول تو یہ کہ کفر و ارتداد اُس صورت
میں عائد ہوتا ہے جب کہ حکم قطعی کے تسلیم کرنے سے انکار اور گردن کشی
کے اور اُس حکم کے واجب التعمیل ہونے کا عقیدہ نہ رکھے لیکن اگر کوئی شخص حکم
کو تو واجب التعمیل سمجھتا ہے مگر غفلت یا شرارت کی وجہ سے اُس پر عمل نہیں کرتا تو اس
کو کفر و ارتداد نہ کہا جائے گا اگرچہ ساری عمر میں ایک دفعہ بھی اس حکم پر عمل کرنے کی
نوبت نہ آئے بلکہ اس شخص کو مسلمان ہی سمجھا جائے گا۔ اور پہلی صورت میں کہ کسی حکم قطعی
کو واجب التعمیل ہی نہیں جانتا اگرچہ کسی وجہ سے وہ ساری عمر اُس پر عمل بھی کرتا رہے
جب بھی کافر مرتد شرار دیا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص پانچوں وقت کی نماز کا شدت کے

ساتھ پابند ہے مگر فرض اور واجب لتعمیل نہیں جانتا یہ کافر ہے اور دوسرا شخص جو فرض جانتا ہے مگر کبھی نہیں پڑھتا وہ مسلمان ہے اگرچہ فاسق و فاجر اور سخت گناہگار ہے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے احکامِ اسلامی کی مختلف قسمیں ہو گئی ہیں۔ تمام اقسام کا اس بارہ میں ایک حکم نہیں۔ کفر و ارتداد صرف ان احکام کے انکار سے عائد ہوتا ہے جو قطعی الثبوت بھی ہوں اور قطعی الدلالت بھی قطعی الثبوت ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ ان کا ثبوت قرآن مجید یا ایسی احادیث سے ہو جن کے روایت کرنے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لے کر آج تک ہر زمانہ اور ہر قرن میں مختلف طبقات اور مختلف شہروں کے لوگ اس کثرت سے رہے ہوں کہ ان سب کا بھڑکی بات پر اتفاق کر لینا محال سمجھا جائے (اسی کو اصطلاح حدیث میں تواتر اور ایسی احادیث کو احادیث متواترہ کہتے ہیں)۔

اور قطعی الدلالت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو عبارت قرآن مجید میں اس حکم کے متعلق واقع ہوئی ہے یا حدیث متواترہ سے ثابت ہوئی ہے وہ اپنے مفہوم مراد کو صاف صاف ظاہر کرتی ہو اس میں کسی قسم کی الجھن نہ ہو کہ جس میں کسی کی تاویل چل سکے۔ پھر اس قسم کے احکام قطعاً اگر مسلمانوں کے ہر طبقہ خاص و عام میں اس طرح مشہور و معروف ہو جائیں کہ ان کا حاصل کرنا کسی خاص اہتمام اور تعلیم و تعلم پر موقوف نہ رہے بلکہ عام طور پر مسلمانوں کو وراثتاً وہ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا فرض ہونا چوہدری، شراب خوری کا گناہ ہونا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیا ہونا وغیرہ تو ایسے احکام قطعاً کو ضروریات دین کے نام سے تعبیر کہتے ہیں۔ اور جو اس درجہ مشہور نہ ہوں وہ صرف قطعیات کہلاتے ہیں ضروریات نہیں۔

اور ضروریات اور قطعیات کے حکم میں یہ فرق ہے کہ ضروریات دین کا انکار باجماع اہمست مطلقاً کفر ہے ناواقفیت و جهالت کو اس میں عذر نہ قرار دیا جائے گا اور نہ کسی قسم کی تاویل سنی جائے گی۔

اور قطعیاتِ محضہ جو شہرت میں اس درجہ کو نہیں پہنچتے تو حنفیہ کے نزدیک اُس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کوئی عامی آدمی بوجہ تاواقفیت و جہالت کے اُن کا انکار کر بیٹھے تو ابھی اس کے کفر و ارتداد کا حکم نہ کیا جائے گا بلکہ پہلے اُس کو تبلیغ کی جائے گی کہ یہ حکم اسلام کے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت احکام میں سے ہے اس کا انکار کفر ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ اپنے انکار پر قائم رہے تب کفر کا حکم کیا جائے گا۔

عما فی المسایرة و المسامحة
لابن الہمام و لفظہ و اماما ثبت قطعاً
ولم یبلغ حد الضرورة کا مستحق
بنت الابن السدس مع البنت
الصلبیة بإجماع المسلمین فکلام
الحنفیة الا کفار مجدداً بانہم ہم یشتروا
فی الا کفار سوی القطع فی الثبوت
رالی قولہ) و یجب حملہ علی ما اذا علم
المنعرتیوتہ قطعاً (مسامرہ ص ۱۲۹)

اور جو حکم قطعی الثبوت تو ہو مگر ضرورت کی حد کو نہ پہنچا ہو جیسے (میراث میں) اگر پوتی اور بیٹی حقیقی جمع ہوں تو پوتی کو چھٹا حصہ ملنے کا حکم اجماع امت سے ثابت ہے۔ سو ظاہر کلام حنفیہ کا یہ ہے کہ اس کے انکار کی وجہ سے کفر کا حکم کیا جاوے گا کیونکہ انھوں نے قطعی الثبوت ہونے کے سوا اور کوئی شرط نہیں لگائی رالی قولہ مگر واجب ہے کہ حنفیہ کے اس کلام کو اُس صورت پر محمول کیا جاوے کہ جب منکر کو اس کا علم ہو کہ یہ حکم قطعی الثبوت ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس طرح کفر و ارتداد کی ایک قسم تبدیلِ مذہب ہے اسکی طرح دوسری قسم یہ بھی ہے کہ ضروریاتِ دین اور قطعیاتِ اسلام میں سے کسی چیز کا انکار کر دیا جائے یا ضروریاتِ دین میں کوئی ایسی تاویل کی جائے جس سے اُن کے معروف معانی کے خلاف معنی پیدا ہو جائیں اور غرض معروف بدل جائے اور ارتداد کی اس قسم دوم کا نام قرآن کی اصطلاح میں الحاد ہے۔

قال تعالیٰ ان الذین یلحدون
فی آیاتنا لا یخفون علینا۔ الایة
جو لوگ ہماری آیات میں الحاد کرتے ہیں وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے۔

اور حدیث میں اس قسم کے ارتداد کا نام زندقہ رکھا گیا ہے جیسا کہ صاحب مجمع البحار نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کرتے ہوئے فرمایا ہے:-

اتی علی بزنادقة هی جمع زندیق
 (الی قولہ) ثم استعمل فی کل ملحد
 فی الدین والمراد ہنما قوم ارتدادوا
 عن الاسلام۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس چند زنداقہ
 (گرفتار کو کے) لائے گئے۔ زنداقہ جمع زندیق کی ہے
 اور لفظ زندیق ہر اس شخص کے لئے استعمال کیا جاتا
 ہے جو دین میں الحاد یعنی بے جاتا دیلات کے
 (مجمع البحار ص ۶۹۵)

اور علمائے کلام اور فقہاء اس خاص قسم ارتداد کا نام باطنیت رکھتے ہیں۔ اور کبھی
 وہ بھی زندق کے لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

شرح مقاصد میں علامہ تفتازانی اقسام کفر کی تفصیل اس طرح نقل فرماتے ہیں۔

”یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ کافر اس شخص کا نام ہے جو مومن نہ ہو۔ پھر
 اگر وہ ظاہر میں ایمان کا ملکا ہو تو اس کو منافق کہیں گے۔ اور اگر مسلمان ہونے کے
 بعد کفر میں مبتلا ہوا ہے تو اس کا نام مرتد رکھا جائے گا۔ کیونکہ وہ اسلام سے پھر گیا
 ہے۔ اور اگر دو یا دو سے زیادہ معبودوں کی پرستش کا قائل ہو تو اس کو مشرک
 کہا جائے گا۔ اور اگر ادیان منسوخہ یہودیت و عیسائیت وغیرہ میں کسی مذہب کا
 پابند ہو تو اس کو کتابی کہیں گے۔ اور اگر عالم کے قدیم ہونے کا قائل ہو اور تمام واقعات
 و حوادث کو زمانہ کی طرف منسوب کرتا ہو تو اس کو دہریہ کہا جائے گا۔ اور اگر
 وجود باری تعالیٰ ہی کا قائل نہ ہو تو اس کو معطل کہتے ہیں اور اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
 کی نبوت کے اقرار اور شعار اسلام نماز و روزہ وغیرہ کے اظہار کے ساتھ کچھ ایسے
 عقائد دلی رکھتا ہو جو بالاتفاق کفر میں تو اس کو زندیق کہا جاتا ہے۔ (ترجمہ عبارت شرح
 مقاصد ص ۲۶۸ و ص ۲۶۹ ج ۲)“ و مختلفہ فی کلیات ابی البقار ص ۵۵۲ و ص ۵۵۳۔

زندیق کی تعریف میں جو عقائد کفریہ کا دل میں رکھنا ذکر کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ
 نہیں کہ وہ مثل منافق کے اپنا عقیدہ ظاہر نہیں کرتا بلکہ یہ مراد ہے کہ اپنے عقیدہ کفریہ
 کو طمع کر کے اسلامی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔

کما ذکرہ الشامی حیث قال علامہ شامی نے فرمایا ہے کہ زندیق اپنے کفر پر طمع

فان الذندیق یوۃ کفرہ و یروج عقیدتہ الفاسدۃ و یخرجہا فی الصورۃ لصحیحۃ و ہذا معنی ابطان الصفر فلا یتآ فی اظہارہ الدعوی -

سازی کرتا ہے اور اپنے عقیدہ فاسدہ کو رائج کرنا چاہتا ہے اور اس کو عمدہ صورت میں ظاہر کرتا ہے اور ذندیق کی تعریف میں جو یہ لکھا جاتا ہے کہ وہ اپنے کفر کو چھپاتا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ اپنے کفر کو ایسے عزائم اور صورتوں میں پیش کرتا ہے جس کو لوگ مناظر

(شامی باب المرتد ص ۲۵۸) میں پڑ جائیں اس لئے یہ اختفاء کفر اظہار دعویٰ کے منافی نہیں

کفر کی اقسام مذکورہ بالا میں سے آخری قسم اس جگہ زیر بحث ہے جس کے متعلق شرح مقاصد کے بیان سے ظاہر ہو گیا کہ جس طرح اقسام سالیقہ کفر کے انواع ہیں اسی طرح یہ صورت بھی اسی درجہ کا کفر ہے کہ کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن مجید کے احکام کو تسلیم کرنے کے باوجود صرف بعض احکام و عقائد میں اختلاف رکھتا ہو اگرچہ دعویٰ مسلمان ہونے کا کرے اور تمام ارکان اسلام پر شدت کے ساتھ عامل بھی ہو۔

ایک شبہ کا جواب

یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں اور کتب فقہ و عقائد میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں نیز بعض احادیث سے بھی یہ مسئلہ ثابت ہے۔

کما رواہ ابو داؤد فی الجہاد عن انس رضی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث من اصل الایمان الکف عن قال لا الہ الا اللہ ولا تحقرہ بذنب ولا تخرجہ من الاسلام بعمل الحدیث -

حضرت انس رضی فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان کی اصل تین چیزیں ہیں ایک یہ کہ جو شخص کلمہ لا الہ الا اللہ کا قائل ہو اس کے قتل سے باز رہو۔ اور کسی گناہ کی وجہ سے اس کو کافر مت کہو اور کسی عمل بد کی وجہ سے اس کو اسلام سے خارج نہ قرار دو۔

اس لئے مسئلہ زیر بحث میں یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ جو شخص نماز روزہ کا پابند ہے وہ اہل قبلہ میں داخل ہے تو پھر بعض عقائد میں خلاف کرنے یا بعض احکام کے تسلیم نہ کرنے

سے اُس کو کیسے کافر کہا جاسکتا ہے۔ اور اسی شبہ کی بنیاد پر آج کل بہت سے مسلمان قسم ثانی کے مرتدین یعنی ملحدین و زنادقہ کو مرتد و کافر نہیں سمجھتے۔ اور یہ ایک بھاری غلطی ہے جس کا صدمہ براہِ راست اصولِ اسلام پر پڑتا ہے۔ کیونکہ میں اپنے کلام سابق میں عرض کر چکا ہوں کہ اگر قسم دوم کے ارتداد کو ارتداد نہ سمجھا جائے تو پھر شیطان کو بھی کافر نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس شبہ کے منشاء کو بیان کر کے اُس کا شافی جواب ذکر کیا جائے۔ اصل اُس کی یہ ہے کہ شرح فقہ اکبر وغیرہ میں امام عظیم ابو حنیفہ رحمہ سے اور حواشی شرح عقائد میں شیخ ابوالحسن اشعری سے اہل سنت و الجماعۃ کا یہ مسلک نقل کیا گیا ہے:-

ومن قواعد اهل السنة و
الجماعة ان لا يكفر واحد من اهل
القبلة ركنا في شرح العقائد التسفية
ص ۱۳۱ وفي شرح القمير ص ۳۱۸ ج ۲
وسياقتها عن ابي حنيفة رح ولا تكفر
اهل القبلة بذنبا نكفوا فقيده
بالتاب في عبارة الامام واصل في
حديث ابي داود كما مر انفاً -
اہل سنت و الجماعۃ کے قواعد میں سے ہے کہ اہل
قبلہ میں سے کسی شخص کی تکفیر نہ کی جائے (شرح عقائد
نسفی) اور شرح تحریر ص ۳۱۸ ج ۲ میں ہے کہ یہ
مضمون امام عظیم ابو حنیفہ رحمہ سے منقول ہے کہ ہم اہل قبلہ
میں سے کسی شخص کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے
سوا اس میں بظن کی قید موجود ہے اور قال بآیہ قید
حدیث ابوداؤد کی بنا پر لگائی گئی ہے جو ابھی گزر
چکی ہے۔

جس کا صحیح مطلب تو یہ ہے کہ کسی گناہ میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر
مت کہو خواہ کتنا ہی بڑا گناہ ہو بشرطیکہ کفر و شرک نہ ہو (کیونکہ گناہ سے مراد اس جگہ پر
وہی گناہ ہے جو حد کفر تک نہ پہنچا ہو۔

عماد فی کتاب الایمان لابن تیمیہ
حیث قال و نحن اذا قلنا اهل السنة
متفقون علی ان لا یکفر بالذنب
فانما نرید به المعاصی كالزنا والشر
جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ کی کتاب الایمان میں ہے
کہ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت و الجماعۃ اس پر متفق
ہیں کہ اہل قبلہ میں سے کسی شخص کو کسی گناہ کی وجہ سے
کافر نہ کہیں تو اس جگہ گناہ سے ہماری مراد معاصی

انتھی و اوضحہ القونوی فی شرح مثل زنا و شراب خوری وغیرہ ہوتے ہیں اور علامہ قزوینی العقیدۃ الطحاویۃ - نے عقیدہ طحاوی کی شرح میں اس مضمون کو خوب واضح کر دیا ہے۔

ورنہ پھر اس عبارت کے کوئی معنی نہیں رہتے اور لفظ بدنہ کے اصناف کی جیسا کہ فقہ اکبر اور شرح تحریر کے حوالہ سے اوپر نقل ہوا ہے) کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ اب شہادت کی ابتداء یہاں سے ہوئی کہ بعض علماء کی عبارات میں اختصار کے مواقع میں بدنہ کا لفظ بوجہ معروف و مشہور ہونے کے چھوڑ دیا گیا۔ اور مسئلہ کا عنوان عدم تکفیر اہل القبۃ ہو گیا۔ حدیث و فقہ سے نا آشنا اور غرض متکلم سے ناواقف لوگ یہاں سے یہ سمجھ بیٹھے کہ جو شخص قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے اُس کو کافر کہنا جائز نہیں خواہ کتنے ہی عقائد کفریہ رکھتا ہو۔ اور اقوال کفریہ بکتا پھرے۔ اور یہ بھی خیال نہ کیا کہ اگر یہی لفظ پرستی ہے تو اہل قبلہ کے لفظوں سے تو یہ بھی نہیں نکلتا کہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے بلکہ ان لفظوں کا مفہوم تو اس سے زائد نہیں کہ صرف قبلہ کی طرف منہ کر کے خواہ نماز بھی پڑھے یا نہ پڑھے۔ اگر یہ معنی مراد لئے جائیں تو پھر دنیا میں کوئی شخص کافر ہی نہیں رہ سکتا کیونکہ کبھی نہ کبھی ہر شخص کا منہ قبلہ کی طرف ہو ہی جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ لفظ اہل قبلہ کی مراد تمام اوقات و احوال کا استیعاب یا استقبال قبلہ نہیں۔

خوب سمجھ لیجئے کہ لفظ اہل قبلہ ایک شرعی اصطلاح ہے جس کے معنی اہل اسلام کے ہیں اور اسلام وہی ہے جس میں کوئی بات کفر کی نہ ہو۔ لہذا یہ لفظ صرف اُن لوگوں کے لئے بولا جاتا ہے جو تمام ضروریات دین کو تسلیم کریں۔ اور اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام پر (بشرط ثبوت) ایمان لائیں۔ نہ ہر اُس شخص کے لئے جو قبلہ کی طرف منہ کر لے۔ جیسے دنیا کی موجودہ عدالتوں میں اہل کار کا لفظ صرف اُن لوگوں کے لئے بولا جاتا ہے جو باضابطہ ملازم اور قوانین ملازمت کا پابند ہو۔ اُس کے مفہوم لغوی کے موافق ہر کام والے آدمی کو اہل کار نہیں کہا جاتا۔ اور یہ جو کچھ لکھا گیا علم فقہ و عقائد کی کتابیں تقریباً تمام اس پر شاہد ہیں جن میں سے بعض عبارات درج ذیل ہیں :-

حضرت طاعلی قاری شرع فقہ اکبر میں فرماتے ہیں:-

اعلم ان المراد باهل القبلة
الذين اتفقوا على ما هو من ضروريات
الدين كحدوث العالم وحشر الاجساد
وعلم الله تعالى بالكميات والجزئيات و
ما شبه ذلك من المسائل السهله
فمن واطب طول عمره على الطاعات
والعبادات مع اعتقاد قدم العالم و
نفي الحشر ونفي علمه سبحانه وتعالى
بالجزئيات لا يكون من اهل القبلة
وان المراد بعدم تكفير احد من اهل القبلة
عند اهل السنة انه لا يكفر احد ما
لم يوجد شيء من امارات الكفر وعلاماته
ولم يصدر عنه شيء من موجباته

خوب سمجھ لو کہ اہل قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جہاں تمام
عقائد پر متفق ہوں جو ضروریات دین میں سے ہیں جیسے حدود عالم
اور قیامت حشر اجساد اور اللہ تعالیٰ کا علم تمام کمیاں و جزئیات
پر حاوی ہونا اور اسی قسم کے دوسرے عقائد میں
جو شخص تمام عمر طاعات و عبادات پر مداومت کرے مگر
ساتھ ہی عالم کے قیام ہونے کا معتقد ہو یا قیامت میں
مردوں کے زندہ ہونے کا یا حق تعالیٰ کے علم جزئیات کا
انکار کرنے وہ اہل قبلہ میں سے نہیں اور یہ کہ اہل سنت
کے نزدیک اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے سے مراد
یہی ہے کہ ان میں سے کسی شخص کو اس وقت
تک کافر نہ کہیں جب تک اس سے کوئی
ایسی چیز سرزد نہ ہو جو علامات کفر یا موجبات
کفر میں سے ہے۔

اور شرح مقاصد مسجرت سابق میں مذکور الصدر مضمون کو مفصل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:-

فلا نزاع في كفر اهل القبلة الموات
طول العمر على الطاعات باعتقاد قدم
العالم ونفي الحشر ونفي العلم بالجزئيات
وهو ذلك وكذلك يصدر شيء من
موجبات الكفر منه

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ اہل قبلہ میں سے اس شخص
کو کافر کہا جائے گا جو اگرچہ تمام عمر طاعات و عبادت میں گزارے
مگر عالم کے قیام ہونے کا اعتقاد رکھے یا قیامت و حشر کا
یا حق تعالیٰ کے عالم جزئیات ہونے کا انکار کرے اسی
طرح وہ شخص جس سے کوئی چیز موجبات کفر میں سے صادر
ہو جائے۔

اور علامہ شامی نے رد المحتار باب الامامة جلد اول میں بحوالہ تحریر الاصول نقل فرمایا ہے:-

لا خلاف في كفر المخالف من اهل القبلة
اي للفقهاء ۱۲

اس میں کسی کا خلاف نہیں کہ اہل قبلہ میں سے جو شخص

المواظب طول صبراً علی الطاعات كما
فی شرح التقریر (ص ۳۷، ۱۶۷)

مضوریات دین میں سے کسی چیز کا انکار ہو وہ کافر ہے
اگرچہ تمام عمر طاعات و عبادات میں گزارے۔

اور شرح عقائد فلسفی کی شرح نیز اس ص ۵۷، ۲ میں ہے۔

اهل القبلة فی اصطلاح المتکلمین
من یصدق بضروریات الدین الی
قوله فمن انکر شیئاً من الضروریات
الی قوله) لو کن من اهل القبلة
ولو کان مجاہداً بالطاعات وکذا
من باشر شیئاً من امارات
التکذیب کسجود الصنم والاهانت
بامر شرعی والاستهزاء علیہ
فلیس من اهل القبلة ومعنی عدم
تکفیر اهل القبلة ان لا یحکم
بارتکاب المعاصی ولا بانکار الامور
الخفیة غیر المشهورة هذا ما حقه
المحققون -

اہل قبلہ متکلمین کی اصطلاح میں وہ شخص ہے
جو تمام ضروریات دین کی تصدیق کرے پس جو شخص
ضروریات دین میں سے کسی چیز کا انکار کرے
وہ اہل قبلہ میں سے نہیں اگرچہ عبادت و اطاعت میں
مجاہدات کرنے والا ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جو علامات
کفر و تکذیب میں سے کسی چیز کا مرتکب ہو جیسے
بت کو سجدہ کرنا یا کسی امر شرعی کی امانت و استزاد
کرتا وہ اہل قبلہ میں سے نہیں اور اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے
کا مطلب یہ ہے کہ معاصی کے ارتکاب کی وجہ سے
اُس کو کافر نہ کہیں اور نہ ایسے اموال کے انکار کی وجہ
سے کافر کہیں جو اسلام میں مشہور نہیں یعنی ضروریات
دین میں سے نہیں۔

تنبیہ

کسی مسلمان کو کافر کہنے کے معاملہ میں آج کل ایک عجیب افراد و تفریط رونما ہے
ایک جماعت ہے کہ جس نے مشغلہ ہی اختیار کر لیا ہے کہ ادنی معاملات میں مسلمانوں
پر تکفیر کا حکم لگا دیتے ہیں اور جہاں ذرا سی کوئی خلاف شرع حرکت کسی سے دکھتے ہیں
تو اسلام سے خارج کہنے لگتے ہیں۔ اور دوسری طرف تو تعلیم یافتہ آزاد خیال جماعت
ہے جس کے نزدیک کوئی قول و فعل خواہ کتنا ہی شدید اور عقائد اسلامیہ کا صریح

مقابل ہو کفر کھلانے کا مستحق نہیں۔ وہ ہر مدعی اسلام کو مسلمان کہنا فرض سمجھتے ہیں اگرچہ اوس کا کوئی عقیدہ اور عمل اسلام کے موافق نہ ہو اور ضروریات دین کا انکار کرتا ہو۔ اور جس طرح کسی مسلمان کو کافر کہنا ایک سخت پُرخطر معاملہ ہے اسی طرح کافر کو مسلمان کہنا بھی اوس سے کم نہیں کیونکہ حدود کفر و اسلام میں التباس بہر دو صورت لازم آتا ہے اس لئے علماء اُمت نے ہمیشہ ان دونوں معاملوں میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے۔ امر اول کے متعلق تو یہاں تک تصریحات ہیں کہ اگر کسی شخص سے کوئی کام خلاف شرع صادر ہو جائے اور اوس کلام کی مراد میں محاورات کے اعتبار سے چند احتمال ہوں اور سب احتمالات میں یہ کلام ایک کلمہ کفر بنتا ہو لیکن صرف ایک احتمال ضعیف ایسا بھی ہو کہ اگر اس کلام کو اس پر حمل کیا جائے تو معنی کفر نہیں رہتے بلکہ عقائدِ حقہ کے مطابق ہو جاتے ہیں تو مفتی پر واجب ہے کہ اسی احتمال ضعیف کو اختیار کر کے اوس کے مسلمان ہونے کا فتویٰ دے جب تک کہ خود وہ متکلم اس کی تصریح نہ کرے کہ میری مراد یہ معنی نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان کسی ایسے عقیدہ کا قائل ہو جاوے جو ائمہ اسلام میں سے اکثر لوگوں کے نزدیک کفر ہو لیکن بعض ائمہ اوس کے کفر ہونے کے قائل نہ ہوں تو اوس کفر مختلف فیہ سے بھی مسلمان پر کفر کا حکم کرنا جائز نہیں (صرح بہ فی البحر الرائق باب المرتدین جلد ۵) و مثله فی رد المحتار و جامع الفصولین من باب کلمات الکفر۔

اور امدوم کے متعلق بھی صحابہ کرام اور سلف صالحین کے تعامل نے یہ بات متعین کر دی کہ اس میں تہاون و تکاسل کرنا اصول اسلام کو نقصان پہنچانا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو لوگ مرتد ہوئے تھے اون کا ارتداد قسم دوم ہی کا ارتداد تھا۔ صریح طور پر تبدیل مذہب (عموماً) نہ تھا۔ لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اون پر جہاد کرنے کو اتنا زیادہ اہم سمجھا کہ نزاکت وقت اور اپنے ضعف کا بھی خیال نہ فرمایا۔ اسی طرح میسلہ کذاب مدعی نبوت اور اس کے ماننے والوں پر جہاد کیا جس میں جمہور صحابہ شریک تھے جن کے اجماع سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جو شخص ختم نبوت کا انکار کرے یا نبوت کا دعویٰ کرے وہ مرتد ہے اگرچہ تمام ارکان اسلام کا پابند اور زاہد و عابد ہو۔

مقابل ہو کفر کھلانے کا مستحق نہیں۔ وہ ہر مدعی اسلام کو مسلمان کہنا فرض سمجھتے ہیں اگرچہ اوس کا کوئی عقیدہ اور عمل اسلام کے موافق نہ ہو اور ضروریات دین کا انکار کرتا ہو۔ اور جس طرح کسی مسلمان کو کافر کہنا ایک سخت پُرخطر معاملہ ہے اسی طرح کافر کو مسلمان کہنا بھی اوس سے کم نہیں کیونکہ حدود کفر و اسلام میں التباس بہر دو صورت لازم آتا ہے اس لئے علماء اُمت نے ہمیشہ ان دونوں معاملوں میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے۔ امر اول کے متعلق تو یہاں تک تصریحات ہیں کہ اگر کسی شخص سے کوئی کام خلاف شرع صادر ہو جائے اور اوس کلام کی مراد میں محاورات کے اعتبار سے چند احتمال ہوں اور سب احتمالات میں یہ کلام ایک کلمہ کفر بنتا ہو لیکن صرف ایک احتمال ضعیف ایسا بھی ہو کہ اگر اس کلام کو اس پر حمل کیا جائے تو معنی کفر نہیں رہتے بلکہ عقائدِ حقہ کے مطابق ہو جاتے ہیں تو مفتی پر واجب ہے کہ اسی احتمال ضعیف کو اختیار کر کے اوس کے مسلمان ہونے کا فتویٰ دے جب تک کہ خود وہ متکلم اس کی تصریح نہ کرے کہ میری مراد یہ معنی نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان کسی ایسے عقیدہ کا قائل ہو جاوے جو ائمہ اسلام میں سے اکثر لوگوں کے نزدیک کفر ہو لیکن بعض ائمہ اوس کے کفر ہونے کے قائل نہ ہوں تو اوس کفر مختلف فیہ سے بھی مسلمان پر کفر کا حکم کرنا جائز نہیں (صرح بہ فی البحر الرائق باب المرتدین جلد ۵) و مثله فی رد المحتار و جامع الفصولین من باب کلمات الکفر۔

اور امدوم کے متعلق بھی صحابہ کرام اور سلف صالحین کے تعامل نے یہ بات متعین کر دی کہ اس میں تہاون و تکاسل کرنا اصول اسلام کو نقصان پہنچانا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو لوگ مرتد ہوئے تھے اون کا ارتداد قسم دوم ہی کا ارتداد تھا۔ صریح طور پر تبدیل مذہب (عموماً) نہ تھا۔ لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اون پر جہاد کرنے کو اتنا زیادہ اہم سمجھا کہ نزاکت وقت اور اپنے ضعف کا بھی خیال نہ فرمایا۔ اسی طرح میسلہ کذاب مدعی نبوت اور اس کے ماننے والوں پر جہاد کیا جس میں جمہور صحابہ شریک تھے جن کے اجماع سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جو شخص ختم نبوت کا انکار کرے یا نبوت کا دعویٰ کرے وہ مرتد ہے اگرچہ تمام ارکان اسلام کا پابند اور زاہد و عابد ہو۔

ضابطہ تکفیر | اس لئے تکفیر مسلم کے بارہ میں ضابطہ شرعیہ یہ ہو گیا کہ جب تک کسی شخص کے کلام میں تاویل صحیح کی گنجائش ہو اور اس کے خلاف کی تصریح متکلم کے کلام میں نہ ہو۔ یا اس عقیدہ کے کفر ہونے میں ادنیٰ سے ادنیٰ اختلاف ائمہ اجماع میں واقع ہو۔ اس وقت تک اس کے کہنے والے کو کافر نہ کہا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص ضروریات دینی میں سے کسی چیز کا انکار کرے یا کوئی ایسی ہی تاویل و تحریف کرے جو اس کے اجماعی معانی کے خلاف معنی پیدا کر دے تو اس شخص کے کفر میں کوئی تاویل نہ کیا جائے واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

تنبیہ ضروری کمر

مسئلہ زیر بحث میں اس بات کا ہر وقت خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ مسئلہ نہایت نازک ہے۔ اس میں بیباکی اور جلد بازی سے کام لینا سخت خطرناک ہے۔ مسئلہ کی دونوں جانب نہایت احتیاط کی مقتضی ہیں کیونکہ جس طرح کسی مسلمان کو کافر کہنا وبالِ عظیم ہے اور حسب تصریح حدیث اس کہنے والے کے کفر کا اندیشہ قوی ہے۔ اسی طرح کسی کافر کو مسلمان کہنا یا سمجھنا بھی اس سے کم نہیں جیسا کہ عبارت شفاء سے منقول ہے۔ اور شفاء میں مسئلہ کی نزاکت کو بایں الفاظ بیان فرمایا ہے:-

ولمثل هذا ذهب ابوالمعالی
فی اجوبتہ الی محمد عبدالحق و
کان سألہ عن المسألة فاعتذرا
لہ بان الغلط فیہ یصعب لان دخال
کافر فی الملة الاسلامیة او اخراج
مسلم عنہا عظیم فی الدین دشوہ شفا
فصل فی تحقیق القول فی الکفار المتأولین
ابوالمعالی نے جو محمد عبدالحق کے سوالات کے جواب
لکھے ہیں ان میں ان کا بھی یہی مذہب ثابت ہے کیونکہ ان
سے ایسا ہی سوال کیا گیا تھا جس کے جواب میں انھوں
نے عذر کر دیا کہ اس بارہ میں غلطی سخت مصیبت کی چیز
ہے کیونکہ کسی کافر کو مذہب اسلام میں داخل
سمجھنا یا مسلمان کو اس سے خارج سمجھنا دین
میں بڑے خطرہ کی چیز ہے۔

اسی لئے ایک جانب تو یہ احتیاط ضروری ہے کہ اگر کسی شخص کا کوئی مبہم کلام سامنے آئے جو مختلف وجوہ کو محتمل ہو اور سب وجوہ سے عقیدہ کفریہ قائل کا ظاہر ہوتا ہو لیکن صرف ایک وجہ ایسی بھی ہو جس سے اصطلاحی معنی اور صحیح مطلب بن سکے۔ گو وہ وجہ ضعیف ہی ہو۔ تو مفتی وقاضی کا فرض ہے کہ اُس وجہ کو اختیار کر کے اُس شخص کو مسلمان کہے (کما صرح بہ فی الشفا فی ذہ الصفتہ ومثلہ صرح فی البحر وجامع الفصولین وغیرہ)۔

اُدو دوسری طرف یہ لازم ہے کہ جس شخص میں کوئی وجہ کفر کی یقیناً ثابت ہو جاوے اُس کی تکفیر میں ہرگز تاخیر نہ کرے اور نہ اُس کے متبعین کو کافر کہنے میں دریغ کرے جیسا کہ علماء اُمت کی تصریحات محررہ بالا سے بخوبی واضح ہو چکا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم و احکم۔

تممہ مسئلہ از امداد الفتاویٰ جلد ساوِس

یہ نکل بیان اُس صورت میں تھا جب کہ کسی شخص یا جماعت کے متعلق عقیدہ کفریہ دیکھنا یا اقوال کفریہ کا کہنا متیقن طریق سے ثابت ہو جائے لیکن اگر خود اسی میں کسی موقع پر شک ہو جائے کہ یہ شخص اس عقیدہ کا معتقد یا اس قول کا قائل ہے یا نہیں تو اُس کے لئے احتیاطِ اہل علم وہ طریق ہے جو امداد الفتاویٰ میں درج ہے۔ جس کو بعینہ ذیل میں بطور تتمہ نقل کیا جاتا ہے۔

اگر کسی خاص شخص کے متعلق یا کسی خاص جماعت کے متعلق حکم بالکفر میں تردد ہو خواہ تردد کے اسباب علماء کا اختلاف ہو خواہ قرآن کا تعارض ہو یا اصول کا غموض تو اہل علم یہ ہے کہ نہ کفر کا حکم کیا جاوے نہ اسلام کا حکم اول میں تو خود اُس کے معاملات کے اعتبار سے بے احتیاطی ہے اور حکم ثانی میں دوسرے مسلمانوں کے معاملات کے اعتبار سے بے احتیاطی ہے پس احکام میں دونوں احتیاطوں کو جمع کیا جائے گا۔ یعنی اُس سے نہ عقد مناکحت کی اجازت دیں گے نہ اُس کی اقتدار کریں گے نہ اُس کا ذبیحہ کھائیں گے اور نہ اُس پر سیاست کا سرانہ جاری کریں گے۔ اگر تحقیق کی قدرت ہو اُس کے عقائد کی تفتیش کریں گے اور اُس تفتیش کے بعد جو ثابت ہو ویسے ہی احکام جاری کریں گے اور اگر تحقیق کی قدرت نہ ہو تو سکوت کریں گے اور اُس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں گے اس کی نظیر وہ حکم ہے

جو اہل کتاب کی مشتبہ روایات کے متعلق حدیث میں وارد ہے۔

لا تصدقوا اهل الكتاب ولا
تکذبوا هم وقولوا امنا بالله وما
انزل الينا الاية رواه البخاری۔
نہ اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب بلکہ یوں کہو کہ ہم
اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اس وحی پر جو ہم پر نازل
ہوئی الخ

دوسری فقہی نظیر احکام غنشی کے ہیں:

يؤخذ فيه بالاحوط والاوثق
في امور الدين وان لا يحكم بثبوت
حكم وقع الشك في ثبوته و اذا
وقف خلف الامام قام بين صف
الرجال والنساء ويصلي بقتاع و
يجلس في صلاته جلوس المرأة ويكره
له في حياتها لبس الحلي والمخدير وان
يتلو اية غيرهم من رجل او امرأة
او يسافر مع غيرهم من الرجال
والاناث ولا يغسله رجل ولا امرأة
ويقيم بالصعيد ويكفن كما يكفن
المجارية و امثاله مما فصله الفقهاء
|| اشعبان ساهه ||
غنشی مشکل کے بارہ میں امور دین میں وہ صورت اختیار
کی جاد جس میں احتیاط ہو اور کسی ایسی چیز کے ثبوت کا اس
پر حکم نہ کیا جاد جس کے ثبوت میں شک ہو اور جب وہ امام
کے پیچھے نماز کی صف میں کھڑا ہو تو مردوں اور عورتوں کی
صف کے درمیان کھڑا ہو۔ اور عورتوں کی طرح دوپٹہ
اولاد نہ نماز پڑھے اور قعدہ میں اس طرح بیٹھے جیسے
عورتیں بیٹھتی ہیں اور اس کے لئے زینر اور لیٹھی کپڑا،
پہننا مکروہ ہے اور یہ بھی مکروہ ہے کہ کوئی مرد یا عورت
غیر محرم اس کے ساتھ خلوت میں بیٹھے یا ایسے مرد یا عورت
کے ساتھ سفر کرے جو اس کا محرم نہ ہو اور مرنے کے بعد
اس کو نہ کوئی مرد غسل دے نہ عورت بلکہ تیمم کر دیا جائے
اور کفن ایسا دیا جائے جیسا لڑکیوں کو دیا جاتا ہے اور اسی
طرح دو کمر احکام جن کو فقہاء نے مفصل لکھا ہے۔

مَشْوَرَاتُ

یہ بحث کہ کن کن امور سے کوئی مسلمان خارج از اسلام ہو جاتا ہے اور حکم تکفیر کے لئے
شرعی ضابطہ کیا ہے۔ اور اہل قبلہ کو کافر نہ کہنے کی کیا مراد ہے۔ اس کے متعلق ایک
جامع مانع بہترین رسالہ رئیس المحدثین حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ

کا کفار الملحدین کے نام سے عربی زبان میں شائع ہو چکا ہے جو حضرات ان مسائل کو مکمل دیکھنا چاہتے ہیں اس کی مراجعت کریں۔

سوال دوم

اس عام سوال کے بعد چند فرقوں کے متعلق خاص طور پر سوال کی ضرورت محسوس ہوئی۔
 اول فرقہ چکڑالویہ۔ دوم فرقہ مرزائیہ۔ سوم فرقہ رافضیہ۔ ان تینوں فرقوں کے عقائد و وجہ
 ذیل ہیں۔ ان عقائد کو زیر نظر رکھتے ہوئے ان فرقوں کے متعلق تحریر فرمایا جائے کہ یہ فرقے
 دائرہ اسلام میں داخل ہیں یا نہیں؟

فرقہ چکڑالویہ کے عقائد

پنجاب میں ایک فرقہ ہے جو اپنے کو اہل قرآن کہتا ہے۔ اس کا بانی عبداللہ چکڑالوی
 ہے اور اسی کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے۔ اس فرقہ کے عقائد کا نونہ خود بانی فرقہ
 عبداللہ چکڑالوی کی کتاب دربان الفرقان علی صلواتہ القرآن سے بحوالہ صفحات لکھا جاتا
 ہے تاکہ علماء کرام اس پر غور فرمائیں کہ یہ فرقہ اور اس کے متبعین مسلمان ہیں یا نہیں۔ یہ عقائد
 بعینہ اس کے الفاظ میں یہ ہیں:-

منقول از برہان الفرقان علی صلواتہ القرآن از عبداللہ چکڑالوی

- ۱۔ قرآن مجید ہی کی سکھائی نماز پڑھنی فرض ہے اور اس کے سوا اور کسی طرح کی نماز
 پڑھنا کفر و شرک ہے ص ۵ سطر ۶
- ۲۔ سنو کہ وہ شے محض قرآن مجید ہی ہے حمد سوا اللہ کی طرف دہی کی گئی اس کے سوا
 اور کوئی چیز ہرگز ہرگز خاتم النبیین پر دہی نہیں ہوتی۔ ص ۹ سطر ۳۔
- ۳۔ آسمانی کتاب کے سوا پر ایک دینی کام کرنا شرک و کفر ہے خواہ کوئی ہو جو ایسا
 کرے وہ مشرک ہو جاتا ہے۔ ص ۱۲ سطر ۱۶

۴۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلعم نے ماسوائے کتاب اللہ کے بھی احکام بتائے ہیں وہ حقیقت میں خاتم النبیین پر سب کرتے ہیں ص ۱۵ سطر ۱۲۔

۵۔ سوائے اللہ تعالیٰ اور کا حکم ماننا بھی اعمال صحیح کا باطل کرنے والا باعث ابدی و دائمی عذاب ہے افسوس مشرک فی الحکم میں آج کل اکثر لوگ مبتلا ہیں ص ۲۱ سطر ۲۱۔

۶۔ لیکن مشرک فی الحکم لوگوں کی طبیعتوں میں ایسا مل گیا ہے کہ اس کو اب وہ ایک دینی مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس کے بڑا ہونے کا ان کو خیال تک بھی نہیں آتا بلکہ اس کے بڑا سمجھنے والے کو بڑا سمجھتے ہیں۔ علانیہ بڑے زور و شور سے کہتے ہیں اور اس اپنے کہنے پر قرآن شریف سے دلائل پیش کرتے ہیں کہ جس طرح اللہ کا حکم ماننا فرض ہے اسی طرح رسول اللہ سلام علیہ کا العجب ثم العجب اور اس مشرک کا نہ خیال کو اصل اصول جانتے ہیں۔ ص ۱۷ سطر ۲۔

۷۔ پس واضح ہو کہ مطابق الرحمن علم القرآن کے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تعلیم دی ہے اور بس دیگر ذریعہ سے تعلیم نہیں دی۔ ص ۱۹ سطر ۱۵۔

۸۔ اور جس رسول کی فرماں برداری کا حکم ہوا ہے وہ خاص قرآن مجید ہی ہے واجب الاتباع دو چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی شے ہے قرآن مجید اور محمد رسول اللہ سلام علیہ بے شک دو چیزیں ہیں۔ لیکن آپ کی فرماں برداری کا قرآن مجید میں کسی جگہ حکم نہیں ہوا۔ ص ۲۱ سطر ۱۱۔

۹۔ میں محمد رسول اللہ کو دل و جان سے رسول جانتا ہوں مگر جن آیات میں رسول اللہ کی فرماں برداری کا حکم ہوا ہے وہاں رسول اللہ سے مراد فقط قرآن مجید ہی ہے ص ۱۹ سطر ۱۹۔

۱۰۔ لیکن محمد رسول اللہ صرف اپنے زمانہ کے لوگوں کے ہی پاس آئے تھے آج کل کے لوگوں میں سے آپ کسی کے پاس نہیں آئے اگر کسی صاحب کے پاس آپ کی آمد و رفت ہو تو بتاویں۔ یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا رسوله ولا تولوا عتدہ

اس جگہ رسول اللہ سے مراد آپ کی ذات نہیں ہو سکتی ورنہ معنی لغو ہو جاتے ہیں، لہذا رسول اللہ سے مراد اس جگہ پر قرآن مجید ہی ہے۔ ص ۳۰ سطر ۱۔

۱۱- ان کنتہم تجبون اللہ فاتبعونی واضح ہو کہ پیروی اور اتباع سے صرف یہ مراد ہے کہ جس طرح قرآن مجید پر عمل کرتا ہوں اسی طرح تم بھی عمل کرو کسی مومن یا رسول کا ہر ایک فعل واجب الاتباع نہیں ص ۴۲ سطر ۱۔

۱۲- واضح ہو کہ کتاب اللہ میں جنہی کو صرف نماز سے روکا گیا ہے جیسے کہ آیت ولا تقربوا الصلوٰۃ سے ثابت ہے۔ لیکن قرآن مجید پڑھنے سے کہیں نہیں روکا گیا ص ۵۸ سطر ۱۰۔

۱۳- مسواک کے بیان کے ذیل میں لکھتا ہے کہ اگر بالفرض رسول اللہ سلام علیہ نے یہ باتیں کہی بھی تھیں تو وحی خفی سے نہیں کہیں بلکہ عقل انسانی سے ص ۶۰ سطر ۱۳۔

۱۴- یا ایہا الذین امنوا اذا قمتم الىٰ اخر الایۃ۔
مطابق آیت بالا یقیناً پاؤں کا دھونا بھی فرض ہے مسح جائز نہیں خواہ تنگے پاؤں پر ہو خواہ جرابوں پر یا موزوں پر جس قدر ایسی احادیث ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ رسول اللہ سلام علیہ نے موزوں اور جرابوں پر مسح کیا اور دوسروں کو ایسا کرنے کی اجازت دی، سب باطل اور رسول اللہ پر اقرار ہیں۔ ص ۶۳ سطر ۱۔

۱۵- قرآن سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ شرمگاہ کو ہاتھ لگنے اور نکسیر پھوٹنے آگ کی پکی ہوئی چیزیں یا اونٹ کا گوشت کھانے یا قے سے دھنو ٹوٹ جاتا ہے جن احادیث میں یہ مضمون ہے کہ یہ چیزیں دھنو کو توڑنے والی ہیں وہ بے ہودہ اور مردود ہیں۔

ص ۸۲ سطر ۱۔

عقائد فرقہ ہذا مندرجہ الصلوٰۃ للہ

دلائل کا سدھ	عقائد قاسدہ
(۱) جس چیز کا بیج ازل سے جاری ہوا ہد تک رہے گا بدلنے کا امکان نہیں ہے	(۱) آسمانی کتابوں میں کوئی فرق نہیں ہے ہم رتبہ دہم پلہ ہیں۔

دلائل کا سہ	عقائد فاسدہ
ایسی ہی کتابیں ایک خدا کی ہیں سب کیساں ہوں گی لا تبدیل مخلوق اللہ (۲) لا نفرق بین احد من رسلہ ولن تجد لسنة اللہ تحویلاً۔	(۲) نبیوں میں فرق نہیں ہے سب ایک رجبہ کے ہیں اور سلسلہ نبوت تا قیامت جاری رہے گا۔
(۳) تہجد کا وقت نفل کے لئے باقی کا فرض کے لئے ہے دلیل یہ ہے رب المشرق والمغرب۔ واقم الصلوٰۃ لعلوک الشمس الخ	(۳) اوقات نماز چار ہیں۔ تہجد، فجر، مغرب، ظہر۔
(۴) دلیل رب المشرق والمغرب ہے غرض جب آفتاب پورب کی سمت میں ہو تو پورب کرے جیسے تہجد و فجر میں اور جب پچھم ہو تو پچھم کی جانب جیسے ظہر و مغرب میں۔	(۴) قبلہ پورب اور پچھم دو طرف ہے تہجد و فجر مشرق جانب اور ظہر و مغرب پچھم جانب میں۔
(۵) سلیمان علیہ السلام کا قصہ انہ من سلیمان و انہ یسم اللہ الرحمن الرحیم موجود ہے۔	(۵) تکبیر نماز اللہ اکبر نہیں ہے، بلکہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔
(۶) انا اعطیناک الکوثر۔ کوثر سے مراد سبع مثانی۔ سبع مثانی سے مراد چودہ اور چودہ سے مراد ارکان قرآن میں ذکر نہیں ہے بلکہ ان انکار الاصوات لصوت الحمید آیا ہے۔	(۶) ارکان چودہ ہیں جو داخل نماز ہیں اور وہ یہ نہیں ہیں جو لوگ سمجھتے ہیں اور عقیدہ رکھتے ہیں۔
(۸) فاغسلوا وجوهکم وایدیکم	(۸) وضو کا لفظ خود ساختہ اور غلط ہے اصل لفظ غسل سکر ہے۔
	(۹) وضو میں صرف ہاتھ منہ دھونا ہے اور سر پیر کا مسح کرنا ہے بس۔
	(۱۰) جب سے زمانہ نے رنگ بدلا اور میرے جانشین ہو اسی نماز کی صورت بگاڑ دی اور شرکاتہ دعائیں شامل کر

عقائد فاسدہ	دلائل کا سدرہ
دی ہیں۔ (۱۱) رکعت کا لفظ قصر قصر تعریف ہو کر بنا ہے اول قصر اولیٰ قصر آخری ہے رکعت اولیٰ رکعت آخری نہیں ہے۔	الی المرافق۔
(۱۲) صلوٰۃ جنازہ میں ہاتھ نہ باندھے (۱۳) رمضان شریف کا مہینہ تیس دن کا ہے۔	(۱۲) واخفض جناحك للمؤمنين دلیل ہے۔ (۱۳) واعدنا موسىٰ ثلاثين ليلة دلیل ہے۔
(۱۴) شہر رمضان سے شمسی مہینہ مراد ہے۔ (۱۵) صورت نماز اہل قرآن یہ ہے کہ اپنی تکبیر کہتا ہوا بصورتِ قعدہ بیٹھ جاوے پھر کھجور کے ساتھ کھڑا ہو پھر بائیں ہاتھ دائیں بغل میں دباو اور دایاں ہاتھ بائیں شانے پر رکھے پھر رکوع کرے پھر سجدہ میں ٹھوڑی رکھے پھر سر۔ پھر جلسہ میں آدے اور سینہ میں ہاتھ رکھے پھر سجدہ کرے وغیرہ وغیرہ	(۱۴) ورنہ آیت بالا کے معنی درست نہ ہوں گے۔

الجواب

۱۔ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ

الْكَا فِرِينَ (ال عمران ۳۲)

(۲) قَالَ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ط وَتَوَاتَرَهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاوُزًا فَاسْتَعَفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لُوَجْدُ وَاللَّهُ تَوَّابًا رَحِيمًا (نساء: ۶۴)

(۳) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ الْآيَةَ

(سورۃ نساء: ۵۹)

(۴) وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلْغُ الْمُبِينُ - (سورۃ تغابن: ۱۲)

(۵) مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا - (الاحزاب: ۳۶)

(۶) فَلَا وَرَيْكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِي مَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا - (نساء: ۶۵)

(۷) قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ

(سورۃ آل عمران: ۳۰)

(۸) وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا - (سورۃ حشر: ۵)

(۹) هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَیْقُوا ضَلَالًا مُبِينًا - (سورۃ جمعہ: ۲)

(۱۰) وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ - (سورۃ نحل: ۴۴)

(۱۱) وَارْسَلْنَا لِلنَّاسِ رَسُولًا وَكَفَى بِاللّٰهِ شَهِيدًا ۝ مَنْ يُطِيعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلَّى فَاوْرَسْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا .

(سورہ نساء : ۸۰، ۷۹)

(۱۲) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رُسُوْلِ اللّٰهِ اُسُوَةٌ حَسَنَةٌ .

(سورہ احزاب : ۲۱)

(۱۳) وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ تُوَلِّهِ مَا تُوَلَّى وَنُصَلِّهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيْرًا ۝

(سورہ نساء : ۱۱۵)

(۱۴) قَامِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ الَّذِيْ اَلَمْتُمْ بِاللّٰهِ وَكَلِمًا قَلِيْلًا ۝ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

(الاعراف : ۱۵۸)

(۱۵) فَلْيَعْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَافُوْنَ عَن اَمْرِهٖ اَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ .

(سورہ نور : ۶۳)

(۱۶) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلَى مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاٰى اَيْتَ الْمُنَافِقِيْنَ يَصُدُوْنَ عَنكَ صُدُوْدًا ۝

(سورہ نساء : ۶۱)

آیات مذکورہ بالا ونیز دیگر آیات کثیرہ سے نہایت صراحت اور وضاحت کے ساتھ دو امر ثابت ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ قرآن مجید اپنے ماننے والوں کو جس طرح احکام قرآنیہ کی اطاعت کا حکم دیتا ہے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت پر مجبور کرتا ہے جیسا کہ آیت ۱۶ و آیت ۱۵ سے ثابت ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ آپ قرآن مجید کے صحیح مطالب و صحیح تفسیر بیان فرمایں جیسا کہ آیت ۱۶ و ۱۵ سے ثابت ہے۔

اسی لئے جب کسی آیت کے متعلق آپ سے کوئی تفسیر منقول ہو تو اس کے

مخالف کوئی دوسری تفسیر بہرگز قابل التفات نہ ہوگی۔ اگرچہ الفاظِ قرآن میں باعتبار لغت کے اُس کا احتمال بھی موجود ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے آج تک تمام اُمتِ محمدیہ کا یہی اعتقاد رہا ہے۔ اور اگر کسی نے کبھی اس کے خلاف عقیدہ ظاہر کیا ہے تو اُس کو باجماعِ مسلمین کافر و مرتد سمجھا گیا اور اُس کے ساتھ وہی معاملہ کیا گیا جو کفار و مرتدین کے ساتھ شریعت میں معمول ہے۔

ایسی ہی تفسیر کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا أَفَمَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ خَيْرٌ أَمْ مَنْ يَأْتِي آمِنًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ - (حَمَّ سَجْدَاة : ۱۳۰)

ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

هو يضع الكلام على غير موضعه المحاد کرنے والا وہ شخص ہے جو کلام کو بے

محل استعمال کرے۔

اخرجه ابن ابی حاتم

(کذا فی الاتقان ص ۱۹۱ ج ۲)

اور تفسیر روح المعانی میں ہے۔

وہ آیات کی تفسیر میں صحت و استقامت کے

یخرفون فی تاویل آیات القرآن

علمدہ ہوتے ہیں اور اُن کو معانی باطلہ پر معمول

عن جهة الصحة والاستقامة

کرتے ہیں اور یہی مراد حضرت ابن عباس کی ہے

يحملونها على المعامل الباطلة

اس ارشاد سے کہ وہ لوگ کلام کو بے محل استعمال

وهو ما ادا ابن عباس بقوله يضلون

کرتے ہیں اس کے بعد حق تعالیٰ کے ارشاد افسن

الكلام في غير موضعه انتهى رثم

يلقى في النار الاية کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

قال في تفسير قوله تعالى افسن

یہ اس پر تنبیہ ہے کہ کفارِ محمدین کی سزا کیسی ہو

يلقى في النار الاية تنبيه على

گی رپھرا عملوا ما شئتم کی تفسیر میں

كيفية الجزاء - رثم قال في قوله

إِعْمَلُوا مَا بَشَرْتُمْ تَهْتَدُوا شَدِيدًا لَكُمْ
 المذللین الذین یلقون فی النار
 فرماتے ہیں کہ یہ تہدید شریک ہے کفارِ مطہین کے لئے
 جو جہنم میں ڈالے جائیں گے۔

(روح ص ۱۱۲ و ۱۱۳ ج ۲۲)

‡ ‡ ‡

عقائد نسفی میں ہے:-

النصوص علی ظاہرہا و
 العدول عنہا الی معان یدعیہا اهل
 النصوص اپنے ظاہری معانی پر محمول ہیں اور
 ان معانی سے ایسے معانی کی طرف عدول کرنا جن
 کا اہل باطل دعویٰ کرتے ہیں الحاد ہے۔

اور علامہ سیوطی نے اتقان میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص آیت کہ یرہ من ذالذی
 یشفع عندہ کے الفاظ کو تحلیل کر کے من ذالذی قرار دے کر یہ تفسیر کرتا تھا کہ جو
 شخص اپنے نفس کو ذلیل کرے وہ اللہ کے نزدیک شفا رس کر سکتا ہے۔

شیخ الاسلام سراج الدین بلقینی ج ۷ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو یہ فتویٰ دیا کہ وہ
 محدث زندقہ ہے (اتقان مصری ص ۱۹۱ ج ۲ فضل ما یتحاج الیہ لمفسر)۔
 اور قرآن شریف میں ہے:

لا تحرك به لسانك لتعجل به
 ان علينا جمعه وقرآنہ فاذا قرأنا
 فاتبع قرآنہ ثم ان علينا بیانہ۔
 اے پیغمبر آپ قرآن پر اپنی زبان نہ بلایا کیجئے تاکہ
 آپ اس کو جلدی جلدی میں بہا کر ڈمبے اس کا جمع کر
 دینا اور اس کا پڑھنا دینا تو جب ہم اس کو پڑھنے لگا
 کریں تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجئے پھر اس کا بیان کرادینا ہمارے ذمہ ہے۔

الغرض آیات و عبارات مذکورہ سے واضح ہوا کہ جو شخص وہ عقائد رکھے جو فرقہ چکڑ الوہیہ
 کی کتابوں سے سوال میں ظاہر کئے گئے ہیں وہ بلاشبہ محدث زندقہ اور کافر خارج از اسلام
 ہے کیونکہ وہ بہت سی ضروریات دین کا منکر ہے۔ جیسا کہ عقائد مذکورہ کے دیکھنے والے
 پر مخفی نہیں رہ سکتا۔ عقائد مذکورہ کا ضروریات دین کے خلاف ہونا چونکہ بالکل بدیہی اور آفتاب
 کی طرح روشن ہے اس لئے ضرورت نہیں کہ ہر عقیدے کے متعلق جُدا جُدا کچھ لکھا جاوے۔

علاوہ ازیں اس وقت مجرم مشاغل کے سبب فرصت بھی نہیں۔ آئندہ اگر فرصت ملی دیا کی

دوسرے صاحب نے بہت کی اور اس کی تفصیل لکھ دی تو انشاء اللہ تعالیٰ اُس کو اس رسالہ کا ضمیمہ بنا دیا جاوے گا۔

فرقہ مرزائیہ کے عقائد

مرزا غلام احمد ساکن قادیان ضلع گورداسپور پنجاب اس فرقہ کا بانی ہے اور اس وقت اس فرقہ کی تین پارٹیاں مشہور ہیں ایک ظہیر الدین اردو بی کی متبع اور دوسری مرزا محمود کی متبع جس کو قادیانی پارٹی کہا جاتا ہے تیسرے مسٹر محمد علی لاہوری کی متبع جس کو لاہوری پارٹی کہا جاتا ہے پہلی پارٹی مرزا غلام احمد کے مذہب کو بغیر کسی تفاق و تاویل کے ظاہر کرتی ہے اور ان کو ان کی تعلیم کے مطابق نبی اور رسول مستقل ناسخ شریعت مانتی ہے کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو معاذ اللہ منسوخ کہتی ہے اور ان حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت میں مرزا کا نام لینا ضروری سمجھتے ہیں۔

دوسری پارٹی خواہ اپنی چالاکی کی وجہ سے کہ مسلمان ایسے شدید کفر سے فوراً متنفر ہو جائیں گے۔ یا اپنی کم فہمی کی وجہ سے مرزا کی تصریحات کے خلاف اس کو صاحب شریعت ناسخ القرآن نہیں مانتی، لیکن نبی اور رسول ہونے کا بلکہ دوسرے انبیاء سے افضل ہونے کا اعتقاد رکھتی اور ظاہر کرتی ہے۔

تیسری پارٹی اُس کو مسیح موعود اور مہدی و امام کہتی ہے۔ نبی اور رسول کا لفظ بھی اُس کے لئے استعمال کرتی ہے مگر یہ کہہ کر کہ لغوی اور مجازی اُمتی نبی ہیں ایسے نہیں جیسے پہلے انبیاء گزرے ہیں۔

ان تینوں پارٹیوں کے عقائد مفصل حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب دام مجدہم نے اپنے رسالہ "اشد العذاب" میں ان کی کتابوں میں سے بقیہ صفحات نقل کئے ہیں جن میں سے بعض بطور نمونہ اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں۔

رسالہ البارک ص ۳ میں اردو بی کتا ہے۔ اپنے عقائد کا خلاصہ،
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہوئے

احسن طور پر یہ بیان کرنا ہوگا کہ لا الہ الا اللہ احمد جوی اللہ - اور اسی کتاب کے صفحہ مذکور پر ہے۔ قرآن کریم کو سچے دل سے منجانب اللہ یقین کرتے ہوئے اس تازہ وحی الہی پر یقین لانا مقدم سمجھنا ہوگا جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلاۃ والسلام پر نازل ہوئی۔

پھر اسی صفحہ میں لکھتا ہے اور خدا کی عبادت کرتے وقت مسجد اقصیٰ اور مسیح موعود کے مقام قادیان کی طرف منہ کرنے کو ترجیح دینی ہوگی۔ پھر رسالہ "تبدیل قانون ص ۲، ۲ میں مفصل تحریر کے ذیل میں لکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے لئے وہ شریعت نہیں رہی جو آج کے تیرہ سو برس پہلے تھی۔ دیکھو حضرت مسیح موعود کیسی وضاحت سے لکھتے ہیں الخ

مرزا محمود خلیفہ قادیان اپنی کتاب حقیقۃ النبوة ص ۱۷۴، ۱۷۵ میں لکھتے ہیں "پس شریعت اسلام نبی کے جو معنی کرتی ہے اس کے معنی سے حضرت صاحب ہرگز مجازی نبی نہیں بلکہ حقیقی نبی ہیں۔"

اور اخبار الفضل جلد دوم ۱۲۲ و ۱۲۳ مورخہ ۲۶/۴، ۱۹۱۵ء میں ہے حکم کیا ہے حضرت مسیح موعود نبی ہیں یہ بلحاظ نفس نبوت یقیناً ایسے ایسے ہمارے آقا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم محکم کیا ہے۔ نبی کا منکر اولئک ہم الکفرون حقا کے فتوے کے نیچے داخل ہے (اشد العذاب ص ۲۵ بحوالہ رسالہ موجودہ قادیانی مذہب)

اور رسالہ موجودہ قادیانی مذہب ص ۳ میں بحوالہ تشیخ الاذیان جلد ۲ نمبر ۱۲ لکھا ہے قرآن شریف میں انبیاء کے منکرین کو کافر کہا گیا ہے۔ اور ہم لوگ حضرت مسیح موعود کو نبی اللہ مانتے ہیں اس سے ہم آپ کے منکروں کو کافر کہتے ہیں۔

اشد العذاب ص ۵۷ میں بحوالہ ہنڈیل ۲ ص ۱ قبل اس کے کہ جناب میاں صاحب ادا سن کے مریدین کے عقائد کو خلاف عقائد حضرت مسیح موعود دکھایا جاوے یہ تبادیلا ضرور ہے کہ ہم حضرت مسیح موعود کے متعلق یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ آپ امام الرمان مجدد ملہ من اللہ جزوی ملی بردزی مجازی الہی نبی معنی محدث نہ معنی نبی مہدی و مسیح موعود ہیں۔

یہ تو وہ عقیدہ ہے جو لاہوری پارٹی مرزا کے متعلق رکھتی ہے اس کے علاوہ خود اس

کے رئیس مسٹر محمد علی صاحب نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن میں بہت سی آیات قرآنیہ کی ایسی تحریف کی ہے جن میں سے ہر ایک مستقل وجہ کفر معلوم ہوتی ہے۔ ان عقائد پر غور کرتے ہوئے ہر ایک پارٹی کے متعلق جُدا جُدا تحریر فرمایا جاوے کہ یہ پارٹیاں خارج از اسلام ہیں یا ان میں کوئی تفصیل ہے؟

الجواب

ان تینوں پارٹیوں میں چند وجوہ تو کفر ہیں اور بعض وجوہ خاص خاص پارٹیوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس جگہ مشترک وجوہ میں سے چند وجوہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں:-
(۱) مرزا کو باوجود ایسے صاف دعویٰ نبوت کے جس میں کسی تاویل کی ہرگز گنجائش نہیں مسلمان بلکہ مہدی و مسیح سمجھنا۔

(۲) ختم نبوت کے مسئلہ میں جو کہ ضروریات دین میں سے ہے تاویل فاسد کرنا اور اس کے اجتماعی مفہوم کو بدلنا۔

(۳) مرزا کو باوجود کھلی ہوئی توہین انبیاء کے مسلمان سمجھنا یہ وجوہ کفر ایسی ہیں جو تینوں پارٹیوں میں مشترک ہیں اور ان کے کفر کے لئے کافی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری بہت سی وجوہ اور بھی ہیں جن کے استیعاب کی اس جگہ ضرورت نہیں اور وجوہ مذکورہ بالا کے کفر ہونے کا ثبوت تمام کتب مذہب میں موجود ہے جن میں سے چند عبارات اس جگہ نقل کی جاتی ہیں۔

علامہ خجائی شرح سفار میں فرماتے ہیں:-

ابن قاسم اس شخص کے متعلق کہتے ہیں جو نبوت کا	و كذلك ابن القاسم في من
دعوى كرسى كرسى مثل مرتد كرسى خرافه انبي نبوت كرسى	تنبأ وزعم انه يوحى اليه وقاله
طرفه لوكون كرسى ادعوت دسے یا جبراً جیسے	سحنون وقال ابن القاسم فيمن
مسيد كرسى لعنة الله تعالى اور اصبح	تنبأ انه كرسى سوا كان دعا
بن شرح فرماتے ہیں کہ وہ یعنی وہ شخص جو یہ	ذلك الى متابعة نبوته سرا وجهاً

کے کہ میں نبی ہوں اور مجھ پر وحی آتی ہے تمام احکام میں مثل مرتد کے ہے اس لئے کہ وہ کتاب اللہ کا منکر ہے۔ کیونکہ اُس نے اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حکم میں تکذیب کی کہ آپ خاتم النبیین ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں اور اُس کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر اترتا بھی کرتا ہے (کیونکہ اُس نے اس کو نبی صحتاً ہی نہیں بنایا یہ محض اترتا کرتا ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے)۔

جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ نبوت کسب و عمل سے حاصل ہو سکتی ہے اور کبھی منقطع نہ ہوگی یا یہ کہ نبی سے ولی افضل ہے وہ زندقہ ہے اُس کا قتل واجب ہے۔ اور سفار قاضی عیاض میں ہے۔

عبد الملک ابن مروان نے حارث مدعی نبوت کو قتل کیا اور رسولی پر چڑھایا اور یہی معاملہ بہت سے سفار اور شاہان اسلام نے مدعیان نبوت کے ساتھ کیا ہے اور ہر زمانہ کے علماء نے اس پر اجماع و اتفاق کیا کہ ان خلفاء اور ملوک کا فعل درست ہے اور جو شخص ان مدعیان نبوت کے کفر میں اختلاف کرے وہ بھی کافر ہے۔

اسی طرح ہم اُس شخص کو بھی کافر سمجھتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی کو نبی مانے یعنی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں کسی

کسیلمة لعنه الله وقال اصبح
بن الفرح هو اى من زعم انه نبى يوحى
اليه كالمرتد فى احكامه لانه قد
كفر بكتاب الله لانه كذابه صلى
الله عليه وسلم فى قوله انه خاتم
النبين ولا نبى بعد لامع الفرية
على الله۔

ابن جہان فرماتے ہیں۔

من ذهب الى ان النبوة مكتوبة
لا تنقطع او الى ان الولي افضل من
النبى فهو زنديق يجب قتله
رزق قافی ص ۱۸۸ ج ۶

وقد قتل عبد الملك ابن مروان
الحارث المتبني وصلبه و قتل ذلك
غير واحد من الخلفاء والملوك
باشباههم واجمع علماء وقتهم
على صواب فعلهم والمخالفة فى
ذلك من كفرهم كافر۔

رازاكفاد ص ۴۳

اور شرح سفار میں ہے :-

وكذلك تكفر من ادعى نبوه
احد مع نبينا صلى الله عليه وسلم
اى فى زمانه كسيلمة الكذاب و

کو نبی تسلیم کرے جیسے مسیحا کذاب اور اسود منسی یا آپ کے بعد کسی شخص کی نبوت کا قائل ہو اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہیں قرآن و حدیث خاتم النبیین ہیں تو آپ کے ساتھ یا آپ کے بعد کسی کو نبی قرار دینا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تکذیب ہے جیسے عیسویہ کہتے ہیں۔

والاسود العنسی او ادعی نبوة احد بعده فانه خاتم النبیین بنص القرآن والحديث فهذا تكذيب الله ورسوله صلى الله عليه وسلم كالعيسوية۔

(شرح شفاء)

اور صحیح الا نشی ص ۳۰۵ میں ہے:-

اور یہ دونوں مسئلے ان مسائل میں سے ہیں جن کی وجہ سے ان لوگوں کی تکفیر کی گئی ہے کیونکہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت جاری رہنے کو جائز قرار دیا۔ جن کے متعلق حق تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔

وهاتان المسئلتان من جملة ما كفى وابه بتجويز النبوة بعد النبي صلى الله عليه وسلم الذي اخبر تعالى انه خاتم النبیین۔

فتاویٰ عالمگیری ص ۲۶۳ ج ۲ میں ہے:-

جو کوئی شخص یہ اعتقاد نہ رکھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخر الانبیاء میں وہ مسلمان نہیں ہے اور اگر یہ کہا کہ میں رسول ہوں (اگرچہ اس کی مراد اصطلاحی رسول و پیغمبر نہ ہو) بلکہ پیغام رساں مراد ہو جب بھی وہ کافر ہے (کیونکہ یہ تاویل بے معنی اور الحاد کا دروازہ کھولنے والی ہے)۔

اذا لم يعرف ان محمدا صلى الله عليه وسلم اخر الانبياء فليس بمسلم ولو قال اتا رسول او قال بالفارسية من پیغمبرم یرید به من پیغام می برم یحضر۔

(فتاویٰ عالمگیری)

علامہ ابن حجر مکی شافعی اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:-

جو شخص اس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد

من اعتقد و حیا بعد محمد

کسی نئی وحی کا اعتقاد کرے وہ باجماع مسلمین

صلى الله عليه وسلم كفر باجماع

کافر ہے۔

المسلمین۔

اشباہ والنظائر کتاب السیر والردۃ میں لکھتے ہیں :-

اذ لم یعرف ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم اخر الانبیاء فلیس بسلم لانہ من الضروریات

جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر الانبیاء نہ سمجھے وہ مسلمان نہیں اس لئے کہ یہ مسئلہ ضروریات دین میں سے ہے۔

(اشباہ ص ۲۹۶)

اور ملا علی قاری شرح شمائل میں مہربوت کے متعلق فرماتے ہیں :-

واضافتہ الی النبوة لانه ختم بہ بیت النبوة حتی لا یدخل بعدہ احد۔

خاتم النبوت میں خاتم کی انماقت نبوت کی طرف اس لئے کی گئی کہ اس نے بیت نبوت پر مہر لگا دیا کہ اس کے بعد اس میں کوئی داخل نہ ہو سکے گا۔

اور نیز علامہ موصوف شرح فقہ اکبر ص ۱۹۱ میں فرماتے ہیں :-

ودعوی النبوة بعد نبینا صلی اللہ علیہ وسلم کفر بالاجماع (طبیب و گلزار محمدی لاہور)

اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا باجماع مسلمین کفر ہے۔

اور علامہ سید محمود آلوسی مفتی بغداد نے اپنی تفسیر روح المعانی میں اس مسئلہ کو نہایت مکمل لکھا ہے جس کے چند جملے یہ ہیں :-

وكونه صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین مما نطقت بہ الکتب وصدعت بہ السنۃ واجمعت علیہ الامۃ فیکفر المدعی خلافہ ویقتل ان اصر۔

آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین مہرنا ان چیزوں میں سے ہے جن پر قرآن مجید نے تصریح فرمائی اور احادیث بنویں نے ان کو واضح کر دیا۔ پس جو شخص اس کے خلاف کا مدعی ہو اس کو کافر کہا جاوے گا اور اگر اس پر اصرار کہے گا تو قتل کیا جائے گا۔

(روح المعانی ص ۶۵ ج ۷)

اور تحفہ شرح منہاج میں لکھا ہے :-

وکذب رسولاً او نبیاً او یا کسی رسول و نبی کی تکذیب کرے یا ان کی کسی

نقصہ بائی منقص کان صغر اسمہ
 مریداً تحقیقاً او جواز نبوتاً احد
 بعد وجود نبوتاً نبیناً صلی اللہ
 علیہ وسلم و عیسیٰ علیہ السلام
 نبی قبل فلا یرد -
 (از انکفار ص ۴۲)

طرح تنقیص شان کرے خواہ اسکی طرح ہو کہ ان کے
 نام کی تصغیر بقصد تحقیر کرے یا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
 کی نبوت کے بعد کسی دوسرے شخص کے لئے نبوت
 کو جائز رکھے (وہ کافر ہے) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام
 (باوجود نبی ہونے کے آخر زمانہ میں نازل ہوں گے اس
 سے ختم نبوت پر شبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ
 علیہ وسلم سے پہلے نبی ہو چکے ہیں۔

اور مل ص ۲۴۹ جلد ۳ میں فرماتے ہیں :-

و کذا لک من قال (الی قولہ)
 او ان بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم
 نبیا غیر عیسیٰ بن مریم علیہ
 السلام فانه لا یختلف اثنان
 فی تکفیرہ لصحة قیام الحجۃ بکل
 ایسے ہی وہ شخص بھی کافر ہے جو یہ کہے کہ آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بجز عیسیٰ علیہ السلام کے کوئی
 اور نبی ہے کیونکہ یہ ایسی کھلی ہوئی بات ہے کہ اس میں
 دو آدمی بھی اختلاف نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ
 اس پر حجت قائم ہے۔

اور شیخ ابو شکور سالمی رحمہمید میں تحریر فرماتے ہیں :-

وقالت الرافض ان العالم
 لا یعون خالیاً من النبی قط و
 هذا کفر لان اللہ تعالیٰ قال
 وخاتم النبیین ومن ادعی
 النبوة فی زماننا فانه یصیر کافراً
 ومن طلب منه المعجزات فانه
 یصیر کافراً لانه لا شک فی ان
 فیجب الاعتقاد بانہ لا شرکة لاحد فی
 النبوة لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم
 روافض کہتے ہیں کہ عالم کسی وقت ہرگز نبی
 سے خالی نہیں رہ سکتا اور یہ کفر ہے کیونکہ حق تعالیٰ
 نے فرمایا ہے (وخاتم النبیین) اور جو شخص ہمارے
 زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کرے وہ کافر ہوتا ہے
 اور جو شخص اس سے (بمنظر اعتقاد) معجزات طلب کرے
 وہ بھی کافر ہے کیونکہ اس نے نص قرآنی میں شک
 کیا۔ پس واجب ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جاوے
 کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نبوت میں کسی کی
 شرکت نہیں ہے۔ بخلاف روافض کے جو کہتے ہیں

بجلاف ما قاله الروافض ان عليا
كان شريكاً لمحمد صلى الله عليه
وسلم في النبوة وهذا منهم كفر -
کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے ساتھ نبوت میں شریک تھے۔ اور
یہ ان کا رکھنا ہوا کفر ہے۔
اور امام غزالی اپنی کتاب اقتصاد میں فرماتے ہیں:-

ان الامم فہمت من هذا
اللفظ انه افہم عدم نبی بعدا
ابدا و عدم رسول بعدا ابدا
وانہ لیس فیہ تاویل ولا تخصیص
فکلامہ من انواع الہذیان
لا ینح حکم بتکفیرہ لانہ
مکذب لہذا النص السنی
اجمعت الامم علی انہ غیر ماؤل
ولا مخصوص -
تمام امت محمدیہ نے اس لفظ یعنی خاتم النبیین
سے یہی سمجھا ہے کہ اس نے یہ بتلایا ہے کہ نبی کریم صلی
اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک نہ کوئی نبی ہوگا نہ
رسول۔ اور یہ کہ نہ اس میں کوئی تاویل ہے نہ تخصیص
اور جو شخص اس میں کسی قسم کی تخصیص و تاویل کرے
اس کا کلام مجہوزانہ بھریان (بڑا) ہے اور یہ تاویل
اس پر حکم کفر کرنے سے مانع نہیں ہے کیونکہ وہ اس
نص و آئی کی تکذیب کرنے والا ہے جس
کے متعلق امت کا اجماع ہے کہ وہ نہ مؤول ہے
نہ مخصوص۔

اور حضرت عوثؓ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں:-

ادعت ایضاً ان علیاً نبی (الی قولہ)
ای الروافض ۱۲
لعنہم اللہ والملائکة وسائر
خلقہ الی یوم الدین وقلع اباد
خضرائہم ولا جعل منہم فی الارض
دیارا فانہم بالغوا فی غلوہم
ومردوا علی الکفر و ترکوا الاسلام
وفارقوا الایمان و مجدوا لا
الہ الا اللہ والرسول والتنزیل
روافض نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حضرت علیؓ
نبی ہیں۔ لعنت کرے اللہ تعالیٰ اور اس کے
فرشتے اور تمام مخلوق ان پر قیامت تک، اور
برباد کرے ان کی کھیتوں کو اور نہ چھوڑے
ان میں سے کوئی گھر میں بسنے والا۔ اس لئے کہ انہوں
نے اپنے غلو میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور کفر
میں جم گئے۔ اور اسلام و ایمان کو چھوڑا اور
انبیاء اور قرآن کا انکار کیا۔ پس ہم اللہ تعالیٰ

فنعود باللہ من ذہب الی ہذا
المقالة
سے پناہ مانگتے ہیں۔ اُس شخص سے جس نے یہ
قول اختیار کیا۔

اور علامہ عارف باللہ شیخ عبدالغنی نابلسی شرح فراید میں رد و افض کی تکفیر کرتے
ہوئے لکھتے ہیں:-

فساد مذہبہم غنی عن
البیان لشہادۃ العیان کیف و
ہو یؤدی الی تجویز نبی مع نبیا
صلی اللہ علیہ وسلم ادبعادہ و
ذلک یتلزم تکذیب القرآن اذ
قد نص علی انہ خاتم النبیین
واخر المرسلین و فی السنۃ العاقب
لا نبی بعدی واجمعت الامۃ
علی ابقاء ہذا الکلام علی ظاہرہ
وہذا احد المسائل المشہورۃ اللتی
کفرنا بہا الفلاسفة لعنہم اللہ
تعالیٰ راز احقار ص ۴۲

اُن کے مذہب کا فساد محتاج بیان نہیں بلکہ
مشاہد ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ اس سے یہ لازم
آتا ہے کہ ہمارا آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ
یا بعد بھی کوئی نبی پیدا ہو سکتا اور اس سے قرآن کی
تکذیب لازم آتی ہے اس لئے کہ اس کی تصریح
کر دی گئی ہے کہ آپ خاتم النبیین اور آخر المرسلین
ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ میں عاقب ہوں
میرے بعد کوئی نبی نہیں اور امت کا اجماع
ہے کہ یہ کلام اپنے ظاہر پر بغیر کسی تاویل و تخصیص
کے رکھا جائے اور یہ بھی انہیں مسائل میں سے
ہے جن کی وجہ سے ہم نے فلاسفہ ملعانہ کی تکفیر
کی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ لوگ مرزا کو باوجود ان خیالات و عقائد باطلہ کفریہ کے جو
باجماع امت کفریہ ہیں اور جن سے مرزائی کتابیں لبریز ہیں نہ صرف مسلمان بلکہ مسیح موعود
مہدی موعود۔ محدث وغیرہ مانتے ہیں جس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ (معاذ اللہ) تمام
اسلاف امت صحابہ و تابعین اور ائمہ اجتہاد اور ساڑھے تیرہ سو برس تک کے تمام
علماء گمراہی و ضلالت میں تھے کہ وہ جن اقوال و افعال کو باجماع کفر و ضلال کہتے ہیں
وہ بجائے کفر و ضلالت کے ہدایت مجسمہ اور مسیحیت موعودہ ہے۔ اور کوئی ایسا
عقیدہ رکھنا جس سے تمام امت کا گمراہی پر ہونا لازم آئے باتفاق کفر ہے۔

شفار قاضی عیاض اور اس کی شرح ملا علی قاری میں ہے۔

و کذا لک نقطع بتکفیر کل قائل
 قال قولا یتوصل بہ الی تضریل
 الامۃ المرحومة و تکفیر جمیع
 الصحابة (شرح شفاللقاری ص ۵۱ ج ۲) ہو۔

اور علامہ ابن حجر کی کتاب الزواجر عن اقراف الکبائر میں اسی مضمون کو ان الفاظ میں لکھتے ہیں۔

وفی معنی ذلک کل من فعل
 فعلا اجمع المسلمون علی انہ لا
 یصدر الا عن کافر الی قولہ
 اویشک فی نبوة بنی رالی قولہ
 اوفی تکفیر کل قائل قولا
 یتوصل بہ الی تضریل الامۃ

اور اسی حکم میں ہے وہ شخص جو کوئی ایسا فعل کرے جس کے متعلق مسلمانوں کا اجماع ہو کہ یہ فعل سوائے کافر کے کسی سے صادر نہیں ہو سکتا۔ یا کسی نبی کی نبوت میں شک کرے یا اس شخص کی تکفیر میں شک کرے جو ایسا قول اختیار کرتا ہے کہ جس سے تمام امت کا گمراہ ہونا سمجھا جاوے

(زواجر ص ۲۴ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ ایسے شخص کے کفر میں جو شخص شک کرے وہ بھی کافر ہے پس جب کسی کافر کو جس کا کفر کھلا ہو اور صاف ہو صرف مسلمان کہتا بلکہ اس کے کفر میں شک کرنا بھی کفر ہے جیسا کہ زواجر کی عبارت مذکورہ سے ثابت ہو اگرچہ کسی تاویل کے ساتھ ہو تو پھر مرزا کو اس کے عقائد معلوم ہونے کے بعد مہدی اور مسیح وغیرہ کہنے والا ضرور بالضرور کافر اور خارج از اسلام ہے۔ اور قاضی عیاض نے شفار میں اور ملا علی قاری نے اس کی شرح میں اس پر اجماع نقل کیا ہے و لفظ ہذا

فالا جماع علی کفر من لہ
 یکفر احدًا من النصارى والیہود
 وکل من فارق دین المسلمین

اس شخص کے کفر پر اجماع ہے جو نصاریٰ و
 یہود میں سے کسی کو کافر نہ سمجھے یا اس شخص کو کافر نہ
 سمجھے جو مسلمانوں کے دین سے جدا ہو۔ یا اس میں

او وقف اوشك قال القاضی ابوبکر
لان التوقیف والاجماع اتفقوا علی
کفرهم فمن وقف فی ذلك فقد
کذب النص والتوقیف اوشك
فیہ والتکذیب والشک فیہ لا
یقع الا من کافر۔

ر بلا وجہ شرعی، توقف یا شک کرے قاضی ابوبکر
فرماتے ہیں کہ نقل شرعی اور اجماع دونوں
ان کے کفر پر متفق ہیں پس جو شخص اس میں
ر بلا وجہ شرعی، توقف یا شک کرے اُس نے
نص شرعی کی تکذیب کی اور اُس میں تکذیب یا
شک کا فرہی کر سکتا ہے۔

(متن الشفاء از شرح قاری ص ۲۵ ج ۲)

اسی طرح در مختار باب المرتدین میں اس شخص کے متعلق جس نے کسی نبی کی توبہ
کی ہو تصریح کرتے ہیں۔

ومن شك في كفره وعذابه
كفر (در) واقرة الشامي

اور جو شخص اُس کے کفر اور معذب ہونے میں
شک کرے وہ بھی کافر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اگر یہ کہا جاوے کہ یہود و نصاریٰ اور ہندو آریہ وغیرہ کو مسلمان
کہنا توبہ کے شک حسب تصریحات مذکورہ کفر ہے لیکن تاویلی
کا کفر اس درجہ میں نہیں اس کے متعلق اگر کوئی شخص بوجہ حسن ظن کے تاویل کرے
تو گنجائش ہے کیونکہ وہ مدعی اسلام ہے اور ظاہر میں قرآن و حدیث کا اقرار کرتا ہے
اور نماز روزہ وغیرہ احکام و شرائع اسلامیہ کا پابند ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ ضروریات
دین کے خلاف میں تاویل معتبر نہیں۔ اور نہ اس کی گنجائش ہے ورنہ اگر یہی حسن ظن اور تاویل
کی وسعت کی جائے تو دنیا میں کوئی کافر نہیں رہتا۔ کیونکہ عموماً کفار کے طبقات کچھ
نہ کچھ تاویل رکھتے ہیں۔ بہت پرست اور مشرکین کی تاویل خود قرآن میں مذکور ہے ما
نعبدہم الا لیقہ یوننا الی اللہ ذلغی۔ اور یہ اُن کی تاویل بلاشبہ مرزا کی تاویلات
سے زیادہ بہتر ہے۔

مرزا کے عقائد کفریہ۔ نبوت کا دعویٰ۔ وحی کا دعویٰ۔ ختم نبوت کا انکار۔ ختم نبوت
کے اجماعی معانی، اور اس بارہ میں آیات قرآنیہ کی تحریف عیسیٰ علیہ السلام کی سخت ترین

توہین - دوسرے انبیاء کی توہین وغیرہ وغیرہ ان کی تمام تصانیف میں اس قدر واضح اور صاف ہیں کہ ان میں کوئی تاویل کرنا اس سے کم نہیں جو مشرکین کی تاویل بت پرستی کے متعلق آیت مذکورہ میں گزری ہے یا حدیث میں ہے کہ مشرکین بوقت طواف تلبیہ میں کہا کرتے تھے لا شریک لک الا شریکاً هولک - (ترمذی)

اس لئے علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ ضروریات دین کے بارہ میں اجماعی معانی کے سوا آیات و روایات کی کسی دوسرے معنی کی طرف تاویل کرنا عذر مسموع نہیں۔ اور یہ تاویل ان پر حکم تکفیر کے لئے مانع نہیں ہو سکتی۔ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ اکفار الملحدین میں اس کے متعلق کافی نقول جمع فرمادی ہیں (من شاء فلیراجع ثمة) واللہ الحمد اولہ و آخرہ -

عقائد روافض و شیعہ

روافض و اہل تشیع میں بہت سے مختلف العقائد فرقتے ہیں۔ اور ہر فرقہ کے عقائد کو جدا جدا منضبط کرنا بھی دشوار ہے۔ ایک دوسری مشکل یہ ہے کہ کسی فرقہ کی کتابوں میں ان کے بعض عقائد معلوم ہوتے ہیں مگر جب وہ عقیدہ ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ مثلاً کتب شیعہ میں جا بجا اس قسم کی عبارتیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ قرآن کو محرف و ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ مگر جب کہا جاتا ہے کہ تم موجودہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتے تو وہ شدت کے ساتھ اس سے تبری کرتے ہیں۔ ایک مشکل یہ ہے کہ ہندوستان میں عوام روافض کے متعلق یہ فیصلہ بھی دشوار ہے کہ وہ کس فرقہ میں راجع ہیں۔ اب دریافت طلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں ہم روافض کے ساتھ کیا معاملہ کریں ان کو مسلمان سمجھیں یا کافر ان کے فرقوں کے جس قدر عقائد معلوم ہو سکے۔ وہ لکھے جاتے ہیں :-

(۱) بعض شیعہ مسلمانوں سے صرف اس میں اختلاف رکھتے ہیں کہ وہ خلافت کے مستحق اول حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو قرار دیتے ہیں۔ مگر باقی صحابہ کرام پر بھی تبری

نہیں کرتے؟

(۲) بعض روافض وہ ہیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ اول قرار دیتے ہیں اور باقی حضرات صحابہ پر تبراً بھی کرتے ہیں؟

(۳) بعض وہ ہیں جو (معاذ اللہ) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خود معبود سمجھتے ہیں

(۴) بعض وہ ہیں جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام نے وحی لانے میں غلطی

کی۔ اصل میں وحی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر آئی تھی وہ غلطی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے (نعوذ باللہ منہ) گویا حقیقتاً نبی و رسول حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مانتے ہیں؟

(۵) بعض وہ ہیں جو حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت رکھتے ہیں یا تمام

حضرات صحابہ کو معاذ اللہ کافر مرتد کہتے ہیں؟

الجواب

مختصر اور محقق و جامع کلام روافض کے بارہ میں یہ ہے کہ بلحاظ احکام روافض کی تین صورتیں ہیں۔

اول :- یہ کہ ان میں سے کسی شخص یا فرقہ کے متعلق یقینی طور سے یہ بات ثابت ہو جاوے کہ وہ ضروریات دین میں سے کسی چیز کا منکر ہے اگرچہ انکار میں تاویل بھی کرتا ہو اور صاف انکار کرنے سے تبریٰ بھی کرتا ہو۔ مثلاً قرآن مجید کے محرف و ناقابل اعتبار ہونے پر اگر کسی شخص کی ایسی صاف عبارت ہے کہ اُس سے یقینی طور پر یہی مفہوم نکلتا ہے پھر باوجود اس کے وہ اپنی عبارت کو غلط مان کر اُس سے زبور ظاہر نہیں کرتا مگر عقیدہ تحریف قرآن سے تبریٰ کرتا ہے تو اس تبریٰ کا کوئی اعتبار نہیں۔ بلکہ وہ بالاتفاق و باجماع کافر مرتد ہے۔ اُس کے ساتھ کسی قسم کا اسلامی معاملہ رکھنا جائز نہیں۔ نہ اُس سے کسی مسلمان کا نکاح جائز اور اگر نکاح کے بعد اس کا عقیدہ ایسا ہو گیا تو نکاح فسخ ہو جاوے گا نہ اُس کے ہاتھ کا ذبیحہ

۱۔ ضروریات دین اصطلاح میں ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن کا ثبوت اسلام میں قطعی و یقینی اور ایسا بدیہی ہو کہ عام مسلمان اُس سے واقف ہوں اس کی مفصل تعریف اور احکام اسی رسالہ کے ص ۶ میں گزر چکے ہیں ۱۲

حلال، نہ اس پر نماز جوازہ جائزہ وغیر ذلک من الاحکام۔ اور دلیل اس کی وہ تمام عبارات فقہاء ہیں جو سوال اول کے جواب میں ضروریات دین میں سے کسی چیز کے منکر کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ نیز علامہ شامی کی عبارت ذیل بھی اس کے لئے کافی ہے۔ نعم لا شک فی تکفیر من قد

السیدة عائشة رضاً وانکر صحبة الصديق او اعتقد الا لوهية في على او ان

جدید غلط فی الوجی الخ شامی استنبولی ص ۲۰۶ ج ۳۔

دوم:۔ صورت یہ ہے کہ کسی شخص یا فرقہ کے متعلق یقینی طور پر یہ معلوم ہو جاوے کہ وہ ضروریات دین میں سے کسی چیز کا منکر نہیں مگر صرف اس میں اختلاف رکھتا ہے کہ جمہور امت کے خلاف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو افضل الصحابہ اور خلیفہ اول سمجھتا ہے۔ تو وہ شخص فاسق و گمراہ ہے مگر کافر و مرتد نہیں۔ اس کے ساتھ وہ اسلامی معاملات جائزہ ہیں جو کسی فاسق و گمراہ کے ساتھ کئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ذبیحہ اس کا حلال ہے اس کے جوازہ پر نماز جائزہ ہے۔ نکاح کے معاملہ میں اس سے بھی اجتناب کرنا بہتر ہے کیوں کہ فاسق کی معاشرت کے اثرات و نتائج خطرناک ہیں۔ لیکن اگر کسی مسلمان سنی لڑکی کا نکاح اس سے کر دیا گیا تو اگرچہ بلا ضرورت شدیدہ ایسا کرنا اچھا نہیں۔ لیکن یہ نکاح اس شرط سے جائز و منعقد ہو جائے گا کہ لڑکی بالغہ اور اس کے اولیاء دونوں کو نکاح کے وقت اس کا عقیدہ معلوم ہو اور وہ دونوں اس عقیدہ کے باوجود نکاح کی اجازت دے دیں۔ اور اگر دونوں میں سے کسی ایک نے بھی نکاح کی اجازت دینے سے انکار کیا تو یہ نکاح (مذہب مفتی بہ کے مطابق) منعقد و صحیح نہیں ہوگا۔ لڑکی کو شرعاً اختیار ہوگا کہ اپنا نکاح دوسری جگہ کسی سنی مسلمان سے کرے۔

اور اگر بوقت نکاح اس شخص نے دھوکہ دے کر اپنے آپ کو سنی مسلمان ظاہر کیا اس پر لڑکی اور اس کے اولیاء نے نکاح کر دیا۔ بعد نکاح حقیقت حال معلوم ہوئی تو لڑکی اور اس کے اولیاء کو حق ہوگا کہ مسلمان حاکم کی عدالت میں دعویٰ دائر کر کے نکاح فسخ کرالیں اور اگر مسلمان حاکم کی عدالت میں مقدمہ لے جاتا اختیار میں نہ ہو تو اہل محلہ یا اہل شہر میں سے دیندار مسلمان

لہ ما فی الشامی عن الاختیار اتفق الاثمة علی تفضیل اهل البدع اجہم و تحظمتہم و سب احد

من الصحابة و بغضہ لایکون کفراً لکن یضلل (شامی ص ۲۰۵ ج ۳)

کی ایک جماعت کے سامنے معاملہ پیش کر کے ان سے فسخ نکاح کرایا جائے لیکن اس صورت میں قانونی گرفت سے بچنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ پہلے موجودہ حکومت میں درخواست دے کر نکاح فسخ کرائیں خواہ حاکم مسلم ہو یا غیر مسلم۔ پھر اگر حاکم مسلم ہو تو یہی فسخ شرعاً بھی معتبر ہوگا اور اگر حاکم غیر مسلم تھا تو دوبارہ مسلمانوں کی پنچائت میں معاملہ پیش کر کے نکاح فسخ کرایا جاوے۔ مسلمانوں کی پنچائت جس کا فیصلہ شرعاً معتبر ہو سکتا ہے اُس کے لئے چند شرائط ہیں جو رسالہ حیلۃ ناجزہ میں مدلل و مفصل اور رسالہ المرقومات للمظلومات میں مختصر مگر کافی طور سے لکھ دیئے گئے ہیں۔ اگر ضرورت پیش آوے تو بغیر اُس کے دیکھے ہوئے عمل نہ کیا جاوے اس قسم دوم کے احکام کے دلائل بھی رسالہ حیلۃ ناجزہ کے تتمہ میں خیار کفارات کے ذیل میں مفصل مذکور ہیں وہاں دیکھ لینا چاہئے اور اجمالی طور پر عبارات ذیل بھی ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ فی الدر المختار فی الباب الخامس من نکاح۔ العالمگیزیہ۔ اعتبار الکفاءة فی الدیانتہ و هذا قول ابی حنیفۃ ابی یوسف وهو الصحیح کذا فی الہدایۃ فلا یكون الفاسق کفوًا للصالحۃ کذا فی المجمع سواء کان معین الفسق او لم یکن کذا فی المعیط رعالمگیزی ص ۱۳ ج ۲ مطبوعہ کانپور) نفذ نکاح حرۃ مکلفۃ بلا ولی و لہ اذا کان عصیۃ و لو غیر محرم (الی قولہ) الاعتراض فی غیر الکفر و ما لم تلد و یفتی بعدم جوازہ اصلاً و فی رد المختار ہذا روایۃ الحسن عن ابی حنیفۃ رحم و ایذا صاحب الدر بقولہ و هو المختار للفتویٰ والعلامة الشامی وغیرہ بقول شمس الاثمة و هذا اقرب الی الاحتیاط انتهى۔ و کذا لک فی کفاءة الدر المختار و لوزوجہا برضاها و لم یعلموا بعدم الکفاءة ثم علموا الاخیار لاحد الا اذا شرطوا الکفاءة او اخبروا بها وقت العقد فزوجوا علی ذلك ثم ظہر انہ غیر کفو کان لہم الخیار ولو الجبہ۔

تیسری صورت یہ ہے کہ یقینی طور پر کسی امر کا ثبوت نہ ملے یعنی نہ اس کا یقین ہے کہ وہ ضروریات دین میں سے کسی چیز کا منکر ہے اور نہ اس کا کہ منکر نہیں۔ بلکہ ایک مشتبہ حالت ہے۔ ادشتاہ اس وجہ ہو کہ اس فرقہ کے اقوال و عقائد ہی مشتبہ ہیں یا اس وجہ سے

کہ اس شخص کے متعلق یہ یقین نہیں کہ اس کا تعلق باعتبار مذہب و عقائد کے کس فرقہ سے ہے ایسے لوگوں کے متعلق شرعی فیصلہ بھی دشوار ہے اس میں سب سے زیادہ احوط و اسلم وہ حکم ہے جو فقہ العصر امام وقت مجدد الملت حکیم الامت سیدنا و سندنما حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم نے امداد الفتاویٰ میں تحریر فرمایا ہے۔ جو رسالہ ہذا کے ص ۲۱ میں بعینہا مذکور ہے اور اس جگہ مکرر نقل کیا جاتا ہے۔

عبارت امداد الفتاویٰ جلد سادس | اگر کسی خاص شخص کے متعلق یا کسی خاص جماعت کے متعلق حکم بالکفر میں تردد ہو، خواہ تردد کے اسباب علماء کا اختلاف

ہو خواہ قرائن کا تعارض ہو یا اصول کا غموض تو اسلم یہ ہے کہ نہ کفر کا حکم کیا جائے نہ اسلام کا حکم اول میں تو خود اس کے معاملات کے اعتبار سے بے احتیاطی ہے اور حکم ثانی میں دوسرے مسلمانوں کے معاملات کے اعتبار سے بے احتیاطی ہے۔ پس احکام میں دونوں احتیاطوں کو جمع کیا جائے گا یعنی نہ اس سے عقد مناکحت کی اجازت دیں گے نہ اس کی اقتداء کریں گے۔ اگر تحقیق کی قدرت ہو اس کے عقائد کی تفتیش کریں گے اور اس تفتیش کے بعد جو ثابت ہو ویسے ہی احکام جاری کریں گے اور اگر تحقیق کی قدرت نہ ہو تو سکوت کریں گے اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں گے۔ اس کی نظیر وہ حکم ہے جو اہل کتاب کی مشتبہ روایات کے متعلق حدیث میں وارد ہے۔ لا تصدقوا اهل الکتاب ولا تکن بؤھم و قولوا ما باللہ وما انزل الینا الایہ ررواہ البخاری، دوسری فقہی نظیر احکام غنثی کے ہیں۔ یوخذ فیہ بالاحوط والاوثق فی امور الدین وان لا یحکم بنبوت حکم وقع الشک فی ثبوتہ و اذا وقف خلف الامام قام بین صف الرجال والنساء و تصلى بقتاع و یجلس فی صلاتہ جلوس المہأة و یکبر لہ فی حیاتہ لبس الخلی و الحدیث و ان یخلو بہ غیر محرم من رجل او امہأة او یسافر مع غیر محرم من الرجال و الاناث ولا یفسلہ رجل ولا امہأة و یتیمم بالصعید و یکنف کما یکنف الجاریۃ۔ امثالہ مما فصلہ الفقہاء و ترجمہ اس بار کا ص ۲۲ پر گزر چکا ہے) و اخذ عن ابی احمد اللہ رب العالمین۔ العبد الذلیل محمد شفیق عفا عنہ مدرس دارالعلوم دیوبند۔ رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ ہجری

الحکم الحَقَّانی

فِی

الحزب الاغاخانی

مصنفہ حضرت مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانی دامت برکاتہم

استفتاء

کیا سہماتے ہیں علماء دین اور مفتیان شرع متین صورتِ مسئلہ میں کہ ہمارے شہر لکھ میں ایک شخص..... اطرافِ بمبئی کا باشندہ قوم سے خوجہ، سوداگر رہتا ہے، اپنے آپ کو آغا خان کا مرید اور پیرو ظاہر کرتا ہے اتفاق سے اُس کے یہاں ایک میت ہو گئی تاجر مذکور نے اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا چاہا۔ اُس پر یہاں کے مسلمانوں میں کچھ کش مکش پیدا ہو گئی ہے۔ ایک فریق کی رائے ہے کہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں ہرگز دفن نہ کیا جائے۔ کیونکہ سر آغا خاں دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور اپنی رائے کی تائید میں امور ذیل پیش کرتا ہے:

(۱) سر آغا خان کی تصویر کی پرستش کرتا ہے۔

(۲) ہندوؤں نے مشہور اوتار کرشن جی کی مورت اپنے عبادت خانہ میں رکھ چھوڑی

ہے۔

(۳) دیوالی جو ہندوؤں کا مشہور تیوہار ہے۔ اس میں اپنے حساب کا ہی کھاتہ تبدیل

کرتا ہے۔ علاوہ اس کے اور بھی بعض مراسم مشترک ادا کرتا ہے مثلاً

(۴) اپنے کھاتے کی ابتداء میں بجائے بسم اللہ الخ کے لفظ اوم لکھتا ہے۔

(۵) سر آغا خاں کے اندر خدائی حلول کا معتقد ہے۔

— مسلمانوں کا دوسرا فریق کہتا ہے کہ وہ کلمہ گو ہے اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے

اس کو کسی طرح کافر نہیں کہہ سکتے۔

خود تاجر موصوف سے جو دریافت کیا گیا تو اس نے بھی بیان کیا کہ میں مسلمان ہوں کلمہ پڑھتا ہوں۔ مسلمانوں کی ضروریات میں چندہ دیتا ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں سرآغاخان کو اپنا رہنما اور مرشد سمجھتا ہوں جیسے عام طور پر مسلمان کسی نہ کسی پیر کے مرید ہوا کرتے ہیں۔ ویسے۔

فریقِ اول اس تمام بیان کو تاجر مذکور کے ضرورت اور مصلحتِ وقت پر محمول کرتا ہے۔ اب حضور سے چند امور دریافت طلب ہیں۔

سوال اول: سرآغاخانوں کے متعلق حضور کی کیا تحقیق ہے، ان کو شرعاً مسلمان کہیں گے یا کافر؟

سوال دوم: اگر کافر ہیں تو تاجر مذکور کا اپنی صفائی میں یہ پیش کرنا کہ مسلمان ہوں، کلمہ گو ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اس بیان سے اس کو مسلمان سمجھا جائے گا یا نہیں؟

سوال سوم: اگر نہیں تو ایک مدعی اسلام کی تکفیر کیسے ہو سکتی ہے۔ کافر اور مسلمان ہونے کا آخر کیا معیار ہے۔

سوال چہارم: بعض ہی خواہان قوم کا خیال ہے کہ گو تاجر مذکور شرعی نقطہ نگاہ سے اسلام سے خارج ہو لیکن اس وقت ہم مسلمانوں کو اتحادِ قومی اور ترقی کی ضرورت ہے۔ لہذا ایسے بھگڑے بھگڑے کو نکالنا مناسب نہیں۔ یہ وقت نازک ہے سب مدعیانِ اسلام کو مسلمان کہنا اور سمجھنا چاہیے۔ ان کو اسلام سے خارج کر کے اپنی تعداد اور مردم شماری کو گھٹانا نہیں چاہیے۔ یہی خواہان قوم اور مہدروان اسلام کا یہ خیال شرعاً کس قدر وقعت رکھتا ہے؟

سوال پنجم: سرآغاخانوں کے معتقدات کا خواہ اسلام روادار ہو یا نہ ہو بے حد یہ امر حل طلب ہے کہ خصوصیت کے ساتھ تاجر موصوف کا بیان اور دعوائے اسلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو کافر کہیں گے یا مسلمان سمجھیں گے اور ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں جگہ دی جائے یا کیا معاملہ کرنا چاہیے؟

سوال ششم: جو نام نہاد مولوی تاجر مذکور کی میت کی نماز جنازہ پڑھتے اور اس کو مسلمان کہتے ہیں اور کہلاتے ہیں اور اس میں کوشش کرتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟

نوٹ :- اسی اثناء میں گجراتی زبان میں ایک استفتاء دستیاب ہو گیا جس میں ان کے عقائد و طریقہ نماز کا تذکرہ موجود ہے۔ مزید بصیرت کے لئے منسلک لفافہ ہذا ہے۔

محمد طاہر

طریقہ نماز پر اصول و دعائیں تعلیم کردہ آغا خان گجو

م منقول از ترجمہ رسالہ تقویۃ الایمان بزبان گجراتی

نماز پر طھو۔ نماز پر طھو۔ خدام کو برکت دے۔ خدا کا نام لو۔ خداوند شاہ علی تم کو ایمان اور اخلاق دے۔ یا شاہ میری شام کی نماز اور دعائیں قبول کر، جو حق تم کو ملا ہے۔ میں اس کا واسطہ دیتا ہوں۔ اے ہمارے آقا آغا سلطان محمد شاہ۔ اس کے بعد سجدہ کرو اور اگر رات کی نماز ہو تو اس طرح کہو۔ میری شام اور رات کی دعائیں، دوسری مرتبہ سجدہ کرو اور تسبیح پڑھو اور حسب ذیل طریقہ پر دعاء درود پڑھو۔

تسبیح۔ میں اپنے گناہوں پر پھپھاتا ہوں۔ دو مرتبہ۔ میں سر سے پاؤں تک تیرا تقصیر وار ہوں۔ اے غفور۔ رحیم شاہ میرا گناہ معاف کر۔ پیر تیری ہی عبادت کرتے ہیں بندہ دعا مانگتا ہے۔ اے سچے شاہ تو منظور رکھنے والا ہے۔ میں شاہ کے اسی فرمان کو سراور آنکھوں پر رکھتا ہوں جو پیر کے ذریعہ مجھ کو ملا ہے۔ یہ کہہ کر تسبیح زمین پر رکھ دو اور نیچے بتایا ہوا درود کرو۔

اشہد۔ سبحان اللہ۔ لا الہ الا اللہ۔ اللہ اکبر۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

الرحمن۔ ذی الجلال والاکرام۔

ان تمام صفتوں سے بنا ہوا قدوس۔ سب پر طاقت ور خدا۔ ایران کے ضلع جالندیا میں انسان کا جسم لے کر شتر پاپ کی پیٹھ سے نکلا۔ اُنٹھ خدا ہو جانے کے بعد ستر تھویں (اوتار کے لفظ سے) اڑتا لیسواں امام۔ دسواں بے عیب اوتار۔ ہمارا خداوند آتا۔ سلطان محمد شاہ داتا۔

اس کے بعد سجدہ کرو۔ حق شاہ اچھا۔ دنیا اور زمین کا شاہ۔ خلیفہ اور گدی کے جانشینوں کا نام کا وظیفہ کرو۔ دنیا اور زمین کے اچھوں کا نام یہ ہے۔ شاہ کے خلیفہ ابوطالب دلی کا نام حسب ذیل :-

۱	ہمارا پچا خداوند شاہ علی۔	۶	ہمارا پچا خداوند شاہ اسمعیل
۲	شاہ حسین۔	۷	شاہ محمد ابی اسمعیل
۳	شاہ زین العابدین	۸	شاہ فیح احمد۔ بکڑالی نمبر ۲۶
۴	شاہ محمد باقر	۹	شاہ آقا علی شاہ
۵	شاہ محمد جعفر	۱۰	شاہ آقا محمد شاہ داتا۔

اور اس وقت کی امامت کا مالک خداوند زمان۔ امام شیخ المشائخ امامت کی طاقت رکھنے والا مانو۔ آغا سلطان محمد شاہ داتا بے شمار کروڑوں آدمیوں کا دستگیر اس وقت کی امامت کا مالک۔ اے شاہ جو حق تم کو طاہ ہے یہ طفیل اس کے اپنے حضور میں میری دعا منظور کر۔ اے ہمارے خداوند آغا سلطان محمد شاہ۔

الجواب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اول چند مقدمات مہد کرتا ہوں۔

(الف) قال اللہ تعالیٰ لقد کفر الذین قالوا ان اللہ هو المسیح بن مریم

(ب) قال اللہ تعالیٰ ما جعل اللہ من بحیرة ولا سائبة ولا وصیلة ولا

حام ولا کن الذین کفروا یفترون علی اللہ الکذاب۔

(ج) قال اللہ تعالیٰ ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکوا النار۔

(د) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی صلاتنا واستقبل قبلتنا

واکل ذبیحتنا فذلک المسلم۔ رواہ البخاری۔

(ه) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیة المنافق ثلاث رواہ الشیخان۔

زاد مسلم وان صار وصلى وزعم انه مسلم

(۹) عن حذيفة رضى قال انما النفاق كان على عهد رسول صلى الله عليه وسلم فاما اليوم فانما هو الكفر او الايمان رواه البخارى -

(منا) فى اللغات فى شرح الحديث اى الحكم بعدم التعرض لاهل البيت عليهم كان على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم لمصالح كانت مقتصره على ذلك الزمان اما اليوم فلم تبق تلك المصالح فنحن ان علمنا انه كافر قتلناه حتى يؤمن اه

(ح) فى رد المختار احكام المرتد تحت قول الدر المختار لان التلطف لها صامه علامه على الاسلام مانصه افاد بقوله صار الى ان ما كان فى زمن الامام محمداً تغير لانه فى زمنه ما كانوا يمتنعون عن النطق بها فلم تكن علامه الاملا فلذا اشروطوا معها التبرى واما فى زمان قارى الهداية فقد صارت علامه الاسلام لانه لا ياقى بها الا المسلم الخ

(ط) فى الدر المختار احكام غسل الميت ومحل دفنهم كدفن ذميه جلى من مسلم الخ

(ي) فى مختصر المعانى بحث الاسناد مانصه وقولنا فى التعريف بتأول يخرج نحو ما مر من قول الجاهل ابنت الربيع البقل رايتا الانبات من الربيع الخ فيه بحث وجوب القرينة للاستناد المجازى مانصه وصدوره عطف على استحالة الئى كصدوره عن الموحد فى مثل اشاب الضعير الخ

آيات وروايات وعبارات بالاسم يه امور مستفاد ہوئے -

اول :- حلول كاقائل هو تا كفر ہے (الآية ۱)

ثانى :- جو رسوم وعادات كفار کے ساتھ ایسی خصوصیت رکھتی ہوں کہ بمنزل ان کے شعار کے ہو گئے ہوں۔ اگر عرفاً وہ شعار مذہبی سمجھے جاتے ہوں وہ بھی کفر ہیں (آیت ب) اس اصول پر فقہار نے شد ز تار کو کفر نہ مایا ہے ورتہ تشبہ بالكفار ہے جو مستلزم

رکون الی الکفار ہونے کے سبب معصیت و حرام ہے (آیت ج) جس طرح عادات مخصوصہ باسلیب
 دلیل اسلام ہیں (روایت د) بشرطیکہ کوئی یقینی دلیل کفر کی نہ ہو ورنہ کفر ہی کا حکم کیا جائے
 گا۔ لقولہ تعالیٰ اِنَّ الدِّیْنِ یَکْفِیْ وُنَّ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَیُؤْمِنُوْنَ اِن یُفْرَقُوْا
 بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَ یَقُوْلُوْنَ نُوْمِنُ مِنْ بَعْضِ وَ نَکْفِرُ مِنْ بَعْضٍ وَ یُرِیْدُوْنَ
 اِن یَسْتَخَذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا - اَو لَیْسَ لَکَ هُمَا کٰفِرُوْنَ حَقًّا۔

اورد اسلام کی وجہ واحد کو کفر کی وجہ متعددہ پر ترجیح اُس وقت ہے جب وہ وجہ
 متحمل ہوں متیقن نہ ہوں۔

تالث :- موجبات کفر کے ہوتے ہوئے بعض کا دعویٰ اسلام و صلوات و صیام اور
 استقبال بیت الحرام ترتیب احکام اسلام کے لئے کافی نہیں جب تک اُن موجبات سے
 تائب نہ ہو جائے (روایت ۵)

(سابع) باوجود ثبوت کفر کے اسلام ظاہر کرنے والوں کے ساتھ بنا بر مصالح اسلامیہ
 مسلمانوں کا سا برتاؤ کرنا گو بعض اوقات اُن کے کفر کا بھی ظہور ہو جاتا تھا کما نقل
 عنہم قولہم انو من کما امن السفهاء و نحوہ۔ مخصوص تھا حضور اقدس صلی
 اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کے ساتھ اب وہ حکم باقی نہیں رہا (روایت عبارات سن)
 بلکہ بعض احکام کے اعتبار سے خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیر عہد میں
 معاملہ کا مسلمان میں تغیر ہو گیا تھا۔ چنانچہ آیت لا تصل علی احد منہم مات ابدا
 ولا تقم علی قبرہ میں مصرح ہے والنبی عن الزیارة یستلزم التہی عن
 الدفن فی مقابر المسلمین لان الدفن یستلزم الزیارة عاۃ۔ البتہ تعرض
 بالقتل والنہب کی ممانعت باقی رہ گئی تھی۔

خامس :- جو کافر اصول اسلامیہ کا بھی مقرر ہو اُس کے حکم یا اسلام کے لئے
 محض تلفظ کلمتہ الشہادہ کافی نہیں جب تک اپنے کفریات سے تیری کا اعلان نہ کرے
 (عبارت ۶)

سادس :- کافر کو مقابر مسلمین میں دفن کرنا جائز نہیں (عبارت ۷)

سابع: جس شخص کا کفر ثابت ہو جائے اس کے اقوال و افعال محتملہ للکفر والا سلام میں تاویل کرنے سے اس کا کفر مانع ہو گا (جارت ی)

آب مقدسہ کے بعد سب سوالات کا جواب ظاہر ہے مگر تبرعاً بعداً بھی عرض کرنا ہوں سوال میں دو قسم کے امور مذکور ہیں ایک قسم وہ جو یقیناً موجب کفر ہیں جیسے تصویر کی پرستش کرنا یا کوشن کی تصویر عبادت خانہ میں رکھنا جو شعائر کفار کا ہے یا بجائے بسم اللہ کے لفظ اوم کھنڈ یا حلول کا قائل ہونا جو سوال کی تمہید اور ترکیب نماز کے آغاز میں مذکور ہے اور دوسری قسم وہ جو صرف متعل کفر ہیں جیسے دیوانی سے یہی کھانا کا حساب شروع کرنا یا معتداؤں کو لفظ خداوند سے خطاب کرنا یا ان سے وعار مانگنا۔ پس قسم اول پر تو حکم بالکفر ظاہر ہے۔ (اللاہ الاول والثانی) اور قسم ثانی کا صدور اگر مسلمان ہوتا تو اس میں تاویل کر کے مباح یا معصیت پر معمول کیا جاتا۔ مگر جب اس کا صدور کافر سے ہے تو تاویل کی ضرورت نہیں (اللاہ السابع) اور ان کفریات کے ہوتے ہوئے نہ ایسے شخص کا دعویٰ اسلام کافی ہے اور نہ اس کا نمازی اور روزہ دار ہونا کافی ہے اور نہ اس پر نماز جنازہ جائز ہے، نہ مقابر مسلمانوں میں دفن کرنا جائز ہے (اللاہ الثالث والساد) اور نہ مصلحت کے سبب کافر کو مسلمان کہنا یا اس کے ساتھ مسلمانوں کا سامنا کرنا جائز ہے۔

رابع والرابع والخامس، البتہ بلا ضرورت کسی سے لڑائی جھگڑا بھی نہ چاہیے۔ اور ایسے مصالح کی بناء پر ایسی رعایت کرنا ان مصالح سے زیادہ مفاسد کا موجب ہو جاتا ہے کیونکہ وہ مصالح تو محض ذمیوی ہیں اور مفاسد دینیہ۔ ان مفاسد کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ان کفریات کے پھرنے کسی کو مسلمان کہا جاوے گا تو نادانانہ مسلمانوں کی نظر میں ان کفریات کا قبح کم ہو جاوے گا۔ اور وہ آسانی سے ایسے گمراہوں کے شکار ہو سکیں گے تو کافروں کو اسلام میں داخل کہنے کا انجام یہ ہو گا کہ بہت سے مسلمان اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔ کیا کوئی مصلحت اس مفسدہ کی معاونت کر سکے گی۔ ایسے مصالح و مفاسد کے اجتماع کا یہ فیصلہ فرمایا گیا قُلْ فِيمَا اِنَّهُمْ كَلِمَةٌ وَمَا فِيهَا لِنَاسٍ وَاِنَّهَا اَعْيُنٌ نَّقِصَتْ وَقَالَ تَعَالَى يٰۤاٰمَنُوْنَ فَزَلُّواْ قَلِيْلًا مِّنْ نَّقِصَةٍ

اشرف علی

میں نقیصہ۔ فقط واللہ اعلم

۱۰ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ

تخذیر الانام

عن تغییر اسم الخط من

مصحف الامام

قرآن کریم کا رسم الخط

اور اس کے احکام

مقام تالیف _____ دیوبند
 تاریخ تالیف _____ محرم ۱۳۶۳ھ
 اشاعت اول _____ باہتمام خطیب عبدالکریم صاحب
 تاجر چرم محلہ بٹری پیٹ و انباری
 از مطبع کربھی مدراس

”ستران کریم کی بعض تفسیریں مائل زبان
 میں شائع ہوئیں جنہیں اُلٹی طرف سے شروع
 کیا گیا اس کے متعلق ایک سوال کے جواب
 میں یہ مقالہ زیر تفسیر آیا جس میں رسم عثمانی
 کے اتباع سے متعلق تمام ضروری احکام
 جمع کر دیئے گئے۔“

تَحذِيرُ الْإِتْكَامِ

عن تَغْيِيرِ رِسْمِ الْخَطِّ

مِنْ مَصْحَفِ الْإِمَامِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ

ام بعد

سوال

ما قولكم ايها العلماء رحمكم الله في هذا الباب ايا شخص نے قرآن مجید کا ترجمہ علاقہ مدراس کی ٹائل زبان میں کیا ہے اور جب وہ اس کی طباعت کریں گے تو اس کے ساتھ قرآن مجید عربی صفحہ بہ صفحہ لگانا بھی چاہتے ہیں چونکہ ٹائل زبان کی کتابت بائیں طرف سے شروع ہوتی ہے اس لئے اس کا لوح بائیں طرف سے ہی رکھا جاتا ہے اور بائیں طرف سے شروع ہونے لگتے ہیں۔ اب یہ ترجمہ بھی اسی طرح بائیں طرف سے شروع ہوگا اور عربی قرآن بھی بائیں طرف سے شروع ہوگا بائیں طرف سے اور اوراق اٹے جائیں گے گو اس کی کتابت سید طرف سے ہوئی ہے!

اب قابل غور بات یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو قرآن مجید کو لکھوائے تھے تیرہ سو سال سے قرآن مجید کی کتابت سیدھی شروع ہو کر سیدھی طرف سے ہی اور اوراق اٹے جاتے ہیں۔ اب اس طرح کا ترجمہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآنی وضع اور تیرہ سو سال کے مترجمین و مفسرین کے اوضاع و تعامل اور اجماع امت علیٰ ہذا العمل کا خلاف ہوتا ہے یا نہیں؟

(۱) کیا یہ صورت جائز ہے کہ ایک صفحہ میں قرآن مجید عربی کو ٹائل رسم خط میں لکھا جاوے اور دوسرے صفحہ میں اُس کا ٹائل ترجمہ لکھا جاوے؟

(۲) نیز کیا یہ جائز ہے کہ قرآن مجید عربی کو عربی ہی رسم خط میں ایک صفحہ میں اور اُس کا ترجمہ ٹائل زبان کا دوسرے صفحہ میں لکھا جاوے وجہ شہہ یہ ہے کہ قرآن اصل ہے اور ترجمہ اس کا تابع اس اصل کو تابع بنا کر ٹائل کے موافق بائیں طرف سے صفحات شروع کر کے اور اوراق اٹے جانا

علمائے اُمتِ محمدیہ کے پاس جائز ہے یا نہیں۔ باوجودیکہ ٹائل زبان کی اگرچہ کہ بائیں طرف سے شروع ہوتی ہے لیکن اس کے صفحات سیدھے طرف سے رکھے جاسکتے ہیں اور ہر صفحہ کا ہندسہ صفحات اس کے سر پر رکھا جاسکتا ہے۔ اس طریقے سے قرآن شریف بھی موافق وضع عثمانی اور تیرہ سو سال کے تعاملِ اسلامی کے موافق ہو سکتا ہے اور یہ کچھ دشوار امر نہیں ہے اور یہ خیال کہ اگلوں نے اس قسم کے ترجمے لکھے ہیں اور قرآنی صفحات کو ٹائل یا انگریزی وغیرہ کے تابع بنا کر ورقوں کو بائیں طرف سے الٹنے کے لئے کتابیں ترجمہ تفاسیر لکھی ہیں اور شائع بھی ہو چکی ہیں کسی نے اس کا خلاف نہیں کیا اور ایسا کرنے والے علماء تھے انھوں نے اس کام کو جائز قرار دے کر عمل کیا۔ اب اس کا خلاف کرنے والا عالم نہیں۔ ایسا کہنا کہاں تک صحیح ہے۔ حضراتِ علمائے کرام کی اس باب میں کیا رائے ہے؟ اور قرآن مجید کی وضع عثمانی کیسی تھی بیان فرمائیے؟

الْحَمْدُ لِلَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ سَوَابِ

اتفاقاً انھیں آیام میں متعدد سوالات اس قسم کے جمع ہو گئے۔ کسی میں قرآن کو ہندی رسم خط میں اور کسی نے گجراتی رسم خط میں کسی نے انگریزی رسم خط میں لکھنے کے متعلق سوال کیا ہے اس لئے اس کا جواب کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے جو سب سوالات کا جواب ہو سکے۔

پہلے ایک بات بطور مقدمہ سمجھ لی جاوے پھر اس سے سب سوالات کا جواب آسان ہو گا وہ یہ ہے کہ باجماع صحابہ و تابعین اور بالاتفاق ائمہ مجتہدین پوری امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک قرآن مجید کی کتابت میں مصحف عثمانی جس کو اصطلاح میں امام کہا جاتا ہے اس کا اتباع واجب ہے، اس کے خلاف کرنا تحریر قرآن اور زندقہ کے حکم میں ہے اور خصوصاً کلمات قرآنی کی ترتیب بدلتا یا اس میں کسی حرف کی کمی زیادتی کرنا تو کھلی تحریر ہے جس کو کوئی ملحد بھی صراحتاً تجویز نہیں کر سکتا اس اجماع کا ثبوت اور شواہد آخر میں ذکر کئے جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ عہد صحابہ میں جب اسلام مشرق و مغرب کے ممالک عجم میں اپنی آسمانی کتاب

قرآن مجید کے ساتھ پھیلا۔ اس وقت قرآن کریم کے پڑھنے پر پڑھانے والے گئے چنے حضرات تھے۔ عراق و خراسان اور ہندوستان و ترکستان وغیرہ کے رہنے والے نو مسلم نہ عربی رسم خط پڑھ سکتے تھے نہ ان کے ممالک میں ابتداً کوئی ایسا آدمی میسر تھا جو عربی کو سمجھ کر ان کی ملکی زبان میں اس کی ترجمانی ہآسانی کر سکے اور قرآن ان کو پڑھا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت اس کی کس قدر ضرورت ہوگی کہ ہر ملک کے رسم خط میں قرآن لکھو کر ان کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ آسانی سے پڑھ سکیں لیکن پوری تاریخ اسلام میں ایک واقعہ اس کا قرون مشہور لہذا بالآخر میں ثابت نہیں کہ ان حضرات نے کسی عجمی رسم خط میں قرآن لکھوایا ہو یا اس کی اجازت دی ہو۔ بلکہ تعامل صحابہ کرام کا اس وقت بھی وہ ہوا جو صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے ملک شام کے جہاد اور آرمینیہ۔ آذربائیجان کی فتح میں شریک تھے وہاں اہل عراق کو قرآن کی مختلف قراءتوں میں اختلاف کرتے ہوئے دیکھا تو اس وقت کے خلیفہ و اسلام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر سخت تشویش کا اظہار کیا اور یہ الفاظ کہے :-

ادرك الامۃ قبل ان یختلفوا لے امیر المؤمنین آپ امت کی خبر لیں اس سے

اختلاف الیہود والنصارى پہلے کہ ان میں یہود و نصاریٰ جیسا اختلاف واقع ہو جائے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام اہل صحابہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور زبیر بن ثابت

اور عبد اللہ بن زبیر اور سعید بن العاص اور عبد الرحمن بن عمارث وغیرہم کے مشورہ سے طے

کر لیا کہ قبائل عرب کے سات لغات جن پر قرآن نازل ہوا ہے اگرچہ وہ سب وحی اور حق ہیں

لیکن ان کے لفظی اختلاف سے اب یہ اندیشہ ہے کہ کہیں معنوی اختلاف اور تحریف کا راستہ

نہ نکل آوے۔ اس لئے اب صرف قریش کی لغت پر قرآن پڑھا جاوے دوسرے لغات

کو موقوف کر دیا جاوے کیونکہ یہ اختلاف لغات صرف لفظی تھا معنی پر اس کا کوئی اثر نہیں

تھا جو قبائل کی آسانی کے لئے جاری ہوا تھا۔ اس کی مثال اردو میں ایسی ہے جیسے دہلی اور

لکھنؤ کی اردو میں ہا ہی کچھ فرق ہیں مثلاً آپ کو اور آپ کے تئیں وغیرہ کہ جس کا

معنی پر کوئی اثر نہیں۔

باجماع صحابہ لغت قریش پر قرآن کریم کے بہت سے نسخے لکھوائے گئے اور ایک جماعت صحابہ کے سامنے ان کو پڑھا گیا صحیح کیا گیا۔ اس کے بعد وہ نسخے مختلف ممالک عرب و عجم، مکہ مکرمہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ میں بھیج دیے گئے اور باجماع امت ان کا اتباع ہر چیز میں لازم و ضروری سمجھا گیا (کذافی روح المعانی ص ۲۰)

حافظ ابن کثیر نے اپنی کتاب فضائل القرآن میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جامع دمشق میں اس کا ایک نسخہ اب تک موجود ہے۔ جو بڑے وزنی اور اراق پر لکھا ہوا ہے۔ الغرض قرآن کریم عجمی ممالک میں آج نہیں پہنچا بلکہ تقریباً تیرہ سو برس پہلے سے پہنچا ہوا ہے اور عجمیوں کو عربی رسم خط میں قرآن پڑھنے کی مشکلات بھی آج پیدا نہیں ہوئی بلکہ اسی وقت سے ہیں اور اگر غور کیا جاوے تو اس وقت یہ مشکلات بہت زیادہ ہونا چاہئیں کہ ہر جگہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی پھر ان میں لکھے پڑھے کم تھے خصوصاً قرآن پڑھانے والا تو کوئی عرب ہی ہو سکتا تھا جس کا ہر شہر، ہر قصبہ، ہر بستی میں پہنچنا ظاہر ہے کہ آسان نہ تھا لیکن ان سب مشکلات مزعمومہ کے باوجود صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہیں یہ تجویز نہ کیا کہ قرآن کو ملکی رسم خط میں لکھوا کر ان لوگوں کو دیا جاوے۔ بلکہ ان حضرات نے جس طرح قرآن کے معانی اور الفاظ اور زبان کی حفاظت کو ضروری سمجھا اسی طرح اس کے رسم خط کی بھی مصحف عثمانی کے موافق حفاظت کرنا ضروری سمجھا۔ اور ان مشکلات کو حفاظت مذکورہ کے مقابلہ میں ناقابل التفات قرار دیا۔ چنانچہ تھوڑے عرصہ میں دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ سب مشکلات محض خیالی تھیں۔

خداوند سبحانہ و تعالیٰ نے قرأت قرآن کے آسان کر دینے کا کھلے لفظوں میں جو خود اعلان فرمایا ہے و لقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر۔ اس کا مشاہدہ سب کی آنکھوں کے سامنے آ گیا کہ ہر ملک اور ہر زبان والے قرآن کو ایسا پڑھنے لگے کہ اپنی اپنی مادری زبان کی کتابوں کو بھی ایسا نہیں پڑھ سکتے۔ اور انھیں اہل عجم میں سیکڑوں ایسے حضرات ہوئے جو بخوبی قرآن اور دگر علوم قرآنیہ کے امام مانے گئے۔

الغرض اول تو یہ مشکلات محض خیالی ہیں ان کو مشکل تسلیم کرنا ہی غلطی ہے اور بالفرض

تسلیم بھی کیا جاوے تو ہر مشکل کا ازالہ ضروری نہیں۔ یوں تو نماز روزہ وغیرہ ارکان اسلام سب ہی کچھ نہ کچھ مشکل اپنے اندر رکھتے ہیں۔

اسی مضمون کو شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنے فتاویٰ میں خوب واضح فرما دیا ہے جس کی عبارت عنقریب نقل کی جائے گی۔

الغرض صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرزِ عمل سے واضح ہو گیا کہ جس طرح قرآن میں زبان عربی کی حفاظت ضروری اور لازم ہے کسی عجمی زبان میں بدون قرآنی عربی عبارات کے قرآن مجید کی کتابت جائز نہیں اسی طرح عربی رسم خط کی حفاظت بھی ضروری ہے کسی دوسرے رسم خط میں لکھنا اُن کا جائز نہیں کہ اُس میں رسم خط عثمانی کی مخالفت اور تحریف قرآن کا راستہ کھولنا ہے جو باجماع امت حرام ہے۔

مخصوصاً ایسے رسم خط جن میں کلمات کی ترتیب بدل جائے یا کچھ حروف میں کمی بیشی کرنا پڑے جیسے انگریزی رسم خط ہے کہ اُس میں حرکات (زیر، پر، پیش) کو بھی بشکل حروف لکھا جاتا ہے۔ ایسا لکھنا تو قرآن میں زیادتی کرنا اور قطعاً تحریف قرآن ہے۔

عربی رسم خط میں زیر، پر وغیرہ حرکات اگرچہ کلمات سے بالکل جدا اور ممتاز ہوتی ہیں مگر اس کے باوجود علمائے سلف کو اس میں بھی اختلاف کی نوبت پیش آئی کہ قرآن کی عبارت پر یہ حرکات لکھنا بھی جائز ہے یا نہیں۔ بعض حضرات نے اس کو بھی مکہ وہ سمجھا۔ بعض نے صرف مواضع مشککہ میں بضرورت اجازت دی علامہ دانی جنھوں نے رسم خط قرآن پر مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔ اُس میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اعراب (حرکات زیر، پر وغیرہ) اور نقطے سُرخ سے لکھے جاویں تاکہ قرآن کی اصلی عبارت سے ممتاز رہیں۔

علامہ نووی اور جمہور فقہاء نے اس کی مطلقاً اجازت دی کیونکہ عربی رسم خط میں اعراب مستقل جداگانہ چیز ہے اُس کا اختلاط کلمات و حروف کے ساتھ نہیں ہو سکتا لہذا

ذکرہ السیوطی فی الاتقان مفصلاً ص ۱۰۱ ج ۲

الغرض عربی رسم خط میں حرکات اور نقطوں کا کلمات سے بالکل جدا اور ممتاز ہونا ثابت ہونے کے باوجود سلف صالحین کو اُن کی کتابت فی المصاحف میں اختلاف پیش آیا تو جس رسم خط مثلاً

انگریزی) میں یہ حرکات خود کلمات کے درمیان بشکل حروف لکھی جاتی ہوں اس کی اجازت کیسے متصور ہے۔ ٹائل زبان کا حال معلوم نہیں کہ اس بارہ میں وہ بھی انگریزی کی طرح ہے یا کیا صورت ہے؟

علاوہ ازیں عربی زبان میں چند حروف ایسے ہیں کہ ہر حرف سے لفظ کے معنی بالکل جدا ہو جاتے ہیں لیکن بہت سی عجیب زبانوں میں ان حروف میں کوئی فرق نہیں سب کو ایک ہی آواز سے پڑھا جاتا ہے ایک ہی شکل سے لکھا جاتا ہے۔ مثلاً (س - ش - ص) اور (ذال - ز - ظ) وغیرہ تو جب قرآن کو اس رسم خط میں لکھا جائے گا تو ان حروف کا کوئی امتیاز نہ رہے گا جو سخت ترین تحریف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسم خط عثمانی کا اتباع لازم و واجب ہے اس کے سوا کسی دوسرے رسم خط میں اگرچہ وہ بھی عربی ہی کیوں نہ ہو قرآن کی کتابت جائز نہیں۔ مثلاً اوائل سورت میں بسم اللہ کو مصاحف عثمانیہ میں بحذف الف لکھا ہے اور اقرأ باسم ربك میں بشکل الف ظاہر کیا گیا ہے اگرچہ پڑھنے میں دونوں یکساں بحذف الف پڑھے جاتے ہیں مگر باجماع امت اسی کی نقل و اتباع کرنا ضروری ہے اس کے خلاف کرنا عربی رسم خط میں بھی جائز نہیں تو ظاہر ہے کہ سرے سے پورا رسم خط غیر عربی میں بدل دینا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

اور حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ نے ازالۃ الخفا میں ایک مہتمم بالشان مقدمہ میں بیان فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ قرآن کی جمع و ترتیب اور حفاظت ہمارے ذمہ ہے قال تعالیٰ (ان علينا جمعہ وقرآنہ) وقال تعالیٰ (اننا لہ لحافظون) لیکن اس وعدہ الہیہ کے ظہور اور حفاظت الہیہ کا طریق ظاہر ہے کہ اس طرح منظور نہیں تھا جس طرح انسان اپنے سامان کی حفاظت کرتا ہے اور نہ اس طرح کہ قرآن کسی پتھر کے اندر کندہ ہو جاتا جو مٹانے سے نہ مٹ سکے بلکہ مشاہدہ یہ ہوا کہ حفاظت خداوندی کا ظہور اس طرح ہوا کہ چند بندگان صالحین کے قلوب میں ڈالا گیا کہ وہ اس کی جمع اور تدوین کی خدمت انجام دیں اور تمام دنیا کے مسلمان ایک نسخہ قرآنی پر مجتمع اور متفق

ہو جاویں اور ہمیشہ جماعتِ عظیمہ اُس کی تلاوت اور تعلیم میں مشغول رہیں تاکہ سلسلہ تواتر نہ ٹوٹ جاوے اور تکمیل اس کی اس طرح ظہور میں آئی کہ عہدِ عثمانی میں بمشورہ واجماع صحابہ تمام مصاحف میں سے ایک مصحف پر اتفاق کیا گیا جس میں قرأتِ شاذہ نہیں لی گئیں بلکہ قرأتِ متواترہ لی گئی اور قبائلِ عرب کی سات زبانوں میں سے جن پر قرآن نازل ہوا تھا۔ ایک قریش کی لغت لی گئی اور باقی لغات کے مصاحف متروک کر دیے گئے جن کا بعد میں کہیں نام و نشان نہیں رہا۔

اس واقعہ اور مشاہدہ سے ثابت ہو گیا کہ قرآن جس کی حفاظت کا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا وہی مصحفِ عثمانی ہے اور یہی قرآن محفوظ من اللہ ہے۔ ورنہ اگر حفاظتِ خداوندی سب مصاحف کے ساتھ متعلق ہوتی تو دوسرے لغات کے مصاحف کا تلف کر دینا کسی مخلوق کی قدرت میں نہ ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن محفوظ صرف وہ ہی ہے جو مصحفِ امام اور مصحفِ عثمانی کہلاتا ہے جو چیز اُس میں نہیں وہ قرآن نہیں اور جو چیز اس میں ہے وہ نہ مٹائی جاسکتی ہے اور نہ اُس میں کوئی ادنیٰ تغیر کرنا جائز ہو سکتا ہے۔ یہی راز ہے اُس اجماع کا جو اوپر نقل کیا گیا کہ مصحفِ عثمانی کے رسم خط کی بھی حفاظت واجب ہے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے بیان کی چند نظریں یہ ہیں :- (ازالۃ الخفاء ص ۲۵ ج ۱)

«لہذا محققین علماء باں رفتہ اند کہ در صلوات وغیر آن خواندہ نشود مگر قرأت متواترہ و قرأت متواترہ آن است کہ در دے و در شرط ہم آید کیے آن کہ سلسلہ روایت آن ثقہ عن ثقہ تھما کہ آمد سند مجرد متصل خطے دوم آن کہ خط مصاحف عثمانیہ محتمل آن باشد زیرا کہ چوں صورت حفظ آن تدوین میں الوصی جمع است براں مقرر شد ہرچہ غیر آن است غیر محفوظ است غیر قرآن است لان اللہ تعالیٰ قال وَاِنَّا لَنَاجِیْ فِیْ طُوًی و قَالَ اِنَّا عَلَيْنَا جَمْعُہُ الَّذِیْ سِیْ قرأت فالذکر والانشی شاذست در نماز نمی توان خواند حال آنکہ از حدیث ابن مسعود دانی در واد صحیح شدہ است و در وقت انسخہ مصاحف عثمانیہ از اصل شیخین ابن عباس با صحابہ دیگر مباحث فرمود در تبیی بعضی آیات دمشق ربک بجائے قضی ربک گفت اولم یسئرن بجائے اولم یسئرن خواندہ آخر جماعت دیگر للتفات تبیی او کردہ قضی ربک اولم یسئرن

نوشتند وہاں نسخ در آفاق شائع شد ماہیں قاعدہ و استیم کہ قول جماعہ صحیح بود و تحریر ابی عباس من باب خط المذکور ہم چنین جمعے از صحابہ تناقص کردند در جمع قرآن ہر یکے مصحف مرتب نمود ہر یکے۔ از اہل آن عصر سور قرآن را بلغت خود نوشت بر غیر لغت قریش حضرت ذی النورین بالہام ربانی محو آن کرد و بر یک قرآن سہم را جمع نمود در آہ وقت باب قبل و قال مفتوح شد و برومات از ہر دو جانب بیاباں آمد چوں تمام عالم بر مصاحف عثمانیہ جمع شدند یقین کر دیم کہ محفوظ ہماں ست و غیر او مراد الحفظ نبود و اگر مراد الحفظ می بود محو نمی شد و ایں رایسچ عاقلہ حفظ نشمارو کہ نزدیک امام مہموم الوجود متعنی الحال ادعا کنند کہ نہادہ شدہ است سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ۔

مضمون مذکور کے شواہد اصول تفسیر اور تفسیر کی کتب میں نیز کتب فقہ میں پیشاں میں ان میں سے چند بقدر ضرورت اس جگہ لکھے جاتے ہیں :-

علامہ سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں رسم خط قرآنی اور کتابت قرآنی کے اداب پر مستقل فصل بعنوان (النوع السادس والسبعون) رکھی ہے اس میں نقل کیا ہے۔

وقال اشہب سئل مالک هل یکتب المصحف علی ما احدثہ الناس من الہجاء قال لا الا علی الکتبۃ الاولى رواہ الداقی فی المقنع ثم قال ولا مخالف لہ من علماء الامۃ

اشہب فرماتے ہیں کہ امام مالک سے سوال کیا گیا کہ کیا قرآن مجید کو اس خاص طرز تحریر میں لکھ سکتے ہیں جو آج کل لوگوں نے ایجاد کیا ہے فرمایا نہیں بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر ہونا چاہیے۔ اس کو علامہ دانی نے مقنع میں نقل کر کے فرمایا ہے کہ علماء میں سے کوئی امام مالک کا اس بارہ میں مخالف نہیں ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے :-

وقال الامام احمد و یحرم مخالفة خط مصحف عثمان فی واو او یاء او الف او غیر ذلک (اتقان ص ۱۶۷ ج ۲)

اور حضرت امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ مصحف عثمان کے رسم خط کی مخالفت حرام ہے واو یاء الف (زائدہ) میں (جو کہ لفظ میں نہیں آتے مفسر لکھے میں آتے ہیں)

پھر لکھا ہے :-

وقال البيهقي في شعب الايمان
من يكتب مصحفا فينبغي ان يحافظ
على الهجاء الذي كتبوا به تلك المصاحف
ولا يتخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوا شيئا
فانهم كانوا اكثر علما وصدق قلبا ولسانا
واعظم امانة فلا ينبغي ان نطن
بانفسنا استدارا عليهم۔

اس کے چند صفحہ بعد تحریر فرمایا ہے:-

وهل تجوز كتابته بقلم غير
العربي قال الزركشي له ارفيه كلاما
لاحد من العلماء قال ويحمل الجواز
لانہ قد يحسنه من يقرء بالعربية
والاقرب المنع كما تحرم قراءته
بغير لسان العرب ولقولهم القلم
احد اللسانين والعرب لا تعرف
قلما غير العربي وقال تعالى بلسان
عربي مبين۔

(اتقان ص ۱۱، ج ۲)

اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے (بلسان عربی مبین)

اور علامہ حسن شرنبلالی صاحب نور الایضاح جو دسویں صدی ہجری کے مشہور فقیر مصنف
تصانیف کثیرہ اور مذہب حنفی کے معروف مفتی ہیں ان کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر ہے
بنام النفحة القداسیہ فی احکام قراۃ القرآن وکتابتہ بالفارسیہ۔ اس میں مذاہب
اربعہ حنفیہ، شافعیہ مالکیہ اور حنابلہ کی مستند کتب سے اجماع امت اور ائمہ اربعہ کا اس پر
اتفاق نقل کیا ہے کہ قرآن کی کتابت میں مصحف امام کے رسم خط کا اتباع واجب و لازم ہے

اور امام بیہقی شعب الایمان میں فرماتے ہیں جو شخص
قرآن مجید کی کتابت کرے تو ضروری ہے کہ اس طرز تحریر
کی حفاظت کرے جس پر حضرات صحابہ نے مصاحف لکھی ہیں اسی
مخالفت ذکر سے اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے کسی چیز میں
تغیر نہ کرے کیونکہ وہ زیادہ علم والے اور زیادہ سچے دل والے تھے اور
اور زیادہ امانت دار تھے تو ہمارے لئے کسی طرح لائق نہیں کہ
ہم اپنے متعلق یہ گمان کریں کہ ان کی کسی کمی کو ہم پورا کرتے ہیں

کیا غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت جائز ہے۔
علامہ زرکشی نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ میں نے اس بارہ
میں کسی عالم کی تصریح نہیں دیکھی اور احتمال جواز کا ہے
کیونکہ بعض اوقات غیر عربی رسم خط کو وہ دمجی (رگ) بھی
طرح ادا کر سکتے ہیں جو عربی پر ملحہ تر لیتے ہیں (لیکن کھنے کی
قدرت نہیں) لیکن اقرب التحقیق یہ ہے کہ غیر عربی رسم خط
میں کھنے کو منع کیا جاوے جیسا کہ غیر عربی میں قرأت کو منع کیا
جاتا ہے کیونکہ مشہور ہے کہ قلم بھی ایک قسم کی زبان ہے
اور عرب بجز عربی رسم خط کے اور کوئی رسم خط نہیں جانتے

غیر عربی عبارات میں اُس کا لکنا حرام ہے اور اسی طرح غیر عربی خط میں اُس کی کتابت ممنوعہ و ناجائز ہے اس کے چند جملے اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں۔

لیکن قرآن مجید کی کتابت فارسی زبان میں سو کی ایک کتاب میں نہیں (بلکہ بہت سی کتب) جو ہمارے حنفیہ کے نزدیک مستند ہیں اس کی تصریح موجود ہے مجھ کو کہ وہ ہے جو صاحب ہدایہ نے اپنی کتاب تجنیس اور مزید میں فرمایا ہے جس کی عبارت یہ ہے اور فارسی میں کتابت قرآن سے باجماع منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ حفاظت قرآن میں خلل ڈالنے کا ذریعہ ہے کیونکہ ہم قرآن مجید کے الفاظ اور معنی دونوں کی حفاظت کے لئے مامور ہیں کیونکہ الفاظ بھی ثبوت نبوت کی دلیل ہیں اور الفاظ کے بدلنے سے (اگرچہ معنی نہ بدلیں) قرآن مجید کی حفاظت میں سستی پیدا ہوتی ہے۔

اور منجد ان کے وہ ہے جو معراج الدرایۃ میں ہے کہ قرآن مجید کو فارسی میں لکھنے سے نہایت سختی کے ساتھ منع کرنا چاہئے اور یہ کہ ایسا کرنے والا زندیق ہے (یعنی وہ ہے اس کے بعد اس کا قسم کا مفسر کا کافی اور فتح القدر سے نقل کیا ہے) (پھر فرمایا) اور شیخ الاسلام علامہ ابن حجر شافعی نے اپنے فتاویٰ میں ارشاد فرمایا ہے جب کہ ان سے سوال کیا گیا کہ کیا قرآن کریم کی کتابت عجمی (زبان یا رسم خط) میں حرام ہے جیسا کہ اُس کی تلاوت و قراءت عجمی زبان میں حرام ہے تو فرمایا کہ کتاب مجبوراً کا فیصلہ اس بارہ میں یہ ہے کہ اس کی حرمت پر اجماع ہے اور اس کی وجہ بھی بیان فرمائی ہیں اور اس سے پہلے ایک جگہ فرمایا ہے کہ امام زکریا فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کو منظر

و اما کتابۃ القرآن بالفارسیۃ
فقد نص علیہا فی غیر ما کتاب من
کتب ائمتنا الحنفیۃ المعتمدۃ منہا ما قال
مولف الہدایۃ الامام المرغینانی
فی کتابہ التجنیس والمزید ما لخصہ
و یمتد من کتابۃ القرآن بالفارسیۃ
بالاجماع لانہ یودی للاخلال بحفظ
القرآن لانا امرنا بحفظ النظم المعنی
فانہ دلالة علی المنیوۃ ولانہ ربما
یودی الی التہاون بامر القرآن۔

و منہا ما فی معراج الدرایۃ انہ ینع
من آیۃ المصحف بالفارسیۃ اشد
المتعوانۃ یون معتمداً زندقاً۔ ثم
ذکر مثلاً من الکافی وفتح القدر
للحق ابن الہمام (ثم قال) وقد افاد
شیخ الاسلام العلامة ابن حجر العسقلانی
الشافعی فی فتاویہ تحریر الکتابۃ و
قد مثل هل تحرم کتابۃ القرآن الکریم
بالجمیۃ کفرامہ فاجاب بقولہ قضیۃ
ما فی المجموع الاجماع علی التحریم و
ذکر التوجیہ لہ و قال فی محل اخر قبل

هذا ما لخصه قال الزركشي ويستطيع
 وجعله على كرمي وتقبيله ويحرم هذا
 الرجل الى شئ من القرآن او كتب
 العلم ويحرم ايضا كتابته بقلم غير
 العربي انتهى (ثم قال الحافظ ابن حجر)
 وفي كتابة القرآن العظيم بالجهمي تصرف
 في اللفظ المعجز الذي حصل المتحدى به
 بالميرود (الى قوله) لان الالفاظ العجمية
 فيها تقديم المضاف اليه على المضاف
 ونحو ذلك مما يحل بالنظم ويشوش
 الفهم وقد صرحوا بان الترتيب من
 مناط الاعجاز وهو ظاهر في حرمة
 تقديم آية على آية يعني او كلمة
 على كلمة كتقديم المضاف اليه على
 المضاف ونحوه مما يحرم ذلك قراوة
 فقد صرحوا بان الكتابة بعكس السور
 مكروهة وبعكس الآيات محرمة و
 فرقوا بان ترتيب السور على النظم
 المصحفي مظنون وترتيب الآيات
 قطعي. وزعم ان كتابته بالجهمية
 فيها سهولة للتعليم كذا بخالف
 لواقع والمشاهدة فلا يلتفت لذلك
 على انه لو سلم صدقه لم يكن صبيحا

دکھنا اور کسی اور چھبیز شکل رمل وغیرہ پر دکھنا اور اس کو پڑھنا
 دنیا مستحسن ہے اور قرآن کے کسی جزو کی طرف پاؤں پھیلانا
 یا علوم دین کی کتابوں کی طرف پاؤں پھیلانا حرام ہے نیز
 غیر عربی رسم خط میں اس کی کتابت کرنا بھی حرام ہے۔
 اس کے بعد فرمایا، اور قرآن عظیم کو کسی بھی رسم خط میں لکھنا اس
 کے الفاظ میں معنی کے ذریعہ تمام دنیا کے کفار کو چیلنج کیا گیا
 ہے ان میں غیر مشرک تفسیر کرتے کیونکہ کلمہ الجہمی الفاظ میں معنی
 مقدم ہوتا ہے مضاف الیہ پر اور اسی قسم کی دوسری چیزیں
 جو نظم قرآنی میں خلل اندازا دہتی سمجھے میں تشویش پیدا کرنے
 والی ہیں۔ اور علمائے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ قرآن
 کی موجودہ ترتیب حروف و کلمات اور ترتیب آیات
 بھی مارا جاتا ہے اور اس کا ہر یہ ہے کہ ایک آیت کو
 دوسری آیت پر بلکہ ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ پر (کتابتیں)
 مقدم کرنا حرام ہے جیسا کہ تلاوت میں یہ تقدیم و تاخیر حرام
 ہے۔ کیونکہ علمائے اس نے تصریح فرمائی ہے کہ کتابت
 قرآن، سورتوں کی ترتیب بدل کر کرنا مکروہ ہے۔ اور
 آیات کی ترتیب بدل کر کرنا حرام ہے اور وہ فرق یہ ہے
 کہ سورتوں کی (موجودہ) ترتیب جیسی مصحف امام میں
 ہے، اس کا من اللہ ہونا تو ظنی ہے لیکن آیات کی موجودہ
 ترتیب قطعی ہے۔ اور یہ گمان کرنا کہ کلمہ الجہمی زبان یا رسم خط
 میں تعلیم کی سہولت ہے تو یہ غلط اور مخالف واقع
 ہے اور خلاف مشاہدہ ہے اس کی طرف التفات نہ
 کیا جاوے۔ علاوہ ازیں اگر اس کا پرچ ہونا بھی تسلیم کریں

لاخراج الفاظ القرآن عما كتب

عليه واجمع عليه السلف والخلف -

جاو توتب بھی قرآن کے الفاظ کا ان کی اجمالی صورت اور قدیم
طرز کتابت سے نکالتا اس مصلحت کی وجہ سے جائز نہیں ہو سکتا

حافظ الدین شیح الاسلام علامہ ابن حجر رحمہ کی اس تقریر میں ان تمام شبہات کا بھی پورا جواب
ہے جو رسم خط یا زبان بدلنے والے حضرات پیش کرتے ہیں کہ اس میں عجیبوں کے لئے قرآن پڑھنے
میں سہولت ہے۔ حافظ نے واضح کر دیا کہ اول تو یہ سہولت کا خیال غلط ہے اور اگر صحیح بھی مان
لیا جائے تو اس سہولت کی خاطر قرآن کی تبدیل و تغیر جائز نہیں ہو سکتی۔

اور حنا بلہ کے مشہور فقیہ و امام ابن قدامہ کی کتاب مغنی کے حواشی میں اس کو اور بھی زیادہ
واضح کر دیا گیا ہے کہ جبکہ قرآن دنیا میں آیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دعوت
عجم کے سامنے پیش کی کہیں ایک واقعہ بھی اس کا مذکور نہیں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
عجمیوں کی وجہ سے اس کا ترجمہ کر کے بھیجا ہو یا عجمی رسم خط میں لکھوایا ہو۔ آں حضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے مکاتیب جو ملک عجم کسری و قیصر و مقوقس وغیرہ کی طرف بھیجے جن میں سے بعض کے
نوٹو بھی چھپ گئے ہیں اور آج تک محفوظ ہیں ان کو دیکھا جاسکتا ہے کہ نہ ان میں عجمی زبان
اختیار کی گئی ہے نہ عجمی رسم خط اختیار کیا گیا ہے (حواشی مذکورہ کے چند جملے یہ ہیں)۔

وهو انما نزل باللسان العربي

كما هو مصرح في الآيات المتعددة وانما كان

تبليغاً والدعوة الى الاسلام والانتداب

كما انزل الله تعالى لم يترجم النبي

صلى الله عليه وسلم ولا اذن بتلجته

ولم يفعل ذلك الصحابة ولا خلفاء

المسلمين وملوكهم وكتب النبي صلى

الله عليه وسلم كتبه الى قيسر وكسرى

ومقوقس بلغا تهم لصحرة التعليل الذي

علل به (مغنی مع الشرح الكبير ص ۳۱ ج ۱)

اور قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا جیسا کہ متعدد

آیات قرآن میں تصریح ہے اور اسی عربی زبان میں قرآن

کی تبلیغ اور دعوت و انداز عمل میں آیا نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم نے امت کو اس کا ترجمہ کر کے نہیں پہنچایا

اور نہ ترجمہ کر کے پہنچانے کی اجازت دی اور نہ حضرات

صحابہ نے ایسا کیا اور نہ خلفائے اسلام اور سلاطین

اسلام نے ایسا کیا اور اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطوط

قیصر و کسری اور مقوقس وغیرہ کو ان ہی کی زبانوں میں

لکھواتے تو یہ دلیل صحیح مانی جاسکتی تھی کہ عجم کو عجمی زبان میں

پہنچانا زیادہ مفید ہے۔

اور مصر کے شیخ القراء شیخ محمد بن علی حداد نے اپنے رسالہ خلاصۃ النصوص الجلیہ میں رسم خط مصحف عثمانی کے اتباع کو بارہ ہزار صحابہ کرام کے اجماع سے ثابت کیا ہے اور فرمایا ہے۔ اجمع المسلمون قاطبۃ علی وجوب اتباع رسم مصاحف عثمانی ومنع مخالفتہ (ثم قال) قال العلامة ابن عاشر ووجه وجوبہ ما تقدم من اجماع الصحابة علیہ دھو زہا عاشق عشر الفاء والاجماع حجتاً حسباً لتفرد فی اصول الفقہ (نصوص جلیہ) ۱۵

ایک شبہ کا ازالہ

اگر یہ کہا جائے کہ مصحف عثمانی کا رسم خط تو موجودہ مصاحف عربیہ میں بھی محفوظ نہیں کیونکہ بعد عثمانی میں عام طور پر خط کوفی رائج تھا اسی خط میں مصاحف عثمانیہ کی کتابت ہوئی یہ عربی خط جو آج کل نسخہ کے نام سے رائج ہے کوفی رسم خط سے بہت متفاوت ہے تو اس کا جواب اولیٰ تامل سے معلوم ہو سکتا ہے وہ یہ کہ کوفی خط اور خط نسخ یہ دونوں عربی ہی خط ہیں دونوں میں رسم خط کا کوئی تفاوت نہیں بلکہ ان کے تفاوت کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے اردو خط میں ایک تو رواں خطوط ہیں جو عام طور پر خط و کتابت اور فاتر میں مستعمل ہیں ایک اسی اردو خط کو خوش خط لکھا جاتا ہے جس کو نستعلیق کہتے ہیں ظاہر ہے کہ عام خط و کتابت کے رسم خط اور نستعلیق کے رسم خط میں کوئی فرق نہیں بلکہ جو صرف نستعلیق میں غلط سمجھا جاتا ہے وہ عام خط و کتابت میں غلط قرار دیا جاتا ہے۔ البتہ حروف کی ہیئت و نشست میں نستعلیق کا فرق ہے جس میں عام خط و کتابت میں بھی ہر شخص کی کتابت دوسرے سے ممتاز نظر آتی ہے ہر شخص کا خط علیحدہ پہچانا جاتا ہے تو جس طرح زید کا خط عمر کے خط سے متفاوت ہے مگر اس تفاوت سے رسم خط نہیں بدلتا یا عام خطوط نویسی اور نستعلیق کی کتابتیں متفاوت ہیں مگر دونوں کا رسم خط واحد ہے اسی طرح کوفی خط اور نسخ دونوں کے تفاوت کو سمجھنا چاہئے۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی کتاب فضائل القرآن میں کتابت قرآن کی تاریخ پر کلام کرتے ہوئے اس کو واضح فرما دیا ہے وہ فرماتے ہیں:-

قلت والذی کان یغلب علی زمان میں کہتا ہوں کہ سلف کے زمانہ میں عام عادت

السلف المكتابة المكتوفة ثم هذا
 بها على بن مقلة الوزير وصاحبها في
 ذلك فحجروا أسلوب ثم قدر بها على بن
 هلال الجعدي المعروف بابن الجواب
 وسلط الناس وراءه وطريقته في
 ذلك واضحة جيداً - (فضائل القرآن ص ۵۱)

کوئی رسم خط میں لکھنے کی تھی پھر علی بن مقلة نے اس کو
 کچھ خوبصورت بنا دیا اور اس میں ان کا ایک خاص طرز
 تحریر ہو گیا پھر علی بن ہلال نے اسی کو اور زیادہ دلچسپ
 کر دیا اور عام لوگ اسی طرز پر چل پڑے اور ان کا
 یہ طرز واضح اور عمدہ ہے۔

(فضائل القرآن لابن کثیر ص ۱۵ طبع مصر)

اور علامہ احمد حسن زیات مصری نے اپنی کتاب تاریخ الادب العربی میں اقسام کتابت کی
 پوری تاریخ بیان کی ہے جس میں بتلایا ہے کہ دنیا میں خط و کتابت کی اصل فیثقی خط ہے جس
 سے سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں مختلف قسم کے خط نبطی اور عراق میں خط سریانی پیدا
 ہوئے اور یہی دونوں خط عربی خط کی اصل ہیں۔ خط نبطی سے شکل نسعی پیدا ہوئی اور خط سریانی
 سے شکل کوفی پیدا ہوئی جو اسلام سے پہلے خط حیری کے نام سے مشہور ہے عرب شمال نے عموماً
 خط نسعی استعمال کیا کیوں کہ ان کی آمد و رفت شام میں زیادہ رہی اور عرب جنوب نے انہارے
 خط کوفی اخذ کیا (تاریخ الادب العربی للزیات ص ۶۶)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ خط کوفی اور نسعی دونوں عربی رسم خط ہی کی دو قسمیں ہیں جیسے اردو
 رسم خط میں نستعلیق اور شکستہ دو قسمیں معروف ہیں جس طرح نستعلیق کو بدل کر شکستہ یا شکستہ
 سے نستعلیق کر دینا عرف میں رسم خط بدلنا نہیں سمجھا جاتا اسی طرح خط کوفی کے بجائے نسعی یا
 نسعی کے بجائے کوفی کے استعمال کو سمجھنا چاہیے کہ وہ رسم خط کی تغیر نہیں بخلاف انگریزی،
 ہندی، گجراتی، ٹامل وغیرہ رسم خط کے کہ اس میں بدیہی طور پر رسم خط کی تغیر ہے جس میں حروف
 کی تقدیم تاخیر یا کمی بیشی وغیرہ بھی نہ ہو جب بھی حسب تحریر مذکورہ ممنوع و ناجائز ہے اور جبکہ
 ان میں حروف و کلمات میں بھی کچھ تصرف و تغیر ہو تو وہ کھلی ہوئی تحریف اور باجماع اُمت حرام
 ہے۔

اور جہاں تک تحقیق سے معلوم ہوا ان سب محلی زبانوں میں بہت سے وہ حروف بالکل نہیں

ہیں جو عربی زبان اور قرآن میں موجود ہیں مثلاً (ذذ - ظ - ص) انگریزی، ہندی، ٹامل، گجراتی

زبانوں میں ان حروف کے لئے علیحدہ علیحدہ کوئی صورت تجویز نہیں کی گئی بلکہ سب کو ایک ہی نقش سے ادا کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان حروف کے فرق سے معانی بہت بدل جاتے ہیں اس لئے ان زبانوں میں قرآن مجید لکھنا کھلی ہوئی تحریف ہے۔

نیز انگریزی اور ٹامل زبانوں میں تو ایک دوسری تحریف بھی ہے کہ اس میں اعراب و حرکات کو شکل حروف درمیان کلمات لکھا جاتا ہے جس میں حروف کی زیادتی قرآن میں ہوتی ہے جو قطعاً حرام ہے ہذا اول اللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

اس تفصیل کے بعد اصل سوالات کے جوابات بتدریب نمبرات لکھے جاتے ہیں۔
(۱ و ۲) یہ قرآن مجید اگر اس طرح طبع کیا جاوے کہ ایک صفحہ میں قرآن مجید کا متن عربی مگر رسم خط ٹامل میں لکھا جاوے اور دوسرے صفحہ میں ٹامل زبان کا ترجمہ لکھا جاوے تو یہ باجماع اہمیت حرام و ناجائز ہے اور تحریف قرآن کے حکم میں ہے بوجہ ذیل:
(الف) اس لئے کہ ایسا کرنا مصحف عثمانی کے رسم خط کی تغیر و تبدیل ہے جو باجماع حرام ہے جیسا کہ مفصل مع شواہد کے گذر چکا ہے۔

(ب) ٹامل زبان میں بہت سے ایسے حروف موجود نہیں جو قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں مثلاً (ذ - ذ - ص - ظ) ان سب حروف کو (جہاں تک احقر کو معلوم ہوا) ٹامل زبان میں ایک ہی نقش سے ادا کیا جاتا ہے حالانکہ ان حروف کے بدلنے سے معانی بدل جاتے ہیں اس لئے ایسا کرنا قرآن مجید کی کھلی ہوئی تحریف ہے۔

(ج) اگر ٹامل رسم خط میں انگریزی کی طرح حرکات زیر و زبر کو شکل حروف لکھا جاتا ہے تو یہ ایک دوسری تحریف قرآن ہے کہ حروف کی زیادتی قرآن کے ہر کلمہ میں کی جائے گی۔

(د) اس وجہ سے بھی اس طرح قرآن کی کتابت و اشاعت مکروہ و مذموم ہے کہ اس میں قرآن کو ترجمہ کا تابع بنا دیا گیا ہے جو قلب موصوع اور خلاف ادب ہے۔

(ه) ایک وجہ اس طرز کے عدم جواز کی یہ بھی ہے کہ اس میں تشبیہ ہے کفارِ عجم کے ساتھ جن کا یہ مخصوص رسم خط ہے۔

(و) ایک وجہ یہ بھی کہ اہمیت کی ہے کہ بائیں جانب سے شروع کرنا علاوہ تشبیہ بالکفار

کے خود بھی خلاف سنت اور خلاف ادب ہے۔

اور اگر قرآن مجید کا صفحہ عربی رسم الخط ہی میں رہے اور اُس کے مقابل صفحہ میں یا دوسرے کالم میں ترجمہ شامل لکھا جاوے تو اس میں اگرچہ تحریف نہیں مگر آخر الذکر تین وجہ عدم جواز کی اس صورت میں بھی موجود ہیں اس لئے یہ بھی ناجائز ہے۔

(۳) بالکل غلط ہے اول تو کسی مستند اور معتبر عالم نے ایسا کیا نہیں اور کہیں کیا گیا تو دوسرے علماء نے بھی اُس پر فوراً نکیر کیا ہے۔ حضرت مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے ۱۳۲۲ھ میں اس پر ایک مفصل فتویٰ تحریر فرمایا ہے جو امداد الفتاویٰ کے حصہ حوادث الفتاویٰ حصہ دوم ص ۱۹۶ میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ نیز حضرت ممدوح کا دوسرا فتویٰ ۱۳۲۵ھ میں شائع ہوا جس میں قرآن مجید ایک کالم میں اور اُس کا ترجمہ دوسرے کالم میں لکھنے کی ممانعت مذکور ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

سوال

قرآن شریف جس کے ایک ہی صفحہ میں کلام پاک عربی تحریر میں ہو اور اُس کے ترجمہ انگریزی اُردو یا صرف انگریزی ترجمہ اور انگریزی میں تفسیر ہو رکھنا اور پڑھنا اور پچھا پنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

اس طرز میں تشبہ ہے غیر اہل اسلام کے ساتھ کیونکہ یہ انہیں کا ایجاد اور انہیں میں شائع ہے اور اہل اسلام میں اس کا ایسا شیوع نہیں ہوا کہ غیر اہل اسلام کے ساتھ اس میں معنی اختصاص کے نہ رہے ہوں اس لئے منع کیا جاوے گا۔ دوسرے اس ہیئت میں صورت معارضہ و تقابیل و موازنہ کی ہے، چنانچہ جن مضامین میں تقابیل و توازن دکھلایا جاتا ہے وہ اسی ہیئت میں لکھے جاتے ہیں اور یہ امر مشاہد ہے اور معارضہ قرآن کا جیسا مذموم ہے اُس کی صورت موہوم بھی مذموم ہے باقی ان جزاء یعنی ترجمہ و تفسیر کا جمع کرنا اس ہیئت میں بھی ہو سکتا ہے۔

(تقابل و توازن اگلے صفحہ میں دیا گیا ہے)

قرآن شریف
ترجمہ
تفسیر

(منقول از پوراہ النواہر ص ۳۲۷)

نیز ۱۳۵۹ھ میں جب جمعیت تبلیغ الاسلام صوبہ متحدہ ناظر باغ کانپور سے قرآن مجید کو ہندی رسم خط میں شائع کرنے کی تجویز ہوئی تو علماء نے مخالفت کی۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی اس وقت استفتاء اس کے بارہ میں آیا۔ اس وقت احقر دارالعلوم کی خدمت فتویٰ انجام دیتا تھا۔ اس سوال کی اہمیت کے خیال سے احقر نے اس کو دارالعلوم کی مجلس علمی کے مشورہ میں رکھا مجلس علمی کے صدر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے اپنے قلم سے اس پر مضمون ذیل تحریر فرمایا:-

”ہندی رسم الخط میں بہت سے وہ حروف نہیں ہیں جو کہ عربی زبان اور قرآن میں پائے جاتے ہیں اور اسی لئے ہندی میں ان کے لئے کوئی صورت تجویز نہیں کی گئی ہے مثلاً (ذ ز ظ ض) کو ایک ہی نقش سے ادا کیا جاتا ہے حالانکہ ان حروف کے فرق سے معانی بدل جاتے ہیں اس لئے قرآن مجید کو رسم الخط ہندی میں لکھنا تحریر ہوگا جو قطعاً حرام اور ناجائز ہے۔“

۱۳ شعبان ۱۳۵۹ھ

یہ فتویٰ پوری مجلس علمی کے اتفاق سے لکھا گیا جس میں حضرات ذیل شریک تھے:-

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب صدر مدرس دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب محدث دارالعلوم

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی شیخ الحدیث والتفسیر صدر مہتمم دارالعلوم

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم

حضرت مولانا اعجاز علی صاحب مدرس دارالعلوم

مذکورہ صدر فتویٰ مسئلہ زیر بحث یعنی ٹامل زبان میں قرآن مجید لکھنے پر بھی حاوی ہے کما لایحییٰ!

تنبیہ: اب ٹامل زبان کے ترجمہ کی جائز صورت صرف وہی ہے جو عام تراجم

کے لئے معروف اور رائج ہے کہ قرآن عربی میں عربی رسم خط سے لکھا جاوے اس کا ترجمہ ٹال زبان کا ہر ہر سطر کے نیچے لکھا جاوے۔ واللہ اعلم۔

دین دار متبع سنت مسلمان کے لئے یہ بیان کافی سے زائد ہے۔ حق تعالیٰ مسلمانوں کو اتباع سلف صالحین کی توفیق اور ہمت عطا فرمائیں اور محدثات امور اور فتن سے محفوظ رکھیں آمین۔
واللہ سبحانہ و تعالیٰ الہادی للصواب والیہا المرجع والمآب۔

کتبہ الاحقر محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دیوبند

فی یوم الاثنين خامس شھر المحرم الحرام ۱۳۶۳ھ

تصدیقات علماء

دارالعلوم دیوبند و مدرسہ ستریا قیات صالحات و دیوبند علماء مدرسہ انبیا رومی وغیرہ

اصاب الجیب العلم و اجاد قللہ دتہ

مسعود احمد رضا اللہ عنہ

دیوبند

هذا الجواب حق و الحق بالاتباع حقیق

سید احمد علی سعید

نائب مفتی دارالعلوم

دیوبند

الجواب صحیح

بشیر احمد غفرلہ

مدرس دارالعلوم دیوبند

الجواب صواب

محمد ادریس الکاظم حلوی

مدرس دارالعلوم دیوبند

الجواب

قرآن شریف کی بابت چند امور کی رعایت نہایت ضروری ہے۔

(۱) خلاف تعظیم کلام اللہ کوئی کام نہ کرنا چاہیے۔ ایسا کرنا منع ہے و مستحب تطیب

المصحف و جعل علی کرسی و محرم تو سہ لان فیہ اذلالا و امتہانا۔ اتقان ج ۲ ص ۱۷۲۔

(۲) رسم مصحف عثمانی کے خلاف تحریر نہ ہو۔ خلاف کرنا قطعاً ناجائز ہے۔ قال ائٹھب

مثل مالک بل یتب المصحف علی ما حدثہ الناس من الہجاء فقال لا الاعلی الکتبۃ الا ولی رواہ الدانی

فی المقتضب۔ ثم قال۔ ولا مخالفت لہ من علماء الامۃ و قال فی موضع آخر۔ مثل مالک عن الحروف

فی القرآن مثل الواو والالف اترئی ان یغیر من المصحف اذا وجد فیہ کذلک قال لا قال ابو عمر یعنی

الواو والالف المزیدین فی الرسم المعدومتین فی اللفظ نحو او لو او قال الامام احمد یحرم مخالفتہ

خط مصحف عثمانی الخ و قال البیهقی فی شعب الایمان من یتب مصحفاً یعنی ان یحافظ علی الہجاء

الذی یتبوا بہ ملک المصاحف ولا یخالفہم فیہ ولا یغیر ما کتبہ شیئاً فانہم كانوا اکثر علماء و اصدق

قلبا ولساناً و اعظم امانۃ منا فلا ینبغی ان نطن بانفسنا استدراکا علیہم قلت وینحصر امر الہم فی ستۃ قواعد الخ اتقان ص ۱۶۷۔

(۳) بلا ضرورت۔ متعارف امر میں کسی قسم کا تغیر نہ کرنا چاہیے البتہ بضرورت جواز ہے متقدمین سے قرآن شریف باریک قلم سے لکھنے کی ممانعت ثابت ہے مگر اس زمانہ میں بلا تکثیر جائز ہے اسکا طرح بعض صحابہ و تابعین سے قرآن شریف میں نقطے فواتح خواتم اعشار اسماء سورہ وغیرہ لکھنے کی کراہت و ممانعت ثابت ہے لیکن بوجہ ضرورت متاخرین کے نزدیک جائز ہے بلکہ بعض کے نزدیک مستحب کذا فی الاتقان۔ بچوں کی ضرورت کی وجہ سے پارہ علم خلاف مصحف عثمانی بلا تکثیر طبع ہوتا ہے۔ مصحف عثمانی میں ابتداء سورہ نہا سے ہے اور بچوں کے واسطے سورہ الحمد والناس سے ابتداء ہے لہذا بضرورت ترجمہ مع کلام اللہ کسی زبان میں طبع کرنا اور قرآن شریف کو رسم خط عربی میں لکھنا جائز ہے۔

(۴) جب کہ قرآن شریف کی رعایت رکھ کر ترجمہ بائیں جانب سے ہو سکتا ہے، اور اس کے صفحات سیدھے رکھے جاسکتے ہیں بلا ضرورت اس طریقہ سے لکھنا کہ صفحات بائیں جانب سے اٹھے جائیں حوالجات بالاسے ممانعت معلوم ہوتی ہے اس لئے اس طریقہ کو ترک کیا جائے۔

(۵) کتابیں و تفاسیر کا حکم تحریر قرآن شریف سے ملحدہ ہے اس پر اس کا قیاس کرنا جائز نہیں باوجود رعایت ہو سکنے مصحف عثمانی کے اس کا خلاف جن لوگوں نے کیا ہے اگر وہ اسی عالم تھے ان سے اجتہادی غلطی ہو گئی ہے جو شخص اس غلطی کا احساس کرتا ہے اور منع کرتا ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ عالم نہیں کھلی جہالت ہے۔ قرآن مجید کی وضع عثمانی یہی تھی جو کہ اب ہے قال فی الاتقان ص ۶۳ ج ۱۔ وقال ایضاً الذی نذہب الیہ ان جمیع القرآن الذی انزلہ اللہ و امر بالثبات رسمہ ولم ینسخہ ولا رفع تلاوتہ بعد نزولہ ہو الذی بین الدفتین الذی حواہ مصحف عثمان۔

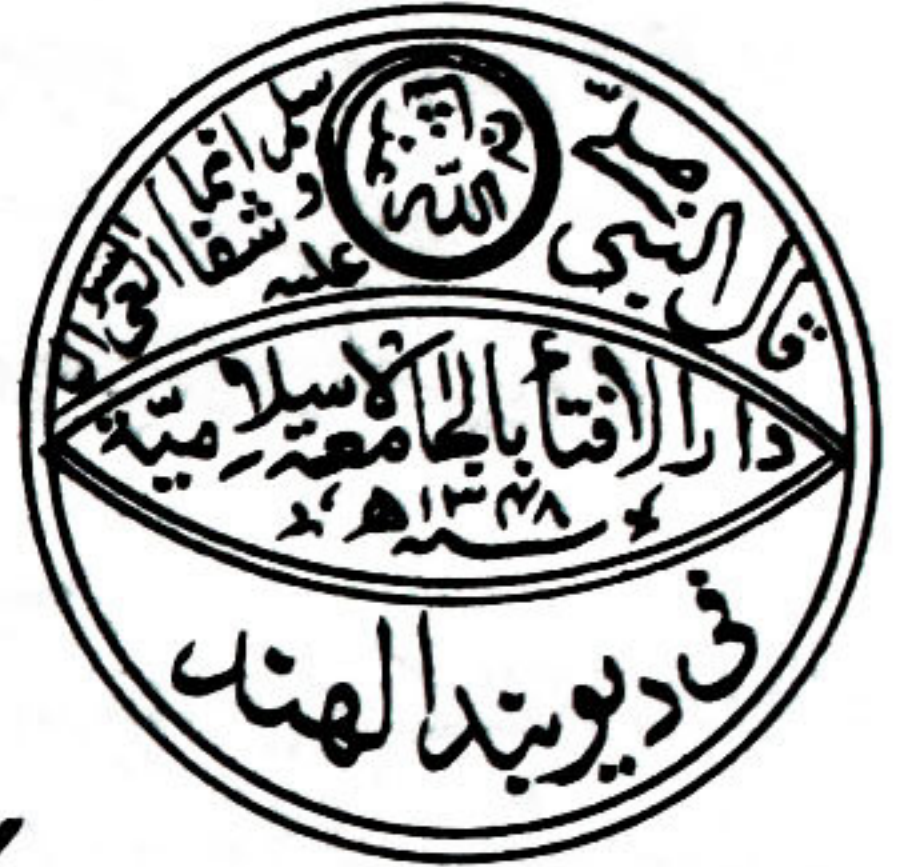
البتہ مصحف عثمانی میں ابتداء میں اسماء سورہ۔ نقاط زیروزہ برپیش اور تینوں کے موجودہ طریق پر نشانات نہ تھے بضرورت بعد میں لکھے گئے اور بلا تکثیر جائز سمجھے گئے۔

باراہ المسلمون حسنا فهو عند الله حسن۔

فاروق احمد مفتی دارالعلوم

دیوبند

۲۴/۳/۲۰۲۰ھ



الجواب

حامد اللہ ومصليا و مسلما علی رسولہ وآلہ وصحبہ۔ در صدق تصور

مستفتی قرآن شریف میں مصحف عثمانیہ کے موافق جو ترتیب

ہے اسی ترتیب سے پیر ہی جانب سے لکھنا چاہئے اسی پر آج تک تعامل و اجماع اُمت ہے اس کے برعکس یعنی بائیں جانب سے لکھنا ناجائز ہے لیکن اطفال کی تعلیم کے لئے صرف ایک جزوہ اخیر سے جو چڑھایا جاتا ہے جائز ہے ریاض القرار وغیرہ علامہ شیخ جلال الدین سیوطی نے اتفاق میں لکھا ہے و ان ترتیب و نظم ثابت علی ما نظمہ اللہ تعالیٰ ورتبہ علیہ رسولہ من آمی السورہ لم یقدم من ذلک مؤخر ولا اخیر منہ مقدم انتہی ص ۸۸ جدی مولانا العلامة والحبر القہامۃ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ نے نثر المرجان فی رسم نظم القرآن میں لکھا ہے للہ یجوز مخالفتہ المصاحف العثمانیہ فی الکتابۃ۔ واللہ اعلم۔

مرقوم ۲۴ ماہ محرم ۱۳۶۳ھ
کتبہ

محمد حبیب اللہ کان اللہ
(سرقاضی مدراس)

اصاب من اجاب

خادم الطلبة محمد قاسم عفا اللہ عنہ العام مدرس مدرسہ فیاض العلوم

اصاب فیما اجاب واللہ اعلم
حافظ محمد اسمعیل عفی عنہ



الجبیب مصیب

فان الکتابۃ بخلاف المصاحف العثمانیہ

بدعت مذمومہ و فعل شنیع باتفاق الامة

محمد عفی عنہ عفا عنہ العفی (معدنی)

الجواب صحیح

خادم العلماء محمد علی معدنی

صفحہ الجواب

عبد العزیز شریف عفی عنہ

الجواب صحیح

عزیز الدین احمد عفی عنہ

المجیب صیب

عبدالرزاق - باقری

الجواب صحیح

محمد حسن عفا عنہ الحسن باقری

الجواب

ہوالمصوّب چونکہ قرآن شریف اہل اسلام کے لئے خصوصاً اور ہر ذوق عقل سلیم کے لئے عموماً ہادی الی الطریق
المستقیم ہونا مسلم و متیقن الامر ہونے کے باوجود اس کی زبان عربی ہونے سے عمی مسلمانان اس
کے مطالب و احکام کے سمجھنے میں قاصر رہے اس لئے اردو فارسی زبانوں میں جن کی تحریر و کتابت
مثل عربی کے سیدھے جانب سے ہی ہوتی ہے قرآن شریف کے ترجمہ کو علماء کرام جائزہ مگر مستحسن
سمجھ کر ترجمے کئے۔ اسی عذر سے بحر ثمال کے اردو فارسی نہیں جاننے والے مسلمانوں کی
تفہیم کے لئے قرآن مجید کا ترجمہ ثمال زبان میں گو اس کی کتابت یہاں سے ہوتی ہے جائز ہوگا
لاکن جب اصل اور مقصود بالذات فہم کلام الہی ہی ہے اور ترجمہ مقصود بالغیر و تابع ہے اس لئے
ترجمہ حامل متن رہے اور ترتیب آیات و اجزاء و سور میں اور کتابت کے رسم الخط میں مصحف
امام و مولف و جامع القرآن حضرت سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سر موخلاف
نہ رہے بدستور ترجمہ کی طباعت بطحاظ متبوع میں سے ہی شروع کر کر یہاں میں ختم کرنا چاہئے
تامراتب اصل و فرع و متبوع و تابع بحال رہے اور اہمیت و عظمت شان قرآن مجید میں
کمی کا وہم و گمان تک نہ پیدا ہوا۔ فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ کتبہ

شیخ آدم عفی عنہ

الجواب صحیح

مدرس - مدرسہ باقیات صالحات ویلور

عبدالرحیم کان اللہ تعالیٰ لہ مدرس المدرسہ

الجواب صواب

محمد عبدالصمد علمی عفی عنہ

الجواب صحیح والمجیب صحیح و قدورہ

اصاب من اجاب

محمد ابراہیم عفا اللہ عنہ

محمد اسماعیل الباقوی

مدرسہ معدن العلوم و انہاری

صیانت القرآن
تغییر الرسم واللّسان

کیا قرآن مجید کا صرف ترجمہ

شائع کیا جاسکتا ہے؟

مقامِ تالیف — دیوبند
 تاریخ تالیف — محرم ۱۳۶۳ھ
 اشاعتِ اول — حافظ حسن الدین لال دین
 خزانہ گیٹ - امرتسر

”کچھ لوگوں نے قرآن کریم کا صرف ترجمہ بغیر
 متن کے چھاپنا چاہا تھا اس کے متعلق ایک
 سوال کے جواب میں یہ مقالہ تحریر کیا گیا جس میں
 مسئلہ کی حقیقت ائمہ اربعہ کے مذاہب کے مطابق
 بیان کی گئی ہے۔“

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَرٌ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّتٰی نَا اَصْطَفٰی

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قرآن شریف کا فقط ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے شائع کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو کیا صرف ترجمہ چھاپنے والا ہی مجرم ہے یا دوسرے خرید و فروخت کرنے والے بھی، حال میں پنجاب میں ایک ترجمہ ایسا چھاپا جیسے انجیل وغیرہ کا صرف ترجمہ چھاپا ہوا ہے۔

الجواب

قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے جیسا کہ روایات ذیل میں اس کا ناجائز و حرام ہونا مذاہب اربعہ سے ثابت ہے اور جب کہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید و فروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی، اس لئے اس کا فروخت کرنا اور خریدنے والا بھی گناہ گار ہوگا۔ اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا۔ اور جتنے مسلمان اس کی خرید و فروخت کی وجہ سے گناہ گار ہوں گے وہ اس کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جاوے گا۔ لقولہ تعالیٰ:

وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا

روایات جن سے حکم مذکور ثابت ہے حسب ذیل ہیں۔

علامہ حسن شرنبلالی صاحب نور الایضاح جو دسویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ اور مفتی صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ ان کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر جس کا نام النقحة القداسیہ فی احکام قراءة القرآن و کتابتہ بالفارسیۃ ہے اس

میں مذاہب اربعہ سے اس کی حرمت اور سخت ممانعت ثابت کی ہے کہ قرآن مجید کو کسی عجمی زبان میں محض ترجمہ بلا نظم قرآنی عربی کے لکھا جاوے جس کی بجا رت یہ ہے۔

واما کتابۃ القرآن بالفارسیۃ
فقد نص علیہا فی غیر ما کتاب
من کتب ائمتنا الحنفیۃ المعتمداۃ
میں اس کے متعلق تصریح ہے۔

(۱) ہدایہ کے مصنف امام اہل اسلام کے شیخ المشائخ حجتہ اللہ علیہ الخلق برمان الدین علی بن ابی بکر مرغینانی کبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب التجنیس والمزید میں یہ الفاظ لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کو فارسی میں لکھنا بالاجماع ممنوع ہے کیونکہ یہ قرآن شریف کے حفظ کرنے میں خلل انداز ہے اور ہم لوگ قرآن شریف کے الفاظ معنی دونوں کی حفاظت کے مامور ہیں کیونکہ یہ نبوت کا معجزہ ہے۔ دوسرے یہ بات تلمذات کے باب میں لوگوں کو سُست کرتی ہے۔

(۲) معراج الدر ایہ میں ہے کہ فارسی میں سترآن شریف لکھنا سخت ترین ممنوع ہے اور قصداً ایسا کرنے والا زندیق ہے اور باقی مضمون ہم آگے لکھیں گے۔

‡ ‡ ‡

‡ ‡

(۳) کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی میں قرآن شریف لکھنے کا ارادہ کرے تو روک دیا جائے گا۔

منہا ما قالہ مولف الہدایہ
الامام الاجل شیخ مشائخ الاسلام
حجتہ اللہ تعالیٰ علی الانام برهان
السدین ابو الحسن علی بن ابی
بکر المرغینانی الکبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ
فی کتابہ التجنیس والمزید ما
نصہ ویمنع من کتابۃ القرآن
بالفارسیۃ بالاجماع لانہ یودی
للاخلال بحفظ القرآن لانا امرنا
بحفظ النظم والمعنی فانہ دلالتہ
علی النبوة ولانہ ربما یودی الی
التہاون بامر القرآن۔ انتہی۔

ومنها ما فی معراج الدر ایۃ
انہ یمنع من کتاب المصحف بالفارسیۃ
اشد المنع وانہ یکون معتدلاً
زندیقاً وسند کرہ تمامہ۔

ومنها ما فی الکافی انہ لو اراد
ان یکتب مصحفاً بالفارسیۃ یمنع

(۴) ہدایہ کی شرح کمال بن ہمام کی تصنیف
فسخ القدر اور کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی
میں تلاوت کی عادت کرے یا فارسی میں لکھنے کا
قصد کرے تو اس کو روک دیا جائے، ہاں اگر
ایک دو آیت کرے تو نہ روکا جائے۔ لیکن اگر
الفاظ قرآن شریف بھی لکھے اور ہر حرف
کا ترجمہ و تفسیر لکھے تو جائز ہے۔

ومنها ما قال في شرح الهداية
فسخ القدير للمحقق الكمال ابن
همام رحمه الله وفي الكافي ان
اعتاد القراءة بالفارسية او اراد
ان يكتب مصحفا بها يمنع فان فعل
آية او آيتين لا فان كتب القرائن
وتفسير كل حرف وترجمته
جاز۔ ۱۵

علامہ محقق ابن ہمام کی عبارت سے اس تفصیل کی بھی تصریح ہو گئی کہ فارسی (یا کسی
اور عجمی) زبان میں قرآن کا محض ترجمہ لکھنا جو ممنوع ہے ایک دو آیت کا ترجمہ لکھنا اس
میں داخل نہیں بلکہ پورا قرآن یا اس کا کوئی معتد بہ حصہ اس طرح لکھنا حرام ہے، نیز یہ کہ
اگر اصل عبارت عربی کے نیچے یا حاشیہ وغیرہ پر ترجمہ اور تفسیر لکھی جاوے تو وہ بھی
ممنوع نہیں۔

پھر عبارات مذکورہ میں چونکہ بطور مثال فارسی زبان کا ذکر تھا جس سے یہ شبہ ہو
سکتا تھا کہ یہ ممانعت ممکن ہے کہ کسی وجہ سے فارسی زبان کے ساتھ مخصوص ہو اس لئے
علامہ شرنبلالی نے روایات مذکورہ بالانقل کرنے کے بعد فرمایا :-

قرآن شریف کو فارسی میں لکھنے کی ممانعت
پر اجماع کو تو ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اب یہ ہے کہ
فارسی کی تصریح اس لئے کی گئی ہے تاکہ دوسری
زبانوں میں ممنوع ہو تا بدرجہ اولیٰ ثابت ہو
جائے کیونکہ کوئی اور زبان فارسی سے فصیح نہیں
ہے یعنی عربی کی طرح جنت میں فارسی بھی بولا کریں
گے جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قد منا حكاية الاجماع على منع
كتابة القرآن العظيم بالفارسية و
انه اتمانص على الفارسية لانفاة
المنع بغيرها بالطريق الاوولى لان
غيرها ليس مثلها في الفصاحة و
لذا كانت في الجنة مما يتكلم به
كالعربية كما تقدم من النسخة القدسية

اور در مختار میں ہے۔

و تجوز كتابة اية او ايتين
بالفارسية لا اعثر (قال الشافعي)
والظاهر ان الفارسية غير
قيد۔

رشامی ص ۲۵۳ ج ۱)

اور کفایہ شرح ہدایہ میں ہے۔

قال الامام المحبوبي اما لو
اعتاد قراءة القرآن او كتابة المصحف
بالفارسية يمتنع منه اشد المنع
حتى ان واحدا من اهل الاهواء
في زمان الشيخ الامام الجليل ابي
بكر محمد بن الفضل كتب فتوى و
بعث اليه ان الصبيان في زماننا
ليشقى عليهم التعلم باللغة العربية
هل يجوز لنا ان نعلمهم بالفارسية
فقال للمستفتي ارجع حتى
نتامل ثم استجب من حاله فاذا
هو كان معروفا بقسا دمذبه
فاعطى لواحد من خدامه سكيناً فقال
اقتل بهذا ومن اخذك به فقل ان فلانا
امرني به ففعل فجاء الشوطى اليه وقال

قرآن مجید کی ایک دعائیت کی کتابت تو فارسی
زبان میں جائز ہے اس سے زیادہ جائز نہیں
علامہ شافعی اس پر لکھتے ہیں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اس
میں فارسی زبان کی کوئی قید نہیں بلکہ مطلقاً عربی زبان
مراد ہے فارسی ہندوستانی، اردو وغیرہ)

امام محبوبی نے بیان کیا ہے کہ اگر فارسی
میں ستر آں شریف کی تلاوت یا کتابت کی
عادت کر لیں تو اس کو شدت سے منع کیا جائے
گا یہاں تک کہ اہل بدعت میں سے ایک شخص
نے شیخ امام محمد بن فضل رحمہ کے زمانہ میں ایک
فتویٰ لکھا اور اس کو شیخ کے پاس بھیجا کہ ہمارے
زمانہ میں بچوں کو عربی میں قرآن پڑھنا شاق ہے
تو کیا ہمارے لئے جائز ہے کہ ہم ان کو فارسی
میں پڑھا دیا کریں۔ آپ نے سائل کو فرمایا پھر آتا
ذرا غور کر لیں، اور اس شخص کے حال کی تحقیق فرمائی
تو وہ فراد مذہب میں مشہور تھا۔ آپ نے اپنے
ایک خادم کو پھرا دیا اور فرمایا کہ اس شخص کو اس
سے قتل کر دو اور اگر تجھ کو کوئی پڑھے
تو کہ دینا کہ فلاں شخص نے مجھے اس کا حکم
کیا تھا اس نے ایسا کر لیا تو سپاہی ان کے

مع هكذا في الاصل و لعل المصواب ثم استخبر - محمد شفيح

پاس آیا اور کہا کہ امیر المؤمنین نے بلایا ہے
شیخ گئے اور سارا قصہ بیان کیا اور فرمایا
کہ یہ شخص اللہ کی کتاب کو گم کر دینا چاہتا تھا۔
امیر نے آپ کو خلعت ادا کیا اور نیک صلہ دیا۔
شیخ محمد بن فضل فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص عمداً
ایسا کرتا ہے وہ لذتی ہے یا مجنون۔ اگر مجنون
ہے تو اس کا علاج کیا جائے اور لذتی
ہے تو قتل کر دیا جائے۔

ان الامیر یدعون فذہب الشیخ
الیہ فقص القصة وقال ان هذا
کان یرید ان یبطل کتاب اللہ
فلحق له الامیر وجازاه بالخیر
رثم قال) وكان الشیخ ابو بکر محمد
ابن الفضل یقول اما من تعد
ذلت یكون زنديقا ومجنونا فالجنون
یداوی والزندیق یقتل۔

(نامش فتح القدر ص ۲۳۹ ج ۱)

یہاں تک یہ سب روایات ائمہ حنفیہ اور معتبر کتب حنفیہ کی تھیں اس کے بعد امام
شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے مذاہب کی روایات حسب ذیل ہیں۔

اور ائمہ شافعیہ کے نزدیک کیا حکم ہے تو ہم
نے پہلے امام زرکشی سے جواز کا احتمال اوردیہ
نقل کر ہی دیا ہے کہ حق کے قریب یہی ہے کہ
فارسی میں قرآن شریف لکھنے کی ایسی ممانعت ہے
جیسے کہ غیر عربی زبان میں تلاوت حرام ہے۔

اما عند الائمة الشافعية
فقد قدمنا عن الامام الزركشي
رحمه الله احتمال الجواز وان
الاقرب المنع من كتابة القرآن
بالفارسية كما تحرم قراءته
بغير لسان العرب اهـ

شیخ الاسلام علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی رح
نے اپنے سنتوی میں ایسے لکھنے کے حرام ہونے کو
بیان فرمایا ہے۔ آپ سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا
تلاوت کی طرح غیر عربی زبان میں قرآن شریف
کا لکھنا بھی حرام ہے تو جواب دیا کہ اس
کل کا فیصلہ یہ ہے کہ حرام ہونے پر اجماع ہے

وقد افاد شيخ الاسلام
العلامة بن حجر العسقلاني الشافعي
في فتاواه تحريم الكتابة وقد
سئل هل تحرم كتابة القرآن الكريم
بالعجمية كقراءته فاجاب بقوله
قضية ما في المجموع الاجماع على

اور پھر اس کے دلائل بیان فرمائے ہیں اور اس سے پہلے ایک مقام پر لکھا ہے کہ زرکشی نے فرمایا ہے کہ قرآن شریف کو خوشبو لگانا، اور رعل وغیرہ پر رکھنا اور بوسہ دینا تو سنت ہے اور قرآن شریف کے کسی جزو اور علم دین کی کتابوں کی طرف پاؤں پھیلانا حرام ہے نیز غیر عربی قلم میں لکھنا بھی حرام ہے مگر اس میں کچھ کلام ہے جس کو میں نے شرح عباب میں بیان کیا ہے۔ اور جواب میں یہ بھی کہا ہے کہ قرآن شریف کو عجمی زبان میں لکھنا ان الفاظ کو جو خود معجزہ ہیں اور ان سے مقابلہ کا حلیغ ہے ایسے لفظوں سے متغیر کرنا ہے جو وارد نہیں ہوئے بلکہ بسا اوقات ان سے معجزہ نہ ہونے کا وہم ہونے لگتا ہے کیونکہ غیر عربی لفظوں میں مضاف الیہ مضاف پر مقدم ہوتا ہے۔ اہل ایسی ایسی باتیں ہوتی ہیں جو کلام کی ترتیب کو مختل اور ذہن میں تشویش پیدا کرتی ہیں اور علمائے اس کی تصریح کی ہے کہ ترتیب اہل اجماع ہے اور ان کی یہ تصریح ایک آیت کے دوسری آیت پر یا ایک کلمہ کے دوسرے کلمہ پر جیسے مضاف الیہ کو مضاف پر یا اسی طرح اور کے مقدم کرنے کے حرام ہونے میں بالکل ایسے ہی ظاہر ہے جیسے یہ سب باتیں تلاوت میں بھی

التحریم و ذکر التوجیہ له وقال فی محل آخر قبل هذا ما نصه قال الزرکشی و لیسق تطیبہ وجعلہ علی کرسی و تقبیلہ و یحرم مدُّ الرجل الی شیء من القرآن او کتب العلم و یحرم ایضا کتابة بقلم غیر العربی انتہی و فیہ کلام یتنتہ فی شرح العباب وقال من جملة جوابہ الاول ما نصه و فی کتابة القرآن العظیم یا لعجمی تصرف فی اللفظ المعجز الذی حصل التحدیث بہ بما لم یر و بل ربما یوہم عدم الاعجاز بل الرکاکة لان الالفاظ العجمیة فیہا تقدیم المضاف الیہ علی المضاف و نحو ذلک ما یخل بالنتظم و لیشوش الفہم وقد صرحوا بان الترتیب من مناط الاعجاز و هو ظاہر فی حرمة تقدیم آیة علی آیة یعنی او کلمة علی کلمة کتقدیم المضاف الیہ علی المضاف و نحوه مما یحرم ذالک قراوة فقد صرحوا بان الکتابۃ بعکس السور مکروہة و بعکس الایات

حرام میں کیونکہ اس کی بھی تصریح ہے کہ الٹی ترتیب سے سورتوں کا لکھنا مکروہ ہے اور آیتوں کو الٹی ترتیب سے لکھنا حرام ہے اور وجہ فرق یہ بیان کی، قرآن کی ترتیب پر سورتوں کی ترتیب قطعی اور آیات کی ترتیب قطعی ہے اور یہ گمان کہ غیر عربی میں لکھنے میں تعلیم کی سہولت ہے کذب محض ہے۔ واقع اور مشاہدہ کے خلاف ہے، اس لئے یہ قابل التفات نہیں بالفرض اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ الفاظ قرآن کو اس منہج سے جس پر کتابت ہوئی ہے اور اس پر اسلاف و اخلاف کا اجماع ہے نکلانے کو جائز نہیں کر سکتے۔ پھر اس پر ہمام شہر کے کے فیخ الائمة الشافعیہ علامہ شمس الدین شوبری شافعی حفظہ اللہ تعالیٰ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ باقی ہی یہ بات کہ اگر غیر عربی میں لکھ لیا جائے تو اس کا رتبہ وضو کو چھوٹا اور اٹھانا حرام ہو گیا نہیں تو جواب میں زیادہ ظاہر یہی ہے کہ ہاں کیونکہ اس فعل سے وہ قرآن ہونے سے خارج نہ ہو گا ورنہ پھر اس کا لکھنا ہی حرام نہ ہوتا۔

اور ائمہ مالکیہ کے نزدیک اس لئے کہ علامہ ابن حجر نے اپنے فتاویٰ میں نقل کیا ہے کہ امام مالک سے سوال کیا گیا کہ لوگوں نے جو یہ نیا طریقہ نکالا ہے الگ الگ حروف کے لکھنے کا کیا اس

محرمة و فرقوا بان ترتیب السور علی النظم المصحفی مظنون و ترتیب الایات قطعی و زعم ان کتابتہ بالعجمیة فیہا سہولۃ لتعلیم کذب مخالف للواقع و المشاہدۃ فلا یلتفت لذلک علی انہ لو سلم صدقہ لم یکن مبہماً لاخراج الفاظ القرآن عما کتب علیہ و اجمع علیہ السلف و الخلف۔

ثم کتب علیہ شیخ الائمة الشافعیۃ بعصرنا و مصرنا هو العلامة شمس الدین محمد الشوبری الشافعی حفظہ اللہ تعالیٰ ما صورته انہ اذا کتب بغیر العربیۃ هل یحرم مسہ و حملہ اولاً الا ظہر فی الجواب نعم اذ لا ینخرج بذلک عن کونہ قرآناً واللم یحرم کتابتہ فلیراجع انتہی

❖ ❖ ❖
❖ ❖

واما عندنا الائمة المالکیۃ فلما نقل العلامة ابن حجر فی فتاواه ان الامام مالک سئل هل یکتب المصحف علی ما احدثہ الناس

طرح لکھا جاسکتا ہے فرمایا نہیں سوائے اس پہلے
طریقہ یعنی طریقہ امام کے جو مصحف عثمانی کا ہے
اور کوئی طرز جائز نہیں قرأت کے بعض ائمہ
نے بیان کیا ہے کہ اس مسئلہ کی نسبت امام
مالک کی طرف اس میں توجہ دینا چاہئے کہ اس سے یہ مسئلہ
دریافت کیا گیا تھا نہ یہ تو ائمہ اربعہ کا مذہب
ہے اور ایسا ہی ابو عمروؓ نے بھی فرمایا ہے۔

اور ائمہ مخالفہ کے نزدیک تو ہم پہلے درایہ
سے نقل کر چکے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں اور
امام شافعی رحمہ کے نزدیک فارسی میں قرأت کرنے
سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ اور یہی امام مالک رحمہ
اور امام احمد رحمہ نے مجز و عدم مجز کے
وقت کے لئے فرمایا ہے۔

ابن قدام حنبلی کی کتاب المغنی کے حاشیہ میں ہے
کہ اس پر اجماع قرار پایا ہے کہ تمام مسلمان نماز
میں بھی اور نماز کے علاوہ بھی قرآن شریف کی
تلاوت عربی ہی میں کریں جیسے نازل کی اور دعائیں
اور ذکر اور سب ادعیہ ماثورہ بھی عربی ہی میں پڑھی
جاتی ہیں اور یہ اجماع مجبیوں کی کثرت کے باوجود
لیکن اس زمانہ کے مجبیوں میں سے بعض مرتد
لوگ اٹھے ہیں اور لوگوں کو ترجمہ قرآن اور ترجمہ
ادکار کی اور تراجم کو بطور عبادت تلاوت کرنے
کی دعوت دینے لگے ہیں اور اس سے ان لوگوں

من العجا فقال لا الاعلى الكتبة الاولى
اي كتب الامام وهو المصحف العثماني
قال بعض ائمة القراء ونسبته
الى الامام مالك لانه المستعمل
المسئله والا فهو هذا هب الائمة
الاربعة وبمثلہ قال ابو عمرو۔

‡ ‡ ‡

واما عند الائمة المتأبلت
فقد قدمت الدرایة مانصه و
عند الشافعی ثم تفسد الصلوة
بالقراءة بالفارسیة وبه قال
مالك واحمد عند العجم وعلامه
انتهی (النفحة القدسیة ص ۳۵)

وفي حاشیة المغنی لابن قدام
الحنبلی مانصه استم الاجماع
على قراءة جميع المسلمين القرآن
في الصلوة وتغيرها بالعربیة كما ذكرها و
سائر الاذكار والادعية الماثورة
على كثرة الاعاجم حتى قام بعض
المرتدين من اعاجم هذا العصر
يدعون الى ترجمة القرآن وتغيره
من الاذكار وبطريق التعبد وانما
مرادهم التوسل بذلك الى تسهيل

الردّة على قومهم ونبذا القرآن
 المنزل من عند الله وراء ظهورهم
 وهو انما نزل باللسان العربي كما
 هو مصرح في الايات المتعددة و
 انما كان تبليغه والدعوة الى
 الاسلام به والا تذار به كما انزل
 الله تعالى لم يترجم النبي صلى الله
 عليه وسلم ولا اذن بترجمته و
 لم يفعل ذلك الصحابة ولا خلفاء
 المسلمين و ملوكهم ولو كتب النبي
 صلى الله عليه وسلم كتبه الى
 قيصر وكسرى والمقوقس بلغاتهم
 لضم التعليل الذي علل به رتم
 قال، وقد بين الامام الشافعي
 في رسالته الشهيرة في الاصول
 ان الله تعالى فرض على جميع الامم
 تعلم اللسان العربي بالتبع
 لمخاطبتهم بالقرآن والتعبد به
 ولم يتكر ذلك عليه احد من
 علماء الاسلام لانه امر مجمع عليه
 وان اهلله الاعاجم بعد صفت
 الدين والعلم-

(مقن مع الشرح الكبير ص ۵۳)

کی غرض اپنی قوم پر مرد ہونے کو سہل کر دینا ہے
 اور اس قرآن کو جو اللہ تعالیٰ کے پاس سے نازل
 ہوا ہے پس پشت ڈال دینا ہے۔ حالانکہ وہ عربی میں
 نازل ہوا ہے جیسا کہ بہت آیتوں میں ہے اور
 تبلیغ اس کی، اور اسلام کی طرف دعوت اور تدار
 اسی سے ہے جیسے اس کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا
 ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی ترجمہ
 خود کر کے بھیجا نہ ترجمہ بھیجنے کی اجازت دی نہ
 صحابہ اور خلفائے مسلمین اور شاہان اسلام
 نے ایسا کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر
 کسریٰ اور مقوقس کو جو خطوط لکھوائے ہیں اگر
 وہ ان کی زبانوں میں لکھواتے تو اس فعل کی اس
 کو علت بنانا صحیح بھی ہوتا، اور امام شافعی رح
 نے اپنے اس رسالہ میں جو اصول فقہ میں ان کا
 مشہور ہے، بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام
 امتوں پر عربی زبان کا سیکھنا فرض کیا ہے کیونکہ
 ان کو قرآن مجید کا مخاطب بنایا ہے۔ اور اس کی
 عبادات کا حکم کیا ہے (وہ عربی ہے لہذا عربی لازم
 ہے) اور امام صاحب پر اس قول کا علمائے اسلام
 میں سے کسی نے انکار نہیں کیا، کیونکہ یہ ایک
 اجمالی بات ہے کہ بعض مجاہدین نے صنوف دین و علم
 کی وجہ سے اسے چھوڑ رکھا ہے اور مصر کے شیخ القراء
 شیخ محمد بن علی حداد نے اپنے رسالہ خلاصۃ النصوص

رنقلہ لی اخی فی اللہ المولی جمیل احمد
القہانوی۔

اجمع المسلمون قاطبة علی
وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان
ومنع مخالفتہ (ثم قال) قال العلامة
ابن عاشر ووجه وجوبہ ما تقدم
من اجماع الصحابة رضی علیہم
وہم زهاء اثني عشر الفاً والاجماع
حجة جسيما تقرق اصول الفقه
ثم ذكر معزيا للمحكّم بسنداً
الی عبد الله بن عبد الحكم قال
قال ائمة سئل مالك فقيل له
اذيت من استكتب مصحفا اليوم
اترى ان يكتب علی ما احداثه
الناس من الهماء اليوم فقال لا
ارى ذلك ولكن يكتب علی الكتابة
الاولی۔ قال العلامة السخاوی
والذی ذهب اليه مالك هو
الحق وقال الجعیدي وهذا
مذهب الائمة الاربعة رضی وخص
ما لكانه صاحب فتياہ و
ومستندهم ومستند الخلفاء الاربعة
رضوان اللہ تعالی علیہم۔

الجلید میں مصحف عثمانی کے رسم الخط کے اتباع پر
مستقل ایک باب رکھا ہے جس کی بعض عبارتیں
یہ ہیں۔ مصاحف عثمانی کے رسم الخط کے اتباع
کے واجب ہونے اور اس کے خلاف کے ممنوع
ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔ علامہ ابن
عاشر کا بیان ہے کہ واجب ہونے کی وجہ وہی
ہے جو گزر چکی ہے یعنی حضرات صحابہ کا اجماع اور
یہ حضرات تقریباً بارہ ہزار تھے اور جیسے اصول فقہ
میں ثابت ہو چکا ہے۔ اجماع حجت قطعیہ ہے پھر
محکم کی طرف منسوب کر کے عبد اللہ بن عبد الحكم
تک ان کی سند سے بیان کیا ہے کہتے ہیں کہ شہب
کا بیان ہے کہ امام مالک سے استفادہ کیا گیا
جو لوگ آج قرآن شریف کی کتابت کر رہے ہیں
ان کے متعلق فرمائیے آپ کی کیا رائے ہے؟
کیا آپ کو پسند ہے کہ اس نوادہ بجا دانگ انگ
حرفوں سے لکھنے کے طریق پر قرآن شریف کی کتابت
کی جایا کرے فرمایا میں اسے جائز نہیں رکھتا۔
ہاں قدیم طرز پر لکھا جائے علامہ سخاوی کہتے ہیں کہ
امام مالک کی جو رائے ہے حق یہی ہے اور جعیری کہتے
ہیں کہ یہ تو ائمہ اربعہ کا مذہب ہے لیکن امام مالک کی
خصوصیت اس لئے ہے کہ وہ سائل کے صاحب فتویٰ
اور تمام لوگوں اور خلفائے اربعہ کے مستند تھے
رضوان اللہ تعالی علیہم۔

ابو عمرو دانی کہتے ہیں۔ علمائے امت میں سے اس باب میں امام مالک سے کوئی اختلاف نہیں رکھتا اور ایک اور مقام پر کہا ہے کہ امام مالک سے قرآن مجید کے حروف کے متعلق جیسے واو اور الف ہے سوال کیا گیا کہ کیا آپ اس کو جائز سمجھتے ہیں کہ یہ قرآن شریف میں بدل دئے جائیں جب کہ پہلے سے ایسے پائے جاتے ہیں۔ فرمایا نہیں۔ ابو عمرو دانی کہتے ہیں یعنی وہ واو اور الف جو لکھنے میں زائد آتے ہیں اور پڑھنے میں نہیں آتے جیسے اولوا امام احمد فرماتے ہیں کہ مصحف عثمانی کے رسم الخط کی مخالفت واو، الف یا وغیرہ میں بھی حرام ہے۔

امام بیہقی رح کہتے ہیں کہ جو شخص قرآن شریف کی کتابت کرنا چاہے تو اس کے لئے مناسب یہی ہے کہ حروف کے اس جوڑ توڑ کی حفاظت کرے جس پر وہ مصاحف لکھے گئے ہیں اور ان کے خلاف نہ کرے اور جیسے جیسے انھوں نے لکھا ہے ہر مونہ بدلے کیونکہ حضرات صحابہ رضہ علم میں سب سے زیادہ کامل، صدق قلبی و لسانی میں سب سے بڑھے ہوئے اور تدین و امانت میں سب اعلیٰ تھے۔ ہم کو روا نہیں ہے کہ اپنے دلوں میں ان کی طرف سے کوئی شبہ قائم کریں یہ اتقان میں ہے جو ہمارے شیخ المشائخ جلال الدین سیوطی رح کی ہے پھر علامہ حداد نے

وقال ابو عمرو والدا في مخالفة
لمالك من علماء الامة في ذلك
وقال ايضا في موضع اخرى سئل
مالك عن المحروف في القرآن مثل
الواو والالف اتري ان تغير من
المصحف اذا وجد فيه كذلك قال
لا. قال ابو عمرو ويعني الواو والالف
المتريدين في الرسم المعدومتين
في اللفظ نحو اولوا وقال الامام احمد
رضي الله عنه تحرم مخالفة مصحف
عثمان في واو والالف واياها وغير ذلك

وقال البيهقي من كتب مصحفاً

فينبغي ان يحافظ على الهماء الذي
كتبوا به تلك المصاحف ولا يتجلففهم
فيه ولا يغير ما كتبوا شيئاً فانهم
كانوا اى الصحابة اعلموا علماء
واصدق قلباً ولساناً واعظم امانة
فلا ينبغي ان تظن بانفسنا استدارا كما
عليهم كما في الاتقان لشيخنا مشائخنا
الجلال السيوطي رح ثم قال العلامة
الحداد فثبت بما ذكر من المنقول
الصحيحة والنصوص الصريحة انما

لکھا ہے کہ جو جو فقول صحیحہ اور نصوص صحیحہ ذکر کی گئی ہیں ان سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس رسم خط کے وجوب پر اور اس پر کہ قرآن شریف کی کتابت میں کسی حال میں بھی اس رسم الخط سے عدول جائز نہیں اور نہ کسی ایسی صورت سے جو مصاحف عثمانیہ کے رسم الخط کے خلاف ہو قرآن شریف کا شائع کرنا جائز ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم وغیر صحابہ ساری

قد انعقد اجماع سائر الامة من الصحابة وغيرهم على تلك الرسوم وانه لا يجوز بحال من الاحوال العدول عن كتابة القرآن الكريم ولا نشره بصورة تخالف رسم المصاحف العثمانية - والله الموفق والمعين انتهى -

(رسالہ النصوص الجلیبۃ ص ۲۵)

امت کا اجماع ہو چکا ہے واللہ الموفق والمہین اور حافظ حدیث امام ابن کثیر رحمہ نے اپنی کتاب فضائل القرآن میں کتابت قرآن اور اس کی تاریخ پر کلام کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

میں کتابت ہوں کہ زمانہ سلف میں کوئی طرز کتابت غالب تھا پھر علی بن مقلدہ ذریعہ اس طرز کو پاکیرہ بنایا، اور کتابت میں اس کا ایک خاص طرز ممتاز ہو گیا، پھر علی بن ہلال بغدادی معروف بابن البواب نے اس کو اور قریب الفہم کر دیا اور دوسرے لوگوں نے اس کا اتباع شروع کر دیا اور اس کا طرز اس باب میں سب عمدہ ہے۔ الغرض چونکہ اس زمانہ میں کتابت کا عمدہ طرز نہ ہوا تھا۔ اس لیے مصاحف کے لکھنے میں کتابت کلمات کی صورت میں نہ کہ معانی میں اختلاف رہا اس باب میں لوگوں نے تصنیفات بھی کی ہیں اور امام کبیر ابو عبیدہ قاسم بن

قلت والذی کان یغلب علی زمان السلف الکتابة المکوفیۃ ثم هذا بها علی بن مقلدۃ وزیر و صار له فی ذلک نهم و اسلوب فی الکتابة ثم قررها علی بن هلال البغدادی المعروف بابن البواب و سلك الناس وراءه و طریقته فی ذلک واضحة جیدة والغرض ان الکتابة لما كانت فی ذلک الزمان لم تحکم جیداً و وقع فی کتابة المصاحف اختلاف فی وضع الکلمات من حیث صناعة الکتابة لا من حیث

۱۰ کوئی رسم الخط ۱۲

المعنى وصنف الناس في ذلك وعتنى
بذلك الامام الكبير ابو عبيد
القاسم بن سلام في كتابه فضائل
القرآن والمحافظة ابو بكر بن داود
في بابا على ذلك ذكر اقطعة صالحة
من صناعة القرآن ليس مقصدنا
ههنا ولهذا نص الامام مالك
على انه لا توضع المصاحف الا على
وضع كتابية الامام فضائل القرآن
ص ۱۵) وقال قبل ذلك واما
مصاحف العثمانية والائمة فاشهرها
اليوم الذي في الشام بجامعة
دمشق عند الركن شرق المقصورة
المعمورة بذكر الله وقد كان قديما
بمدينة طبرية ثم نقل منها الى
دمشق في حدود ثمان وعشرون
مائة وقد رايت كتابا عزيزا
جيلا عظيما ضخما بخط حسن بين
قوى بحير في ورق اظنه من
جلود الابل والله اعلم زاد الله
تشريفا وتعظيما وتكريما. فاما
عثمان رضي كما يعرف انه كتب
بخطه هذه المصاحف وانما كتبها

سلام نے اپنی کتاب فضائل القرآن میں اور حافظ
ابو بکر بن داؤد درم نے بہت اہتمام کیا اور اس
بیان کے لئے ابواب مقرر کئے اور قرآن مجید کی
کتابت پر نفیس بحثیں لکھی ہیں جو اس وقت ہمارے
مقصد سے الگ ہیں، اور اسی لئے امام مالک نے
تصریح کی ہے کہ قرآن شریف صرف مصحف امام
کی کتابت کے طرز پر ہی لکھا جائے اور اس
کے قبل یہ ہے کہ باقی مصاحف عثمانیہ یا مصاحف
امام توان میں مشہور وہ ہے جو آج دمشق کی
جامع میں رکن کے قریب حجرہ مبارکہ کی مشرقی جانب
میں ہے اور یہاں سے پہلے یہ شہر طبریہ میں تھا،
پھر وہاں سے ۱۸ھ کے قریب میں دمشق لایا گیا
میں نے خود اس کو دیکھا ہے، برطانیہ میں
عمدہ نفیس جلی اور صفات خط میں دیر پا
روشنائی سے ایسے اوراق میں لکھا ہے
کہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ اونٹ کی کھال
کے ہیں۔ واللہ اعلم

لیکن یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت
عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود اپنے
مسلم سے یہ سب مصاحف کچھ ہون گے
بلکہ آپ کے عہد میں حضرت زید بن ثابت رضی
اور دوسرے لوگوں نے کچھ اور آپ کی
طرف اس لئے منسوب ہوئے کہ آپ کے

دید بن ثابت فی ایامہ وغیرہ نسبت
الی عثمان لانہا بامہ و اشارتہ ثم قرأت
علی الصحابۃ بیعہیدی عثمان ثم نفذت
الی الافاق -
حکم اور اشارہ سے کھٹے گئے پھر آپ
کے سامنے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے
گئے اور پھر چاروں طرف بھیج دئے گئے تھے
رضی اللہ عنہم -

تنبیہ

رسالہ نصوص جلیہ اور فضائل القرآن ابن کثیر اور امام زرکشی سے جو عبارات و نصوص
نقل کی گئی ہیں ان سے جس طرح عربی کے سوا کسی اور زبان میں قرآن کریم کی کتابت کا حرام
ہوتا باجماع امت ثابت ہوا، اسی طرح اس کی حرمت و مخالفت بھی ثابت ہو گئی کہ
زبان تو عربی ہی رہے لیکن رسم خط انگریزی یا گجراتی یا بنگلہ یا ہندی، انگریزی وغیرہ
کر دیا جائے جیسا کہ اس فتنہ زما زمانہ میں اس کا بھی شیوع ہے کہیں انگریزی رسم خط
میں قرآن کریم کی طباعت کی تجویز ہے کیسے ہندی اور گجراتی میں، جو باجماع امت
ناجائز ہے خصوصاً انگریزی اور ہندی رسم خط میں تو کھلی ہوئی تخریف ہوگی کہ ان میں
حرکات کو بشکل حروف لکھا جاتا ہے اور پھر اس پر مزید یہ ہے کہ اس کو خدمت اسلام
سمجھ کر کیا جا رہا ہے۔ اور اس کے لئے بہت سی مصالح و منیہ بیان کی جاتی ہیں جن کی
تفصیل کا نہ یہ موقع ہے، نہ ضرورت کیونکہ اول تو وہ مصالح بدون رسم خط بدلنے کے
بھی حاصل ہو سکتی ہیں اور ساڑھے تیرہ سو برس سے برابر اسی طرح حاصل ہوتی آئی ہیں
کہ ہر ملک و قوم کے لوگوں کو قرآن پڑھایا گیا اور انھوں نے بدون رسم خط تبدیل کرنے
کے پڑھا اور اتنا پڑھا کہ شاید اب سارے مسلمان مل کر بھی نہ پڑھ سکیں اور ایسا پڑھا کہ
انہیں اہل عجم میں سے بہت سے لوگ قرآن کی قرأت و تجوید اور رسم خط کے امام مانے گئے
اور بالفرض اگر وہ مصالح تسلیم بھی کئے جائیں تو ان مصالح مزعمورہ کی وجہ سے اجماع امت
کا فیصلہ نہیں بدلا جاسکتا اور حفاظت قرآن کی مصلحت پر کسی مصلحت کو ترجیح نہیں دی
جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ خود حضرت عثمان اور دوسرے صحابہ کرام نے ان مصالح کی طرف

نظر نہیں فرمائی۔ حالانکہ یہ مصالِح اس وقت آج سے زیادہ قابل اہتمام نظر آتی تھیں کیونکہ وہ زمانہ تعلیم السنہ کے شیوع کا نہ تھا اب تو ایک ایک آدمی جو معمولی خواندہ کہلاتا مختلف زبانیں سیکھتا اور جانتا ہے اور یہ نہیں کہ اس وقت ان زبانوں میں کتابت کرانا ممکن نہ تھا کیوں کہ خود کتابت قرآن زید بن ثابت رضی اللہ عنہ مختلف زبانیں جانتے تھے مگر اس کے باوجود کتابت قرآن میں خاص خاص ملکی مصالِح کو نظر انداز کر کے صرف عربی زبان اور عربی رسم خط میں قرآن مجید کے نسخے لکھے اور تمام ممالک میں بھیجے۔

والی اللہ المشتکی معامت فیہ البلوئی من ایدی اصحاب الہوی و
ایاہ تسئل الہدی والتقی واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

تنبیہ دوم

یہ سوال کوئی آج پیدا نہیں ہوا ہندوستان میں مدت سے یہ رسم بد چل گئی ہے۔ ۱۳۳۲ھ میں قطب عالم مجدد الملتہ سیدی وسندی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے سامنے ایک ایسے ہی اردو ترجمہ بلا عربی عبارات کی اشاعت کے متعلق لکھا گیا تو حضرت ممدوح نے اس کی ممانعت و حرمت پر ایک نہایت مفصل و مدلل فتویٰ تحریر فرمایا تھا جو حوادث القادسی حصہ دوم ص ۱۵۶ پر شائع بھی ہو چکا ہے۔ مزید بصیرت کے لئے اس کو بھی بعینہ اس کے ساتھ ذیل میں ملحق کیا جاتا ہے۔

واللہ الموفق والمعین

بندہ محمد شفیع دارالعلوم دیوبند

نقل فتویٰ حضرت حکیم الامتہ مجدد الملتہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب نور اللہ امر قدا و قدس سرہ

سوال ایک مولوی صاحب نے ایک کتاب دکھلائی جس میں محض ترجمہ تھا۔ کلام مجید یعنی عربی عبارت کہیں بھی نہ تھی بلکہ انجیل کے ترجمہ وغیرہ کی مانند، ایک گورکھپور کے وکیل نے مختلف تراجم قرآن سے اخذ کر کے لکھا ہے۔ اس پر مولوی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میں جناب والا کو لکھوں کہ اس مترجم پر جناب الا کفر کا فتویٰ لگا دیں۔ میں نے عرض کیا کہ تکفیر کا فتویٰ لگانا تو کسی مسلمان پر تا وقتیکہ کوئی امر صریح ٹھیکانہ پایا جائے مناسب نہیں ہاں امر مذموم سے روکنا ضرور ہے سو جناب والا سے گزارش ہے کہ اس امر کے متعلق کچھ ارشاد اور تحریر فرمادیں۔

الجواب

نصوص صحیحہ صریحہ سے تشبہ باہل الباطل خصوص غیر مسلم پھر خصوص اہل کتاب کی مذمت اور اس کا محل وعید ہونا ثابت ہے من تشبہ بقوم فهو منہم میں وعید کا شدید ہونا ظاہر ہے کہ کفار کے ساتھ تشبہ کرنے کو کفار میں شمار ہونے کا موجب فرمایا گیا۔ دوسری حدیث لقرآن سنن من کان قبضہ الحدیث میں اس مماثلت کو موقع تشبیح میں ارشاد فرمایا گیا۔ اذ یہ بالکل یقینی ہے کہ اس وقت کتاب الہی کا ترجمہ غیر حال المتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے ایسے امر میں جو عرفاً و عادتاً ان کے خصائل میں سے ہے سوا اول تو ان کے ساتھ تشبہ ہی مذموم ہے پھر خصوص جب وہ تشبہ امر متعلق بالذین میں ہو کہ تشبہ فی الامر الدنیوی سے تشبہ فی الامر الدینی اچھڑے۔ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے گوشت شتر چھوڑنے پر آیت یا ایہا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کانہ ولا تتبعوا خطوات الشیطن نازل ہونا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا بتل اور ترہیب کا انکار فرمانا اس کی کافی دلیل ہے، مشکوٰۃ کتاب النکاح و کتاب الاعتقاد لا تشدد و داعی النفس المحرث، اور اس میں بھی خاص کر جب کہ ان کو دیکھ کر ان کی تقلید کی جاوے کہ اتفاقی تشبہ سے یہ اور بھی زیادہ مذموم ہے اور اس وقت اکثر لوگ ایسے کام انہی لوگوں سے اخذ کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذات الانواط کی درخواست پر کیسا زہر فرمایا تھا یہ تشبہ مذکور خصوصاً قیدین مذکورین کے ساتھ تو اس میں مفسدہ حالیہ ہے اور یہ بھی اس کے منع کے لئے کافی ہے جاسیکہ اس میں مفاہم آلیہ شدیدہ بھی متحقق ہیں مثلاً خدا نخواستہ اگر یہ طریق مروج ہو گیا تو مثل تورات و انجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے ضائع ہونے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض ہے اور اس کا اخلال حرام ہے اور فرض کا مقدمہ فرض، اور حرام کا مقدمہ حرام، اور یہ تشبہ نہ کیا جاوے کہ یہ احتمال بعید ہے محققان دین و مہران اسلام سے ایسے احتمالات کا اعتبار ثابت ہے، پھر خواہ بعید ہو یا قریب ہم پر بھی واجب ہے کہ اس کا لحاظ کریں۔ حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بعض قراء کی شہادت کے وقت بعد سرسری مناظرہ کے محض ضیاع قرآن کے احتمال کا اعتبار کر کے قرآن مجید کے جمع کا اہتمام مندرجی قرار دیا تھا حالانکہ قرآن مجید اس وقت بھی متواتر تھا اور اس کے ناقل اس کثرت سے موجود تھے کہ اس کے تواتر کا انقطاع احتمال بعید تھا لیکن پھر بھی اس کا لحاظ کیا گیا پس جیسا اس وقت عدم کتابت میں احتمال ضیاع کا تھا اسی طرح صرف ترجمہ کی کتابت میں اس کا احتمال ہے، اس احتمال کے وقوع کا وہی نتیجہ ہوگا جیسا حدیث میں ہے۔

امتھو کون انتم کما تھوکت الیھو والنصار (مشکوٰۃ ص ۳) اور مثلاً یہ مفسدہ ہوگا۔
 کسب تفریح فقہاء اس ترجمہ کو بلا وضومس کہ ناجائز نہ ہوگا صحافی العالمگیریہ
 ولو کان القرآن مکتوباً بالفارسیۃ یکرہ لھم مسد عند ابی حنیفۃ رحمہ و کذا
 عند ہما علی الصحیحہ کذا فی الخلاصۃ (ص ۱۶۶) و فیہ ایضاً اذا قرأ آیتہ السجدۃ
 بالفارسیۃ فعلیہ و علی من سمعہا السجدۃ فہم السامع امر لا اذا اذخیر السامع
 انہ قرأ آیتہ السجدۃ صحیحہ و ہذا الجزئیۃ الثانیۃ توید الاولیٰ حیث
 وجب سجدۃ التلاوۃ بقراءۃ القرآن بالفارسیۃ فعلم منہ ان الترجمة بالفارسیۃ

لا تخرج القرآن عن كونه قرأنا حكماً فلا يجوز مسه للمحدثات اور یہ لفظی بات ہے کہ عامہ ناس اس ترجمہ کو ایک کتاب عالی از قرآن سمجھ کر ہرگز اس کے مس کے لئے وضو کا انتظام نہ کریں گے تو ایسا ترجمہ شائع کرنا سبب ہوگا ایک امر غیر مشروع کا، اور غیر مشروع کا سبب غیر مشروع ہے۔ اور مثلاً اس کا احترام بھی زیادہ نہ کریں گے اور غیر قابل انتفاع ہو جانے کے وقت مثل دیگر معمولی کتب کے اوراق کے اس کے اوراق کا استعمال بھی کریں گے تو اس سے یہ بھی ایک محذور لازم آوے گا اور محذور کا سبب لا محالہ محذور و منظور ہے اور مثلاً آج تک امت میں کسی نے ایسا نہیں کیا اور جو کسی نے ایسا کیا تو اس پر انکار کیا گیا چنانچہ میں نے محمد عبدالرحمن خاں صاحب مرحوم مالک مطبع نظامی سے یہ سنا ہے کہ کسی نے لکھنؤ میں ایسا ہی ایک پارہ چھاپا تھا مگر علماء نے اس کی اشاعت کی اجازت نہیں دی تو اس شخص نے اس کے اوراق کو قرآن مجید کی دفتیوں میں چسپاں کر کر پوشیدہ کر دیا اور چنانچہ اس وقت بھی ایسے ترجمہ غیر حاصل تین پر علماء کو انکار ہے چنانچہ اس جواب لکھنے کے قبل ایک مجمع علماء سے میں نے ذکر کیا تو ایک نے بھی اس میں نرمی نہیں فرمائی بلکہ سب نے شدید انکار کیا ہے باوجودیکہ دوسری زبان والے مسلمانوں کو اس قسم کی حاجت بھی واقع ہوئی جس حاجت کی تہا پر ایسا کیا گیا ہے تو باوجود و امی کے تمام علماء امت کا انکار کرنا دلیل ہے اجماع کی اس امر کے مذموم و منکر ہونے پر جس میں یہ احادیث وارد ہیں ان اللہ لا یجمع امتی علی الضلالة، و ید اللہ علی الجماعۃ و من شنذنا الی التارو اتبعوا السواد الاعظم (مشکوٰۃ) اور اب تو قرآن مجید سے کچھ علاقہ بھی ہے اگر ترجمہ سے بھی مدد لیتے ہیں تو اصل بھی ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس بہانہ سے کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں اور پھر تو قرآن سے بالکل بے تعلق اور اجنبی ہو جائیں گے اور بے ساختہ ان پر یہ آیت صادق آنے لگے گی نبذ فریق من الذین او تو ان کتاب کتاب اللہ و راء ظہورہم کانہم لا یعلمون۔ اور مثلاً اب اگر ترجموں میں کچھ اختلاف ہے تو اصل بھی سامنے ہے اس کو سب نسخوں میں متحد پاتے ہیں تو اختلاف کا خیال اصل تک نہیں پہنچتا اور جب ترجمے ہی ترجمے رہ جائیں گے اور اصل نظروں سے غائب ہوگی تو اس وقت یہ اختلاف

کلام اللہ کی طرف منسوب ہوگا۔ بعد چندے یہ گمان ہونے لگے گا کہ اصل حکم ہی مختلف ہے یہ تو اعتقاد پر اس کا اثر ہوگا، اور عمل پر یہ اثر ہوگا کہ ترجموں کو لے کر آپس میں لڑیں گے، اور مراجعت الی الاصل کی توفیق ہوگی نہیں جو مدار ہو سکتا ہے فیصلہ کا بس اس آیت کا معنی ظاہر ہو جاوے گا وما اختلف فیہ الا الذین او توه من بعد ما جاء تہم البینات بغیاً بینہم اور مثلاً اب تو ترجمہ کو مستقل کتاب نہیں سمجھتے قرآن کا تابع سمجھتے ہیں اگر کسی مطلب نہیں سمجھتے ہیں یا غلط سمجھتے ہیں یا فصاحت و بلاغت سے گرا ہوا پاتے ہیں تو فہم کا یا مترجم کا تصور سمجھتے ہیں، اور مترجم کو مالک دین کا نہیں جانتے نیز کسی مترجم کو بہت تحریف معنوی کی بھی نہیں ہو سکتی کہ اصل کے سامنے ہونے سے ہر طالب علم اس پر گرفت کر سکے گا اور ایسا ترجمہ اگر ہوا تو اس کو مستقل کتاب سمجھیں گے کسی کا تابع نہ سمجھیں گے اور تمام آثار مذکورہ کی اضداد واقع ہوں گی خصوصاً مترجمین ہی کا متبوع مستقل ہو جانا یہ سب سے بڑھ کر آفت ہوگی اور اہل زیغ کو بہت آسانی سے موقع غلط ترجمہ اور تفسیر کا ملے گا کیونکہ ہر دیکھنے والے حافظ نہیں ہوتے اور مراجعت اصل کی طرف ہر وقت آسان نہیں ہوتی۔ کما قال۔ اتخذوا احبارہم و رہبائہم ارباباً من دون اللہ اور پھر اسی طرح کے اور بھی بہت سے مفاسد ہیں جن کو انشاء اللہ علماء ظاہر کریں گے اسی لئے جا بجا لفظ مثلاً لایا گیا ہے۔ اس وقت دس ہی وجوہ پر جس کو عشرہ کاملہ کہا جاسکتا ہے، اکفایا جاتا ہے مگر کاملہ کا خاتمہ ہونا لازم نہیں، اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ولا تعادوا علی الاثم والعدوان اور فقہار نے اس قاعدہ پر یہاں تک تفریح فرمائی ہے کہ جس شخص کو بھیک مانگنا حرام ہے اس کو بھیک دینا بھی حرام ہے۔ کیونکہ اگر دینے والے دیں نہیں تو مانگنے والا مانگنا چھوڑ دے اسی طرح اس ترجمہ کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ ایسے ترجمہ کو اگر کوئی شخص نہ قیمت لے اور نہ بلا قیمت تو ایسے تراجم کا سلسلہ بند ہو جاوے اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہے گا۔ پس ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیہ میں قبول کرنا اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی اس لئے یہ بھی ناجائز ہے،

۲۰ ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ۔

ثم بعد منتصف ربيع الاول كتب الى محبي المولوي تفضل احمد رواية
فقهية جزئية في تائيد الجواب نصها هكذا ولوقرء بقراءة شاذة لا تقصد
صلاته ذكره في الكافي وفيه ان اعتاد القراءة بالفارسية واران يكتب
مصحفا بها يمنع وان فعل في آية وايتين لا - فان كتب القران وتفسير
كل حرف وترجمته جاز ۳ فسخ القدير ص ۲۰۱ جلد اول مصرية باب
كيفية الصلاة فقط - تم فتوى سيدي حكيم الامت والله سبحانه و
تعالى هو الموفق للسداد - لقد احسن واجاد -

بنداء محمد شفيع
ديوبند - محرم ۱۳۶۳ هجری

(۱) فاروق احمد مفتی دارالعلوم دیوبند

(۲) اصاب المجيب العلم و اجاد فيما افاض فلهذا درة
احقر مسعود احمد عفا الله عنه
دارالعلوم دیوبند

۵/۶۳ هـ

(۳) هذا هو الحق الصريح وماذا بعد الحق الا الضلال

محمد اوريس كانا هوى كان الله له

وكان هو الله

مدرس دارالعلوم دیوبند

(۴) بلا متن کے قرآن شریف کا محقق ترجمہ چھاپنا ناجائز ہے۔ اس کا پڑھنا اور خریدنا بھی
ناجائز ہے اس کے چھاپنے والے کے خلاف مسلمانوں کو ہر ممکن
کارروائی کرنی چاہئے اور ایسے شخص کو اس بات پر مجبور کرنا چاہئے کہ

وہ اس ترجمہ کی اشاعت بند کر دے۔

فقط والسلام
سعید احمد غفرلہ مفتی مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور
۲۸ محرم ۱۳۶۲ھ

(۵) جواب صحیح ہے

عبدالرحمن غفرلہ (صدر مدرس)
مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور
۲۳ ۲ ۱۳۶۲ھ

(۶) ظہور الحسن غفرلہ

(۷) جواب صحیح ہے

اسعد اللہ - مدرس مظاہر علوم سہارنپور
الجواب صحیح
جمیل احمد

(۸)

تخادم الاقضاء خاتماہ اشرفیہ تہانہ بہو
ضلع مظفرنگر

(۹) الجواب صحیح

مولانا عبداللطیف مہتمم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور
۳ صفر ۱۳۶۲ھ ہجری

(۱۰) الجواب صحیح

محمود حسن گنگوہی غفرلہ نائب مفتی مظاہر علوم سہارنپور
۲۳ ۲ ۱۳۶۲ھ

(۱۱) اللہ درالمجیب ما احسن اجاب

محمد خلیل عفا اللہ عنہ مفتی مدرسہ عربیہ گوجرانوالہ

مجموعہ اسلامی تعلیمی و تحقیقی

مقام تالیف _____ دیوبند
 زمانہ تالیف _____ ۱۳۳۵ھ
 اصناف _____ ۱۳۳۵ھ و ۱۳۵۸ھ
 اشاعتِ اول _____ ماہنامہ المفتی دیوبند
 جمادی الاولیٰ ۱۳۵۸ھ و
 ذی قعدہ ۱۳۶۰ھ

”یہ تقلید کے مسئلہ پر متفرق مضامین کا مجموعہ
 ہے جو ماہنامہ المفتی دیوبند میں شائع ہوتے
 رہے۔“

مسئلہ تقلید

پر

چند سوالات و جوابات

یہ سوالات میرے استاذ محترم مفتی اعظم ہند اور دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مستقل مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب کا علیہ ہیں جو برمانہ طالب علمی ۱۳۳۵ھ میں جب کہ احقر دارالعلوم دیوبند میں دورہ حدیث کا ایک طالب علم تھا۔ حضرت ممدوح نے احقر کو جواب لکھنے کے لئے عطا فرمائے تھے اور جواب چونکہ کچھ مفصل ہو گیا تو اس کو دارالعلوم دیوبند کے ایک ماہ نامہ میں شائع کر دیا گیا تھا۔ وہاں سے نقل کیا جاتا ہے۔

واللہ الموفق والمعين

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

استفتاء

کیا حکم ہے کتاب اللہ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مسائل ذیل کے بارہ میں اے علماء کرام تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ بینوا تو جروا

(۱) کسی امام مجتہد کی تقلید عام مسلمانوں کے لئے فرض ہے یا واجب یا مباح؟

الجواب

مطلق تقلید شرط ہے بنص و تدان۔

فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم
لا تعلمون۔
اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت
کر لو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

اطيعوا الله واطيعوا الرسول
واولي الامر منكم۔
اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ کی
اطاعت کرو اور اولو الامر کی اطاعت کرو۔

اولی الامر کی تفسیر حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطاء و مجاہد اور صفحاک و ابوالعالیہ اور حسن بصری وغیرہم صحابہ و تابعین و تبع تابعین نے خلفاء اور علماء و فقہاء سے کی ہے۔ اور خود مولانا صدیق حسن خاں صاحب مرحوم رئیس اہل حدیث اس معنی کو اپنی تفسیر میں قبول کرتے ہیں اور حدیث میں ہے:-

انما شفاء العی السوال { نہ جاننے والے کی شفا اس میں ہے کہ جاننے والوں سے دریافت کرے۔

لیکن اب کلام اس میں ہے کہ آیا ہر وہ شخص جس کو لغت و عرف میں عالم کہا جاتا ہے اس کام کو انجام دے سکتا ہے یا کوئی خاص عالم و فقیہ مراد ہے۔

علمائے سلف نے ایسے عالم کے لئے جس کی تقلید کرنی چاہئے ایک معیار مقرر کیا ہے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ محدث دہلوی اپنی کتاب عقدا المجید میں فرماتے ہیں:-

اجتہاد کی تعریف جو کلام علماء سے بھی جاتی ہے	الاجتہاد علی ما یفہم من کلام
یہ ہے کہ خوب محنت کرنا اور یافت کرنے میں شریعت کے	العلماء استقراغ الجہد فی ادراک
احکام فرعی کو ان کی تفصیلی دلیلوں سے جن کی کلیات	الاحکام الشرعیة الفرعیة عن اولیہا
کا آل چار قسم پر ہے۔ یعنی کتاب اور سنت اور اجماع	التفصیلیة الراجعة کلیاتہا الی اربعۃ
اور قیاس پر۔	اقسام الكتاب و السنة والاجماع والقیاس

اور اجتہاد کی شرط یہ ہے کہ اجتہاد والے کو ضرور ہے کہ قرآن و حدیث اس قدر جانتا ہو کہ جو احکام سے متعلق ہے اور اجماع کے موقوفوں اور قیاس صحیح کی شرطوں اور نظر کی کیفیت اور علم عربیت اور تاریخ اور منسوخ اور راویوں کے حال سے واقف ہو۔ اور اجتہاد میں علم کلام اور اصطلاحی علم فقہ کی کچھ حاجت نہیں اور یہ جوہم نے اجتہاد کی شرط ذکر کی ہے اصول کی کتابوں میں مشروح موجود ہے اور کچھ مضائقہ نہیں کہ نبوی کا قول اس مقام میں یعنی بیان شرط اجتہاد میں ذکر کیا جاوے۔ نبوی نے کہا ہے کہ مجتہد وہ عالم ہے کہ پانچ طرح کے علم کا حامی ہو۔ اول علم کتاب اللہ یعنی قرآن مجید کا دوم علم حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوم علم علماء سلف کے اقوال کا کہ ان کا اتفاق کس قول پر ہے اور اختلاف کس قول میں چہاں علم لغت عربی کا پنجم علم قیاس اور قیاس طریقہ حکم کے نکالنے کا قرآن اور حدیث سے ہے جس صورت میں کہ حکم مذکور صریح قرآن یا حدیث یا اجماع کے نصوص میں مجتہد نہ پاوے اب ان پانچوں علموں کی مقدار مفصل معلوم کرنی چاہیے کہ مجتہد کو ہر ایک علم کتنا سیکھنا چاہئے کہ قرآن کے علم میں سے اس پر ان باتوں کا جاننا واجب ہے تاریخ و منسوخ مجمل اور مفسر خاص اور عام حکم و تشابہ کراہت اور تحریم اہانت اور استحباب اور وجوب کا جاننا اور حدیث میں سے ان اشیاء مذکورہ کا

الی ان قال، و شرطہ اَنَّهُ لَا یَبْدَأُ لَدُنْ اَنْ یَعْرِفَ مِنَ الْکِتَابِ وَالسَّنَةِ مَا یَتَعَلَّقُ بِالْاِحْکَامِ وَمَوَاقِعِ الْاِجْمَاعِ وَشُرَاطِ الْقِیَاسِ وَکِیْفِیَةِ النَّظْرِ وَعِلْمِ الْعَرَبِیَّةِ وَالتَّاسِخِ وَالتَّنْسُوخِ وَحَالِ الرَّوَاةِ وَ لِحَاجَةِ اِلَى الْکَلَامِ وَالْفِقْهِ

(ثم قال) ولا بأس ان یورد کلام

النبوی فی هذا الموضع قال النبوی و المجتهد من جمع خمسة الواع من العلم علم کتاب اللہ عزوجل و علم سنتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و علم اقوال علماء سلف من اجماعهم و اختلافهم و علم اللغة و علم القیاس و هو طریق استنباط الحکم عن کتاب و السنة اذا لم یحبا صریحاً فی نص کتاب او سنتہ او اجماع فیجب ان یعلم من علم العتاب التاسخ و التانسوخ و المجل و المفسر و التام و العلم و المحکم و المتشابه و الکراہة و التحریم و الاباحة و التذکر و الوجوب و یعرف من السنة هذه الاشیاء و یعرف منها الصحیح و الضعیف و المرسل و یعرف ترتیب

السنة على الكتاب وترتيب الكتاب
 على السنة حتى لو وجد حديثاً
 لا يوافق ظاهراً الكتاب يهتدى
 الى وجه محمله فان السنة بيان
 الكتاب ولا تخالفه وانما يجب
 معرفة ما ورد منها في احكام الشرع
 دون ما عداها من القصص والخبار
 والموعظ وكذلك يجب ان يعرف
 من علم اللغة ما اتى في كتاب او سنة
 في امور الاحكام دون الاحاطة بجميع
 لغات العرب وينبغي ان يستخرج
 فيها بحيث يقف على مراد كلام العرب
 فيما يدل على المراد من اختلاف
 المحال والاحوال لان الخطاب ورد
 بلسان العرب فمن لم يعرف لا يقف
 على مراد الشارع ويعرف اقاويل
 الصحابة والتابعين في الاحكام و
 معظم فتاوى فقهاء الامة حتى لا
 يقع حكمه مخالفاً لقوا لهم فيكون
 فيه خرق الاجماع واذا عرفت من
 كل من هذه الانواع معظمة فهو
 حينئذ مجتهد ولا يشترط معرفة
 جميعها بحيث لا يشذ عنه شئ منها

جاننا اور نیز صحیح حدیث اور ضعیف اور مستدر اور مرسل
 کا جاننا اور حدیث کا مرتب کرنا قرآن پر اور قرآن کا
 حدیث پر جاننا حتیٰ کہ اگر کوئی ایسی حدیث پاوے
 جس کا ظاہر موافق قرآن کے نہ ہو تو اس کی مطابقت
 کی صورت کا سراغ لگا سکے کیونکہ حدیث بیان قرآن مجید
 کا ہے مخالف قرآن نہیں کہ مطابقت نہ ہو سکے اور
 احادیث میں سے صرف ان حدیثوں کا جاننا واجب
 ہے جو شرعی احکام کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں نہ
 ان کے سوا اور حدیثوں کا جاننا جن میں حکایا اور اخبار
 اور نصائح مذکور ہیں اسی طرح زبان عربی کے ان الفاظ
 کا جاننا واجب جو قرآن خواہ حدیث کے احکامی امور میں
 واقع ہوئے ہیں نہ یہ کہ سب لغت عربی کو جانے اور بہتر
 یہ ہے کہ لغت دانی میں اتنی محنت کرے کہ عربی کلام کے
 مقصود سے واقف ہو جاوے اس طرح کہ اختلاف مواقع
 اور حالات کی وجہ سے کلام مذکور سے یہ مراد ہوتی ہے
 اس لئے کہ خطاب شریعت عربی زبان میں وارد ہوا ہے تو
 جو شخص عربی نہ جانے گا وہ شارع علیہ السلام کا مقصود
 نہ پہچانے گا اور اقوال صحابہ اور تابعین میں اس قدر
 جانے جو درباب احکام منقول ہیں اور بڑا حصہ ان فتووں
 کا جانے جو امت کے فقہاء نے دیئے ہیں تاکہ اس کا
 حکم مخالف سلف کے اقوال کے نہ پڑے ورنہ اس صورت
 میں اجماع کی مخالفت ہوگی اور جب ان پانچوں
 اقسام کے علموں میں سے بڑا حصہ جاننا ہوگا تو وہ

شخص اس وقت مجتہد ہوگا اور یہ شرط نہیں کہ سب علموں کو بالکل جانتا ہو حتیٰ کہ کوئی چیز ان علوم کی اُس سے باقی نہ رہے۔ اور اگر ان علوم پنجگانہ میں سے ایک قسم سے بھی ناواقف ہو تو اس کی سبیل دوسرے کی تقلید کرنا ہے اگرچہ وہ شخص ایک مذہب میں کسی کے ائمہ سلف میں سے ماہر کامل ہو تو ایسے شخص کو عہدہ تفسیر اختیار کرنا اور فتویٰ دینے کا امیدوار ہونا درست نہیں۔ اور جس صورت میں کہ ان پانچوں علوم کا جامع اور خواہشات نفسانی اور بدعتوں سے علیحدہ ہو اور درج اور تقویٰ کو شعار بنایا ہو اور کبیرہ گناہوں سے محترز ہو اور صغیرہ پر اصرار نہ رکھتا ہو تو اُس کو قاضی ہونا اور اپنے اجتہاد سے شرع میں تفرق کرنا جائز ہے اور اس شخص پر جو ان شرطوں کا جامع نہیں تقلید کرنی شخص جامع کی واجب ہے اُن حادثوں میں کہ اس

وَإِذَا لَمْ يَعْرِفْ نَوْعًا مِنْ هَذِهِ الْأَنْوَاعِ فَسَبِيلُهُ التَّقْلِيدُ. وَإِنْ كَانَ مُتَّبِعًا فِي مَذْهَبٍ وَاحِدٍ مِنْ أَحَادِثِ أُمَّةِ السَّلَفِ فَلَا يَجُوزُ لَهُ تَقْلِيدُ الْقَضَاءِ وَلَا التَّرْصُدُ لِلْفِتْيَانِ وَإِذَا جُمِعَ هَذِهِ الْعُلُومُ وَكَانَ مَجَانِبًا لِلَّهِ وَأَدْوَابًا لِلْمُتَدَرِّعِينَ بِالسُّورِ مَحْتَرِزًا عَنِ الْعِبَابِ تُرْغِيبًا غَيْرَ مُصِرًّا عَلَى الصَّفَاتِ جَائِزًا. إِنْ يَتَقَلَّدُ الْقَضَاءَ وَيَتَهَرَّقُ فِي الشَّرْعِ بِالِاجْتِهَادِ وَالْفِتْوَى وَيَجِبُ عَلَى مَنْ لَمْ يَجْمَعْ هَذِهِ الشَّرَاطِطَ أَنْ يَتَقَلَّدَهُ فِي مَا يَبْعَثُ لَهُ مِنَ الْحَوَادِثِ -

کر پیش آویں۔ تمام ہوا کلام بخوبی کا۔

انتہی کلام البغوی

الغرض نصوص متواترہ سے یہ امر تو بالکل محقق ہو گیا کہ جو مسئلہ معلوم نہ ہو اُس میں علماء کی تقلید کرنی چاہیے اس لئے مطلق تقلید کو تمام محققین اہل حدیث بھی واجب تسلیم کرتے ہیں۔ اکثر اہل حدیث مطلق تقلید کی فرضیت کے قائل بھی ہیں۔

اب خلاف تقلید شخصی میں رہا یعنی کسی امام معین کی تقلید ہر مسئلہ اور ہر حکم میں کرنا یہ علماء اہل سنت والجماعہ کے نزدیک واجب ہے کیونکہ مطلق تقلید جس کی فرضیت عند الفرقین مسلم ہے اُس کے دو فرد ہیں۔ شخصی اور غیر شخصی اس لئے جائز ہو کہ اس مطلق فرض کو اُس کے جس فرد میں چاہیں ادا کر دیں۔ تقلید غیر شخصی کر کے بھی اس فریضہ سے ایسے ہی بری ہو سکیں جیسے تقلید شخصی کر کے بری ہوتے ہیں۔

کیونکہ مامور یہ جب مطلق ہوتا ہے تو لا علی التبعین اس کے فرد کو ادا کر دینے سے مامور بری الذمہ ہو جاتا ہے دیکھو اگر کوئی شخص اپنے خادم کو حکم کرے کہ کسی آدمی کو بلا تو وہ مختار ہے چاہے زید کو بلا لے یا عمر کو یا بکر وغیرہ کو اور وہ جس کو بلا لے گا اپنے فرض منصبی سے بری الذمہ ہو جائے گا۔

اسی لئے چونکہ مامور بنص قرآن مطلق تقلید ہے اور اس کے دو فرد ہیں صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں دونوں فرد پر عمل ہوتا رہا کوئی تقلید شخصی کرتا تھا اور کوئی غیر شخصی تقلید شخصی کرنے والے غیر شخصی کرنے والوں پر کوئی گرفت نہ کرتے اور علیٰ بذاتقلید غیر شخصی کرنے والے شخصی کرنے والوں کو باطل پر نہ سمجھتے تھے جس کو انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب روایات سے مشاہد کر کے دکھلایا جائے گا۔

الغرض دونوں قسم کی تقلید زمانہ صحابہ و تابعین میں ہوتی رہی لیکن جب دوسری صدی کے اخیر میں دیکھا گیا کہ مذاہب مجتہدین کے بکثرت پیدا ہو گئے۔ بہت کم احکام ایسے باقی رہے جن کے حرمت و حجاز میں یا کراہت و استحباب وغیرہ میں خلاف نہ ہو۔ ادھر ابنائے زمانہ میں ہوا وہوس کا غلبہ دیکھا گیا وہ رخصتوں کو تلاش کرنے لگے جس امام مجتہد کا جو مسئلہ اپنی خواہش کے موافق ملا اس کو اختیار کر لیا اور باقی کو پس پشت ڈالا۔ یہاں تک کہ اندیشہ ہو گیا کہ یہ دین متین ایک خواہشات کا مجموعہ بن جائے اور بجائے اس کے کہ مسلمان اپنے دین کا اتباع کریں۔ اب یہ دین کو اپنی خواہش کے تابع بنالیں گے اس لئے اس زمانہ کے زیرک اور دور اندیش علماء نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اب تقلید غیر شخصی میں اتنے بڑے بڑے مفاسد پیدا ہو گئے اور آئندہ ان سے بڑے مفاسد کا اندیشہ ہے اس لئے اس وقت مصلحت شرعی کا تقاضا یہ ہے کہ تقلید غیر شخصی سے لوگوں کو روکا جائے اور سب کو تقلید شخصی پر جمع کر دیا جائے۔

اس پر اجماع منعقد ہو گیا۔ چنانچہ محدث الحد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ جن کی جلالت قدر اور علم حدیث کا اعتراف محققین اہل حدیث مثل نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم کو بھی ہے اپنے رسالہ الانصاف ص ۵۹ میں فرماتے ہیں۔

وبعد المأتین ظهر فيهم التعصب
 دوسری صدی کے بعد لوگوں میں خاص خاص
 بالجتہدین باعیانہم وكان هذا
 ائمہ کے مذہب کی پابندی یعنی تقلید شخصی شروع
 هو الواجب في ذلك الزمان -
 ہوئی اور اس زمانہ میں یہی واجب تھی۔

چونکہ مطلق تقلید کے دوسروں سے تقلید غیر شخصی مفسر ثابت ہوئی اس لئے اب فرض
 تقلید کا ادا کرنا صرف تقلید شخصی میں منحصر ہو گیا اور بوجہ ذریعہ ادا فرض (بہ ثبوت ظنی) ہونے
 کے واجب ہو گئی۔

تقلید شخصی کے وجوب کی ایک واضح مثال

خلافت راشدہ کے عہد میں

اہل علم پر مخفی نہیں کہ عرب کے قبائل کی زبانیں عربی ہونے میں مشترک ہونے کے باوجود مختلف
 تھیں جیسے ہندوستان میں پورب کچھم اور دتی لکھنؤ کی زبانیں مختلف سمجھی جاتی ہیں۔ اسی لئے
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ قرآن مجید کو ان ساتوں لغت پر نازل کیا جاوے
 تاکہ کسی قبیلہ کو شکایت یا پڑھنے میں کلفت نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعاؤ
 تناسل سے قرآن کریم سات لغات پر نازل ہوا جس کو حدیث کے الفاظ میں سبعة احرف
 سے تعبیر کیا گیا ہے (موطا امام مالک) اور عہد نبوت میں ان ساتوں لغت کے موافق قرآن مجید پڑھا
 جاتا رہا۔

مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں جب عجم کی فتوحات ہوئیں اور قرآن کریم
 عجم میں شائع ہوا۔ اس وقت لغات سبعہ کے تفرق کی وجہ سے اہل عجم حیران ہوئے۔ اور
 اندیشہ ہوا کہ یہ لغات سبعہ جو آسانی کے لئے طلب کئے گئے تھے اب کہیں مشکلات بلکہ تحریقات
 کا ذریعہ نہ بن جائیں۔ اس لئے جامع القرآن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حکم فرمایا کہ اب
 قرآن مجید کو صرف ایک ہی لغت میں پڑھا جائے بقیہ لغات میں پڑھنے اور لکھنے کی ممانعت
 فرمادی اور صحابہ کرام کے پھہرے مجمع نے اس کو بچشم صواب دیکھا اور نہایت ضروری خیال

کیا کسی نے بھی اس پر زکیر نہیں کی غرض باجماع صحابہ سبعة احرف میں کحرف واحد پر
اقتصار کرنا ضروری اور واجب سمجھا گیا۔

بعینہ ہی مثال تقلید شخصی اور غیر شخصی کی ہے کہ قرون خیر میں چونکہ اتباع ہوئی کا غلبہ نہ
تھا وہاں تقلید کی دونوں قسموں میں اختیار تھا جس پر چاہے عمل کرے۔ مگر قرون مابعد یعنی تیسری
صدی کے اوائل میں جب غلبہ ہوا وہوس مشاہد ہوا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی
کے مطابق ہوائے نفسانی لوگوں کے رگڑ پے میں سرایت کرنے لگی تو علمائے وقت نے
باجماع یہ ضروری سمجھا کہ تقلید غیر شخصی سے لوگوں کو منع کیا جاوے اور صرف تقلید شخصی ہی
واجب سمجھی جاوے ورنہ تقلید غیر شخصی کی آرٹ میں لوگ محض اپنے نفس کے مقتدی بن جائیں
گے جو کہ باجماع امت حرام ہے۔

حافظ ابن تیمیہ جن کو حضرات غیر مقلدین بھی امام مانتے ہیں۔ انھوں نے اپنے فتاویٰ
میں اس پر اجماع امت کا دعویٰ کیا ہے کہ اپنی نفسانی خواہش کے مطابق سمجھ کر بغرض
اتباع ہو کسی حدیث یا کسی امام کے مذہب کو اختیار کرنا حرام ہے۔

حیث قال فیمن نکح عند شہود فسقة ثم طلقها ثلاثا فاراد التخلص
من المحرمة المغلظة بان النکاح کان فاسدا فی الاصل علی مذہب الشافعی
فلم یقع الطلاق مانصه وهذا القول یخالف اجماع المسلمین فانهم
متفقون علی ان من اعتقد حل الشئ کان علیہ ان یعتقد ذلك سواء
وافق غرضه او خالف ومن اعتقد تحریمه کان علیہ ان یعتقد ذلك فی
المحالین وهو لاء المطلقون لایقولون بفساد النکاح بفسق الولی الا عند
الطلاق الثلاث لا عند الاستمتاع والتوارث یكونون فی وقت یقلدون
من یفسد اذ فی وقت یقلدون من یصحح بحسب الغرض والهوی
ومثل هذا لایجوز باتفاق الامة (ثم قال بعد ثلاثة اسطر) ونظیر
هذا ان یعتقد الرجل ثبوت شقعة الجوار اذا کان طالباً لها وعدم
ثبوتها اذا کان مشتملاً فان هذا لایجوز بالاجماع وكذا من بنی علی صحة ولا

الفاسق فی حال نکاحہ و بنی علی قساد و لایتہ حال طلاقہ لم یجز ذلک
 باجماع المسلمین و لو قال المستفتی المعین انا لکن اعدت ذلک
 وانا لیوم الترم ذلک لم یکن من ذلک لہ لان ذلک یفتہ باب
 التلاعب بالمدین و یفتہ الذریعة الی ان ینوی التحلیل و التحویر بحسب
 الاہواء (فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۳ ص ۲۴۰ و ۲۴۱)

مقلدین پر اعتراض کرنے والے حضرات سوچیں کہ ان حضرات صحابہؓ کو وہ کیا کہیں
 گے جنہوں نے عوام کی غلطی میں پڑ جانے کے خوف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
 جاری کئے ہوئے سات لغات میں سے صرف ایک کو بتعین واجب کر کے باقی کو
 ناجائز قرار دے دیا اور اگر وہ ان حضرات کی طرف سے کوئی توجیہ کرتے ہیں تو کیا
 مقلدین ان سے اس کی توقع رکھیں کہ ان کی طرف سے بھی وہی توجیہ قبول کر لی جاوے۔

ایک مسئلہ فقہیہ | اسی کی نظیر ایک مسئلہ فقہیہ بھی ہے کہ سبع قرات جو آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم سے بتواتر منقول ہیں۔ ساتوں قراتوں میں
 قرآن کا پڑھنا ہمیشہ معمول رہا ہے لیکن شارح منیہ علامہ حلبی رح نے تحریر فرمایا ہے
 کہ یہ زمانہ جبل و نادانی کا ہے اس لئے بہتر یہ ہے سب قرات کے جو اپنے ملک میں
 رائج ہو دوسری قرات نہ پڑھی جاوے۔ تاکہ عوام اس مغالطہ میں نہ پڑ جائیں کہ قرآن
 کے الفاظ میں اختلافات ہیں۔

**سوال دوم (تقلید شخصی کب سے
 شروع ہوتی اور کیوں ہوتی؟)**

تسرون مشہود لہما بالخیر یعنی زمانہ صحابہؓ تابعین
 میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے۔ جو شخص کسی
 مسئلہ سے واقف نہ ہوتا تھا وہ کسی عالم سے

مسئلہ پوچھ کر اس کی تقلید کر کے عمل کرتا تھا اور اس میں تقلید شخصی اور غیر شخصی دونوں
 کے نظائر اس عہد مبارک میں ملتے ہیں۔ تقلید غیر شخصی کا چونکہ حضرات اہل حدیث بھی اقرار
 کرتے ہیں اس لئے اس کے نظائر جمع کرنے کی ضرورت نہیں صرف وہ چند واقعات
 لکھے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ صحابہؓ و تابعین میں بھی بعض لوگ تقلید شخصی

کے پابند تھے۔ اور کسی ایک ہی عالم کو اپنا مقتدا بنایا ہوا تھا۔ تمام مواضع خلاف میں ان کے مذہب کو راجح سمجھ کر اسی پر عمل کرتے ہیں۔

حدیث الہند حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں
 اختلف فی کثیر من الاحکام واتبعہ فی ذلک اصحابہ من اهل مکة
 یعنی حضرت ابن عباس نے جب مکہ میں اقامت فرمائی تو بہت سے مسائل میں دوسرے صحابہ کے خلاف کیا اور بہت سے اہل مکہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کو مرجح بنا کر انہیں کے فتویٰ پر عمل کیا۔

محل خلاف میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کو ترجیح دینا اور ان کے فتویٰ پر عمل کرنا یہی تقلید شخصی ہے۔

نیز حجۃ اللہ ہی میں فرماتے ہیں۔ وکان ابراہیم واصحابہ یرون ابن مسعود
 واصحابہ اثبت الناس فی الفقه۔

یعنی حضرت ابراہیم نخعی اور ان کے تلامذہ حضرت عبداللہ ابن مسعود اور ان کے تلامذہ کو فقہ میں اثبت الناس سمجھتے۔ محل خلاف میں انہیں کے قول کو ترجیح دیتے تھے اور تقلید شخصی کا کوئی اس سے زائد مضموم نہیں۔

اور ابو داؤد مجتہبی ص ۶۸ عن عمرو ابن میمون قال قدم علينا معاذ بن ابي
 رسول رسول الله الى قوله فالقيت محبتي عليه فما فارقتہ حتى دفنتہ بالشام
 ميتاً ثم نظرت الى افقه الناس بعداً فایت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فلزمته حتى
 مات الحديث۔

یعنی عمرو ابن میمون کہتے ہیں کہ جب معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد مہر کتشریف لائے تو میں نے ان سے محبت کی اور اس وقت تک جدا نہیں ہوا جب تک کہ ان کو شام میں دفن کر لیا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ اب الفقہ الناس کون ہے تو حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان کی خدمت میں رہا یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

الحاصل تقلید زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوئی۔ آپ کے حکم سے ہوئی اور پھر صحابہ میں ہمیشہ رہی۔ بعض حضرات نے مطلق تقلید سے کام لیا بعض نے تقلید شخصی سے۔
باقی رہا آپ کا یہ سوال تقلید کیوں ہوئی؟ تو اول تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا امر فرمایا جمہور صحابہ نے اس پر عمل کیا تو پھر ایک مسلمان کے لئے اس سوال کی گنجائش نہیں رہتی کہ یہ "کیوں ہوئی" علاوہ بریں اس کی حکمت کچھ مخفی بھی نہیں کیوں کہ تقلید کا حال علوم دینیہ میں بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ علوم دنیویہ طب و ریاضی و ہنیت کا اور دست کاریوں مثل بخاری و معجمی وغیرہ کا کہ ناواقف کو ان سب میں بدون تقلید کسی واقف کے چارہ نہیں۔ ایسے ہی علوم دینیہ میں ناواقف کو بدون تقلید واقف کے چارہ نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

(۳) تقلید صرف ائمہ اربعہ ہی کی کیوں کی جاتی ہے۔ کیا کوئی دوسرا امام اس درجہ کا نہیں ہوا جس کی تقلید کی جائے۔ اور کیا ائمہ اربعہ کی تقلید کا حکم کسی نص میں وارد ہوا ہے؟ ائمہ اربعہ پر سلسلہ تقلید ختم ہونا کوئی امر عقلی یا شرعی نہیں بلکہ محض اتفاقی ہے کہ مشیت خداوندی سے ان چار مذاہب کے سوا اور جتنے مذاہب تھے مندرس ہو گئے اور مٹ کر کان لہ یکن ہو گئے۔ دو چار دس بیس یا پچاس سوا قوال و احکام اگر آج ان کے منقول موجود بھی ہوں تو وہ کوئی مستقل مذہب نہیں بن سکتا۔ کہ لوگ اس کی تقلید کیا کریں کیونکہ اگر ان سو پچاس احکام میں ان کی تقلید کر بھی لی تو باقی ہزاروں مسائل میں کیا کریں گے۔
اب جب کہ دیکھا گیا کہ کل مذاہب سوائے ان چار مذاہبوں کے مندرس ہو گئے تو ناچار سلسلہ تقلید انہیں میں منحصر ہو گیا۔

چنانچہ ابن خلدون اپنے مقدمہ تاریخ میں ظاہر ہے کہ مذہب پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ثم درس منہب اهل الظاهر اليوم بلادوس اثنته وانكار الجمہور
على منطلیہ و لم یبق الا فی الکتب المجلدۃ۔

اور اسی تاریخ ابن خلدون میں یہ بھی مصرح ہے کہ ووقف التقليد فی الامصار

عند هؤلاء الأربعة ودرس المقلدون لمن سواهم وسد الناس باب
التحلاف وطرقه ولما كثرتشعب الاصطلاحات في العلوم ولما عاق
عن الوصول الى رتبة الاجتهاد ولما خشي من اسناد ذلك الى غير اهل
ومن لا يوثق برأيه ولا يبدأ به فصرحوا بالعجز والاعواز وردوا الناس الى
تقليد هؤلاء كل من اختص به من المقلدين وحظوا وان يتداول
تقليد هم لما فيه من التلاعب ولم يبق الا نقل مذاهبيهم وعمل كل
مقلد بما ذهب من قلادة متهم بعد تصحيح الاصول والاتصال بابتدائها
بالرواية - ولا محصول اليوم للفقهاء غير هذا وملاهي الاجتهاد لهذا العهد
مردود على عقبيه مهجور تقليداً وقد صار اهل الاسلام اليوم على تقليد
هؤلاء الأئمة الأربعة انتهى كلامه -

اور حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ عقد الجید ص ۳۸ میں فرماتے ہیں، ولما انقضت
المذاہب المحقة الا هذه الأربعة كان اتباعها اتباعاً للسواد الاعظم والخروج
عنها خروجاً عن السواد الاعظم -

اور شیخ ابن ہمام فتح القدير میں فرماتے ہیں انعقد الاجماع على عدم العمل
بالمذاہب المخالفة للأئمة الأربعة -

اور علامہ ابن حجر مکی فتح البین شرح الاربعین میں فرماتے ہیں اما في زماننا فقل
انتمنا لا يجوز تقليد غير الأئمة الأربعة الشافعي ومالك وابي حنيفة واحمد
ابن حنبل -

اور طحاوی حاشیہ در مختار میں فرماتے ہیں من كان خارجاً عن هذا الأربعة
فهو من اهل البدعة والنار -

آب کسی کا اس پر یہ دلیل طلب کرنا کہ تقلید چار میں کیوں منحصر ہو گئی محض یہ لاج
اور بالکل ایسا ہے کہ ایک شخص کے اولاد کثیر ہو لیکن وہ مرتے رہیں یہاں تک کہ جب باپ
کا انتقال ہو تو چار بیٹوں کے سوا اور کوئی باقی نہ رہے۔ اب ظاہر ہے کہ تقسیم میراث انھیں

چاروں میں منحصر ہوگی۔ حالانکہ اولاد ان کے سوا اور بھی تھی۔ لیکن آپ نے کسی کو یہ کہتے نہ سنا ہوگا کہ میراث انہیں چار میں کیوں منحصر ہو گئی۔ اور جو کوئی کہے تو اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بھائی مشیتِ ایزدی ہی تھی۔

مآجیون صاحب نے تفسیر احمدی میں لکھا ہے والانساق ان المخصا رالمذاہب فی الاربع فضل الہی وقبولیۃ من عند اللہ لا مجال قید للتوجیہات و الادلۃ۔ انتھی۔

باقی رہا آپ کا یہ فرماتا کہ کونسی آیت قرآن و حدیث نبوی ان کے نام وارد ہوئی سو یہ ایک عجیب سوال ہے۔ احکام شرع نام بنام وارد نہیں ہوا کرتے ورنہ پھر یہ بتلائیے کہ کونسی آیت قرآنی و حدیث نبوی آپ کے نام سے وارد ہوئی ہے کہ آپ کو روٹی کھانا اور کپڑا پہننا جائز ہے۔ کونسی آیت میں آپ کا نام لے کر یہ بتلایا ہے کہ آپ کو سونا اور اٹنا بیٹھنا جائز ہے۔ اگر ثبوت احکام میں نام بنام آیت کی ضرورت ہو کرے تو انشاء اللہ دنیا میں آج نہ کسی پر کوئی چیز منسوخ و واجب رہے گی اور نہ حرام و مکروہ۔ کونسی آیت یا حدیث آپ دکھلائیں گے جس میں آپ کا نام لے کر آپ پر نماز واجب کی گئی ہو۔ اسی طرح مثال مذکور میں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ چار بیٹوں کو جو میراث دی گئی ہے کونسی آیت یا حدیث ان کے نام بنام وارد ہوئی ہے۔ ہرگز نہیں۔ البتہ حکم عام سب کے لئے موجود ہے سو وہ دوبارہ تقلید ائمہ بھی موجود ہے جیسا کہ اوپر گذرا مثل قول باری تعالیٰ فامسئلو اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ کیونکہ ائمہ اربعہ بلا شک اہل ذکر میں سے ہیں۔



سوال نمبر ۳

جو شخص ائمہ اربعہ میں سے کسی کا مقلد نہ ہو اس کی امامت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

ایسے شخص کی امامت فی نفسہ تو جائز ہے مگر چونکہ اس زمانہ میں جو لوگ ائمہ مجتہدین کی

تقلید نہیں کرتے اور بزرگم خود حدیث پر عمل کرنے کے مدعی ہیں ان کے بعض افعال ایسے ہیں جو مفسد صلوٰۃ ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ لوگ ڈھیلے سے استنجا نہیں کرتے اور اس زمانہ میں قطرہ کا آنا عموماً یقینی ہو گیا ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں کے پاجامے اکثر ناپاک ہوتے ہیں بایں وجہ ان کی امامت سے احتراز چاہئے فقط

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم
کتبہ العبد الضعیف
محمد شفیع عفا اللہ عنہ
مدرس دارالعلوم دیوبند ۱۳۳۵ھ ہجری

مسئلہ تقلید پر

حضرت قائم العلوم و الحسینات نور اللہ مرقدہ کا محققانہ تبصرہ

تقلید کی بات سنئے۔ لاریب دین اسلام ایک ہے اور چاروں مذہب حق مگر جیسے نین طبابت یونانی یا ڈاکٹری انگریزی ایک ہے اور سارے طبیب کامل قابل علاج اور ہر ایک ڈاکٹر قابل معالج ہے اور پھر وقت اختلاف تشخیص اطباء یا مخالفت رائے ڈاکٹر ان جس طبیب کا علاج یا جس ڈاکٹر کا معالجہ کیا جاتا ہے۔ ہر بات میں اسی کا کہنا کیا جاتا ہے دوسرے طبیب کی یا دوسرے ڈاکٹر کی رائے نہیں سستی جاتی ایسی ہی وقت اختلاف امر جس مجتہد کا اتباع کیا جائے ہر بات میں اسی کی تابعداری ضروری ہے۔ ہاں جیسی کبھی ایک طبیب یا ڈاکٹر کا علاج چھوڑ کر دوسرے کی طرف رجوع کر لیتے ہیں اور پھر بعد رجوع ہر بات میں دوسرے کا اتباع مثل اول کیا جاتا ہے ایسے ہی کبھی کبھی بعض بزرگوں نے زمانہ سابق میں کسی وجہ سے ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیا تھا اور

بعد تبدیل مذہب ہر بات میں دوسرے ہی کا اتباع کیا یہ نہیں کیا کہ ایک بات ان کی لی اور ایک بات ان کی لی اور تدبیر سے ایک لاندہبی کا پانچواں انداز گھڑ لیا۔ امام طحاوی جو بڑے محدث اور فقیہ ہیں پہلے شافعی تھے پھر حنفی ہو گئے تھے بالجملہ بے تقلید کام نہیں چلتا۔ یہی وجہ ہوئی کہ کروڑوں عالم اور محدث گذر گئے پر مقلد ہی رہے۔ امام ترمذی کو دیکھئے کتنے بڑے عالم اور فقیہ اور محدث تھے۔ ترمذی شریف انہیں کی تصنیف ہے باوجود اس کمال کے مقلد ہی تھے اعتبار نہ ہو تو ترمذی شریف کو دیکھ لیجئے جب ایسے عالم اس کمال پر مقلد ہی رہے امام شافعی کی تقلید امام ترمذی نے کی اور امام طحاوی اور امام محمد اور امام ابو یوسف نے امام ابو حنیفہ کی تقلید کی ہو پھر آج ایسا کونسا عالم ہو گا جس کے ذمہ تقلید ضروری نہ ہو۔ اگر کسی بڑے عالم نے اماموں کی تقلید نہ کی بھی تو کیا ہوا۔ اور اول تو کروڑوں کے مقابلہ میں ایک دو کی کون سنتا ہے جس عاقل سے پوچھو گے یہی کہے گا کہ جس طرف ایک جہان کا جہان ہو وہی بات ٹھیک ہوگی۔

بائیں ہمہ یہ کونسی عقل کی بات ہے کہ اس بات میں عالموں کی چال ہم اختیار کریں یہ ایسی بات ہے کہ کوئی مریض جاہل کسی طبیب کو مرض کے وقت دیکھے کہ اپنا علاج آپ کرتا ہے اور دوسرے طبیب سے نہیں پوچھتا یہ دیکھ کر یہ بھی یہی انداز اختیار کرے کہ اپنا علاج اپنے آپ کرنے لگے اور طبیبوں سے کام نہ رکھے تو تم ہی کہو ایسے آدمی عاقل کہلائیں گے یا بے وقوف۔ سو ایسے ہی کسی عالم کو غیر مقلد دیکھ کر جاہل اگر تقلید چھوڑ دیں تو یوں کہو علم تو تھا یا نہ تھا عقل دین بھی دشمنوں ہی کو نصیب ہوئی اور جاہلوں کو جانے دیجئے آج کل کے عالم یقین جانتے کل نہیں تو اکثر جاہل ہی ہیں بلکہ بعض عالم تو جاہلوں سے بھی زیادہ جاہل ہیں دو کتابیں اردو کی بغل میں دبا کر دغظ کہتے پھرتے ہیں اور علم کے نام خاک بھی نہیں جانتے کم سے کم علم اتنا تو ہو کہ ہر علم کی ہر ایک کتاب طالب علم کو پڑھا سکے۔

باقی رہی تراویح اس میں جو آج کل ملائوں نے تحفیف نکال دی ہے یعنی بیس کی آٹھ کر دی

ہیں تو ہر ایک کو بوجہ آسانی یہ بات پسند آتی ہے۔ پر یہ بات کوئی نہیں سمجھتا کہ آٹھ رکعتیں جو حدیث میں آئی ہیں تو وہ تہجد کی رکعتیں ہیں تہجد اور چیز ہے اور تراویح اور چیز۔ تراویح کی بیس ہی رکعتیں ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہزار باصحابہ تھے اُس زمانے سے لے کر آج تک کسی نے بیس رکعت میں حجت نہ کی تھی مگر آج کل ایسے اُن پر طہامی عالم پیدا ہوئے ہیں کہ انھوں نے حضرت عمرؓ اور صحابہؓ کی بھی غلطی نکالی سبحان اللہ یہ منہ اور مسوہ کی وال۔

باقی یہ کہنا کہ حضرت عمرؓ سے پہلے بیس رکعتیں نہیں پڑھتے تھے یہ خیال خام ہے۔ یہ بات اتنی بات سے کیونکر نکل آئی کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بیس کا اتہام شروع ہوا۔ دیکھئے پہلے زمانہ میں نکاح ثانی کا اس لئے چنداں اتہام نہ تھا کہ اس نکاح کو اتنا بُرا نہ سمجھتے تھے جب شاہ ولی اللہ صاحب نے یہ دیکھا کہ اس امر خیر کو آج کل معیوب سمجھنے لگے انھوں نے اس کا ذکر اپنی تصانیف میں کیا آخر کار اُن کی اولاد اُن کے شاگردوں نے اس کو جاری کرنے میں کمر باندھی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ نکاح ثانی شاہ ولی اللہ صاحب اور اُن کے خاندان کا ایجاد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی بات نہیں۔ ایسی ہی بیس رکعت کو حضرت عمرؓ اور اُن کے زمانہ کے صحابیوں کا ایجاد نہ سمجھئے۔ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سمجھئے ورنہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ حضرت عمرؓ نہ تھے اور ان کے زمانہ کے صحابی سستی نہ تھے سب کے سب نعوذ باللہ بدعتی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مٹا دیا، اپنی سنت جاری کر دی اب تھی بتاؤ حضرت عمرؓ اور اصحابِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا برا سمجھنے والا کون ہوتا ہے۔

میاں جیو صاحب حضرت عمرؓ اور اصحاب رضی اللہ عنہم کی پیروی کا حکم صحیح صحیح حدیثوں میں موجود ہے۔ ایک دو حدیث لکھے دیتا ہوں انھیں مولوی صاحب سے ان کا ترجمہ کرا لینا جو آٹھ رکعت گاتے پھرتے ہیں۔ ایک حدیث تو یہ لیجئے۔ علیہ السلام بسنتی و سنتہ الخلفاء الراشدين من بعدی و و سري ليحجے اقتدا و بالذین من بعدی تیسری لیجئے اصحابی کا لنجوم بایہم اقتدایتم اھدایتم فقط۔

امام الامیر امام اعظم عظیم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

کے متعلق

حفاظ حدیث اور ائمہ اسلام کے چند اقوال پر

از

امام حدیث ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ

امام اعظم ابو حنیفہؒ کی جلالت قدر اور فضائل و مناقب سے غالباً کوئی شخص جس نے کسی مسلمان گھرانے میں پرورش پائی ہو بے خبر نہیں ہوگا۔ ان کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ تفسیق فی الدین اور شان امامت سے وہ لوگ بھی انکار نہیں کر سکے جو امام صاحب پر طعن و تشنیع ہی کو اپنا مذہب بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن بہت سے لکھے پڑھے مگر کم علم و کم فہم لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ حضرت امام صاحبؒ کو حدیث میں وہ پایہ اور مرتبہ حاصل نہ تھا جو دوسرے ائمہ کا امتیازی وصف سمجھا گیا ہے۔ بہت سے علم حدیث اور عمل بالحدیث کے مدعی جو امام ہمام پر طعن و جرح کے لئے تیار بیٹھے رہتے ہیں یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم صرف اسی راستہ سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں کہ علم حدیث اور فن روایت میں امام اعظم رحمہ کا مرتبہ گھٹایا جائے لیکن انھیں یاد رکھنا چاہئے:-

چراغے زکریا زور بر سر زور کسے کو تف زندریش لبوزور

اس مختصر مضمون میں نہ امام موصوف کی سوانح بیان کی جا سکتی ہے نہ وہ تمام اقوال و شہادات جو ائمہ حدیث اور علماء سلف و خلف سے حضرت امامؒ کی شان میں منقول ہیں جمع کی جا سکتی ہیں۔ بلکہ ہماری غرض اس وقت اس مقالہ کا پیش کرنا ہے جو اس باب میں امام حدیث ابو عمرو بن عبدالبرؒ شارح مؤطا مالکی المذہب نے اپنی کتاب جامع العلم میں تحریر فرمایا ہے۔ امام ابن عبدالبرؒ تیسری صدی ہجری کے ان علماء میں سے ہیں جن پر اندلس و قرطبہ کے علم کا مدار سمجھا گیا ہے۔ آپ ۳۶۸ھ میں قرطبہ میں پیدا ہوئے وہیں علم و فن حاصل کیا پھر

اندلس کے مختلف شہروں میں قاضی رہے آپ کی بے شمار تصانیف حدیث و فقہ اور تاریخ میں اپنے اپنے فن کی روح سمجھی گئی ہیں۔ آپ فقہ میں امام مالک کے مقلد میں حنفی المذہب نہیں۔ اس لئے آپ کا کلام امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ کے بارہ میں اور بھی زیادہ قابل اعتناء ہے۔ اسی لئے بہتر یہ معلوم ہوا کہ ان کے اصل عربی کلمات بھی درج مضمون کئے جائیں اور ترجمہ دوسرے کالم میں رہے۔ واللہ المستعان

قال ابو عمر، اقرط اصحاب الحدیث فی ذم ابی حنیفة و تجاوزوا الحد فی ذلک و السبب الموجب لذلک عندنا هو اذ خالہ الراعی و القیاس علی آثار و اعتبارہما و اکثر اهل العلم یقولون اذا صح الاثر بطل القیاس و النظر و کان ردہ لما رد من اخبار الآحاد بتاویل محتمل و کثیر منه قد تقدّم الیہ غیرہ و تابعہ علیہ مثلہ ممن قال بالراعی و جلّ ما یوجد له من ذلک ما کان منه اتباعاً لاهل بدایہ کا براہیم النخعی و اصحاب ابن مسعود الا انہ اغرق و اقرط فی تنزیل النوازل ہو و اصحابہ و الجواب فیہا براہیم و استحصانہم فاقی منهم فی ذلک خلاف کبیر للسلف و شنع ہی عندنا لخالفیہم بدع و ما

امام ابو عمر و ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ (بعض اصحاب حدیث نے امام ابوحنیفہ رحمہ کی مذمت میں سخت زیادتی کی ہے اور حد سے تجاوز کر گئے اور سبب اس کا ان کے نزدیک یہ ہے کہ امام موصوف نے احادیث و آثار میں رائے اور قیاس کو دخل دیا ہے۔ اور اکثر اصحاب حدیث یہ کہتے ہیں کہ جب کوئی حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو قیاس باطل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ امام موصوف نے جن اخباراً کو ترک کیا ہے وہ کسی ایسی تاویل کی وجہ سے کیا ہے جس کی ان اخبار میں گنجائش تھی (پھر امام موصوف اس عمل میں مفرد بھی نہیں بلکہ ان سے پہلے دو کرامت نے بھی ایسا کیا اور ان کے بعد بھی (علماء حقانی) نے ایسا ہی کیا ہے العزیز جو کچھ حدیث میں قیاس کا دخل وغیرہ انہوں نے کیا ہے وہ سب اچھے شہر کے ائمہ حدیث و فقہ کے اتباع میں کیا ہے مثلاً حضرت ابراہیم نخعی اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگرد۔ البتہ امام موصوف کے مسائل میں اس کی کثرت ہے کما انہوں نے ان کے شاگردوں نے بہت مسائل کی صورت میں (جو بیانات فقہیہ) فرض کر کے ان کے جوابات (جس جگہ حدیث و قرآن میں صریح حکم نہ ملا وہاں) اپنے قیاس سے لکھے ہیں اور سلف نے چونکہ فرضی جزیات

پر کلام نہیں کیا تھا اس لئے امام صاحب کے مخالفین نے اس فعل کو بدعت قرار دیا اور عظیم الشان خلاف قائم ہو گیا رہبر حال امام صاحب نے جو قیاس اور رائے سے بعض جو بیانات فقہیہ میں کام لیا اس میں وہ متفرد و تنہا نہیں بلکہ میں کسی اہل علم کو بھی ایسا نہیں پاتا جس نے آیات میں کسی آیت کو اور احادیث میں سے کسی حدیث کو اپنا مذہب و مختار قرار دے کر دوسری آیت اور حدیث میں تاویل نہ کی ہو یا نسخ کا دعویٰ نہ کیا ہو البتہ اس قسم کی چیزیں امام صاحب کے مذہب میں زیادہ اور دوسروں کے مذہب میں کم ہیں۔ حضرت لیث بن سعد فرماتے ہیں کہ میں نے امام مالک کے ستر مسائل ایسے شمار کر رکھے ہیں جو بالکل حدیث کے خلاف ہیں امام مالک نے محض اپنے قیاس سے وہ ارشاد فرمائے ہیں اور میں نے وہ مسائل بغرض خیر خواہی و نصیحت خود امام مالک کی خدمت میں لکھ کر دیئے تھے۔ امام ابو عمر الدین عبد البر فرماتے ہیں کہ علماء امت میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی حدیث کا صادر ہونا ثابت مانے اور پھر اس کو رد کرے جب تک کہ ایسی کسی دوسری حدیث یا اجماع و تعامل سے اس کا نسخ ہونے کا دعویٰ نہ کرے یا اس کی سند میں کوئی جرح نہ کرے اور اگر کوئی شخص ایسا کرے کہ بلاوجہ مذکور کسی حدیث کو رد کرے تو اس کی عدالت ساقط ہو جائے گی اور اس کو فسق کا گناہ ہوگا۔ ایسا آدمی امت کا امام کیسے بن سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے تمام ائمہ دین کو اس آفت سے محفوظ رکھا نیز امام

اعلم احدا من اهل العلم
الاوله تاويل في آية او مذهب
في سنة رد من اجل ذلك
المذهب سنة اخري بتاويل
سائغ او ادعاء نسخ الا ان لا يجي
حيفة من ذلك كثير او هو
يوجد لغيره قليل - وعن الليث
بن سعد انه قال احصيت على
مالك بن انس سبعين مسألة
كلها مخالفة لسنة النبي صلى الله
عليه وسلم مما قال مالك فيها
برايه قال ولقد كتبت اليه اعطه
في ذلك رقال ابو عمرو ليس لاحد
من علماء الامة يثبت حديثا عن
النبي صلى الله عليه وسلم ثم يردده
دون ادعاء نسخ عليه باثر مثله
او باجماع او بعمل يجب على اصله
الانقياد اليه او طعن في سنده و
لو فعل ذلك احدا سقطت عدالتها
فضلا ان يتخذ اماما ولزما اثم
الفسق ولقد عاقبهم الله عز و
جل من ذلك ونقموا ايضا على ابي
حنيفة الارجاء ومن اهل العلم

من ینسب الی الارحاء کثیر لم
یعن احد بنقل قبیم ما قبل فیہ
کما عنوا ہذا لک فی ابی حنیفۃ لما
وکان ایضا مع ہذا یحسد وینسب
الیہ ما لیس فیہ ویختلق علیہ
مالا یلیق بہ وقد اثبت علیہ
جماعۃ من العلماء وفضلوہ ولعلنا
ان وجدنا نشطۃ ان یجمع من
فضائلہ وفضائل مالک ایضا والشافعی
والثوری والاوزاعی کتابا املنا
جمعه قدیمافی اخبار ائمتہ
الامصار ان شاء اللہ - وعن
ابن عباس بن محمد الدوری
قال سمعت یحیی بن معین یقول
اصحما بنا یفرطون فی ابی حنیفۃ
واصحابہ فقیل لہ اکان
ابو حنیفۃ یکذب فقال کان
انبل من ذلک - وعن مسلمۃ
بن شیبیب قال سمعت احمد
بن حنبل یقول رای الاوزاعی

ابو حنیفہ کی مذمت کرنے والوں نے ان کو مرجع کی طرف بھی منسوخ
کیا ہے اور نہ صرف امام موصو کو بلکہ ائمہ دین میں سے بہت سے
دوسرے حضرات پر بھی یہی الزام لگایا گیا ہے۔ مگر اس الزام
کی وجہ سے جس قدر زبان و رازی امام موصوف کے بارہ میں
کی گئی ہے وہ دوسرے لوگوں کے متعلق نہیں کی گئی اور اس
کا سبب یہ ہے کہ وہ امت کے مشہور امام ہیں (دوسرے
اتنے مشہور نہیں) اور باوجود ان باتوں کے بعض لوگ
ان کی مذمت کرتے ہیں ان کی خداداد مقبولیت عامہ کی وجہ
سے لوگ ان سے حسد بھی رکھتے ہیں اور بہت سی ایسی چیزیں
ان کی طرف منسوب کرتے ہیں جو ان کے اندر نہیں ہیں اور
ان کی شان کے خلاف ان پر تہمتیں باندھی جاتی ہیں اور علماء
اہل حق کی بڑی جماعت نے ان کی مدح کی ہے اور ان کو
اوروں پر فضیلت دی ہے اور اگر ہمیں فرصت ملی
تو انشاء اللہ تعالیٰ امام موصو اور امام مالک و شافعی اور
ثوری اور اوزاعی وغیر جمہ ائمہ علیہم کے فضائل کو ایک مستقل
کتاب میں جمع کریں گے۔ اور عباس بن محمد دوری فرماتے ہیں
کہ میں نے حضرت یحییٰ بن معین سے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے
کہ ہمارے اصحاب امام ابو حنیفہ رح اور ان کے شاگردوں
کے بارہ میں بہت زیادتی کرتے ہیں کہ ان کے سوال کیا
کہ کیا امام ابو حنیفہ رح روایت میں سچے تھے یحییٰ بن معین نے

اسے ابداء کتاب میں جو مقدمہ مصنف رح کے حالات کے متعلق ناشر کتاب کی جانب سے لکھا ہوا ہے اس سے
معلوم ہوا کہ امام ابن عبد البر نے یہ کتاب تصنیف فرمائی جس کی صفحات آٹھ جلدوں میں ہے مگر افسوس ہے کہ اس نام
حدیث کی عرق ریزی کا یہ عظیم الشان نتیجہ اب اس قدر مفقود و نایاب ہے کہ کسی کتب خانہ میں اس کا موجود ہونا معلوم نہیں ۱۲۷

فرمایا کہ وہ اس سے بالاتر ہیں اور مسلمہ بن شیبہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں امام احمد بن حنبل رحمہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ قیاس امام اوزاعی کا اور قیاس امام مالک کا اور قیاس امام ابو حنیفہ کا سب قیاس ہی ہے اور وہ سب میرے نزدیک برابر ہیں اور حجت آثار ہی میں ہے اور امام ذراوردی کہتے ہیں جب امام مالک کسی مسئلہ کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر کے علماء کو اس کے موافق پایا ہے تو ان کی مراد ان علماء اور مجمع سے ربیعہ ابن ابی عبد الرحمن اور ابن ہرمز وغیرہ ہوتے ہیں اور محمد بن حسیب ازدی موصلی جو حفاظ حدیث سے ہیں اپنی کتاب المضغاد کے آخر میں فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن معین نے فرمایا ہے کہ میں نے کوئی عالم ایسا نہیں دیکھا جس کو امام دکیع پر مقدم اور افضل سمجھوں (اور اس کے باوجود) وہ فتویٰ امام ابو حنیفہ کے قول پر دیا کرتے تھے اور ان کی تمام حدیثیں انہیں یاد تھیں اور انہوں نے امام ابو حنیفہ سے بہت سی حدیثیں سنی تھیں۔ حافظ ازدی کہتے ہیں کہ دکیع کے بارہ میں جو کچھ یحییٰ بن معین نے فرمایا ہے یہ ان کا تلمیح ہے ورنہ یحییٰ بن سعید اور عبد الرحمن بن مہدی دکیع سے افضل تھے اور یحییٰ بن معین ان سب حضرات کی خدمت میں رہے ہیں۔ یحییٰ بن معین سے دریا فتی کیا گیا کہ کیا امام ابو حنیفہ رحمہ حدیث کے بارہ میں صدق و سچ و صحیح بیان کرنے والے تھے، فرمایا ہاں!

ورای مالک و رای ابی حنیفة کلہ رای و هو عندی سواء و انما الحجۃ فی الآثار - و عن الذراوردی اذا قال مالک و علیہ ادراکت اهل بلدنا و المعتم علیہ عندنا فانه یرید ربیعۃ بن ابی عبد الرحمن و ابن ہرمز و ذکر محمد بن الحسین الازدی الحافظ الموصلی فی الاخبار السنی فی آخر کتابہ فی الضعفاء قال یحییٰ بن معین ما رایت احدا اقدمہ علی وکیع و کان یفتی برای ابی حنیفة و کان یحفظ حدیثہ کلہ و کان قد سمع من ابی حنیفة حدیثاً کثیراً - قال الازدی ہذا من یحییٰ بن معین تحامل و لیس وکیع کیحییٰ بن سعید و عبد الرحمن بن مہدی و قدرای یحییٰ ابن معین ہؤلاء و صحبہم قال و قیل لیحییٰ بن معین یا ابا زکریا ابو حنیفة کان یصدق فی

وہ صدوق ہیں۔ پھر ان سے پوچھا گیا کیا امام شافعیؒ روایت حدیث میں سچے نہ تھے تو فرمایا کہ مجھے ان کی حدیث پسند نہیں اور نہ ادن کا ذکر پسند کرتا ہوں (ابو عمر دین عبد البر رحمہ فرماتے ہیں) کہ امام شافعی رحمہ کی حدیث کو ساقط کہنے کے بارہ میں کسی نے یحییٰ بن یحییٰ کی موافقت نہیں کی اور حسن بن علی حلوانیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت شبابہ بن سوار رحمہ نے فرمایا کہ امام حدیث شعبہؒ امام ابو حنیفہ رحمہ کے بارہ میں اچھی رائے رکھتے تھے اور مجھ سے مساور و رواق کے اشعار جو امام موصوف کی مدح میں ہیں سنا کرتے تھے۔ امام حدیث علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ سے سفیان ثوریؒ عبد اللہ بن مبارک۔ حماد بن زید۔ ہشیم اور وکیع بن جراح اور عباد بن عوام۔ جعفر بن عون جیسے ائمہ حدیث نے حدیث حاصل کی ہے وہ (بلاشبہ) ثقہ ہیں ان میں کوئی کمی نہیں۔ امام حدیث یحییٰ بن سعید رحمہ فرماتے ہیں کہ بسا اوقات ہمیں امام ابو حنیفہ رحمہ کے اقوال پسند آتے ہیں تو ہم انہیں کو اختیار کرتے ہیں اور بیان کیا کہ امام ابو یوسف رحمہ تلمیذ امام ابو حنیفہ رحمہ سے میں نے جامع صغیر پڑھی ہے۔

یہ تمام روایات حافظ ازدی نے بیان کی ہیں۔ امام ابن عبد البر رحمہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں

الحدیث قال نعم صدوق وقیل
لہ فالشافعی کان یکذب قال
ما احب حدیثہ ولا ذکرہ
ر قال ابو عمر) لم یتابع یحیی بن
معین احد فی قوله فی الشافعی
وقال الحسن بن علی الحلوانی
قال لی شبابہ بن سوار کان
شعبۃ حسن الرأی فی ابی حنیفۃ
وکان یستنشد فی ابیات
مساور الوراق۔

اذا ما الناس یوما قایسونا
بأبدۃ من الفتیا لطیفہ
وقال علی بن المدینی ابو
حنیفۃ روی عنہ الثوری وابن
المبارک وحماد بن زید وھشیم
ووکیع بن الجراح وعباد بن
العوام وجعفر ابن عون وهو
ثقة لا بأس بہ وقال یحیی بن
سعید ربما استحسننا الشئ من
قول ابی حنیفۃ فناخذ بہ
قال یحیی وقد سمعت من ابی
یوسف الجامع الصغیر ذکرہ
اللاذی ر قال ابو عمر) الذین

نے امام ابو حنیفہ رحمہ سے روایت کی اور ان کی توثیق
سرمائی اور ان کی مدح و ثنا کی وہ ان لوگوں
سے زائد ہیں جنہوں نے ان کے بارہ میں کچھ کلام
کیا ہے (وہ بھی کسی واقعی عیب کی وجہ سے نہیں)
بلکہ صرف اس لئے کہ انہوں نے ایسے مسائل میں
جن میں کوئی نص قرآن و حدیث میں وارد نہیں
قیاس سے کام لیا اور ان کی طرف ارجحیت کی نسبت
کی گئی ہے اور یہ بات ہمیشہ سے کہی جاتی ہے کہ،
متقدمین میں کسی شخص کے بارہ میں لوگوں کا مختلف
رائیں رکھنا اس شخص کی جلالت قدر اور عظمت
شان کی دلیل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ
وہجہ کا واقعہ خود اس کی دلیل ہے کہ ان کے بارہ
میں دو قسم کے لوگ تباہی میں پڑ گئے۔ ایک ان سے
محبت رکھنے والے جنہوں نے اذیات محبت کی
وجہ سے حدود شرعی سے تجاوز کیا۔ دوسرے جو بغض
رکھنے والے جو حدود شرعی سے تجاوز کر گئے یہی مغفرت
حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ

رحمۃ اللہ علیہ ص ۱۹۲) کے بارہ میں محبت سے حد سے بڑھنے والے اور عداوت رکھنے والے ہلاک ہوں گے اور جن لوگوں
کو حق تعالیٰ دین میں عظمت و جلالت اور بزرگی نصیب فرماتا ہے ان کی یہی شان ہوتی
ہے۔ (مختصر جامع العلم ص ۱۹۳)

روا عن ابی حنیفۃ و وثقوہ و
اثنوا علیہ اکثر من الذین
تکلموا فیہ و الذین تکلموا فیہ
من اهل الحدیث اکثر ما عابوا
علیہ الاغراق فی الرای و القیاس
والارجاء و کان یقال یستدل
علی نبأه الرجل من الماضین
بتباین الناس فیہ قالوا لا تری
الی علی بن ابی طالب انه هلك
فیہ فتیان محب افراط و مبغض
افراط و قد جاء فی الحدیث
انه یهلك فیہ رجلا ن محب
مفراط و مبغض و هذا صفة
اهل النبأه و من بلغ فی الدین
والفضل الغایة و الله اعلم
و مختصر جامع العلم لابن عبد البر

رحمۃ اللہ علیہ ص ۱۹۲)

تقلید گو شخصی گو

کے متعلق قطب عالم فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد قدس سرہ گنگوہی

کا

ایک مکتوب گرامی مشتمل پر تحقیق اہل حق

”ذیل کا مکتوب قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرہ کے کاغذات سے عرصہ ہوا برآمد ہوا تھا اور صاحب زادہ حکیم مسعود احمد صاحب مرحوم سے احقر نے حاصل کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ بہت سے علمی جواہرات پر مشتمل ہے یہ مکتوب اس زمانہ کے ایک صاحب تصنیف بڑے عالم کے شبہات کے جواب میں ہے۔ افسوس کہ اصل خط جس کے جواب میں یہ والا نامہ تحریر فرمایا گیا ہے دستیاب نہیں ہوا جس سے جواب کا مضمون پوری طرح واضح ہوتا لیکن اہل علم کے لئے اب بھی مطلب سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں ہو سکتی افادہ اہل علم کے لئے اس کو شائع کیا جاتا ہے۔ واللہ الموفق والمعين“

از بندۂ رشید احمد

مولوی صاحب سلمہ۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمائید۔

آپ کا خط دیکھ کر بے ساختہ یہ شعر یاد آیا ہے

مرا خواندی و خود بدام آمدی نظر بچتہ تر کن کہ خام آمدی

آپ نے خوب مباحثہ کیا ہے کہ خود ہی فریفتہ ہو گئے۔ بندہ آج کل نہایت عیدم العزت

ہے لکھنا دشوار ہے۔ کاش تم حاضر ہوتے تو اچھی طرح تقریر ہو جاتی۔

قولکہ تقلید شخصی کو واجب سمجھنا بدعتہ سیدہ ہے۔

اقول آپ کے نزدیک تقلید شخصی مباح ہے چنانچہ آپ اوپر مقرر ہوئے ہو۔

مگر مباح ہونے کے آپ معنی نہیں سمجھے کہ کیا ہیں۔ سنو تو سہی تم نے تو منقول اور معقول

دونوں کو دھو دیا ہے۔ نفس تقلید یعنی تقلید مطلق تو فرض بقولہ تعالیٰ فاسئلوا الخ

اور حدیث انما شفاء العی السوال۔ اور خود بدیہی بھی کہ دین بدون سیکھے نہیں آتا عقل و حس کو اس میں دخل ہی نہیں پس مطلق تقلید تو فرض ہے یقین ہے کہ آپ بھی قبول کر لیں گے۔ ورنہ اثبات اس کا کر دیا جاوگا۔ اور اس کے دو فرد ہو دیں گے تقلید شخصی اور تقلید غیر شخصی کیونکہ دونوں حصے ایک جنس کے ہیں۔ خواہ اس کو جنس اور دو نوع کہو یا مطلق اور دو فرد مقید کہو۔ خواہ کلی اور دو جزئی کہو۔ جس طرح چاہو مقرر کرو۔ بہر حال ہر دو نوع تقلید تحت تقلید مطلق کے ہو دیں گی جو فرض ہے۔ بھلا آپ سے پوچھتا ہوں کہ فرض کے نوع یا فرد مباح کس طرح ہوتے۔ مرد خدا فرض اور مباح تو مباح و دو نوع ہیں کہ تحت جنس حکم کے ہیں۔ پھر ایک نوع مباح دوسری نوع کی فرد کس طرح ہو گئی ذرا تو سوچو تقلید مطلق تو فرض اور شخصی مباح اور حالانکہ یہ فرد ہے تقلید فرض کی۔ پس تمام آپ کا خدشہ اس ہی خطا رقم پر مبنی ہے۔ پس ہوش کرو کہ تقلید بہر دو قسم فرض ہے کوئی مباح نہیں۔ مگر چونکہ امثال امر تقلید میں تخییر ہے کہ جس فرد کو چاہو ادا کرو دوسرے کی ضرورت نہیں اور جو دونوں نہ کرو گے تو عاصی ہو گے۔ اس تخییر کو مباح کہہ دیا ہے مجازاً نہ یہ کہ خود شخصی بذاتہ مباح ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کفارہ میں حلف کے مثلاً نفس کفارہ فرض ہے اور اطعام اور کسوة اور رقبہ میں تخییر جس کو ادا کر دیا مطلق کفارہ سے برادرت ہو گئی۔ اور جو کسی کو نہ کیا عاصی رہا۔ علی بذاتہ مطلق اضمحیہ واجب اور کبرا اور صبح بقر و اہل اور پھر نریا مادہ وغیرہ جزئیات میں خیاراتیں فرد کا آتی ہوا۔ آتی فرض ہی کا ہوا مباح کوئی بھی نہیں سب فرض ہیں مگر ایک کے اتیان سے سب سے بری ہو جاتا ہے۔ یہی حال جملہ کلیات کا ہے کہ مطلق شرعی فرض ہوتا ہے اور مباح کہنا اس کا باعتبار اباحت اختیار کسی فرد کے ہے نہ مباح مقابل فرض کہ آپ نے شبہ فرض ہو جانے مباح کا بے موقعہ کیا۔ ورنہ اگر یہی شبہ ہے تو شخصی والے اس ہی آپ کی تقریر سے غیر شخصی کو بدعت سیئہ کہہ دیں گے۔ کیونکہ غیر شخصی کس طرح فرض ہوتی ہے وہ بھی تو مباح ہمیں معنی ہے جو مذکور ہوا۔ اور شاہ ولی اللہ نے کہاں کہا ہے کہ غیر شخصی کے وجوب پر اجماع منعقد ہوا تاکہ مقابل نوع اس کے حرام ہو کیونکہ وجوب کا مقابلہ حرام

سے ہوتا ہے۔ اگر فرضاً یہ کہا ہے تو شخصی مباح کس طرح ہوگی بلکہ حرام ہوئی۔ اور یہی کوتاہی غیر مقلدین کو ہوتی ہے۔ بلکہ (شاہ صاحب نے) یہ فرمایا ہے کہ قرونِ ثلاثہ میں باجماع جائز رہی ہے پس جواز سے دوسری نوع مقابل کی کراہت کس طرح ثابت ہوگئی۔ امکان خاص تو پڑھا ہی ہوگا اور شرع میں ایک فرد کی کے جواز سے دوسرے فرد کی کراہت کہاں ثابت ہے۔ جواز اصحیہ شاة سے جو صحابہ میں شائع رہا۔ سب سے بقرہ حرام کیونکر ہوا۔ بلکہ کلی کے حکم سے سب افراد جائز ہیں اور تعالٰیٰ نہ واحد سے دیگر افراد مرتفع نہیں ہوتے۔ مساوی الاقدام رہتے ہیں پس اگر یہ قاعدہ ذہن نشین ہو گیا ہے تو سوچو کہ جیسے آپ کے نزدیک شخصی مباح ہے ایسے ہی غیر شخصی بھی مباح ہی ہے۔ اور جیسا کہ غیر معین کہ غیر شخصی مراد اُس کی ہے آپ کے نزدیک واجب ہے ویسے ہی معین کہ شخصی اُس کی مراد ہے واجب ہی ہے اور حق یہی ہے کہ دونوں واجب ہیں اور اباحت دونوں میں معنی تخییر ارتکاب احد ہا ہے اور بس۔ اپنی ذات میں دونوں فرض ہیں تو آپ کا شبہ تو گاؤں خورد ہوا۔ اب دوسرے جملہ کو بیان کرنا بھی بطور اعتراض کے ضرور ہے۔

قول لکم۔ اور جو آئین بالجہ و رفع یدین الخ لاریب اگر موافق مسلک علماء کے یہ امور بوجہ عمل بالحدیث کے کرے گا اُس سے لڑنا حرام ہے مگر جو بوجہ تلمی و ہولے نفسانی کلامے گا اور فتنہ اندازی کی وجہ سے تو اُس سے لڑنا عین دین ہے کہ رفع فساد واجب ہے۔ یہ بھی بدیہی ہے اگر اس میں شبہ ہو از پس واضح کیا جائے گا۔ اب حاجت نہیں سمجھی گئی۔

قول لکم۔ پھر تفرد عوام کے خوف سے تقلید شخصی کو الخ عزیز ابدعت سیہ جب ہوتا کہ شخصی بذاتہ مباح ہوتی وہ بذاتہ حق تعالیٰ اور فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرض بنائی ہوئی ہے مثل غیر معین کے اگر بوجہ سہولت کے یا عدم تقرر مذاہب کے شیوع غیر معین کا رہا تو عمل درآمد قرونِ ثلاثہ سے منصوص فرض مباح کس طرح بن گیا اور کس طرح اس کا التزام بدعت ہو گیا۔ اور کیوں خود التزام قرونِ ثلاثہ کا خلاف تخییر نص کے ایک فرد کو بدعت نہ ہوا اگر غیر معین کا التزام بدعت نہیں تو معین کا کیسے بدعت ہوا۔ اور جو معین کا بدعت ہے تو غیر معین کا کیا وجہ

کہ بدعت نہ ہو۔ نص میں دونوں برابر۔ فرضیت میں دونوں مساوی۔ عمل میں ہر دو یکساں عجب العجاب ہے۔ اگر وجوب عمل غیر معین پر اجماع ہو اسے تو کہیں ہم کو بھی مطلع کر دو۔ ہم نے آج تک دیکھا نہ سنا نہ عقل مقبول کرے کہ اللہ تعالیٰ کسی کلی حکم کے ایک فرد کو التزام عمل اُمت بفرود دیگر حرام کر دیوے اور عوام جو خدا تعالیٰ کے ایک حکم کلی کے ایک فرد کا التزام کریں کہ ملتزم قرون سابقہ کے وہ نہ تھے بلکہ دوسرے فرد کے ملتزم تھے تو عوام بیچارے مبتدع ہو گئے کہ کیوں خلاف عمل قرون سابقہ کے خدائے تعالیٰ کے حکم پر عمل کیا لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ بھائی اس کو اگر کوئی تم سے پوچھے کہ قرون ثلثہ کا عمل خدا تعالیٰ کے حکم فرض کا نسخ ہے اور یہ شرک ہے یا نہیں تو کیا جواب دو گے۔ ایسی حماقت سے مقلدین کو غیر مقلدین مشرک بنا کر خود مشرک ہوئے اور خبر نہیں ہوئی کہ اٹا وہ طوق شرک اپنی ہی گردن میں آن پہا۔ ذرا سنبھل کر دیکھنا۔

قول لکھ۔ پس اس صورت میں عوام کو تنبیہ الخ

اقول: بے بیشک تنبیہ چاہیے کہ ایسا عقیدہ فاسد نہ کریں بلکہ دونوں کو سترن مساوی الاقدام جان کر جس کو چاہیں عمل کریں بشرط عدم تلمی و عدم فتنہ و فساد اگر ممکن ہو مگر بے شک ظاہر ہے کہ فساد سے خالی نہ ہوگا خواص تو کہہ سکتے ہیں مگر عوام فساد سے ہرگز خالی نہ رہیں گے۔ اپنے مزے کو آج جو ر و حلال اور کل حرام۔ ایک روز عنب حلال اور دوسرے روز ناپاک خبیث۔ خوب قہقہے ہوں گے کہ ہمارا دین خوب دہریوں کا مذہب ہے۔ اب بھی نصاریٰ ہندو اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے مذہب کا ٹھکانا نہیں۔ پھر خود اہل اسلام عوام بھی ایسا کریں گے ذرا جزئیات کو سوچ کر دیکھنا۔ اگر شبہ رہے تو پھر لکھنا دوچار صورت لکھ دوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

قول لکھ۔ جیسے اور رسوم شادی عتی کی الخ

اقول:۔ مثال غلط ہے رسوم فی ذاتہ مباح تھی نہ فرض مجیر اس کو دوسرے کیا مناسبت ہے۔ یہ آپ کی بنا فاسد علی الفاسد ہے مباح کو واجب بتانا حرام اور حرام سے منع کرنا واجب واجب میں فساد کا خوف درست نہیں اور نکاح خواہ اول ہو یا ثانی

یہ حالت عند التوقان واجب اور نجدشہ زنا فرض اس کا ترک حرام باوجود قدرت کے تو نکاح ثانی کا اجراء بھی واجب ہے اور واجب کا ترک نجدشہ عوام درست نہیں اور تاکید نکاح ثانی رفع فساد کے واسطے ہے کہ زنا ہے اور وہ مشہور ہے پس آپ کی نظر نے بالکل بے عمل نفس غرابت کو دیکھ لیا اس کے ثمرہ لازم کو نہ دیکھا اگر نکاح میں بھی کوئی دوسرا امر قائم مقام نکاح ثانی کے ہو کر واقع زنا ہو جاتا تو اس کی بھی وہی صورت ہوتی مگر یہاں تو سوائے نکاح کے کوئی چارہ ہی نہیں۔ لہذا نکاح کی برفرد واجب ہوئی تقلید میں غیر معین کو پھوڑ کر دوسری فرد خود ذمت کے عمل کو موجود ہے کہ فرض بھی ادا ہو اور فرض رفع فساد کا بھی ادا ہو۔ ہم سیخ و ہم کباب سالم و بجا ہی نکاح کے مقابل قائم مقام بناؤ سوائے قطع اعضاء تناسل کے کہ وہ حرام ہی ہے فافہم۔

قولکم۔ البتہ کوئی مثال ایسی ہو قرون خیر میں الخ

اقول:- یہ کلام آپ کی تو لبس عجیب و رعب ہے۔ سنو خاتم بائیں ہاتھ میں صحابہ کے قرن میں مباح تھی۔ پیچھے بوجہ مشابہت روافض کے کہ یہ بھی فتنہ ہے لقولہ من تشبہ بعموم فہو منہم مکروہ تحریمی ہوئی۔ ہدایہ دیکھ لو۔ پس بسیار کا تختہ اور یمن کا تختہ دونوں جائز اور قرون ثلثہ میں یمن کا مباح رہا۔ اور پھر بسیار کا مکروہ ہوا تو ترک تختہ بسیار واجب ہوا کہ ترک مکروہ واجب ہے بحق فلاں کہنا اول مباح تھا۔ فقہاء نے ترک کو اس کے واجب کیا بسبب فتنہ عوام اور شیوع مذہب معتزلہ کے کہ ان کے نزدیک حق علی اللہ ہے تو اب مطیع و عذاب عاصی و مثال سے اگر تسلی نہ ہو تو پھر دیکھا جائے گا اور تم تو خود ہی بول رہے ہو کہ رسوم مباح اور اب بسبب فتنہ کے حرام اور نکاح ثانی مباح اور بسبب خوف زنا واجب ہوا نجد سے کیا پوچھتے ہو۔ تمام دنیا کے عالم تو فعل و قول رسول کو حجۃ گروانتے ہیں کہ اصل مقیاس علیہ وہی ہے اور آپ لکھتے ہیں کہ وہ خود شارع تھے ماشاء اللہ اگر شارع کے فعل پر قیاس نہ ہو گا تو قیاس کی اصل کہاں سے آوے گی یہ تو تم نے ایسی کہی کہ دنیا میں کوئی نہیں کہہ سکتا۔ قیاس قرآن و حدیث پر اول ہے اس کے بعد کوئی امر دلیل ہوتا ہے تو اب بولو کہ یہ کیا تم نے لکھ دیا ہے۔ اور صحابہ کا قول بھی خود حجت ہے جیسا صحابہ مامور ہا تابع ہیں متبع بالکسر رسول کے اور متبع بالفتح من

بعد کے۔ ایسا ہی دیگر قرون میں ہے۔ نہ معلوم یہ فرق کہاں سے نقل کیا ہے صحابہ کا فعل حجت اور مقیس علیہ ہوتا ہے اگر قیاس صحابہ کا نہ ہو۔ اصول کو دیکھ لو فخر عالم علیہ السلام نے غیر قریش کی زبان میں قرآن کو مباح کیا حضرت عثمان نے اس کو حرام اور ترک کرنا اس کا واجب کر دیا۔ شورش عوام کی وجہ سے یہ عین حجت ہے۔ نہ یہ کہ اس کا مقیس علیہ بنا تا درست نہیں کہ یہ قول محض غلط و خطا ہے۔ اب دوسری قسم کی مثال آپ کی محض خلاف فہم ہے کیونکہ قرون ثلاثہ میں مل نہ ہونے سے فرض مخصوص بدعت نہیں ہو سکتا۔ اور جو بدعت ہے وہ جائز نہیں ہو سکتی۔ یہ آپ کی فہم غلط سے پیدا ہوا ہے۔

فاسئلوا اهل الذکر میں مجتہدین بھی داخل ہیں۔ نہ جہنم تو دوسرے سے پوچھیں حکم عام ہے کوئی مخصوص نہیں۔ احادیث صحیحہ وغیر منسوخہ کا جانا ہی تو مشکل ہے اس کے ہی لئے تقلید کی جاتی ہے اگر کسی کو معلوم ہو جاوے تو حاجت تقلید نہ ہو۔ مگر گویہ کو معلوم ہو خود یہی تقلید ہی ہے۔ دوسری صحیح متعارض کہ نسخ کسی کا معلوم نہیں پھر کسی سے پوچھ کہ کسی کو مرجح کرے گا ورنہ تذبذب میں رہا۔ اور احتمال ائمہ کے حدیث نہ ملنے کا ایک لغو امر ہے۔ جب مصرح اس کی تحقیق موجود ہے پھر یہ احتمال محض ہوائے نفسانی ہے۔ جیسا احادیث جہر آئین دفع بدین وغیرہ میں صحیح ہیں۔ دوسری جانب بھی احادیث ہیں تزییح معارضہ کے وقت ہوتی ہے یہاں معارضہ ہی نہیں۔ امام صاحب بھی وجود ان افعال کے مقرر ہیں مگر آخر فعل ہونا ثابت نہیں ہوتا تعارض میں وحدت زمان شرط ہے دو وقت میں دو فعل کئے ناسخ کا حال اور منسوخ کا محقق نہیں ہر ایک نے تزییح ایک جانب کو اجتہاد دی ہے جس کو چاہے قبول کر لیوے اگر سمجھ جاوے تو مطلع کر دینا ورنہ پھر لکھنا کہ تمہاری اصلاح ضروری ہے۔ تم تو ایک ہی بحث میں بہک کر آل پتال کہنے لگے۔ اور شرم مت کر تا صاف صاف لکھنا کہ دین کی بات ہے، لغزش عالم کی خلاق کو تباہ کرتی ہے۔ غیر مقلدین انہیں دو تین قاعدہ کے خبط سے خراب ہو گئے ہیں۔ براہین قاطعہ کو سمجھ لیتے تو ان خدشات سے محفوظ رہتے مگر سرسری نظر سے دیکھا ہے۔

بندہ

رشید احمد از گنگوہ

تقلید شخصی

کا ثبوت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل سے جو

از

افادہ اسیدی حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دامت فضاہم

”مولانا موصوف کی مجالس عموماً افاداتِ علمیہ سے معمور رہتی ہیں ایک اتفاقی مجلس میں آپ نے دو عظیم الشان فائدوں کی طرف اشارہ فرمایا جن میں سے ایک اس صحبت میں ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ اس میں آپ نے تقلید شخصی کے ثبوت میں صحیح بخاری کی روایت سے صحابہ کرام کے تعامل کا ایک واقعہ بیان فرمایا جس کو احقر نے باصافہ مختصر تمہید ضبط کر لیا وہ ہذا۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کسی مسلمان کو اس میں خلافت نہیں ہو سکتا کہ اصل حکم تمام امور میں حق تعالیٰ کا ہے اور صرف اسی کا اتباع ہر شخص پر واجب ہے۔ انبیاء و رسل کے احکام جو واجب لتسلیم ہیں وہ بھی صرف اسی بنا پر کہ وہ حق تعالیٰ کے احکام کے مبلغ اور خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ ہیں۔ وہ اگر اپنے اجتہاد سے بھی کچھ حکم دیتے ہیں تو اس بنا پر کہ اُس کو کئی قرینہ و دلیل سے حق تعالیٰ کا حکم سمجھتے ہیں اور اسی لئے خود حق سبحانہ و تعالیٰ نے اُن کے احکام کی اطاعت پر فرض و واجب قرار دیا ہے ورنہ ان الحکم الا للہ (اللہ کے سوا کسی کا حکم قابل تسلیم نہیں) قرآن کا کھلا ہوا اعلان ہے۔

اس سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہو گئی کہ جس طرح انبیاء و رسل کے احکام کی اطاعت کو حق تعالیٰ کے ساتھ شرک فی الحکومتہ والربوبیۃ نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح ائمہ امت جو انبیاء کرام

علیہم السلام کے نابین اور ان کے احکام کی حقیقت کو پوری طرح سمجھنے والے ہیں ان کے بتلائے ہوئے احکام کی تبلیغ کرنے والے ہیں وہ جو کچھ اجتہاد سے بھی کہتے ہیں تو اس کی بھی اصل کتاب و سنت کی ساتھ مستند ہوتی ہے۔ تو جس طرح انبیاء علیہم السلام کی اطاعت عین حق تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اسی طرح ائمہ دین کی اطاعت بھی بلاشبہ اللہ و رسول کی اطاعت ہے، اسی اطاعت کا نام اصطلاح فقہ میں تقلید ہے۔

آیت کریمہ فاستلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون را اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کر لو، میں قرآن کریم نے اسی اصولی مسئلہ کی تعلیم دی ہے کہ جو لوگ خود قرآن و حدیث کے غوامض کو نہیں سمجھ سکتے وہ اہل علم سے احکام الہیہ دریافت کریں اور ان کی تقلید کریں۔

خلاصہ یہ ہے کہ تقلید کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ نہ جانتے والے جاننے والوں سے پوچھ پوچھ کر احکام خدا پر عمل کریں۔ اور یہ ایک ایسا مسلم الثبوت ضابطہ ہے کہ کوئی سمجھ دار انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے منصف اہل حدیث بھی مطلق تقلید کے جواز بلکہ وجوب میں اختلاف نہیں کرتے۔ اور اسی لئے اس کے عقلی اور نقلی دلائل جو عامہ کتب میں مذکور و معروف ہیں ان کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اختلاف اور بحث صرف اس میں ہے کہ امام معین کی تقلید پر پابندی کی جاوے کہ ایک امام کی تقلید کرتے ہوئے دوسرے ائمہ کے اقوال پر عمل نہ کیا جاوے جس کو اصطلاح میں تقلید شخصی کہا جاتا ہے لیکن اگر اس کی حقیقت کو سمجھ لیا جاوے تو یہ بھی کوئی مشکل بحث نہیں رہتی۔

تقلید شخصی کی حقیقت

اصل یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی بے شمار نصوص اتباع ہوئی (خواہش پرستی) کی حرمت و ممانعت کے لئے آئی ہیں اور اسی

لئے ائمہ اربعہ اور تمام اہم امت کا اس پر اتفاق ہے کہ اتباع ہوئی احکام دینیہ میں قطعاً حرام ہے جو شخص اپنی غرض اور خواہشات کو سامنے رکھ کر اس کی پیروی کرتا ہے اور پھر قرآن و حدیث میں اس کے دلائل و ٹھونڈھٹا ہے وہ اپنے ارادے اور خیال کے اعتبار سے متبع ہوئی ہے متبع قرآن نہیں اگرچہ قرآن میں اس کی کوئی سند اتفاقاً مل بھی جاوے معاملہ علیم و خیر کے ساتھ جو دلوں کی گہرائیوں پر مطلع اور نیتوں اور ارادوں سے واقف ہے حافظ ابن تیمیہ

رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں اس پر ایک مبسوط مقالہ میں تمام اہمت کا اتفاق نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو شخص اپنی خواہشات کی پیروی کرنے کے لئے ائمہ مجتہدین کے مذاہب کو منہ دینا ہے۔ اور اپنی ہوی پر عمل کر کے اس کو کسی امام کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کا متبع نہیں۔ بلکہ متبع ہوی ہے اور ایسا کرنا دین کو ایک کھلونہ بنا نا ہے۔

ابن تیمیہ کے بعض الفاظ یہ ہیں :-

یہ لوگ ایک وقت اس امام کی تقلید کرتے ہیں جو نکاح کو فاسد قرار دیتا ہے اور دوسرے وقت میں اس امام کی جو اس کو صحیح قرار دیتا ہے اور یہ محض اپنی غرض و ہوی کی وجہ سے ہے اور ایسا کرنا با اتفاق اہم ناجائز ہے (پھر اس کے تین سطر بعد لکھا ہے) اور اس کی نظیر یہ ہے کہ کوئی آدمی جس وقت کسی حق شفعہ کا خود طالب ہو تو مذہب امام ابو حنیفہ کے مطابق شفعہ جو ار کے ثبوت کا اعتقاد ظاہر کرے اور اگر مشتری ہو اور دوسرا شخص طالب شفعہ تو مذہب امام شافعی کے مطابق اس کے عدم ثبوت کا معتقد بن جائے۔ ایسے ہی وہ شخص جو بجا لیت قیام نکاح ولایت فاسق کی صحت کا قائل اور اس کی بناء پر منافع نکاح سے منتفع ہے مگر جب طلاق ٹلے وہ دیکھے تو حرمت مغلطہ سے بچنے کے لئے ولایت فاسق کو کالعدم اور اس کے ماتحت منعقد شدہ نکاح کو فاسد قرار دے کہ یہ باجماع مسلمین جائز نہیں۔ اور اگر کوئی مستفتی یہ کہے کہ پہلے مجھے اس مذہب کی خبر نہ تھی اور اب میں اس کا معتقد اور پابند ہوں تب بھی اس کا قول قابل تسلیم

فی وقت یقلدون من یفسدہ
وفی وقت یقلدون من یصحہ بحسب
الغرض والہوی و مثل هذا
لا یجوز با اتفاق الامة رثم قال بعد
ثلاثة اسطر و نظیر هذا ان یعتقد
الرجل ثبوت شفعة الجوار
اذا كان طالبا لها وعدم ثبوتها
اذا كان مشتريا فان هذا لا یجوز
باجماع و كذا من بنی صحة ولاية
القاسق فی حال نکاحه و بنی علی
فساد ولا یتہ حال طلاقه لم
یجذب ذلك باجماع المسلمین و
لو قال المستفتی المعین انا لم
اكن اعرف ذلك وانا اليوم التزم
ذلك لم یکن من ذلك لان
ذلك یفتی باب التلاعب
بالدین ویفتی الذابحة
الی ان یكون التحریم والتحلیل

بحسب الہواء
 رستاویٰ ابن تیمیہ جلد ثانی ص ۲۳۰ ہے اور اس کا سبب بنتا ہے کہ حرام و حلال کا مدعا بعض
 (ص ۲۴۱) ابوا و خواہشات پر ہر جاوے۔

علماء اہمیت کی تصریحات اس بارہ میں بے شمار ہیں ہم نے ان میں سے صرف حافظ ابن
 تیمیہ کے کلام پر اس لئے اکتفا کیا کہ حضرات اہل حدیث بھی ان کی امامت و جلال کے قائل اور
 بہت سے معاملات میں ان کے متبع ہیں۔

الغرض اتباع ہوئی باجماع اہمیت حرام ہے۔ اور ادھر یہ بات تجربہ سے محسوس و مشاہدہ ہے
 کہ اگر عوام کو آزاد چھوڑ دیا جاوے کہ جس مسئلہ میں چاہیں ابو حنیفہ کے مذہب پر عمل کریں اور
 جس میں چاہیں شافعی کے مذہب پر پھر جب چاہیں مالکیہ کا قول لے لیں اور جب چاہیں حنبلیہ
 یا دوسرے ائمہ مجتہدین کا تو اس کا انجام لازمی طور پر وہی ہوگا جس کو حافظ ابن تیمیہ نے
 نے باجماع مسلمین حرام و ناجائز قرار دیا ہے۔ اس شرعی مصلحت کی بناء پر عاقبت اور امامت
 اس میں دیکھی گئی کہ امام واحد کا اتباع تمام مسائل میں لازم قرار دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اصل مقصود اتباع ہوئی سے بچنا ہے اور چونکہ اس کی تدبیر اس ہوئی
 پرستی کے زمانہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ عمل کرنے والوں کو آزاد نہ چھوڑا جاوے بلکہ امام واحد
 کی تقلید پر مجبور کیا جاوے اس لئے تقلید شخصی بوجہ ذریعہ مقصود ہونے کے واجب قرار دی
 گئی۔ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کی ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ائمہ اربعہ کی تقلید یا کسی
 دوسرے امام معین کی تقلید کے ثبوت کے لئے ضروری نہیں کہ قرآن و حدیث میں ان کا نام
 بتلایا گیا ہو یا ان کی تعیین کو ضروری کہا گیا ہو۔ کیونکہ قرآن و سنت مقاصد شرعیہ کی تصریح
 کرتے ہیں ان کے ذرائع کی تصریح کرنا ضروری نہیں جیسے حج کا فرض ہونا قرآن و حدیث میں
 منصوص ہے۔ مگر ریل اور جہاز یا موٹر اور اونٹ جن کے ذریعہ حج کے مقصود تک رسائی ہوتی
 ہے ان میں سوار ہونے کی ضرورت کی تصریح یا جہاز کے نام کی تعیین کتاب و سنت میں
 ڈھونڈنا ناواقفیت اور بے علمی کی دلیل ہے۔ اس لئے اگر کتاب و سنت میں کہیں بھی تقلید
 شخصی کا ثبوت تصریحاً نہ ہوتا صرف اتباع ہوائی کی ممانعت تقلید شخصی کے ثبوت کے لئے کافی تھی۔

لیکن حضرات صحابہ کے تعامل سے ثابت ہوتا ہے کہ قرن اول میں بھی اس کے نظائر موجود ہیں۔ عام حضرات صحابہ علماء صحابہ کی تقلید کرتے تھے۔ پھر ان میں بھی بعض تو مطلقاً بلا تعین کے کبھی کسی عالم کی اور کبھی کسی دوسرے بزرگ کی تقلید کر کے عمل کرتے تھے۔ کیونکہ وہ حضرات اتباع ہونی کے خطرہ سے محفوظ و مامون تھے۔ اور بعض اُس وقت بھی تقلید شخصی پر عمل تھے جس کی ایک نظیر اس جگہ لکھی جاتی ہے اور یہی اس تحریر کا اصل مقصد ہے۔

اہل مدینہ کا تعامل زید بن ثابت کی تقلید شخصی

صحیح بخاری میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:-

ان اهل المدينة سألوا
ابن عباس رضی عن امرأة طافت
ثم حاضت قال لهم تنصروا قالوا
لا نأخذ بقولك وندع قول
زيد-

اہل مدینہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اُس وقت کے بارہ میں سوال کیا جو طواف فرض کے بعد حائضہ ہو گئی ہو کہ وہ طواف و دواع کے لئے پاک ہونے تک انتظار کرے یا طواف اُس سے ساقط ہو جائے گا۔ اور اُس کو چلا جانا جائز ہوگا، ابن عباس نے فرمایا کہ وہ جاسکتی ہے۔ اہل مدینہ نے کہا کہ ہم آپ کے قول پر زید بن ثابت کے قول کے خلاف عمل نہیں کریں گے۔

(بخاری باب اذا حاضت المرأة بعد ما افاضت)۔ کتاب الحج۔

اور فتح الباری میں بحوالہ ثقفی اسی واقعہ میں اہل مدینہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:-

افتيتنا اولم تفتنا زيد بن ثابت يقول لا تنصروا۔

آپ فتویٰ دیں یا زید بن ثابت ثابت تو یہ کہتے ہیں کہ یہ عورت (بغیر طواف) واپس نہیں جاسکتی۔

فیر فتح الباری میں بحوالہ مستدابی داؤد طیالسی بروایت قتادہ رضی اللہ عنہ اسی واقعہ کے یہ الفاظ منقول ہیں:-

فقات الانصار لا نتابعك يا ابن عباس وانت تخالف زيد ا فقال سلوا صاحبكم ام سليم۔ (فتح الباری ج ۳ ص ۳۶۳)

انصار نے کہا کہ ہم زید بن ثابت کے خلاف قول میں آپ کا اتباع نہ کریں گے۔ ابن عباس نے فرمایا کہ آپ لوگ ام سلیم سے دریافت کریں (کہ مسکے یہی صحیح ہے جو میں نے بتلایا)۔

اس واقعہ میں انصار مدینہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے الفاظ مذکورہ سے دو چیزیں بوضاحت ثابت ہو گئیں۔ اول تو یہ کہ یہ انصار مدینہ حضرت زید بن ثابتؓ کی تقلید شخصی کرتے تھے ان کے قول کے مقابل کسی کے فتوے پر عمل نہ کرتے تھے۔ دوم یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی ان لوگوں پر یہ اعتراض نہیں فرمایا جو ہمارے زمانہ کے مدعیان عمل بالحدیث متقلدین پر کرتے ہیں کہ تقلید شخصی تو شرک فی النبوة ہے، حرام ہے۔ ناجائز ہے۔ بلکہ ان کو مسئلہ کی تحقیق اور حضرت زید بن ثابتؓ رضی اللہ عنہما کی طرف دوبارہ مراجعت کے لئے ارشاد فرمایا۔

چنانچہ فتح الباری ہی میں ہے کہ یہ حضرات مدینہ طیبہ پہنچے تو انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ رضی اللہ عنہما کے ارشاد کے موافق حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا سے واقعہ کی تحقیق کی اور حضرت زید بن ثابتؓ رضی اللہ عنہما کی طرف مراجعت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت زید بن ثابتؓ رضی اللہ عنہما نے مکرر حدیث کی تحقیق فرما کر حضرت عبداللہ بن عباسؓ رضی اللہ عنہما کے قول کو قبول فرمایا اور اپنے سابق فتوے سے رجوع کر لیا (کما صرح بہ فی الفتح ص ۴۶۴ ج ۲)۔

الغرض اس واقعہ سے اتنی بات پر انصار مدینہ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ رضی اللہ عنہما کا اتفاق معلوم ہوا کہ جو لوگ شان اجتهاد اور کافی علم نہیں رکھتے۔ وہ کسی امام معین کی تقلید کو اپنے پر لازم کر لیں تو بلاشبہ جائز ہے۔

تنبیہ

اس واقعہ سے قرن اول اور حضرات صحابہ کے تعامل سے تقلید شخصی کا ثبوت و جواز ثابت ہوا۔ پھر قرون متاخرہ میں اس کو واجب و لازم قرار دینے کا سبب یہ ہوا کہ بغیر اس کے اتباع ہونی سے محفوظ رہنا عادتہ محال ہو گیا۔ اس کے وجوب کی بھی ایک نظیر قرن اول ہی میں موجود ہے جو انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ رسالہ میں لکھی جاوے گی۔ واللہ الموفق

حررہ العبد محمد شفیع عذ اللہ عنہ

فی کورۃ لیکبری من مضافات دیوبند لست من شوال ۱۳۵۰ھ

اتمام الخیر
فی الافتاء
بمذہب الغیر

دوسرے مذہب پر فتویٰ دینے کے حدود



اضطراری حالات میں افتاء بمذہب الغیر مشروع ہے، لیکن یہ بہت کٹھن باب ہے، اس کے مخصوص حدود و قیود ہیں جن سے تجاوز کرنا آئمہ کے نزدیک جائز نہیں، جب اضطرار عام کا تحقق ہو جائے اور رجوع الی مذہب الغیر کی تمام شرائط پائی جائیں تو اس کا جواز ثابت ہو جاتا ہے حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا اور اس کے لئے یہ ابتدائی تمہید بھی لکھی گئی تھی، اس کے لئے مختلف کتب سے آپ نے اس موضوع سے متعلق عبارات کے حوالہ بھی جمع فرمائے تھے۔

اس وقت فقہی رسائل کے مسودات میں سے یہ تمہید اس موضوع سے متعلق ایک مختصر مسودہ اور عبارات فقہاء کے حوالوں پر مشتمل ایک یادداشت نکل آئی۔ بحکم حضرت مفتی صاحب ان تینوں کو اس امید پر طبع کیا جا رہا ہے کہ شاید کوئی عالم اس کی تکمیل کا ارادہ کرے تو اس وقت انشاء اللہ اس محنت کا ثمرہ نکل آئے گا۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔



یافتّاح

انہام الخیر

فی الافتنہ

بمذہب الغیر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله الذي لا اله الا هو ولا حكم ولا طاعة الا له - بعث لنا الرسول الامين مجبل متين وكتاب مبين - فامر المستنبيين متابا عمال الروية والقصر والذين لا يعلمون ان يسألوا اهل الذکر - كيلا يتخذ الهوى مذاهبا - او يجعل المذاهب ملعبا - والصلوة والسلام الايمان الاكملان على سيد الانس والجان - جاء بسمحة سهلة بيضاء ليلا ونهارها سوا - وعلى آله واصحابه نجوم الهداية في وياجي الغواية وليالى العمايه -

وبعد فقال العبد الضعيف محمد بن المدعو بالشفيع الديوبندي كان الله له - ان في ايامنا هذه قد شاعت المعاملات الفاسدة والباطلة في التجارات والاجارات وعمت بها البلوى - ومشائخ الائمة الاربعة متفقون على جواز العمل والفتوى عند البلوى والاضطرار العام على اى مذاهب من مذاهب الفقهاء المجتهدين يوجد فيه الرخصة والسهولة ولكن مشروطا بشرائط كيلا يتجاسر العوام في التلعب بالدين واتباع الهوى -

فاراد العبد الضعيف ان يجمع نصوص المذاهب وشرائط

العمل بمنزلة الغير في جزء مستقل وذلك حين كان العبد
الضعيف يتولى منصب الافتاء بدار العلوم ديوبند الهند
سنة ۱۳۶۰ من الهجرة . فجمع مواد المسئلة من كتب شتى ولم
يرخص هجوم المشاغل بسط هذه المسئلة تصنيفا وتاليفا الى
يومنا هذا من سنة ۱۳۹۴ هـ وقد بلغت الثمانين من عمري وسقطت
القوى كلها . والان لا استطيع النظر في ما كتبت سابقا فكيف
بترتيبها وتاليفها في صورة مقالة او رسالة . فسألني بعض
الاحبة ان اجعل مواد هذه المسئلة كما هي من غير ترتيب وشرح
جزأ مستقلا لعلها تفيد اهل العلم والنظر اذا ارادوا الخوض في
هذه المسئلة فها هي من عبارات الفقهاء من كتب شتى من
المذاهب . والله ولي التوفيق .

العبد محمد شفيع الديوبندي

دارالعلوم كراتشي ۱۲

۱۳۹۴ هـ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اقول وبالله التوفيق ان الحق الحقيق والتحقيق الذي لا يمازج
 تلبیس ولا تلفیق فی هذا الباب هو جواز الافتاء بمذهب الامام
 المالک رحمہ اللہ فی امر اة المفقود وغيره مما مست الضرورة
 اليه لعموم البلوى فقول عمر في هذا الباب هو الصحيح المختار لكنه
 اخطأ في عدم اشتراط القضاء فان الصحيح المختار عند ارباب
 الترجيح من مشائخ المالكية والمرجوع اليه من مذاهب امام دار
 الهجرة رحمة الله عليه هو اشتراط القضاء في التفريق بين المفقود
 وزوجه كما صرح به العلامة الباجي في شرح المؤطا تحت اثر الفارق
 الاعظم حيث قال قوله رضى الله عنه ايما امر اة فقدت زوجها
 فلم تدارين هو فاتها تنتظر اربع سنين ولم يعتبر بما اقامت
 قبل ان ترقع اليه - يعنى الحاكم ولو اقامت عشرين سنة
 (منتقى شرح مؤطا ص ۹۰ ج ۲) وقال العلامة الخليل وهو من
 كبار الائمة المالكية في مختصره ولزوجة المفقود الرقع الى القاضي
 والوالى ووالى الماء والا فجماعة المسلمين قال العلامة الدرديري
 شرحه وائى وان لم يوجد واجد منهم فليجماعة المسلمين من صالحى
 بلدها - (شرح درودير على مختصر الخليل ص ۳۹۹ ج ۱)
 وكذا لك اشتراط القضاء مصرح عند الحنفية في الايضاح عليه
 فى الهداية والكنز والدر وغيرها فالحكم بالتفريق بين المفقود
 وزوجه بلا اشتراط القضاء خلاف للاجماع واما قول من قال ان الإقلاء
 بمذهب الغير والمذهب المرجوح لا يجوز فهو صحيح فى نفسه بلا خلاف

ولا انكار كما صرح به في الدر المختار وعدة خلافا للاجماع وهو المصريح
في عامة كتب الفقه والاصول وبه صرح العلامة الشامي في رسالته
المسماة بعقود رسم المفتي غير ان مواضع الضرورة مستثناة منها فالافتاء
بالمرجوح في مسألة المفقود وامثاله لم تختص الا ان اشاهدنا فيها
ضرورة تفوق الضرورات والدليل على ما قلنا ما ذكره العلامة ابن
عابد في رسالته المسماة بعقود رسم المفتي ولفظه ومتى كان
قول ابي يوسف ومحمد موافق قوله لا يتعدى عنه الا فيما مست الضرورة
و علم انه لو كان ابو حنيفة راى ما راوا ولا فتى به ص ٢٦ ووله في
ذلك نظم

ولا يجوز بالضعيف العمل ولا يجاب من جاء يسأل

الا لعامل له ضرورة أو من له معرفة مشهورة

وقال في شرح هذه الابيات والاطهر في الجواب اخذ من التعبير
بالتشهي ان يقال ان الاجماع على منع اطلاق التخيير اي بان يختار
ويتشهي مهما اراد من الاقوال في اي وقت اراد اما العمل بالضعيف
في بعض الاوقات لضرورة اقتضت ذلك فلا يمنعه منه وعليه يحمل
ما تقدم عن الشربلالي من ان مذهب الحنفية المنع بدليل انهم اجازوا
للمسافر والضعيف الذي خاف الريية ان ياخذ يقول ابي يوسف بعدم
وجوب الغسل على المحتلم الذي امسك ذكره عند ما احتس بالاحتلام
الى ان فترت شهوته ثم ارسله مع ان هذا خلاف الراجح في المذهب
لحسن اجازوا لاخذ به للضرورة وينبغي ان يكون من هذا القبيل
ما ذكره الامام المرغيناني صاحب الهداية في كتابه مختارات النوازل
وهو كتاب مشهور ينقل عنه شرح الهداية وغيرهم حيث قال في
فصل النجاسة والدم اذا خرج من القروح قليلا قليلا غير سائل فذاك

ليس بمانع وان كثرو قيل لو كان بحال لو تركه يسئل يمنع انتهى ثم
اعاد المسئلة في نواقض الموضوع فقال ولو خرج منه شيء قليل ومسحه
بخرقة حتى لو ترك يسئل لا ينقض وقيل الخ ولا يخفى ان المشهور
في عامة كتب المذهب هو القول الثاني المعبر عنه واما ما اختاره
من القول الاول فلم ار من سبقه اليه ولا من تابعه بعد المراجعة
الكثيرة فهو قول يشاذ ولكن صاحب الهداية امام جليل اعظم مشائخ
المذهب من طبقة اصحاب الترجيح والصحيح كما هو فيجوز للمعدوكا
تقليدا في هذا القول عند الضرورة فانه فيه توسعة عظيمة لا اله الا
(ثم قال بعد ذلك) وقد ذكر صاحب البحر في الجبض في الوان الدماء
اقوالا ضعيفة ثم قال وفي المعراج عن فخر الأئمة لو افقت مفت بشيء
من هذا الاقوال في مواضع الضرورة طلبا للتيسير كان حسنا انتهى
وبه علم ان المضطر له العمل بذلك لنفسه كما قلنا وان المفتي
لما لاقته به للمضطر فانه ليس له العمل بالضعيف والافل
به محمول على غير موضع الضرورة كما علمته من مجموع ما قررناه
والله اعلم - انتهى ما قاله العلامة الشامي في رسم المفتي قال العبد
الضعيف اقال الله تعالى عثراته ان هذا هو الحق المحقق الذي لا ينبي
ان يتجاوز عنه وهو الامر العدل والقول الفصل في الباب وبه صرح
العلامة كمال المحقق ابن الهمام في تحرير الاصول ص ٣٥٠ ج ٣ وفيه
من المساهلة في هذا الباب ما لا ينبغي اظهاره والساعة في زمننا هذا
الغلبة الفساد واتباع الهوى فرايتا طيبة على غيره اولى ولكن نور ومنها
شرائط الانتقال من مذهب الى مذهب آخر وهو جملة مفيدة أشد
الضرورة اليه وهو هذا اقال الروياني يجوز تقليد المذاهب والانتقال
اليها بثلاثة شروط ان لا يجمع بينها على صورتها لف الاجماع كمن تزوج

بغير صدق والأولى ولا شهود قان هذه الصورة لم يقل بها أحد وإن
يعتقد فيمن يقلده الفضل بوصول تجارة اليد ولا يطلها أمياً في عمارة
والآيت تبع رخص المذهب انتهى وتحرير الأصول ص ۲۵۲ ج ۲ و ۲۳ و
قال الامام العلامة سيف الدين الأمدى في احكام الاحكام في هذا
الباب ما نقله -

المسئلة الثامنة اذا اتبع العاى بعض المجتهدين في حكم حادثة
من الحوادث وعمل بقوله فيها اتفقوا على انه ليس له الرجوع عنه في
ذلك الحكم بعد ذلك الى غيره وهل له اتباع غير ذلك المجتهد في حكم
آخر اختلفوا فيه فمنهم من منع منه ومنهم من اجازة وهو الحق نظراً
الى ما وقع عليه اجماع الصحابة من تسويخ استفتاء العاى لكل عالم في
المسئلة وانه لم ينقل عن احد من السلف الجهر على العامة في ذلك
ولو كان ذلك ممتنعاً لما جاز من الصحابة اهماله والسكوت عن الانكار
عليه والان كل مسئلة لها حكم نفسها فكما لم يتعين الاول للاتباع في
للمسئلة الاولى الا بعد سؤاله كذلك في المسئلة الاخرى واما اذا عين
العاى مذهباً معيناً كمذهب الشافعى او ابى حنيفة او غيره وقال
انا مذهبى وملتزم له قبل الرجوع الى الاخذ بقول غيره في مسئلة
من المسائل اختلفوا فيه فجزء قوم نظراً الى ان التزامه لمذهب معين
غير ملتزم له ومنع من ذلك آخرون لانه بالتزامه المذهب صار لازماً له
كما لو التزم مذهباً في حكم حادثة معينة والمختار انما هو التفصيل و
هو ان كل مسئلة من مذهب الاول اتصل عمله بها فليس له تقليد
الغير فيها وما لم يتصل عمله بها فلا مانع من اتباع غيره فيها انتهى
(احكام ص ۳۱۸ ج ۲) وفي كتاب الاحكام للأمدى من ليس بمجتهد هل
يجوز له الفتوى بمذهب غيره من المجتهدين كما هو المختار في زماننا

هذا اختلفوا فيه فذهب ابو حسين البصرى وجماعة من الاصوليين الى المنع من ذلك لانه انما يسأل عما عنده ولا نه لو جازت الفتوى بطريق الحكاية عن مذهب الغير لمجاز ذلك للعامة وهو محال مخالفت للاجماع ومنهم من جوزة اذا ثبت ذلك عنده بنقل من يوثق بقوله والمختار انه اذا كان مجتهدا في المذهب بحيث يكون مطلعاً على ماخذ المجتهد المطلق الذي يقلده وهو قادر على التفريع على قواعد امامه واقواله متمكن من الفرق والجمع والنظر والمناظرة في ذلك كان له الفتوى تمييزاً له عن العامة ودليله انقطاع الاجماع من اهل كل عصر على قبول مثل هذا النوع من الفتوى وان لم يكن كذلك فلا (احكام الاحكام ص ٣١٥ ج ٢) وفي تحرير الاصول للكمال ابن الهمام و شرح لابن امير الحاج مسئله لا يرجع المقلد فيما المجتهد رقيه اى عمل به اتفاقاً ذكره الآمدى وابن الحاجب لكن قال الزركشى وليس كما قال فى كلام غيرهما ما يقتضى جريان المخلاف بعد العمل ايضا وكيف ينتج اذا اعتقد صحته لكن وجه ما قاله انه بالتزامه مذهب امام مكلف به ما لم يظهر له غيره والعامة لا يظهر له بخلاف المجتهد حيث ينتقل من امانة الى امانة (الى ان قال) نعم المفتى على مذهب الامام اذا افتى يكون الشئ واجباً او مباحاً او حراماً ليس له ان يقلد ويفتى بخلافه لانه حينئذ محض تشبهى كذا (رثم قال) وهل يقلد غيره اى غير من قلده اولا في شئ (في غيره) اى غير ذلك الشئ كان يعمل اولا في مسئلة بقول ابى حنيفة رح وثانياً فى اخرى بقول مجتهد آخر (المختار) كما ذكره الآمدى وابن الحاجب رنعم للقطع بالاستقراء التام - ربانهم) اى المستفتين فى كل عصر من زمن الصحابة وهلم جرا كانوا يستفتون مرة واحدة ومرة ثانية غير ملتزمين مفتياً واحداً وشاع

وتكرر ولم ينكر وهذا اذا لم يلتزم مذهباً معيناً فلو التزم مذهباً معيناً
 كما في حنيفة رح والشافعي رح فهل يلزمه الاستمارة عليه فلا يعدل عنه
 في مسألة من المسائل فليلزم لانه بالتزامه يصير ملزماً به
 كما لو التزمه في حكم حادثة معينة ولا نة اعتقد ان المذهب الذي
 انتسب اليه هو الحق فعليه الوفاء بموجب اعتقاده روقيل لا يلزم
 وهو الاصح كما في الراقعي وغيره لان التزامه غير ملزم او لا واجب
 الا ما اوجبه الله تعالى ورسوله ولم يوجب الله ولا رسوله على احد
 من الناس ان يتخذ مذهباً بذهب رجل من الامة فيقلده في دينه
 في كل ما ياتي ويبدون غيرة رالي ان قال (ثم قال الامام صاحب الدين
 علائي والذي صرح به الفقهاء في مشهور كتبهم جواز الانتقال في
 احاد المسائل والعمل فيها بخلاف مذهب امامه الذي يقلد مذهب
 اذا لم يكن ذلك على وجه التتابع المرخص انتهى رتحريمه شرحه من ٢٥١
 ج ٣) وبمثل هذا صرح الاسنوي في شرح المتهاج للبيضاوي حيث قال
 اذا قام بجهداً في مسألة فليس له تقليد غيره منها اتفاقاً ويجوز ذلك
 في حكم آخر على المختار فلو التزم مذهباً معيناً كما لطائفة الشافعية
 والحنفية ففى الرجوع الى غيرة من المذاهب الثلاثة اقوال ثالثها
 يجوز الرجوع في ما لم يعمل به ولا يجوز في غيرة .

(فائدتان) احدهما ذكر القرافي في شرح المحصول ان تقليد
 مذهب الغير حيث جوزناه فشرطه ان لا يكون موقفاً في امر يحتمر
 على ابطاله الامام الذي كان على مذهبه والامام الذي انتقل اليه
 فمن قلده مالاً مثلاً في عدم النقص باللمس الخالي عن الشهوة ففصل
 فلا بد ان يدلك بدنه ويسمى جميع راسه والا فتكون صلواته
 باطلة عند الامامين انتهى بقدر الضرورة راسنوي على المتهاج ص ٣٢٩

على هامش التمهيد ج ٣، وحاصل الكلام الذي تلخصناه من نقشات
اولئك الاكابر ان اختيار مذهب القير في بعض المسائل والاقتضائه
يجوز للمجتهد خلاصته الاجتهاد - الاول ان لا يدرم التلقيب بين
المنهيين بحيث يفتح اجماع الامامين على بطلان ما من من تحرير الاصول
والاحكام والاستنوي وغيره والثاني ان يكون اختيار مذهب الغير
قبل العمل بمذهب امامه بان لم يكن عمل به في هذه الحادثة
بمذهب امامه كما في التمهيد والاحكام وغيره. والثالث ان لا يكون
على وجه التبع للرخص فانه لا يجوز للعامة اجماعاً كما صرح به ابن عبد البر
من انه لا يجوز للعامة تتبع الرخص اجماعاً شرح تمهيد ص (٣٥ ج ٣) قلت
هذا رأى المتقدمين من مشائخنا الحنفية حيث لم يشترطوا ضرورة
الشديدة والاضطرار بل اكتفوا على اشتراط عدم تتبع الرخص واما
زماننا هذا فهو زمان اتباع الهوى واعجاب كل ذي رأى برأيه والملا^{عب}
بالدين فتتبع الرخص متعين ومتيقن باعتبار الغالب الاكثر. فلا
يجوز الا بشراط الضرورة الشديدة وعموم البلوى والاضطرار كما ذكره
العلامة ابن العابد في رسالته عقود رسم المفتي وقدمنا
نصه والله سبحانه وتعالى اعلم وعلمه اتم واحكم

كتبه الاحقر الافقر

محمد شفيع الديوبندي

ملخص المسئلة

- قنية الفتاوى في باب مستقل ص ١٥٥
 فتاوى مهدييه ص ٢١٦ ج ٢
 رد المحتار باب الرجعة مطلب التحليل رشامى مصرى قديم ص ٥٥٦
 شرح المنظومة المسماة بعقود رسم المفتى ص ٢٦ ، ٢٧ الى آخر الرسالة
 تحرير الاصول لابن همام رح ص ٥٣ ج ٣
 شروط الانتقال من مذهب الى آخر
 تحرير الاصول ص ٥٢ ج ٣
 ترجيح بعض الائمة على بعض تحرير الاصول ص ٥٣ ج ٣
 واجماع القرون على الائمة الاربعة
 ما يتعلق بالاجتهاد والتقليد والافتاء الاستفتاء مفصلاً كتاب
 الاحكام للأمدى ج ٢ ص ٣١٨ الى آخر الكتاب القاعدة الثالثة في المجتهدين
 واحوال المفتين والمستفتين -
 فتاوى ابن تيمية ص ٢٢٠ ج ٢ وقبل ذلك وبعده مطالب مفيدة
 في الباب فليراجع -
 الرسالة ، الرسالة الثامنة لصاحب الاشباة ص ٢٩ ، ٣٠
 الافتاء بمذاهب الغير وشرائطه ، فتاوى خيريه ص ١٥ ج ٢
 الافتاء بالضعيف شامى ص ٥٣ ج ٢
 الافتاء بمذاهب الغير كتاب الحدود ، حد السرقة شامى ص ٢١٨
 ذكر الفقيه ابو الليث في تاسيس النظر انه اذا لم يوجد في مذهب
 الامام قول في مسئلة يرجع الى مذهب المالك لانه اقرب المذاهب
 اليه -

شامی کتاب الطلاق باب الرجعة فصل التحلیل ج ۲ ص ۵۸۳
 باب القضاء بخلاف ما یعتقد المحکوم له او المحکوم علیه -
 باب ثامن من قضاء العالمگیریه مصری ص ۵، ۲ ج ۳
 اذا لم یوجد فی المسئله عن ابی حنیفه رح

تنقیح الفتاوی ص ۳۳۲ ج ۲ و ص ۳۰۵
 الانتقال من مذهب الی مذهب آخر قنیه ص ۱۵۵
 تنقیح الفتاوی کتاب الکراهیه ص ۳۲ ج ۲
 الحكم

کتاب الموافقات للشاطبی ص ۸۱ ج ۲ فیض القدیر شرح جامع صغیر
 (حدیث) تحت حدیث اختلاف امتی رحمة ص ۲۱۰ ج ۱
 شامی کتاب الشهادة باب قبول الشهادة ص ۲۲۰ ج ۲ و شامی
 فصل التعزیر -

فتاوی حدیثیه ص ۸۵ و ۸۶
 تنقیح الفتاوی کتاب القضاء مطلب فسخر یبین المضافة ومثله
 فی طلاق الشامیه -

فتوٰے متعلقہ جماعت اسلامی



تاریخ تالیف :- ۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ

مارچ ۱۹۷۵ء

مقام تالیف :- کراچی

غیر مطبوعہ :-

سوال

بگڑائی خدمتِ حفتہ اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مفتی اعظم پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گزارش آنکہ جیسا کہ حفتہ والا کو معلوم ہے کہ احقر کو دارالعلوم الاسلامیہ، ٹنڈوالہ یار میں افتاء کی خدمت انجام دینی پڑتی ہے۔ طرح طرح کے سوالات میں اکثر یہ سوال بھی آتا ہے کہ موردی صاحب اور ان کی جماعت جمہور اہل سنت والجماعت کے طعنے پر ہے یا نہیں؟ اور مذاہب اربعہ میں سے ان کا کس مذہب سے تعلق ہے؟ اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ اور یہ جو مشہور ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ان کے رجحانات سلف صالحین کے خلاف ہیں، اس کی کیا حقیقت ہے؟ بعض لوگ آپ کی کسی سابلتہ تحریر کی بنا پر آپ کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں کہ آپ ان کے نظریات سے اتفاق رکھتے ہیں اس کی کیا اصل ہے؟

والسلام

احقر محمد وجیہ، ازدارالعلوم،

ٹنڈوالہ یار (سندھ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الجواب

مولانا موردی صاحب اور جماعت اسلامی کے بارے میں میرے پاس سالہا سال سے سوالات آتے رہے ہیں، جن کا جواب میں اس وقت کے حالات اور ان کے بارے میں اپنی اس وقت کی معلومات کے مطابق لکھتا رہا ہوں، ان میں بعض تحریریں شائع بھی ہوئی ہیں اور بعض نجی مکاتیب کے جواب میں لکھی گئی ہیں، اس وقت ان تمام تحریروں کو سامنے رکھنا ممکن نہیں، البتہ اس عرصہ میں احقر کو کچھ ان کی مزید

تحریرات کے مطالعہ کا موقعہ ملا، کچھ ان کی نئی تالیفات سامنے آئیں اور کچھ ان کے لٹریچر کے عام اثرات اور ان کی جماعت کے حالات کو مزید دیکھتے ہوئے جمع ملا، اس مجموعے سے اب ان کے بارے میں جو میری رائے ہے بے کم و کاست ذیل میں لکھ رہا ہوں :-

میری سابقہ تحریرات اگر اس تازہ تحریر کے موافق ہوں تو قبعا اور اگر سابقہ تحریرات میں کوئی چیز اس کے خلاف محسوس ہو تو اسے منسوخ سمجھا جائے اور اب میری رائے کے حوالہ کے لئے صرف ذیل کی تحریر پر اعتماد کیا جائے۔

احقر کے نزدیک مولانا مودودی صاحب کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ عقائد اور احکام میں ذاتی اجتہاد کی پیروی کرتے ہیں، خواہ ان کا اجتہاد جمہور علمائے سلف کے خلاف ہو، حالانکہ احقر کے نزدیک منصب اجتہاد کے شرائط ان میں موجود نہیں اس بنیادی غلطی کی بنا پر ان کے لٹریچر میں بہت سی باتیں غلط اور جمہور علمائے اہل سنت کے خلاف ہیں، اس کے علاوہ انہوں نے ایسی تحریروں میں علمائے سلف یہاں تک کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ انتہائی غلط ہے خاص طور سے "خلافت و ملوکیت" میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جس طرح صرف تنقید ہی نہیں بلکہ ملامت کا ہون بھی بنایا گیا ہے، اور اس پر مختلف حلقوں کی طرف سے توجہ دلانے کے باوجود اصرار کی جو روش اختیار کی گئی ہے وہ جمہور علمائے اہل سنت والجماعت کے طرز کے بالکل خلاف ہے۔

بیزان کے عام لٹریچر کا مجموعی اثر بھی اس کے پڑھنے والوں پر بجزرت یہ محسوس ہوتا ہے کہ سلف صالحین پر مطلوب اعتماد نہیں رہتا، اور ہمارے نزدیک یہ اعتماد ہی دین کی حفاظت کا بڑا حصہ ہے، اس سے نکل جانے کے بعد لوہی نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ بھی انسان نہایت غلط اور گمراہ کن راستوں پر پڑ سکتا ہے، ہاں یہ صحیح ہے کہ ان کو منکرین حدیث، قادیانیوں یا اباحت پسند لوگوں کی صف میں گھرنا کہنا بھی میرے نزدیک درست نہیں، جنہوں نے سود، شراب، قمار اور اسلام کے کھلے محرمات کو حلال کرنے کے لئے قرآن و سنت میں تحریفات کی ہیں۔

..... بلکہ ایسے لوگوں کی تردید میں ان کے
تحریریں ایک خاص سطح تک ز تعلیم یافتہ حلقوں میں مؤثر اور مفید بھی ثابت
ہوتی ہیں، یہ بات میں ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں، لیکن اگر کوئی شخص میری اس بات
کو بنیاد بنا کر یہ کہے کہ میں مودودی صاحب کے ان نظریات سے متفق ہوں جو انہوں نے
جمہور علماء کے خلاف اختیار کئے ہیں تو یہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ بات ہے۔
اگرچہ جماعت کے قانون میں مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی
الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں اور اصولاً جو بات مولانا مودودی صاحب کے بارے
میں درست ہو، فروری نہیں کہ وہ جماعت اسلامی کے بارے میں بھی درست
ہو، لیکن عملی طور سے جماعت اسلامی نے مولانا مودودی صاحب کے لٹریچر کو نہ صرف
جماعت کا علمی سرمایہ اور اپنے عمل کا محور بنایا ہوا ہے بلکہ اس کی طرف سے
زبانی اور تحریری مدافعت کا عام طرز عمل ہر جگہ مشاہدہ میں آتا ہے۔ جو اس
بات کی دلیل ہے کہ جماعت کے افراد سبھی ان نظریات اور تحریروں سے متفق
ہیں، البتہ اگر کچھ مستثنیٰ حضرات ایسے ہوں جو مذکورہ بالا امور میں مولانا مودودی
سے اختلاف رکھتے ہوں اور جمہور علمائے اہل سنت کے مسلک کو اس کے مقابلے
میں درست سمجھتے ہوں تو ان پر اس رائے کا اطلاق نہیں ہوگا۔

نماز کے بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ امام اس شخص کو بنا نا چاہیے جو
جمہور اہل سنت کے مسلک کا پابند ہو، لہذا جو لوگ مودودی صاحب سے
مذکورہ بالا امور میں متفق ہوں انہیں با اختیار خود امام بنا نا درست نہیں،
البتہ اگر کوئی نماز ان کے پیچھے پڑھ لی گئی تو نماز ہوگئی۔

یہ میری ذاتی رائے ہے جو اپنے حد تک غور و فکر کے
بعد فیما بینی و بین اللہ و تا کم کہ ہے، میں کسی مسلمان
کے بارے میں بدگمانی اور بے احتیاطی سے بھی اللہ کے

پناہ مانگتا ہوں اور دینے کے معاملہ میں مدد ہنت سے بھی۔
 جن حضرات کو میری اس رائے سے اتفاق نہ ہو وہ اپنے عمل
 کے مختار ہیں، مجھے ان سے کوئی مباحثہ کرنا نہیں نہ میرے توئے
 اور مصروفیات اس کے متحمل ہیں، اور اگر کوئی صاحب
 اس کو شائع کرنا چاہیے تو اس سے میری درخواست
 ہے کہ اسے کوپورا شائع کریں، ادھر یا کوئی طبعی شائع کر کے
 خیانت کے مرتکب نہ ہوں۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلیف

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ

پیر و مرید کا فقہی اختلاف

مثالی بحث و تنقید

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

زیر نظر سطور میں ایک واقعہ کی یادداشت، جس کو متعدد فوائد کے پیش نظر ضبط کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ کا تعلق میرے مخلص دوست مولانا حافظ جلیل احمد صاحب سابق رئیس علی گڑھ رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ مرحوم سیدی حضرت حکیم الامتہ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص اور ممتاز خلفاء میں سے تھے۔ حضرت رحمہ سے تعلق ارادت و اصلاح ہونے کے بعد آپ پر درویشی کا ایسا رنگ غالب ہوا کہ اپنی زمینداری اور ریاست کو چھوڑ چھاڑ کر مع اہل و عیال تھانہ بھون کی سکونت اختیار کر لی تھی اور حضرت رحمہ کی وفات تک وہیں مقیم رہے۔ علم دینی حاصل کرنے کا شوق ہوا تو خانقاہ میں مقیم ایک عالم سے باقاعدہ تعلیم حاصل کر کے ضروری علوم پورے کئے۔ حضرت رحمہ کی وفات کے بعد جب پاکستان بنا تو پاکستان میں منتقل ہو گئے اور جامعہ اشرفیہ انارکلی لاہور میں حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس قیام فرمایا۔ اور خموشی و گنہامی کے ساتھ دعوت و ارشاد اور تعلیم و تبلیغ کی خدمات میں مشغول رہ کر اب سے چند سال پہلے جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ اپنے صاحبزادے کے ساتھ اب بھی جامعہ اشرفیہ میں مقیم ہیں۔ آپ کے صاحبزادے مولانا دکیل احمد

صاحب شروائی اب بھی جامعہ اشرفیہ میں مدرس ہیں۔

جس زمانے میں مرحوم اپنے اہل وعیال کے ساتھ تھانہ بھون میں مقیم تھے آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ کی وقف کردہ جائداد کے متعلق کچھ سوالات حضرت حکیم الامتہ قدس سرہ کی خدمت میں پیش کئے جن کا جواب اس وقت کے مفتی خانقاہ نے تحریر فرمایا مگر حضرت رح کو اس جواب پر اطمینان نہ ہوا اور اس پر کچھ اشکالات تحریر فرما کر اپنا جواب لکھا اور ارشاد فرمایا کہ اب یہ مجموعہ محمد شفیع کے پاس دیو بند بھیج دیا جائے کہ وہ جواب لکھے میں نے مسئلہ میں جتنا غور و فکر کیا تو مجھے حضرت رح کی تحریر پر اطمینان اور شرح صدر نہ ہوا بلکہ کچھ شبہات و اشکالات پیش آئے جن کو تحریر کر کے حضرت کی خدمت میں بھیج دیا اور مسئلہ کے متعلق میرا جواب حضرت رح کے جواب سے مختلف ہو گیا۔ اب معاملہ اور زیادہ الجھ گیا تو حضرت رح نے مولانا سائمن محمد حلیل صاحب فرمادیا کہ خط و کتابت میں طول ہوگا، محمد شفیع کے تھانہ بھون آنے کا انتظار کرو زبانی گفت گو سے بات طے کر لی جائے گی۔ جب احقر تھانہ بھون حاضر ہوا تو حضرت رح نے اس مسئلہ پر گفتگو کے لئے ایک وقت مقرر فرمایا اور کافی دیر تک مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث و گفتگو ہوتی رہی مگر عجب اتفاق یہ پیش آیا کہ اس زبانی گفتگو میں بھی کسی ایک صورت پر رائیں متفق نہ ہوئیں، حضرت کے سامنے مجھ بے علم و عمل کی رائے ہی کیا تھی؛ مگر حکم یہی تھا کہ جو کچھ رائے ہو اس کو پوری صفائی سے پیش کرو اس میں ادب مانع نہ ہوتا چاہیے اس لئے اظہار رائے پر مجبور تھا۔ کچھ دیر کے بعد مجلس اس بات پر ختم ہوئی کہ دیر کافی ہو گئی ہے اب پھر کسی روز اس مسئلہ پر غور کریں گے۔

اب حافظ رخصت ہو چکا ہے پوری بات یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ اس کے بعد پھر تحریری سلسلہ شروع ہوا، حضرت رح نے میرے شبہات و اشکالات کا جواب تحریر فرمایا مگر اس جواب پر احقر کو اطمینان نہ ہوا تو مزید سوالات لکھ کر بھیجے اس طرح ایک عرصہ تک پھر یہ دیر بجٹا مسئلہ ملتوی رہا اور آخر میں جب احقر تھانہ بھون حاضر ہوا

تو مزید غور و فکر کے لئے ایک مجلس منعقد ہوئی اس میں بھی صورت حال یہی رہی کہ نہ حضرت رح کی رائے بدلی نہ میری حضرت رح نے فرمایا کہ میں تمہارے جواب کو اصول و قواعد کی رو سے غلط نہیں کہتا، مگر اس پر میرا شرح صدر نہیں، اس لئے اختیاراً نہیں کرتا۔ احقر نے بھی عرض کیا کہ حضرت کی تحقیق کے بعد غالب یہی مسلم ہو گیا ہے کہ میری ہی رائے غلط ہوگی مگر کیا عرض کروں کہ اس کا غلط ہونا مجھ پر واقع نہیں اس پر حضرت رح نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اچھا بس آپ اپنی رائے اور فتویٰ پر رہو میں اپنی رائے اور فتویٰ پر ہوں مستفتی کو ہم اس کی اطلاع کریں گے کہ اس مسئلے میں ہم اور ان میں اختلاف ہے اور ہم کسی جانب کو یقین غلط بھی نہیں کہہ سکتے اس لئے تمہیں اختیار ہے کہ جس پر چاہو عمل کر لو۔

عجب اتفاق ہے کہ مستفتی جو حضرت رح کے مرید اور خلیفہ خاص تھے ان کو جب اختیار ملا تو انہوں نے عرض کیا کہ اگر مجھے اختیار ہے تو بندہ محمد شفیع کے فتویٰ کو اختیار کرتا ہے، حضرت رح نے بڑی خوشی کے ساتھ اس کو قبول کیا۔ یہ واقعہ حضرت حکیم الامتہ کی وفات سے چھ سال پہلے یعنی ۱۳۵۶ء کا ہے۔

مسئلہ کی اہمیت اور اس پر مکرر، سہ کر غور و فکر کا تقاضا تھا کہ یہ ساری بحث سوالات و جوابات پورے تحریر کے ذریعہ محفوظ رکھے جاتے اور فتاویٰ کا جز بنیتے مگر افسوس اس وقت اس کا اندازہ.... نہ تھا کہ یہ بحث اتنا طول پکڑے گی، اور اس میں اتنے علمی فوائد ہوں گے، اس لئے زبانی بحث کو تو ضبط ہی نہیں کیا گیا۔ تحریر میں بھی دو طرفہ تحریروں کے جمع کرنے کا اتفاق نہ ہوا اور یہ بات ہمیشہ دل میں کھٹکتی رہی کہ ہم اس مفید علمی بحث کو ضائع کر دیا۔ کچھ عرصہ ہوا مولانا مرحوم کے صاحبزادے مولانا وکیل احمد صاحب سے اس کا تذکرہ ہوا میں نے ان سے کہا کہ شاید والدہ محترمہ کے پاس اس خط و کتابت کا کچھ حصہ محفوظ ہو، انہوں نے تفتیش کی تو صرف ایک خط ملا جو احقر نے مولانا جلیل احمد صاحب کو حضرت کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لکھا تھا جس پر تاریخ ۶ جمادی الثانیہ ۱۳۵۶ء بڑی ہوئی ہے

ظاہر ہے کہ یہ درمیانی ایک خط ہے نہ اس میں مسئلے کی پوری صورت مذکور ہے نہ پہلے سوال و جواب نہ آخری فیصلہ اس سے کسی خاص نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہے مگر اس کو اس لئے شائع کیا جاتا ہے کہ کم از کم اس سے اتنا فائدہ ہوگا کہ استاد شاگرد پیر مرید میں اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو طرز اختلاف کیا اور کیسا ہونا چاہیے کہ بے ادبی کا ثابہ بھی د آئے۔ آج کل بہت سے لوگ برطوں پر تنقید کرنے کو تو اپنا حق سمجھتے ہیں مگر تنقید کے بجائے تنقیص میں مبتلا ہو کر ادب سے محروم ہو جاتے ہیں ان کے لئے یہ واقعہ اور اس کا یہ ایک خط ہی سبق حاصل کرنے کے لئے کافی ہے، اس خط کی نقل یہ ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مخدوم بندہ مولوی جلیل احمد صاحب۔
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

احقر عرصہ سے بیمار تھا اور اب بھی طبیعت صاف نہیں اس لئے جناب کی تحریر کے جواب میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔

اب حضرت والا دامت برکاتہم کی تحریر کا چند بار مطالعہ کیا، حضرت کے شرح صدر کے بعد عمل میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کیوں کہ اس باب میں سب سے بڑی چیز احقر کی نظر میں بزرگوں کا شرح صدر ہے لیکن طالب علمانہ چند شبہات قلب میں وارد ہوتے ہیں وہ احقر نے اس پرچہ میں ضبط کر دیئے ہیں اگر موقع مل جائے تو حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش فرمادیں اور جو کچھ ارشاد ہوا اگر اس کو ضبط کر کے احقر کو بھی مطلع فرمادیں تو عنایت ہو۔

حضرت والا کے ارشاد گرامی۔ یہ ہے کہ رجسٹری کی شرط ملائم عقدا نہ ہونے کی وجہ سے معتبر نہیں اس پر یہ شبہ گزرتا ہے کہ کسی شرط کے معتبر ہونے کے لئے متون و فتاویٰ میں صرف یہ شرط تو مذکور ہے کہ خلاف شرع نہ ہو، شرط کے ملائم وقف

۴
۱۷۸ یعنی ایسے مسائل میں جہاں علماء کا اختلاف ہو اور دلائل و دوزن کے موجب ہوں ۱۷ محمد شفیع

ہونے کی شرط کہیں نظر سے نہیں گذری۔ بلکہ شامی کی عبارت ذیل سے کچھ اطلاق و
تعمیم ہی متبادر ہوتی ہے۔ عبارت یہ ہے:

فان شرائط الوقت معتبرة ما لم تخالف الشرع وهو
مالك فله ان يجعل ماله حيث شاء ما لم يكن معصية (الی ان
قال) اریت لو وقف علی فقراء اهل الذمّة ولم یذکر
غیرهم الیس یجر منه فقراء المسلمین ولو دفع المتولی الی المسلمین
ضمن الخ (شامی استنبولی ص ۲۹۹ ج ۳) تحت مطلب۔ شرائط
الوقت معتبرة ما لم تخالف الشرع۔

اس سے خلاصہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالک اپنی ملک کے تصرفات میں کوئی شرط بیوقوفی
سے غیر ملامت عقوبتی لگا دے تو گو اس کے لئے وہ شرط نافع نہ ہو، مگر متولی اس
کا پابند ہوگا جیسا کہ تمام عقود میں مالک کے تصرفات اور شرائط خواہ اس کے لئے
مفید ہوں یا مضرت ملامت ہوں یا غیر ملامت نافذ سمجھے جاتے ہیں۔

دوسرا جز یہ ہے کہ رجسٹری کی شرط خلاف شرع ہے کیوں کہ حکومت موجودہ
کے ماتحت حکام کبھی مسلم ہوتے ہیں کبھی کافر اور کافر کی شہادت معتبر نہیں
اس میں یہ شبہ ہے کہ اصل شرط میں تو کوئی سقم نہیں کہ احتمال شہادت مسلم کا بھی
ہے، وقوعاً کسی وقت شہادت کافر اس پر مرتب ہو جائے تو اس کی وجہ سے شرط
کو خلاف شرع قرار دینا سمجھ میں نہیں آیا۔

تیسرا جز یہ ہے کہ رجسٹری اصل مقصود نہیں بلکہ بحسب عرف مقصود
اصلی جعل سازی کا انسداد اور ثبوت ہے، رجسٹری بھی چوں کہ عادتاً اس کا ایک
ذریعہ ہے اس لئے رجسٹری کا ذکر کر دیا گیا۔

اس میں یہ بات غور طلب ہے کہ اس میں تو شبہ نہیں کہ رجسٹری خود کوئی مقصود
چیز نہیں، لیکن پھر اس کلام کے دو محمل ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ مقصود اصلی ثبوت اور
غلط دعاوی کا انسداد ہے مگر اس عام مضمون کو خاص عنوان رجسٹری سے تعبیر کر دیا

جیسا کہ حضرت والا کی تحریر میں مذکور ہے اور دوسرا عمل اس کلام کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ثبوت اور انسداد و جعل سازی کو قرار دے کر اس کے ذرائع اور طرق مختلفہ میں سے واقف نے اپنی نظر اور عادت و عرف کی بنا پر ایک ذریعہ رجسٹری کو متعین کر دیا، پہلے عمل کی بنا پر رجسٹری شرط نہ رہے گی بلکہ نفس ثبوت خواہ کسی طریق سے ہو جائے ترمیم کے لئے کافی ہوگا۔ اور دوسرے عمل پر رجسٹری شرط قرار دی جائے گی کیوں کہ واقف نے طرق ثبوت میں سے اس کو متعین کر دیا ہے اور ظاہر عبارت سے احقر کا خیال یہی ہے کہ عمل ثانی متبادر ہے۔ یہ چند طالب علماتہ شبہات ہیں جن کا کچھ جواب ہو جائے تو تشفی ہو جاوے گی ورنہ عمل میں حضرت والا کے شرح صدر سے تجاوز کرنا مناسب نہیں۔

احقر کو جو اس فتویٰ میں کوئی بات کھٹک کی باقی ہے وہ صرف ائمہ اور ارباب فتویٰ کے اقوال متضادہ میں سے قول محمد کو ترجیح دینا ہے کہ یہ اپنی حیثیت سے بہت اونچا معاملہ ہے، اس میں خصوصیت سے حضرت والا کے رائے معلوم ہو جائے تو بہتر ہے

بند کا محمد شفیع عفا اللہ عنہ

والسلام

۶ رجب ۱۳۵۶ھ

انتباہ

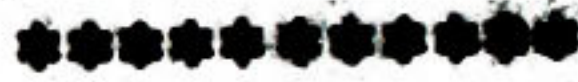
اصل معاملہ کیا اور کس طرح تھا، اب حافظہ میں کچھ نہیں رہا، خط میں خود کرنے سے اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ واقف نے وقف نامہ میں اپنے لئے شرائط وقف میں ترمیم و تبدیل کا حق رکھا تھا اس کے لئے شرط یہ لکائی تھی کہ اس ترمیم کی بھی رجسٹری کرائی جائے جیسا کہ اصل وقف نامہ رجسٹری ہے۔ بعد میں کوئی ترمیم کی گئی مگر اس کی رجسٹری نہیں ہوئی، اس لئے سوال یہ ہوا کہ یہ ترمیم شرعاً معتبر ہوگی یا نہیں۔ حضرت نے رجسٹری کی شرط کو غیر ملائم للعقد قرار دے کر اس کے بغیر بھی ترمیم کو معتبر قرار دیا، احقر کو اس پر شبہات تھے جن کا اس خط میں ذکر کیا گیا ہے واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

بند کا محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۲ رجب ۱۳۹۷ھ

تعديل الهادى و
تقبيل الايادى

دست بوى اور قدم بوى



دارالعلوم كراچى	مقام تاليف
۱۲ روى الحجۃ ۱۳۹۲ھ	تاريخ تاليف
البلاغ ربيع الاول ۱۳۹۳ھ	اشاعت اول



”اس كا سبب تاليف و لچسپ اور انذر حضرت
مفتى صاحب مدظلهم كى تحرير ميں ملاحظه هو“



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

عجائب اتفاق سے ہے کہ آج سے سینتیس سال پہلے وسط ذی الحجہ الثانی ۱۳۵۶ھ میں احقر نے خواب میں دیکھا کہ سیدی و مرشدی حکیم الامت قدس سرہ میرے مکان پر تشریف لائے اور مجھے ارشاد فرمایا کہ تقبیل کے متعلق تم نے کتاب دیکھی ہے یا نہیں (ایسا محسوس کرتا تھا کہ حضرت نے اس سے پہلے کسی اشکال کی وجہ سے اس مسئلہ پر کتابیں دیکھنے کے لئے ارشاد فرمایا تھا، اس کی تاکید کے لئے اس وقت یہ جملہ فرمایا) میں نے عرض کیا کہ اب تک دیکھنے کا وقت نہیں ملا، اب دیکھوں گا، اور غالباً طریقہ محبت میں مسئلہ حل جائے گا۔ یہ تو حضرت سے عرض کیا اور اپنے دل میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ عالمگیری کتاب الخطر والا باعث میں یہ مسئلہ ہے، اب اس کو بھی دیکھوں گا، اسی اثناء میں آنکھ کھل گئی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ تقبیل سے کیا مراد ہے اور اس پر اشکال کیا ہے، جس کے لئے کتابیں دیکھنے کا ارشاد ہوا ہے، احقر نے یہ خواب حضرت کی خدمت میں لکھ بھیجا جس کا جواب یہ آیا:

”ادل بار تو شرح صدر کے ساتھ کچھ سمجھ میں نہ آیا اگر تکلف سے کچھ حل ہوا مگر خود تکلف ہی پسند نہیں۔ دوسری بار جو خط پرٹھا تو بیساختہ خیال آیا کہ اس وقت تقبیل ایدی (دست بوسی) کی جو اہتمام کے ساتھ عادت ہو گئی ہے، اس کے محذورات بھی بیان کرتا ہوں، شاید خواب میں اس کی طرف متوجہ کیا گیا ہوگا۔ خواہ عمل کے لئے خواہ ضبط کے لئے تاکہ دوسروں کو بھی معلوم ہو جائے، واللہ اعلم۔ اگر کسی وقت اس کے متعلق کچھ لکھا جاوے اس کا نام یہ مناسب ہے۔ تعدیل الہادی فی تقبیل الایادی“

اول تو معاملہ خواب کا پھر تعبیر خواب میں بھی حضرت والا نے اس مسئلہ پر کچھ لکھنے کی

تاکید نہیں فرمائی، بلکہ محض اپنی فرصت اور خواہش پر چھوڑا، اس لئے اس مسئلہ پر کچھ لکھنے کا فوری طور پر کوئی ارادہ نہ ہوا اور انجام کار مردہ ایام سے اس میں ذہول ہو گیا۔

اتفاقاً ۱۳۸۲ھ میں احقر کو عمرہ و زیارت کے لئے حرمین کی حاضری نصیب ہوئی۔ مدنیہ طیبہ میں محب محترم انجی فی اللہ مولانا سید محمود بن سید نذیر طرازی مقیم مدینہ منورہ کے پاس ایک قلمی رسالہ شیخ امام محمد عابد سندھی کا جو بارہویں صدی ہجری کے مشائخ سندھ میں سے ہیں اور آپ کے حواشی تقریباً صحاح ستہ پر معروف و مقبول ہیں، نظر پڑا جس کا نام تھا "الکوامتہ و التقبیل" جس میں پہلے کرامات اولیاء کے حق ہونے کا مسئلہ بیان فرمایا ہے اس کے بعد علماء و مشائخ کی دست بوسی اور قدم بوسی کو احادیث معتبرہ اور آثار صحابہ و تابعین سے ثابت فرمایا ہے جس سے احقر کو یہ خیال آیا کہ خواب میں جو اس مسئلہ کا طریقہ محمدیہ میں نے دیکھنے کا ذکر کیا ہے، شاید طریقہ محمدیہ سے بھی سنن و آثار مراد ہوں۔ احقر نے اس رسالہ کو خود اپنے قلم سے نقل کر لیا، تاکہ وہ قدیم ارادہ پورا کروں کہ مسئلہ تقبیل پر کچھ لکھوں، لیکن اب کہ ۱۳۹۲ھ ہے، اس واقعہ کو بھی دس سال ہو گئے اور اس کام کا موقع نہ ملا خواب میں جس تعویق اور تاخیر کا اظہار ہوا تھا وہ شاید کوئی تکوینی امر تھا کہ اب تک بھی اس کے لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ ۱۳۹۲ھ میں احقر کو شدید قلبی مرض پیش آیا، بظاہر امید زلیست نہ تھی، پھر حق تعالیٰ نے کرم فرمایا اور صحت ہو گئی مگر ضعف شدید ہنوز چل رہا ہے اسی سال میں نامکمل تالیفات کی تکمیل اور خاص خاص تالیفات پر نظر ثانی کا عزم کیا حق تعالیٰ نے سب سے اہم تالیف تفسیر معارف القرآن کی تکمیل بھی اس واقعہ کے بعد کرا دی اور اس وقت شیخ محمد عابد سندھی کا قلمی نسخہ سامنے آ کر اس کے لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ مفید و نافع بنا دیں اور قبول فرمائیں۔

پندرہ محمد شفیع روز عید الاضحیٰ

۱۳۹۲ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

والصلوٰۃ والسلام علیٰ نبیہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ ازلوا لجمعیۃ
 علماء و مشائخ کی دست بوسی و قدم بوسی کے مسئلے میں حضرات فقہاء میں کچھ اختلاف پایا جاتا
 ہے اور مستند روایات حدیث اور آثار صحابہ و سلف سے اس کا جواز بلکہ اس پر تعالیٰ ثابت
 ہوتا ہے مگر جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی ایک حدیث سے تقبیل کی ممانعت بھی معلوم
 ہوتی ہے اس لئے مسئلہ تحقیق طلب ہو گیا، روایات حدیث کی تطبیق و تحقیق کے لئے
 تو حضرت شیخ محمد عابد سندھیؒ کا رسالہ مذکورہ کافی شافی ہے۔ حضرات فقہاء نے
 جو اس کو منع فرمایا اس کی وجہ اس کی فی نفسہ ممانعت و حرمت نہیں بلکہ بعض مفاسد
 اور منکرات کی شمولیت کے سبب سے ان حضرات نے بطور سد ذرائع دست بوسی
 و قدم بوسی کو منع فرما دیا ہے۔

میں پہلے اس جگہ رسالہ حضرت شیخ محمد عابد سندھیؒ کی تلخیص اردو زبان میں لکھا ہوا
 ان کا اصل رسالہ عربی زبان میں ہے۔ اس کے بعد حضرات فقہاء کے اختلاف اور اس
 میں اعدل الاقوال پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

تلخیص مقالہ حضرت شیخ محمد عابد سندھیؒ محرم ۱۲۲۳ھ

کسی کی تقبیل یعنی بوسہ دنیا مختلف اسباب سے ہوتا ہے۔ ایک نفسانی شہوت کے ساتھ
 بوسہ دینا ہے وہ بالاتفاق فقہاء مجتہدین اپنی ذمہ داریاں خرید کنیز کے کسی دوسری عورت یا مرد کے
 لئے جائز نہیں خواہ لقموں پر ہو یا سر یا چہرہ وغیرہ۔ حدیث اس کا بھگاتہ
 شفقت ہوتی ہے جیسے والدین کا اپنی اولاد کے سر یا چہرہ وغیرہ پر بوسہ دینا، تیسرا

سبب اس کا تعظیم و تکریم ہوتا ہے جیسا کہ علماء مشائخ یا سلطان عادل کے ہاتھوں وغیرہ پر بوسہ دینا۔ آخری دونوں صود میں جائزہ میں اور احادیث و آثار سے ثابت ہیں۔

تقبیل شفتت | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بدن کو بوسہ دیا اور حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت صدیقہ عائشہؓ کے چہرہ پر بوسہ دیا جب کہ ان کو تجار میں مبتلا دیکھا (کما اختص ابو داؤد) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی پیشانی کو بوسہ دیا (کما اختص ابو داؤد) یہ واقعات وہ ہیں کہ تقبیل بزرگانہ شفتت کی بنا پر ہوئی اور اس میں فقہاء کا بھی کوئی اختلاف نہیں۔

تقبیل تعظیم | شیخ محمد عابد سندھی نے اپنے رسالہ میں تحریر فرمایا کہ تعظیم و تکریم کے لئے دست بوسی یا قدم بوسی صرف ان لوگوں کی جائز ہے جو عالم صالح یا سلطان عادل ہو یا کوئی دینی مشرف و بزرگی رکھتا ہو، ان کے سوا دوسروں کے لئے جائز نہیں حرام ہے، کیوں کہ نصوص حدیث سے اس کا جواز صرف دینی خرافات و فضیلت رکھنے والوں کے لئے ثابت ہے۔ ان کے سوا دوسروں کے لئے ثابت نہیں۔

البتہ علمی و دینی مشرف رکھنے والوں کے لئے دست بوسی بلکہ پا بوسی بھی قوی دویا

حدیث سے ثابت ہے۔

روایات حدیث متعلقہ | ۱۔ ابو داؤد نے سنن میں اور امام بخاری نے الادب المفرد میں حضرت ذابیح رحمہ

سے روایت کیا ہے۔ وہ ایک وفد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، ان کی روایت ہے کہ ہم جب مدینہ طیبہ پہنچے تو ہم اپنی سواریوں سے جلدی جلدی اترے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔ ۲۔ نیز ابو داؤد نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اس قصہ کے ذکر

کے بعد یہ الفاظ کہے ہیں (رواہ ابن ماجہ فی کتاب الادب)

قال قد نونا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقبلنا یدایہ
یعنی ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کے دونوں ہاتھوں

کو بوسہ دیا۔

۳ ————— نیز ابو داؤد نے حضرت صدیقہ عائشہ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر میں داخل ہوتے تو وہ استقبال کے لئے کھڑی ہو جاتیں اور آپ کے دست مبارک کو بوسہ دیتی تھیں۔

۴ ————— نیز ابو داؤد نے حضرت سید بن حصیب سے روایت کیا کہ وہ ایک انصاری صحابی سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز کچھ لوگ بیٹھے ہوئے باہم بات چیت کر رہے تھے۔ ان میں ایک شخص منہی مزاج کرنے والا بھی تھا جو ان کو تنہا رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوکھ کو ایک لکڑی سے پھیرا تو اس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ (آپ نے میری کوکھ میں لکڑی لگائی ہے میں اس کا بدلہ لوں گا) آپ مجھے بدلہ دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (آؤ بدلہ لے لو۔ اس نے عرض کیا کہ میرے بدن پر تو کرتہ نہیں تھا، تنگے بدن پر آپ کی چھڑی لگی ہے اور آپ کے بدن پر کرتہ ہے۔ اس لئے انتقام پورا نہیں ہوگا، آپ نے قمیص مبارک کچھ اٹھا دی یہ شخص آگے بڑھا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لپٹ کر آپ کے پہلو کو بوسے دینے لگا اور پھر عرض کیا، یا رسول اللہ میری عرض اس گفتگو سے یہی تھی۔

۵ ————— طبرانی نے کعب بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے تو آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک اپنے ہاتھوں سے تھاما اور اس کو بوسہ دیا۔

۶ ————— طبرانی نے معجم اوسط میں سندجید کے ساتھ حضرت سلمہ بن اکوعؓ سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی۔ میں نے آپ کے دست مبارک کو بوسہ دیا تو آپ نے مجھے منع نہیں فرمایا۔

۷ ————— حاکم نے مستدرک میں حضرت بریدہؓ سے روایت کر کے اس کو

صحیح الاسناد قرار دیا ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے آپ کے سر مبارک اور قدموں کو بوسہ دیا۔

۸ — ترمذی، نسائی۔ ابن ماجہ نے حضرت صفوان سے روایت کیا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں کو بوسہ دیا۔ امام ترمذی نے اس کو روایت کر کے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے۔

حضرت شیخ محمد عابد سندھی نے مذکورہ بالا روایات نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ ان احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ عالم اور سلطان عادل اور صاحب شرف و نبی کی دست بوسی بلکہ قدم بوسی بھی جائز ہے کیوں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان تینوں صفات کے ایسے جامع ہیں کہ جس کی کوئی نظیر عالم میں نہیں۔ اس کے بالمقابل حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے جو تقبیل کی ممانعت معلوم ہوتی ہے وہ ان عام لوگوں کے لئے ہے جو اوصاف ثلثہ مذکورہ سے خالی ہوں۔

۹ — ترمذی نے بسند حسن حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم میں سے کوئی آدمی جو اپنے بھائی یا دوست سے ملے تو کیا اس کی تعظیم کے لئے جھک جائے آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر اس نے سوال کیا کہ کیا معانقہ کرے اور تقبیل کرے، آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر اس نے سوال کیا کہ کیا مصافحہ کرے؟ تو فرمایا کہ ہاں۔

شیخ محمد عابد صاحب نے فرمایا کہ یہ حدیث ان لوگوں پر معمول ہے جن میں مذکورہ صدر اوصاف ثلثہ میں سے کوئی وصف نہ ہو اس کے ساتھ یہ معاملہ معانقہ اور تقبیل کا نہ کیا جائے، صرف مصافحہ کافی ہے اور تشریح اس کا خود وہ سوال ہے جو حدیث میں مذکور ہے، کیوں کہ سائل نے یہ نہیں پوچھا کہ بڑے عالم یا بزرگ سے ملیں تو کیا کریں بلکہ سوال عام دوست یا بھائی کا کیا ہے جس کے جواب میں آپ نے معانقہ اور تقبیل کو منع فرمایا۔ یہاں تک تو واقعات اس کے تھے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی دست بوسی کی، اب وہ واقعات بھی سنئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کی تقبیل فرمائی۔

۱۰۔۔۔۔۔ حدیث میں ثابت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تشریف لانے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معانقہ فرمایا اور ان کے منہ کو بوسہ دیا۔ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے دیکھا تو انہوں نے بھی آپ کی اتباع میں صدیق اکبر کے منہ کو بوسہ دیا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا اے ابوالحسن ابو بکر کا درجہ میرے نزدیک ایسا ہے جیسا میرا درجہ میری والدہ کے سامنے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تقبیل اور دست بوسی وغیرہ کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت نہیں، دوسروں کے لئے بھی جائز ہے بشرطیکہ ان میں اوصاف مذکورہوں سے کوئی موجود ہو اور مندرجہ ذیل روایات سے اس عدم خصوصیت کی پوری تائید ہو جاتی ہے جن میں صحابہ کرام کا باہم ایک دوسرے کی دست بوسی وغیرہ کرنا ثابت ہے اور اس پر کسی نے ٹکیر نہیں کیا۔

۱۱۔۔۔۔۔ طبرانی نے یحییٰ بن عارف الذہری سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ میں وائل بن اسقع رضی اللہ عنہ سے ملا تو ان سے کہا کہ آپ کے اس ہاتھ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی ہے انہوں نے فرمایا کہ ہاں، میں نے عرض کیا تو آپ اپنا ہاتھ مجھے دیکھئے کہ میں اس کو بوسہ دوں، انہوں نے میری درخواست منظور کر لی۔ میں نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا، حافظ بیہقی نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ رجال اسنادہ ثقات یعنی اس کی اسناد کے سب رجال ثقہ ہیں۔

۱۲۔۔۔۔۔ اور محب طبری نے اپنی کتاب الریاض النضرہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فضائل میں ابو جہاد عطار دی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں مدینہ منورہ میں داخل ہوا تو لوگوں کا ایک مجمع دیکھا اور ایک شخص کو دیکھا جو ایک دوسرے

شخص کے سر کو بوسہ دے رہا تھا اور یہ کہتا جا رہا تھا کہ میں تم پر تبر بان ہو جاؤں
 اگر تم نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے؟
 جس کے سر کو بوسہ دیا جا رہا ہے۔ اور بوسہ دینے والا کون ہے؟ لوگوں نے بتایا
 کہ یہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور بوسہ دینے والے حضرت عمر بن خطاب ہیں۔ یہ واقعہ
 اُس وقت کا ہے جب کہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کرنے پر حضرت صدیق اکبرؓ
 کی رائے جم گئی تھی اور حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کو اس میں خطرہ تھا، اس
 لئے مخالفت کر رہے تھے، مگر جب صدیق اکبر کی رائے کے مطابق جہاد ہوا اور
 اس کے نتائج خیر سامنے آئے تو اس وقت عمر بن خطابؓ نے صدیق اکبر کی رائے
 کی تصویب کے لئے یہ عملی مظاہرہ فرمایا۔

۱۳ — اور حافظ ابن حجرؒ نے اصحاب میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ
 کے حالات میں بروایت ابن مبارک عن داؤد بن ابی المنذر عن الشعبي یہ واقعہ
 نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت زید بن ثابتؓ گھوڑے پر سوار ہوئے تو حضرت
 ابن عباسؓ نے (بطور تعظیم و اکرام کے) ان کی رکاب تھامی، حضرت زید نے منع کیا
 کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی، آپ ایسا نہ کریں مگر حضرت
 عبد اللہ بن عباس نے فرمایا کہ:

هكذا امرنا ان نفعل بعلما ننا - ہمیں ایسا ہی حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنے
 علماء کے ساتھ تعظیم و اکرام کا ایسا ہی معاملہ کریں حضرت زید بن ثابتؓ نے
 حضرت ابن عباسؓ کے ہاتھ چوم لئے اور فرمایا هكذا امرنا ان نفعل
 باهل بيت نبينا صلي الله عليه وسلم - یعنی ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے کہ ہم
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے ساتھ اسی طرح کی تعظیم و اکرام
 کا معاملہ کریں۔

یہی واقعہ مستدرک حاکم باب معرفۃ الصحابہ میں بروایت ابن عباسؓ نقل
 کر کے منسوخ فرمایا ہے کہ اسناد اس کی صحیح علی شرط مسلم ہے اور حافظ ذہبی نے بھی

اس پر کوئی تنقید نہیں سردمانی، بلکہ سکوت سے اقرار فرمایا ہے۔ اور یہ واقعہ شمس لائبر
سرخسی نے مبسوط میں بھی ذکر کیا ہے (ص ۷۳ - ج ۱۶)

۱۴ — اور بیہقی نے بروایت صرار بن عمر حضرت ابو رافع رضی سے
روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک لشکر روم کے جہاد کے لئے بھیجا تھا
جن میں حضرت عبداللہ بن حذافہ صحابیؓ بھی تھے (مگر پوایہ کہ رومیوں کی قوت زیادہ تھی)
انہوں نے ان مسلمانوں کو قید کر لیا اور بادشاہ روم نے حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی
کو حکم دیا کہ تم نصرانی بن جاؤ تو میں تمہیں اپنی سلطنت میں شریک کر لوں گا حضرت
عبداللہ بن حذافہ رضی نے اس سے انکار کیا تو حکم دیا کہ ان کو سولی پر چڑھاؤ اور چار طرف
سے ان پر تیر برسوں کے لوگوں نے تعمیل کی مگر حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی سولی پر چڑھے
ہوئے بھی بالکل مطمئن ہر شاش بشارت نظر آئے گھبراہٹ پاس نہ تھی تو بادشاہ نے حکم
دیا کہ ان کو سولی سے اتار لو اور حکم دیا کہ ایک دیگ میں پانی کو خوب گرم کر کے پکالو۔
جب یہ پانی پوری طرح جوش مارنے لگا تو حکم دیا کہ ایک قیدی کو اس میں ڈال دو۔
وہ ڈالا گیا تو فوراً ہی اس کا گوشت گل کر پانی میں گر گیا اور اس کی ہڈیاں چمکتی نظر آنے
لگیں۔ عبداللہ بن حذافہ کو یہ منظر دکھانے کے بعد حکم دیا کہ ان کو اسی دیگ میں ڈال دو۔
جب ان کو دیگ کے پاس لے گئے تو یہ روتے لگے۔ بادشاہ نے ان کو
اپنے پاس واپس بلایا اور کہا کہ تمہارے روتے کی کیا وجہ ہے تو فرمایا کہ مجھے حسرت و
افسوس اس پر ہے کہ میری ایک ہی جان ہے، وہ ایک دفعہ اس کھولتے ہوئے پانی
میں پڑ کر ختم ہو جائے گی تو مجھے حسرت ہی رہ جائے گی، کاش میری سوجائیں تو میں اور
ایک ایک کے اس پانی میں ڈالی جاتیں اور یہ پُر کیفیت سلسلہ کچھ دیر تک چلتا۔ بادشاہ
روم پر حق تعالیٰ نے ان کی اس ثابت قدمی کا رعب ڈال دیا۔ وہ سخت تعجب میں پڑ
گیا اور کہنے لگا کہ اچھا بس تم ایک کام کر لو کہ میرے سر کو بوسہ دے دو تو میں تمہیں آزاد
کر دوں گا۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی نے فرمایا کہ شرط یہ ہے کہ سب مسلمان قیدیوں
کو آزاد کیا جائے۔ شاہ روم نے اس کو بھی مان لیا تو عبداللہ بن حذافہ رضی نے اس کے سر

کو بوسہ دے دیا کیوں کہ نہ وہ کوئی شرک و کفر تھا نہ کوئی گناہ اور اپنی اور مسلمان قیدیوں کی جان اس سے بچتی تھی۔ اس لئے قبول کر لیا جس کے نتیجے میں شاہ روم نے ان کو مع سب مسلمان قیدیوں کے آزاد کر دیا۔

جب یہ سب مسلمانوں کے ساتھ واپس حضرت عمر بن خطابؓ کی خدمت میں پہنچے تو عمر بن خطابؓ کھڑے ہو گئے اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

ابن عساکر نے اس قصہ کا ایک شاہد اور بھی حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور ہشام بن عثمان کے فوائد میں مرسل زہری سے نقل کیا ہے۔

۱۵ — طبقات ابن سعد، ص ۲۲۴، ج ۶ میں عاصم بن ابی النجود کے

حالات میں حضرت ابو وائل سے نقل کیا ہے کہ ابو وائل کبھی کبھی گاؤں میں جاتے اور چند روز غائب رہتے تھے جب واپس آ کر حضرت عاصم سے ملتے تو ان کے ہاتھ کو بوسہ دیتے تھے۔

۱۶ — مستدرک حاکم باب معرفۃ الصحابہ (ص ۲۵۴، ج ۳) میں

حضرت ابوسفیان کے مناقب میں لکھا ہے کہ غزوہ حنین میں حضرت ابوسفیانؓ بھی ان حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، حضرت عباسؓ نے آپ سے عرض کیا کہ یہ آپ کا چچا زاد بھائی ابوسفیان بن حرب ہے۔ آپ ان سے آپ ان سے راضی ہو جائیے کیوں کہ فتح مکہ سے پہلے جتنے معرکے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہوتے ان سب میں ابوسفیان ہی کفار کے لشکر کی قیادت کرتے تھے فتح مکہ میں مسلمان ہو گئے مگر حضرت عباسؓ کو یہ خیال تھا کہ اس کے باوجود آپ کے قلب مبارک میں ان کی طرف سے تکدہ ہو گا، اسی لئے یہ درخواست کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ کی سفارش قبول ہے میں ان سے راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان کی ہر وہ عداوت جو میرے خلاف کی ہے معاف فرما دے۔ پھر حضرت عباسؓ کی طرف توجہ فرما کر فرمایا کہ وہ بیشک میرا بھائی ہے، حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کے قدم مبارک کو بوسہ دیا جب کہ وہ گھوڑے کی رکاب میں تھا۔

روایاتِ مذکورہ بالا سے واضح ہو گیا کہ بزرگانِ دین کی دست بوسی وغیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین اور ائمہ دین میں بلا نیکر و اختلاف ثابت ہے بعد کے علماء میں بھی یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔

۱۷ ————— ابن السنی نے عمل الیوم واللیلہ میں ابو بکر بن محمد بن عمر سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک روز حضرت ابو بکر بن مجاہد کی خدمت میں حاضر تھا۔ حضرت شبلی اس مجلس میں تشریف لائے تو ابو بکر بن مجاہد کھڑے ہوئے اور ان سے معاف کیا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے سردار آپ شبلی کے ساتھ یہ معاملہ کرتے ہیں۔ ابو بکر بن مجاہد نے فرمایا کہ میں نے ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو میرے ایک خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ کیا تھا کہ شبلی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی پیشانی کو بوسہ دیا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ شبلی کے ساتھ یہ معاملہ فرماتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ یہ اپنی تازہ کے بعد یہ آیت پڑھا کرتے ہیں لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم الایۃ اور اس کے بعد مجھ پر صلوٰۃ و سلام بھیجتے ہیں۔

۱۸ ————— حافظ ابو موسیٰ مدینی وغیرہ نے حضرت سفیان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک مجلس میں بیان کیا کہ عالم اور سلطان عادل کی دست بوسی سنت ہے اس مجلس میں حضرت عبداللہ بن مبارک موجود تھے وہ کھڑے ہوئے اور ان کے سر کو بوسہ دے کر کہا کہ اس سنت پر عمل کرنے کے لئے اس سے اچھا موقع کہاں ملے گا۔

۱۹ ————— امام مسلم بن حجاج کا واقعہ جو امام بخاری کے ساتھ پیش آیا کہ امام مسلم نے امام بخاری کی پیشانی کو بوسہ دیا اور قدم بوسی کا ارادہ کیا یہ کتب حدیث و رجال میں معروف و مشہور ہے۔ مذکورہ روایات سے علماء امت کا باہم معاملہ تقبیل کا بغیر کسی نیکر و انکار کے ثابت ہو گیا۔ اور اس کی مزید تاکید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صدیق اکبرؓ کی طرف سے پیش آیا کہ جب

وہ جنازہ سب پر پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کو بوسہ دیا۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن مظعون کے چہرہ پر ان کی موت کے بعد بوسہ دیا۔

ان تمام روایات واقعات سے ثابت ہوا کہ علماء و مشائخ اور دینی خرفوں رکھنے والے حضرات کی دست بوسی بلکہ قدم بوسی بھی نیکو پیشانی وغیرہ پر بوسہ دینا سنت اور تعامل صحابہ و تابعین سے بلا کسی تکمیر کے ثابت ہے اتنی (رسالہ شیخ محمد عابد ندوی محرمہ ۱۳۲۳ھ)۔

اقوال فقہاء

بسوط شمس الائمہ شرحی کتاب الاستحسان جلد ماشر ص ۴۹ میں لکھا ہے۔

۲۰ ——— روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقبل فاطمة رضو ویقول اجدا متہاریح الجنة و قتل ابو بکر راس عائشة
وقال صلی اللہ علیہ وسلم قبل رجل امہ فکانما قبل عتبة الجنة۔
(بسوط)

روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ کی تقبیل فرماتے اور فرماتے تھے کہ مجھے اس میں سے جنت کی خوشبو آتی ہے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ کے سر کو بوسہ دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اپنی ماں کا پاؤں چوما گویا اس نے جنت کی چوکھٹ کو بوسہ دیا (بسوط)

بسوط شمس الائمہ ہی میں محمد بن المنکدر سے نقل کیا ہے کہ ایک رات میں اپنی والدہ کے پاؤں دباتا رہا اور میرا بھائی ابو بکر تمام رات ناز میں مشغول رہا اور مجھے ہرگز پسند نہیں کہ میں اپنی رات کو ان کی رات سے بدل لوں۔

عورتوں کی تقبیل اولاد سے چہرے کے متعلق ان روایات کو نقل کر کے شمس الائمہ نے فرمایا کہ یہ تقبیل اور بدن کو مس کرنا صورت اس صورت میں جائز ہے جب کہ نہ

اپنے نفس سے شہوت کا خطرہ ہونہ اس عورت سے جس کی تقبیل کی جائے اگرچہ وہ اولاد
ہی میں سے ہو اور خواہ تقبیل بدن کے کسی حصہ پر ہو اور جب خطرہ شہوت کا اس کے
لئے یا اپنے لئے ہو تو قطعاً جائز نہیں (مبسوط، ص ۱۴۹ ج ۱۰)

واما حکم المس فلا خلاف ان المصافحة حلال لقوله عليه السلام
تصافحوا تحابوا وروى عنه صلى الله عليه وسلم انه قال اذا التقى المؤمن
انحاه فصاحبه تناشرت ذنوبه ولان الناس يصافحون في سائر الاعصار
في العهود والمواثيق فكانت سنة متوارثة.

واختلف في القبلة والمعانقة قال ابو حنيفة روى عنه محمد بن يعقوب
للرجل ان يقبل قم الرجل او يده او ثيابه او يعانقه وروى عن
ابى يوسف روى انه لا بأس به ووجهه ما روى انه لما قدم جعفر بن
ابى طالب روى من الحبشة عانقه سيدنا رسول الله صلى الله عليه وسلم
وقبل بين عينيه وكذا روى ان اصحاب رسول الله صلى الله عليه
وسلم كانوا اذا رجعوا من اسفارهم كان يقبل بعضهم بعضاً ويعانق
بعضهم بعضاً واحتمى بما روى انه سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم
فقبل يقبل بعضنا بعضاً فقال لا فقبل ايعانق بعضنا بعضاً فقال
عليه الصلوة والسلام لا فقبل ايصافح بعضنا بعضاً فقال عليه الصلوة
والسلام نعم وذكر الشيخ ابو منصور ان المعانقة انما تكرر اذا
كانت شبيهة بما وضعت للشهوة في حال التقابل كما اذا قصد
بها الميرة والاحرام فلا تكرر وكذا التقبيل الموضوع لقضاء الطور
والشهوة وهو المحرم فاذا زال تلك الحالة ابيح وعلى هذا الوجه
الذى ذكره الشيخ يحمل الحديث الذى احتج به ابو يوسف.

(بدائع ص ۱۲۲ ج ۵ کتاب الاستحسان)

اور اہل سنیہ کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ مصافحہ

حلال ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آپس میں مصافحہ کیا کرو تا کہ ہر ایک
 محبت برٹھے اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب کوئی مومن اپنے بھائی
 مومن سے ملے اور مصافحہ کرے تو اس کے گناہ بھر جاتے ہیں اور اس لئے کہ مصافحہ
 کا رواج ہر زمانے میں معاہدات کے مواقع میں رہا ہے اس لئے یہ سنت متواتر ہے
 اور بوسہ دینے اور معانقہ کے مسئلے میں اختلاف ہے امام ابو حنیفہ اور محمدؐ نے فرمایا کہ ایک
 دوسرے مرد کے منہ پر یا ہاتھ پر یا اس کے کسی اور عضو پر بوسہ یا معانقہ کر یہ مکروہ ہے اور ابو یوسفؒ کی روایت
 کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور دلیل ان کی وہ روایت ہے کہ جب جعفر بن ابی طالب
 حبشہ سے واپس ہو کر مدینہ طیبہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے
 معانقہ فرمایا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اسی طرح یہ روایت کیا گیا ہے کہ صحابہ
 کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب اپنے سفروں سے واپس آتے اور آپس میں ملتے تو
 تو ایک دوسرے کو بوسہ دیتے تھے اور معانقہ کرتے تھے۔ اور ابو حنیفہ رحمہ اور محمدؐ
 نے اس روایت سے استدلال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا
 کہ ہم آپس میں ملا کریں تو کیا ایک دوسرے کو بوسہ دیں آپ نے فرمایا نہیں پھر سوال
 کیا گیا کہ کیا معانقہ کریں، آپ نے فرمایا نہیں پھر سوال کیا گیا کہ آپس میں مصافحہ
 کیا کریں تو فرمایا کہ ہاں۔ شیخ ابو منصور نے فرمایا، معانقہ اس صورت میں مکروہ
 ہے جب کہ اس طرز پر ہو جو شہوت کے ساتھ کیا جاتا ہے جب کہ درمیان میں کپڑے
 حائل نہ ہوں لیکن جب کہ اس سے محض اکرام اور احسان مقصود ہو تو مکروہ نہیں یہی
 حکم بوسہ دینے کا ہے کہ جو بوسہ شہوت کے ساتھ دیا جاتا ہے اس کے مشابہ ہو تو
 جائز نہیں ورنہ جائز ہے۔ اور ابو یوسف نے جس حدیث سے جواز کا قول اختیار
 کیا وہ حدیث اسی صورت پر معمول ہے کہ اس میں شہوت کا کوئی خطرہ یا مشابہت
 نہ ہو۔

اور فتاویٰ قاضی خان کتاب الخطر والاباحہ میں ہے کہ :

ویکروہ ان یقبل الرجل فم الرجل او یدہ او شیئاً منہ فی قول

ابن حنیفہ و محمد و لا بأس بالمصافحة و قال ابو یوسف لا بأس بالتقبیل
والمعانقة فی ازار و احد فان كانت المعانقة من فوق قمیص اوجبة
او كانت القبلة علی وجه المسرة دون الشهوة جاز عند العمل۔
(فتاویٰ قاضی خاں بر حاشیہ عالمگیری ص ۴۴۴، ج ۳)

مکروہ ہے کہ ایک مرد دوسرے مرد کے منہ پر بوسہ دے یا اس کے ہاتھ کو یا کسی
اور حصہ بدن کو ابو حنیفہ اور محمد کے قول میں اور مصافحہ میں کوئی مضائقہ نہیں اور
ابو یوسف نے فرمایا کہ بوسہ دینے اور معانقہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور جب وہ
کرتے اور جبہ کے اوپر سے اور بوسہ دینا بطور مسرت و اکرام کے ہوشیہ سے نہ
ہو تو سب کے نزدیک جائز ہے۔

فتاویٰ قاضی خاں کی آخری عبارت سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقبیل و معانقہ میں
جو اختلاف امام ابو حنیفہ و محمد رحمہما کا نقل کیا جاتا ہے وہ اس صورت میں ہے جس میں
خطرہ شہوت کا یا مشابہت اس کی پائی جائے ورنہ معانقہ اور تقبیل تینوں آئمہ کے
نزدیک جائز ہے۔ بدائع میں شیخ ابو منصور کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے

فی الدار المختار طلب من عالم او زاہد ان یدفع الیہ قدمہ
و یکنہ من قدمہ لیتقبلہ اجابہ و قیل لا یرخص فیصرفی رد المختار
قولہ اجابہ لما اخرجہ الحاکم ان رجلاً اتى النبی صلی اللہ علیہ وسلم
فقال یا رسول اللہ ارنی شیئاً اذداد بہ یقیناً فقال اذهب الی تلك
الشجرة فادعها فذهب الیها فقال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یدعوك فجاءت حتی سلمت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال لها
ارجعی فرجعت ثم اذن له فقبل راسه ورجلیه و قال لو كنت امر
احداً ان یسجد لاحد لامرت المرأة ان تسجد لزوجها و قال صحیح
الاسناد ۵۱ من رسالة الشربینلا الی (شامی ج ۵ ص ۳۷۸)

کسی عالم سے کوئی درخواست کرے کہ اپنے قدم ہمیں دیں کہ ہم ان کو بوسہ دیں تو

اس کے لئے جائز ہے کہ اس کی درخواست قبول کرے اور بعض فقہاء نے فرمایا کہ ایسا کرنا اس کے لئے جائز نہیں۔ شامی نے اس کی شرح میں فرمایا کہ جو از پر دلیل وہ حدیث ہے کہ ایک شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی چیز دکھلا دیجئے جس سے میرا یقین ایمانی برطرف جائے آپ نے کسی درخت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس کے پاس جاؤ اور میرے پاس بلاؤ، وہ گیا اور درخت سے کہا کہ تجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاتے ہیں۔ وہ درخت اسی وقت حاضر ہوا اور آپ کو سلام کیا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اپنی جگہ واپس چلے جاؤ تو وہ واپس چلا گیا۔ اس کے بعد اُس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے آپ کے سر مبارک اور دونوں قدموں کو بوسہ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں اگر کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرے۔ حاکم نے اس حدیث کی روایت کی اور فرمایا کہ صحیح الاستاد ہے۔

اور عالمگیری ص ۴۰۴ جلد ۵ میں ہے۔

طلب من عالم اوزاھدا ان یدفع الیہ قدامہ لیقبلہ لایرخص فیہ ولا یجیبہ الی ذلک عند البعض و ذکر بعضهم یجیب الی ذلک۔
اگر کسی عالم یا بزرگ زاہد سے درخواست کی جائے کہ اپنا قدم دیجئے کہ ہم بوسہ دیں تو اس شخص کے لئے جائز نہیں کہ یہ درخواست قبول کرے۔ بعض کے نزدیک اور بعض نے اجازت دی ہے۔

اور اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے فرمایا ہے کہ،

”اگر یکے از عالم یا زاہد التماس پائے بوسا او کند باید کہ اجابت

نکند و نگذارد کہ بوسہ و در قنہ گفتہ لا باس بہ است“

اور مظاہر حق شرح مشکوٰۃ میں حدیث وفد عبد القیس نقل کرنے کے بعد فرمایا،

”ظاہر اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چوڑے پاؤں کا جائز ہے مگر فقہاء اس کو منع کرتے ہیں۔ الخ“

اس مسئلہ میں ایک اختلاف ائمہ حنفیہ کا بدائع اور قاضی خان کے حوالہ سے اوپر ذکر کیا ہے، اس میں دست بوسی اور قدم بوسی کے ساتھ معانقہ بھی شامل ہے۔ اس اختلاف کا حاصل قاضی خان کی تحقیق کے مطابق یہ تھا کہ جس صورت میں یہ افعال ایسے طرز پر ہوں جس میں شہوت کا خطرہ اور اشتباہ ہو، اس کو ابو حنیفہ رحمہ فرمایا ہے اور جہاں یہ صورت نہ ہو وہ متفق علیہ جائز ہے۔

اور در مختار شامی اور عالمگیری وغیرہ کے حوالے سے جو اختلاف اوپر نقل کیا گیا ہے یہ اختلاف فقہاء متاخرین کا ہے اور اصل مسئلہ تقبیل و معانقہ میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ منشاء اختلاف کا یہ ہے کہ جس شخص کی قدم بوسی دست بوسی کی جائے کیا اس کے لئے بھی یہ جائز و درست ہے کہ اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا کر لوگوں کو اس کا موقع دے۔

اور وجہ اختلاف کی بظاہر یہ ہے کہ اس صورت میں اگر حقیقتاً ”عجب و تکبر“ نہ بھی ہو تو صورتاً ایک حکمرانہ فعل ہے جس سے تکبر پیدا ہو جانے کا احتمال غالب ہے، اس لئے بعض فقہاء نے اس خطرہ کی بنا پر مکروہ قرار دیا۔ بعض نے اصل فعل کے جواز پر نظر کر کے جائز قرار دیا۔

سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے سامنے یہ آخری سوال بعض لوگوں نے پیش کیا تو آپ نے اس کا جواب حسب ذیل تحریر فرمایا:-

”تاویل بلا دلیل غیر مسموع ہے اور ظاہر سے بلا صاف عدول نہیں کیا جاسکتا پس صحیح جواز تقبیل قدم فی نفسہ ہے اور فقہاء کے منع کو عارض مضدہ پر محمول کیا جائے گا راد الفوائد مبوب جلد خامس ص ۲۲۵ مورخہ ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ

مذکورہ سوال کے ساتھ چند اور سوال و جواب بھی اس معاملے سے متعلق ہیں

ان کا نقل کرنا بھی مناسب معلوم ہوا۔

سوال دوم

”اگر قدم بوسی بلا کر اہت جائز ہو تو سر جھکا کر اگرچہ سجدہ رکوع و سجود ہو تو جائز ہے یا نہیں؟ اس امر میں ہمارے دیباہ کے علماء کے درمیان اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ جب قدم بوسی جائز ہے تو اگرچہ بصورت رکوع و سجود انحناء راس سے ہوتی بھی جائز ہے اور ایک جم غفیر علماء کہتے ہیں کہ قدم بوسی اس صورت میں جائز ہے جب کہ انحناء راس بہیئت رکوع و سجود نہ ہو اور یہ لوگ اس بارے میں اس حدیث کو پیش کرتے ہیں جو مشکوٰۃ کے باب المصافحہ والمعانقہ میں ہے، عن انس قال قال رجل یا رسول اللہ الرجل منا یلقى اخاه او صدیقہ ایمنی لہ قال لا، رواہ الترمذی صدقاً شرح مشکوٰۃ جلد چہارم ص ۶۷، ۶۸ میں مرقوم ہے (ایمنی لہ) الانحناء وهو مالۃ الراس والظہر تو اضعا وقدامتہ (قال لا) ای فانہ فی معنی الركوع وهو کالسجود من عبادۃ اللہ تعالیٰ وفی شرح مسلم للتووی حتی الظہر مکروہ للحدیث الصحیح فی اللفی عنہ و لا تعتبر کثرة من یفعلہ ممن ینسب الی علم وصلاح، فی اشعۃ اللمعات ص ۲۴ ج ۲ وانحناء مائل گرو ایندن سرو پشت ست وطیبی از می السنۃ نقل کردہ کہ انحناء ظہر مکروہ است از بہت ورود حدیث صحیح در نہی ازاں اگرچہ بسیار ازاں ہا کہ منسوب بعلم وصلاح اند، آزامی کنند اما اعتبار و اعتماد بیداں نتوان کرد و در مطالب المؤمنین از شیخ ابوالمنصور نقل کردہ کہ اگر بوسہ و ہدیہ کی پیش کیے زمین یا یا پشت دو تا کند یا سرنگوں گردانند کافر نگردد بلکہ آثم است زیرا کہ مقصود تعظیم است

زہد و عبادت سے، و بعضے مشائخ درمخ ازاں تغلیظ و تشدید بسیار کرده
 و گفته کا د الانحاء ان یكون کفر انتہی۔ اسی طرح مظاہر حق کی جلد
 چہارم کے ص ۶۱ میں مذکور ہے اور مجمع الانہر ص ۴۲۰ ج ۲ میں ہے فی
 القہستانی الایماء فی السلام الی قریب الركوع کالسجود و
 فی العبادیۃ ویکرہ الانحاء لانہ یشبہ فعل المجرس اور
 ملتقی الاجرمین ہے فی المجتبی الایماء بالسلام الی قریب الركوع
 کالسجود و الانحاء مکروہ و المختار کتاب الکرہت میں ہے فی
 الذاہدی الایماء فی الاسلام الی قریب الركوع کالسجود
 و فی المحيط انہ یکوہ الانحاء للسلطان و غیرہ انتہی۔

ان عبارتوں سے ظاہر ہے کہ انحاء کے طور پر قدم بوسی ناجائز ہے
 اور عالمگیری کے تقبیل رجل میں جو یہ روایت ہے کہ طلب من عالم
 اوز اهدان ید فح الیہ قدمہ لیقبلہ اور در مختار میں جو یہ
 روایت ہے طلب من عالم اوز اهد ان ید فح الیہ قدمہ
 و یکنہ من قدمہ لیقبلہ اور غایت الاوطار کی جلد چہارم ص ۲۱۹
 پر جو اس کا ترجمہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے عالم یا زاہد سے اس کی درخواست
 کی کہ اپنا قدم اس کی طرف بڑھا دے اور اس کو چومنے دے، یہ بات
 بلند بتاتی ہے کہ یہ قدم بوسی بطریق انحاء اور مالہ نہیں ہے، اب کس فریق
 کا قول حق اور احق بالاتباع ہے؟

الجواب: جو انحاء مقصوداً اہودہ ناجائز ہے اور جو بضرورت تقبیل
 کے لازم آجائے وہ حکم میں تقبیل کے تابع ہے۔

سوال سوم

تقبیل قدم کے کیا معنی ہیں؟ قدم کو بوسہ دینا یا حجر اسود کی طرح ہاتھ سے قدم

کو مس کر کے ہاتھ کو بوسہ دینا یا عام معنی لئے جاویں۔

جواب

معنی اول ہی اس کا مدلول ہے اور ثانی بے اصل ہے (ذی قعدہ ۳۲۵ھ)

خلاصہ کلام

روایات حدیث اور آثار صحابہ و تابعین اور اقوال ائمہ و فقہاء جن کی تفصیل آپ اوپر پڑھ چکے ہیں ان سے ”مسئد تقبیل“ کے متعلق مندرجہ ذیل احکام حاصل ہوئے۔

۱۔ تقبیل و معانقہ اگر شہوت کے ساتھ ہو وہ باتفاق امت اپنی بیوی یا زرخرید کنیز کے علاوہ کسی کے ساتھ جائز نہیں۔ اسی طرح جب اپنے نفس میں یا دوسری جانب میں شہوت پیدا ہو جانے کا خطرہ ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

۲۔ اور جو تقبیل اور معانقہ پھوٹوں پر شفقت یا بزرگوں کی تعظیم و اکرام کے لئے ہو وہ باتفاق جائز اور سنت سے ثابت ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ کوئی امر منکر یعنی ناجائز کام شامل نہ ہو جائے۔

۳۔ اور جہاں تقبیل و معانقہ بلکہ مصافحہ میں بھی کچھ منکرات شامل ہو جائیں وہ باتفاق مکروہ ہے وہ منکرات جو ایسے مواقع میں شامل ہو جاتے ہیں کسی قسم کے ہیں ان کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ ان سے بچ سکیں۔

تقبیل اور معانقہ و مصافحہ میں شامل ہونے والے منکرات | اقل یہ کہ جس شخص کو ان امور سے اپنے نفس میں تکبر و اعجاب پیدا ہو جانے کا خطرہ ہو اس

کو درست نہیں کہ دوسرے لوگوں کو دست بوسی، قدم بوسی وغیرہ کا موقع دے۔

دوسرے یہ کہ جس صورت میں یہ خطرہ ہو کہ اس عمل سے دوسرے شخص کو ایذا تکلیف پہنچے گی تو وہاں ان امور میں سے کچھ یہاں تک کہ مصافحہ بھی جائز نہیں مثلاً جب دیکھے

کہ جس سے ملاقات کرنا ہے وہ مشغول ہے یا کسی ضروری کام میں ہے اُس وقت اُس کے ساتھ معانقہ و تقبیل بلکہ مصافحہ کی کوشش کرنا بھی اس کی ایذا و تکلیف کا سبب ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اس سے اجتناب چاہیے۔

تیسری جہاں خطرہ ہو کہ جس کی دست بوسی کی جا رہی ہے یہ اُس کے نفس میں تکبر و غرور پیدا کر دے گا تو اس سے اجتناب ضروری ہے خصوصاً دست بوسی اور قدم بوسی اگر کسی مجمع کے اندر ہو تو ایک مفسدہ تو یہی ہے کہ اس میں وقت بڑا خرچ ہوگا کام کی ضروری باتوں میں خلل آئے گا اور دوسرا بڑا مفسدہ یہ ہے کہ جس جگہ اس کی رسم اور عادت ہو جائے تو ہر آنے والا یا تو خواہی نہ خواہی دست بوسی اور قدم بوسی میں اہل مجلس کا اتباع کرے یا پھر سبک مختلف ہونے کا گویا اعلان کرے جس سے اور بہت سے مفائد پیدا ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے جو واقعات آپ نے اس رسالہ میں ملاحظہ فرمائے ان کو اسی درجہ میں رکھنا ضروری ہے جس درجہ میں سنت اور تعامل سلف سے اس کا ثبوت ہوا ہے، ان تمام روایات و واقعات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کام ہوئے مگر اتفاقاً طور پر کسی ایک دو آدمی نے کر لئے نہ اس کی عادت تھی نہ سب مجمع کو یہ کام کرنا تھا نہ کوئی کسی کو اس کی دعوت دیتا تھا اور نہ کوئی کسی کی حرص کرتا تھا بس اسی سادگی اور عدم پابندی کے ساتھ جہاں ہوں جائز و درست بلکہ مستحب بھی ہو سکتا ہے جہاں یہ سادگی نہ رہی پابندی آگئی یا عادت پڑ گئی تو وہ مفاسد سے خالی نہیں اور فقہاء کا یہ ضابطہ معروف و مشہور ہے کہ اگر کسی مستحب کام میں کچھ منکرات شرعیہ شامل ہو جائیں تو اس مستحب کو بھی چھوڑ دینا واجب ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ سنن مقصودہ میں سے نہ ہو، جیسے جماعت نماز کے بعد کے مصافحہ کو بعض فقہاء نے اس لئے مکروہ قرار دیا کہ اس کو نماز کی ایک سنت جیسا قرار دے دینا خلاف شرع اور گناہ ہے۔

بس مختصر بات یہی ہے کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تعامل صحابہ میں اس کی جو حد منقول ہے اس کو اسی حد پر رکھا جائے تو بلاشبہ دست بوسی، قدم بوسی، معانقہ

مصافحہ سب جائزہ بلکہ سنت و مستحب میں اور جہاں اس میں غلو کا پہلو یا دوسروں کی ایذا شامل ہو جائے وہ گناہ ہے۔

میرا وہ خواب جو اس رسالہ کی وجہ تالیف ہوا ہے اس میں حضرت سیدتی حکیم الامتہ قدس سرہ نے یہی فرمایا تھا کہ اس وقت جو لوگوں میں دست بوسی کی عادت ہو گئی، میں اس کے محذورات و منکرات بیان کیا کرتا ہوں وہ اسی طرح کے محذورات ہیں کہ سنت کو حد سنت سے بڑھا کر اس میں غلو کرنے سے یا دوسروں کی ایذا کا سبب بنتے سے پیدا ہوتے ہیں۔

الحمد للہ کہ یہ رسالہ روزِ عید الاضحیٰ ۱۳۹۲ھ سے شروع ہو کر ۱۴ رزی الحجہ کو پانچ روز میں مکمل ہوا۔ واللہ ولی التوفیق۔ دینا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

﴿﴾

مروجہ سیرت کیٹی اور اس کی شرعی حیثیت

اشاعت اول — دارالاشاعت دیوبند ۱۳۵۱ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارہ میں کہ آج کل ملک کے اندر سیرۃ کیٹی اور یوم النبی کے نام سے ماہ ربیع الاول میں جو مجالس منشد کی جاتی ہیں جس میں بہت سے راجے اور شرعی حدود سے متجاوز اور منکر بھی غلط ہو جاتے ہیں، روایات کی نقل میں معتبر اور غیر معتبر کا کوئی معیار قائم نہیں رکھا جاتا۔

نیز سال بھر کے بارہ مہینوں میں محض ربیع الاول اور مہینے کے تیس دنوں میں سے صرف بارہ تاریخ کی خصوصیت اس کے لیے رکھی گئی ہے۔

نیز بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس سیرۃ کیٹی کے پردہ میں قادیانی اثرات اور اس کی تحریک کی تبلیغ و اشاعت کی جاتی ہے اور مقصد بھی اس تحریک سے اشاعت مذہب قادیان ہے۔

لہذا عرض ہے کہ ان قیودت مروجہ اور تخصیصات کے ساتھ ان سیرۃ کیٹیوں کا انعقاد اذعنے شرع شریف کیا حیثیت رکھتا ہے بینوا توجروا۔

الجواب

سیرت کیٹی کی تحریک ابتداء میں سخت تبلیغ کے ساتھ اٹھائی گئی، اس کو منکرات اور رسوم بدعیہ سے پاک دکھلایا گیا اور ایسے دل فریب مقاصد و قواعد سطح پر رکھے گئے جن کو دیکھ کر ہر شخص موافقت پر مجبور ہو، کیونکہ بلاشبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ اور آپ کے حالات و مقالات کا مسلمانوں تک خصوصاً اور تمام عالم میں عموماً

یہ صحیح صورت میں شائع کر دینا اسلام اور مسلمانوں کا اہم ترین فریضہ ہے اور تمام مدارس و مکاتب اور تعلیم و تبلیغ کی روح یہی ہے، اس کی ضرورت کا احساس قلوب میں پہلے ہی سے تھا، اس تحریک سے اس کو عملی صورت میں آتے ہوئے دیکھ کر عام مسلمانوں نے اس آواز پر لبیک کہا۔ لیکن اہل علم و فراست کو پہلے ہی سے یہ خطرہ تھا کہ مبادیہ تحریک کوئی بدعت و ضلالت کی صورت اختیار کر لے اور اگرچہ اس وقت اس کو سادہ رنگ میں ظاہر کیا جاتا ہے لیکن عوام کی آمیزش خیال سے کچھ عرصہ کے بعد اس میں بھی وہی رسمی بدعات و خرافات شامل ہو جائیں جو عید میلاد وغیرہ کی قدیم رسوم میں ہیں۔ اس لیے علمائے کرام کی بہت بڑی جماعت نے تو اسی وقت سے اس کی موافقت کسی عنوان سے نہیں کی اور بعض مقتدر حضرات علماء نے موافقت کی بھی تو ایسی قیود و شرائط لگا کر کہ جن کی وجہ سے کوئی بدعت اس میں شامل نہ ہو سکے، لیکن افسوس کہ بانسیان تحریک نے اس میں خیانت سے کام لیا اور ان کی تحریرات میں سے قیود و شرائط کو علیحدہ کر کے مطلقاً اپنی موافقت شائع کر دی، جس کا راز یہ تھا کہ ان کو ان قیودات و شرائط کا خلاف کرنا اور اس تحریک کو مجموعہ بدعات بنانا تھا۔ چنانچہ تین سال کے قلیل عرصہ میں اس کی حقیقت کھل گئی اور یہ تحریک اصلی صورت میں دنیا کے سامنے آگئی تو معلوم ہوا کہ یہ وہی مشہور بدعت ہے جس کو پہلے عید میلاد کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور و معروف امام حدیث و تفسیر علامہ شاطبی اپنی کتاب الاعتصام میں تحریر فرماتے ہیں۔ واما غیر العالم وهو الواضح لها یعنی البدعة فانه لا يمكن ان يعتقد ما بدعة بل هي عنده مما يلحق بالمشروعات كقول من جعل يوم الاثنين بصام لانه يوم مولد النبي صلى الله عليه وسلم وجعل الثاني عشر من ربيع الاول ملحقا بايام الاعياد لانه عليه السلام ولد فيه الخ (اعتصام ص ۲۱۳ ج ۲)

لے بدعات غیر مشروعہ کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں، جیسے اس شخص کا قول جو یوں کہے کہ پیر کے روز روزہ رکھنا اس لیے تو اب ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا دن ہے اور ۱۲ ربیع الاول کو عیدین کی ساتھ ملحق کرے اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس میں پیدا ہوئے ہیں ۱۲۔

اور ساتویں صدی ہجری کے مشہور و معروف بزرگ علامہ ابن الحاج رحمہ اللہ نے اپنی کتاب مدخل میں اس بحث کو مستقل فصل میں بیان فرمایا، جس کے متفرق جملے درج ذیل ہیں۔

وجملہ ما احدثہ من البدع مع اعتقادہم ان ذلک من اکبر العبادات و اظہار الشرائع ما يفعلونہ فی شہر ربیع الاول من المولد وقد احتوی علی بدع و محرمات الخ مدخل ص ۲۶۱ ج ۱۔

باقی رہے وہ مہموم منافع جن کو اس تحریک کا سنگ بنیاد بتلایا جاتا ہے، اول تو ان محرمات و منکرات کے ساتھ جو ان جلسوں میں مشاہد ہو رہے ہیں ان کا حصول ہی متصور نہیں، اگر بالفرض وہ منافع حاصل بھی ہوں مگر ایک مستقل بدعت و ضلالت اور بہت سے معاصی کا نتیجہ ہو کر حاصل ہو تو کیا کوئی عاقل ان منافع کی وجہ سے اس مجموعہ منکرات کو جائز کہہ سکتا ہے اور اگر اس کو جائز کہا گیا تو پھر دنیا میں کوئی گناہ گناہ نہیں رہ سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی برے سے برا کام اور سخت سے سخت گناہ ایسا نہیں جس میں کچھ نہ کچھ منافع و فوائد نہ ہوں اور ظاہر ہے اگر منافع نہ ہوں تو ان کے پاس ہی کون جائے۔ لیکن ان منافع کے موجود ہونے کا اقرار کرنے کے باوجود قرآن کریم کا فیصلہ ایسے امور میں یہی ہے کہ اثمہما اکبر من نفعہما۔ اور اگر ذرا غور کیا جائے اور صرف سطحی اور وقتی چیزوں سے گذر کر اسلامی تاریخ کے مجموعی حالات پر نظر ڈالی جائے تو بلاشبہ ہر آنکھوں والے پر یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے کسی وقت اور کسی حال وہ طریقہ نافع نہیں ہو سکتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین، اور صحابہ کرام کی سنت سنیت سے جدا ہو۔

مسلمانوں کی دینی ترقیات و منافع تو اتباع پر موقوف ہیں، لیکن سارے تیرہ سو برس

لے منجملہ ان بدعات کے جو لوگوں نے گھڑی ہیں اور اس کے ساتھ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ سب سے بڑی عبادت اور دین کی نشرو اشاعت ہے، وہ بدعات ہیں جو ماہ ربیع الاول میں مجلس مولد کے نام سے کی جاتی ہے حالانکہ یہ مجلس بہت سی بدعات اور محرمات پر مشتمل ہے ۱۲ مدخل ص ۱۵ ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑھا ہوا ہے ۱۲۔

کی اسلامی تاریخ کا تجربہ یہ بھی بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی تمام دینی ترقیات بھی بحیثیت مجموعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی سنت کے اتباع پر موقوف ہیں۔ اور اس کا یقین کرنا پڑتا ہے کہ اس موجودہ تنزل و انحطاط کے بعد بھی اگر اس امت مرحومہ کے لیے کوئی ذریعہ سمجھنے کا ہے تو یہی اور صرف وہی ذریعہ ہے جس نے ان کو اول مرتبہ تمام گمراہیوں اور ذلتوں کی اندھیروں سے نکالا تھا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی سنت کا اتباع، امام دارالہجرت حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے۔

لا یصلح اخر هذه الامة الا ما
صلح به اولها۔
اس امت کی اصلاح صرف وہی طریقہ کر سکتا ہے
جس نے اس امت کے متقدمین اور سلف کی اصلاح
کی تھی۔

اور ارشاد فرمایا ہے:-

ما لم یکن یومئذ دینا لایکون
الیوم دینا۔ (اعتصام)
اور جو چیز اس وقت یعنی آنحضرت اور صحابہ کے زمانہ
میں دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔
اور مسلمانوں کی اصلاح یا اسلام و تعلیمات اسلام کی اشاعت و تقویت کے لیے نئے
نئے طریقے اور رسوم بدعت ایجاد کرنے کی ممانعت جو بے شمار آیات و احادیث میں وارد ہے،
اس کا راز بھی امام مالکؒ نے خوب ظاہر فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

من ابتداء فی الاسلام بدعت یرواها حسنة
فقد زعم ان محمداً صلی اللہ علیہ وسلم خان
الرسالة لان اللہ تعالیٰ یقول الیوم
اکملت لکم دینکم، فما لم یکن
یومئذ دینا لایکون الیوم
دینا۔

جو شخص اسلام میں کوئی بدعت ایجاد کرے، جس کو وہ
نیکی سمجھتا ہو، گویا وہ اس کا مدعی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے احکام امت کو پہنچانے
میں خیانت کی کہ یہ نیکی ان کو نہیں بتلائی، کیونکہ حق تعالیٰ
کا ارشاد ہے کہ میں نے آج تمہارا دین کامل کر دیا ہے
تو جو چیز اس دن دین میں داخل نہ تھی وہ آج بھی دین
نہیں بن سکتی۔

(اعتصام للشاطبی ص ۲۱۱ ج ۱)

خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ سیرت کیٹی کی موجودہ تحریک ان موجودہ تعینات و تشخصات کے ساتھ خود بھی ایک بدعت سیئہ ہے جو اگر دوسرے منکرات پر مشتمل نہ ہو تو اس وقت بھی گناہ ہے اور بالخصوص اب تو اطراف ہندوستان سے ان جلسوں کی جو کیفیات موصول ہو رہی ہیں وہ ایک خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے اور ذکر سیرت کی آڑ میں محرمات لہو و لعب اور تماشے کیے جاتے ہیں جن کے مقابلہ میں نصاریٰ کی رسم کرسمس ڈے بھی گرو ہو گئی۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس تحریک کی ابتدائی تبلیغی کی وجہ سے جن حضرات علماء نے قیود و شرائط مناسبہ کے ساتھ اس میں شرکت کی اجازت دی تھی ان سے مکرر استفتاء کیا جائے۔ چنانچہ نائب شیخ الہند حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ اس بارہ میں درج ذیل ہے جو کہ سیکرٹری خلافت کیٹی کا ذیلہ کے استفسار کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔

نائب شیخ الہند حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر مدرس دارالعلوم کا

مکتوب گواہی

محترم المقام زید مجاہد۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

والا نامہ باعث سرفرازی ہوا، یاد آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سیرت کیٹیوں کا انشاء اور اختراع قادیانیوں کی طرف سے تو نہیں ہوا مگر بعض اوقات میں اس سے قادیانیوں نے فائدہ ضرور اٹھانا چاہا۔ اور اٹھایا اس کا بیڑا اٹھانے والے شیخ عبدالمجید صاحب قریشی ساکن پٹی لاہور ہیں، قریشی صاحب نے ابتداء میں اس کے متعلق مختلف مقالات سے رائے لی۔ چنانچہ میرے پاس اور مولانا کفایت اللہ صاحب کے پاس بھی ان کے خطوط آئے تھے، ہم دونوں کے جوابات تقریباً متفق تھے۔ خلاصہ یہ تھا کہ یہ امر نہایت مستحسن ہے بشرطیکہ اس کے لیے کوئی تاریخ اور مہینہ متعین نہ ہو، کبھی صفر میں ہو تو کبھی جمادی الاول میں، کبھی ربیع الاول میں ہو تو کبھی رجب میں، علیٰ ہذا القیاس، بارہ یا پندرہ کی ہمیشہ کے لیے تعین نہ ہوا کرے۔ نیز سال میں صرف ایک دفعہ نہ ہوا کرے بلکہ دوسرے تیسرے مہینہ اور اگر اس سے زائد ممکن ہو تو زیادہ تر ہوا کرے۔ نیز سیرت کے متعلق بیان کرنے والے

کوئی واقف کار شخص ہوں جو کہ صحیح اور قوی روایتیں بیان کریں اور عوام کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل زندگی سے آگاہ کرتے رہیں، جب تک اس قسم کے بیانات عوام تک لگاتار اور کثرت سے نہ پہنچائے جائیں گے، کمابھی فائدہ نہ ہوگا، مقررین علی الاسلام کے زہر آلود پروپیگنڈوں سے عوام کو اسی طرح محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ قریشی صاحب نے ہماری عبارت میں کانٹ چھانٹ کی اور اپنے مدعا کے موافق جملوں کو لے کر شائع کرایا اور باقی کو حذف کر دیا، ہم نے اس کے بعد اسی زمانہ میں اخباروں میں اپنی تراشیدہ عبارت کو پھر چھپوایا مگر وہ اپنے پروپیگنڈے سے باز نہیں آئے اور اب انہوں نے سالانہ ربیع الاول کو اس کی تحریک شروع کر دی اور اس کے استحسان میں ہمارے نام شائع کر رہے ہیں، ہم ہرگز تصیخ تاریخ و ماہ سالانہ ایک جلسہ کو شرعی اور ملکی نقطہ نظر سے نہ مفید اور نہ ضروری سمجھتے ہیں۔ بلکہ اب تو یہ مثل عمل نصاریٰ (برتھ ڈے)، یوم پیدائش اور اس کی رسوم کے ایک رسم ہو رہی ہے کیونکہ عیسائی یوم ولادت عیسیٰ علیہ السلام مناتے ہیں اس کو دیکھ کر مصر وغیرہ کے لوگ بھی اس قسم کی تاجاری کرنے کے لیے آمادہ ہو رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال اور اخلاق اور سیر لوگوں کے کانوں تک پہنچانے نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہیں۔ اگر مذکورہ بالا طریق پر ہو تو مفید اور بہترین چیز ہے ورنہ اجتناب چاہیے، افسوس کہ سیرت کبھی اور اس کے علم برداروں نے تمام امور مشروطہ کو ترک کر دیا۔ والسلام

از دارالعلوم دیوبند ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ۔

اس مفصل تحریر کے بعد میں امید کرتا ہوں کہ عمل کرنے والوں کے لیے مسئلہ میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے گا اور معاندین کی بحث کا خاتمہ کسی حجت و دلیل سے غیر ممکن ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ ولی التوفیق و علیہ التکلان۔

کتبہ احقر محمد شفیع غفرلہ خادم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند۔ ۳ صفر ۱۳۵۱ھ۔

الجواب صحیح

نگ اسلاف حسین احمد صدر مدرس دارالعلوم دیوبند۔

مروجہ صلوٰۃ و سلام کی شرعی حیثیت

ایک استفتاء اور اس کا جواب

استفتاء

(الف) بعض مساجد میں کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جمعہ کی نماز یا دوسری نمازوں کے بعد التزام کے ساتھ جماعت بنا کر اور کھڑے ہو کر ہاواز بلند بالفاظ ذیل سلام پڑھتے ہیں یا رسول سلام علیک یا نبی سلام علیک وغیرہ وغیرہ ان میں بہت سے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مجلس میں تشریف لاتے ہیں۔ یا ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں اس لئے یہ سلام خود سنتے اور جواب دیتے ہیں جو لوگ ان کے اس عمل میں شریک نہیں ہوتے ان کو مطعون کرتے اور طرح طرح سے بدنام کرتے ہیں جس کے نتیجے میں عموماً مسجدوں میں نزاع اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں دریافت طلب یہ ہے کہ کیا اس طرح کا سلام پڑھنا مسجدوں میں جائز ہے؟ اور متوتلیان مساجد کو اس کی اجازت دینا چاہیے یا نہیں؟

(ب) جہاں مذکورہ طریقہ پر صلوٰۃ و سلام پڑھا جائے وہاں

۱۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اس محفل میں تشریف لاتے ہیں۔ یا

۲۔ بغیر تشریف لائے سلام کو خود سن لیتے ہیں۔ یا

۳۔ اس طرح کے صلوٰۃ و سلام کو فرشتے آپ تک پہنچا دیتے ہیں۔ ان میں سے کون

کی بات صحیح ہے؟

(ج) طریقہ مندرجہ بالا پر صلوٰۃ و سلام پڑھنا قیام کے بغیر کیسا ہے اور قیام کے

ساتھ ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟

(۵) اندرون مسجدیہ صلوٰۃ و سلام کیا حکم رکھتا ہے اور مسجد کے باہر اس کا کیا حکم ہے؟
جواب با صواب تحریر فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

والسلام !

الجواب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سوالات کے جواب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام میں تمام عبادات نماز، روزہ، ذکر اللہ، تلاوت قرآن وغیرہ سب کے لئے کچھ آداب و شرائط اور حدود و قیود ہیں جن کی رعایت کے ساتھ یہ عبادات ادا کی جائیں تو بہت بڑا ثواب اور فلاح دنیا و آخرت ہے اور ان حدود و قیود سے ہٹ کر کوئی دوسری صورت اختیار کی جائے تو ثواب کے بجائے عذاب اور گناہ ہے۔ نماز تمام عبادات میں افضل ہے لیکن طلوع و غروب کے وقت نماز پڑھنا حرام ہے۔ مقرر کردہ رکعات میں کوئی رکعت زائد کر دے تو حرام ہے۔ جماعت کی نماز سنت مؤکدہ ہے اور اس سے نماز کے ثواب میں ستائیس گنا اضافہ ہو جاتا ہے لیکن کوئی نفل نماز کی جماعت کرنے لگے تو ممنوع اور گناہ ہے۔ روزہ کتنی بڑی عظیم عبادت اور اس کا ثواب کتنا بڑا ہے مگر عیدین اور آیام نحر میں روزہ رکھنا حرام ہے، قرآن مجید کی تلاوت بہترین عبادت ہے لیکن رکوع و سجدہ کی حالت میں تلاوت ممنوع اور ایسے مقامات پر جہاں لوگ سننے کی طرف متوجہ نہ ہوں بلند آواز سے تلاوت نا جائز ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام افضل عبادات و موجب برکات اور سعادت دنیا و آخرت ہے مگر دوسری سب عبادات کی طرح اس کے بھی آداب و شرائط ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے سے ثواب کے بجائے گناہ لازم آتا ہے۔

(الف) جس ہیئت سے مساجد میں بطرز مذکور اجتماع اور التزام کے ساتھ درود و سلام کے نام پر جگامہ آرائی ہوتی ہے اس کو درود و سلام کی نائش تو کہا جاسکتا ہے درود و سلام کتنا اس کا صحیح نہیں کیونکہ وہ بہت سے مفاسد کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

(۱۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مسجد پوری مسلمان قوم کی مشترک عبادت گاہ ہے اُس میں کسی فرد یا جماعت کو فرائض و واجبات کے علاوہ کسی ایسے عمل کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی جو دوسرے لوگوں کی انفرادی عبادت نماز - تسبیح - درود - تلاوت قرآن وغیرہ میں خلل انداز ہو۔ اگرچہ وہ عمل سب کے نزدیک بالکل جائز اور مستحسن ہی کیوں نہ ہو فقہاء رحمہم اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ مسجد میں باواز بلند تلاوت قرآن یا ذکر ظہری جس سے دوسرے لوگوں کی نماز یا تسبیح و تلاوت میں خلل آتا ہو، ناجائز ہے (شامی خلاصۃ الفتاویٰ) ظاہر ہے کہ جب قرآن اور ذکر اللہ کو باواز بلند مسجد میں پڑھنے کی اجازت نہیں تو درود و سلام کے لئے کیسے اجازت ہو سکتی ہے۔

(۱۲) کسی نماز کے بعد اجتماع و التزام کے ساتھ بلند آواز سے درود و سلام پڑھنا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے نہ صحابہ و تابعین سے اور نہ ائمہ مجتہدین اور علماء سلف میں کسی سے اگر یہ عمل اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک محمود و مستحسن ہوتا تو صحابہ و تابعین اور ائمہ دین اس کو پوری پابندی کے ساتھ کرتے۔ حالانکہ ان کی پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ درود و سلام کے لئے اجتماع اور التزام کو یہ حضرات بدعت و ناجائز سمجھتے تھے جس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صحیح بخاری و مسلم میں بروایت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا منقول ہے من احداث فی امرنا هذا ما لیس منہ فہو رد۔ یعنی جس شخص نے ہمارے دین میں کوئی نئی چیز نکالی جو اس میں داخل نہ تھی تو وہ مردود ہے۔ اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہے۔ و شر الامور محدثا تھا و کل بدعة ضلالة یعنی بدترین عمل وہ نئی چیزیں ہیں جو خود ایجاد کی جائیں اور ہر نئی ایجاد عبادت گراہی ہے۔ عبادت کے نام پر دین میں کسی نئی چیز کا اضافہ تعلیمات رسول کو ناقص قرار دینے کا مرادف اور بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تحریف دین کا راستہ ہے۔ اسی لئے حضرات صحابہ و تابعین نے اس معاملہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کل عبادۃ لم یتعبدھا اصحاب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم قلا تعبدوا ہاذا لی، وخذوا بطریق من کان قبلکم۔
یعنی جس طرح کی عبادت صحابہ کرام نے نہیں کی تم بھی اس کو عبادت نہ کیجو بلکہ اپنے اسلاف
صحابہ کا طریق اختیار کرو (کتاب الاقتصام للشافعی ص ۱۱۱ ج ۲)
اور حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا اتبعوا آثارنا ولا تبتدعوا فقد کفتم
یعنی تم لوگ ہمارے صحابہ کرام کے آثار کا اتباع کرو اور نئی نئی عبادتیں نہ گھڑو کیوں کہ
تم سے پہلے عبادت کا تعین ہو چکا ہے۔

تنبیہ

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ سب کلام انفرادی درود و سلام کے بارے میں نہیں کیوں کہ
انفرادی طور پر درود کی کثرت کے فضائل حدیث و قرآن میں مذکور اور صحابہ و تابعین کا معمول
ہے نہ اس کے لئے کوئی وقت مقرر ہے نہ تعداد جتنا کسی سے ہو سکے اختیار کرے اور
سعادت و این حاصل کرے۔ کلام صرف اس کی مروجہ اجتماعی صورت میں ہے۔
اسلام میں نماز سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں مگر اس کی بھی نفلوں کی جماعت
کو باتفاق فقہاء و ائمہ مکروہ کہا گیا ہے تو کسی دوسری چیز کی جماعت بنا کر دوام و التزام
سے کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے خصوصاً جب کہ کرنے والوں کو اس پر ایسا امر ہو جیسے
فرض و واجب پر بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ یہاں تک کہ جو لوگ اس میں شریک نہ ہوں ان
پر طعن و تشنیع کی جائے۔ جو کسی حال جائز نہیں۔ کیونکہ اگر بالفرض یہ عمل بدعت بھی نہ ہوتا
تب بھی زیادہ سے زیادہ ایک نفل عمل ہوتا جس پر فرض و واجب کی طرح امر اور کرنے اور
دوسروں کو مجبور کرنے کا کسی کو حق نہیں۔

جس کام پر اللہ و رسول نے کسی کو مجبور نہیں کیا کسی دوسرے کو اس پر مجبور کرنے کا
کیا حق ہے اور نہ کہنے کی سعادت میں اس پر طعن و تشنیع کرنا ایک مستقل گنہ گناہ ہے
جس میں یہ حضرات مناد اقیقت سے مبتلا ہوتے ہیں اور اس پر مجبور نہیں کرتے کہ خود ان
کے نزدیک بھی یہ عمل زیادہ سے زیادہ مستحب اور نفل ہے ایک نفل کی خاطر گنہ گناہ

میں مبتلا ہونا کونسی دانشمندی ہے۔

(۳) خطاب کے الفاظ یا رسول یا نبی اگر اس عقیدہ سے ہوں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ہر زمان و مکان میں موجود اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے کائنات کی ہر ادا کو سنتا اور ہر حرکت کو دیکھتا ہے۔ اسی طرح (معاذ اللہ) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان خدائی صفات میں شریک ہیں تو یہ کھلا ہوا شرک اور نصاریٰ کی طرح رسول کو خدائی کا درجہ دینا ہے۔ اور اگر یہ عقیدہ ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس مجلس میں تشریف لاتے ہیں تو گو بصورت معجزہ ایسا ہونا ممکن ہے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن یا حدیث سے اس کا ثبوت ہو۔ حالانکہ کسی آیت یا حدیث میں قطعاً اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اور بغیر ثبوت و دلیل کے اپنی طرف سے کوئی معجزہ گھڑ لینا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء ہے جس کے بارہ میں آپ نے فرمایا ہے:-

من كذب علي متعمداً فليتبوء مقعده من النار یعنی جو شخص میری طرف بھوٹی بات منسوب کرے اس کو چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں سمجھ لے اور اگر اس طرح کا کوئی بھی غلط عقیدہ نہ ہو تب بھی موسم الفاظ میں جن میں اس عقیدہ فاسدہ کو راہ ملتی ہے اس لئے بھی ان سے اجتناب ضروری ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلام کو یا عیسیٰ کہہ کر پکارنے سے اسی لئے منع فرمایا کہ یہ الفاظ موسم شرک ہیں۔

البتہ روضہ اقدس کے سامنے الفاظ خطاب کیساتھ سلام پڑھنا سنت سے ثابت اور مستحب ہے کیونکہ وہاں براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام سنا اور جواب دینا روایات حدیث سے ثابت ہے۔

الغرض روضہ اقدس کے علاوہ دوسرے مقامات میں اگر ان الفاظ خطاب کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ ہے تو کھلا ہوا شرک ہے۔ اور مجلس میں تشریف لانے کا عقیدہ ہے تو رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم پر افتراء اور بہتان ہے اور دونوں میں سے کوئی غلط عقیدہ نہیں تو بھی موہم شرک ہونے کی وجہ سے ایسے الفاظ ممنوع ہیں پھر اس ناجائز عمل پر اصرار کرنا دوسرا گناہ ہے اور شرع و واجب کی طرح اس کو ضروری سمجھنا تیسرا گناہ ہے اور اس میں شریک نہ ہونے والے بے گناہ مسلمانوں کو برا بھلا کہتا اور مطعون کرنا چوتھا گناہ ہے اور مساجد میں باواز بلند کہہ کر دوسرے مشغول لوگوں کے مشغل میں خلل انداز ہونا پانچواں گناہ ہے۔

افسوس ہے کہ بہت سے نیک دل مسلمان قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے ناواقف ہونے کے سبب اس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت کا نشان سمجھ کر اس میں شریک ہوتے ہیں یہ جذبہ محبت و عظمت بلاشبہ قابل قدر و مبارکباد ہے مگر اس کا بے جا استعمال ایسا ہی ہے جیسے کوئی اللہ تعالیٰ کی محبت میں مغرب کی نماز تین کے بجائے چار رکعت پڑھے اور اپنے دل میں یہ حساب لگائے کہ ایک رکعت زیادہ پڑھی ہے تو مجھے ثواب اوروں سے زیادہ ملے گا حالانکہ وہ کعبت اپنی تین رکعتوں کا ثواب بھی کھو بیٹھا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اجتماع اور التزام کے ساتھ کھڑے ہو کر باواز بلند مسجدوں میں درود و سلام پڑھنے کا مروجہ طریقہ سراسر خلاف شرع اور باہم نزاع و جدال اور مسجدوں کو اختلافات کا مرکز بنانے کا سبب ہے اس لئے متولیٰ مسجد اور ارباب حکومت پر لازم ہے کہ مسجدوں میں اس کی ہرگز اجازت نہ دیں

اگر کسی کو کرنا ہے تو اپنے گھر میں کرے تاکہ کم از کم مسجدیں تو شور و شغب اور نزاع و جدال سے محفوظ رہیں۔

(ب) سوال الف کے جواب میں واضح ہو چکا ہے کہ اس مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لانا کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کا فیصلہ خود ایک حدیث میں اس طرح فرمایا ہے:-

من صلی علی عند قبری سمعته ومن صلی علی نائیا ابلغتہ
(مشعورۃ از بیہقی) یعنی جو شخص میری قبر کے پاس درود و سلام پڑھتا ہے اُسے میں خود سنتا ہوں اور جو دُور سے درود و سلام بھیجتا ہے وہ (فرشتوں کے ذریعہ) مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔

(ج) جس طرح ذکر اللہ تلاوت قرآن کھڑے ہو کر بیٹھ کر بلکہ لیٹ کر بھی ہر طرح جائز ہے اسی طرح درود شریف بھی ہر طرح جائز ہے ہاں اگر کوئی کھڑے ہو کر پڑھنے کو ضروری اور اُس کے خلاف کو بے ادبی سمجھے تو یہ ایک غیر واجب کو اپنی طرف سے واجب قرار دینے کی وجہ سے ناجائز ہے خصوصاً جب کہ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درود شریف کو بیٹھ کر پڑھنے کی سنت جاری فرمائی ہے تو بیٹھ کر درود و سلام پڑھنے کو خلاف ادب کہنا اس حکم ربانی اور تعلیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ قرآن کو صرف کھڑے ہو کر پڑھنا چاہیے۔ بیٹھ کر پڑھنا بے ادبی ہے۔

(د) جواب الف میں واضح ہو چکا ہے کہ بطرز مذکور سلام پڑھنے کے لئے اجتماع والتزام تو بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہے جو مسجد میں بھی ناجائز ہے اور مسجد سے باہر بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ مسجد میں اگر کوئی بیٹھ کر مسنون درود و سلام کے الفاظ کو بھی باواز بند اس طرح پڑھے جس سے دوسرے حاضرین مسجد کے مشغل میں خلل آتا ہو تو وہ بھی ناجائز

ہے۔ اور مسجد سے باہر اس کی گنجائش ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

ہمدردانہ مشورہ

ہر شخص کو اپنی قبر میں سونا اور اپنے اعمال کا جواب دینا ہے اور ان معاملات میں حجتہ نبوی اور قدیم آبائی رسوم پر ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر سنجیدگی کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو سمجھنا چاہئے اور یہ غور کرنا چاہیے کہ دنیا کے تو تمام معاملات میں ہمارے جھگڑے چلتے ہی رہتے ہیں کم از کم اللہ کے گھر اور عبادت نماز کو تو ہر طرح کے جھگڑے فساد سے محفوظ رکھا جائے۔

نبیہ محمد میں عفا اللہ عنہ

دارالعلوم - کراچی

۱۲/۱۱/۸۱ھ

مساجد کی نئی شکلیں اور ان کے

مفاسد



مقام تصنیف: _____ دارالعلوم کراچی
تاریخ تصنیف: _____ ۱۵ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ



مغربی تہذیب نے مسلمانوں کی معاشرت کو فیشن پرستی اور
جوت پسندی کے جس راستہ پر ڈال دیا ہے اس کی تباہ کاریاں وقت کے
ساتھ بڑھتی جا رہی ہیں اور اس نے مسلمانوں کو صحت و دولت ہر اعتبار
سے نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن غمناک یہ ہے کہ اب یہ
ذوق معاشرت نکل کر عباد اور جلاوت گاہوں میں بھی ظاہر ہونے لگا ہے جو معابد و مساجد
کے بالکل ہی خلاف شان اور بدینی شائے سے رفتہ رفتہ محرومی کا سبب بن گیا۔ اب بعض لوگوں کا
میلان اس طرف ہونے لگا ہے کہ مسجد کی تعمیر میں بھی جدید ترین فیشن کا مظاہرہ کیا جائے
اس سلسلے میں لاہور سے ایک استفسار کیا تھا پیش نظر صفحات میں یہی سوال و
جواب مذکور ہے۔



استفتاء

ہمارے شہر لاہور کی ایک مشہور شارع عام پر پیادگانہ شہداء ایک مسجد عام مسلمانوں کے چندے سے تعمیر ہو رہی ہے جس کے قریب میں ایک عظیم الشان گرجا کی تعمیر چلے سے موجود ہے۔

(الف) مسجد شعاثر اسلام میں سے ہے اور دنیا میں ہزار تنوع کے باوجود اس کی ایک ممتاز ہیئت متعین ہے جس کو دور سے دیکھ کر ہر مسلم وغیر مسلم واقف و ناواقف مسجد سمجھتا ہے لیکن اس مسجد کی تعمیر کا انتظام جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے انھوں نے اس مسجد کا ڈیزائن دنیا کی سب مسجدوں سے مختلف رکھا ہے کہ جب تک کوئی تیلے نہیں اس کو دیکھنے والا مسجد نہیں سمجھ سکتا بلکہ اس کا ایک علیحدہ مینار گرجا کے مشابہ ہے اور پوری چھت کا محیط اور پست گنبد صومعہ سے مشابہت رکھتا ہے۔

(ب) مسجد سات (مربع) پہلو سطح پر بنائی گئی ہے جب کہ مستطیل کے اوپر کے کونے کو محراب کی جگہ دی ہے اور آج تک مسلمانوں نے اس سطح پر مسجد کبھی تعمیر نہیں کی جس کی وجہ سے اول تو مسجد میں داخل ہونے والے کے لئے کوئی سمت قبلہ متعین نظر نہیں آتی، دوسرے جو سمت قبلہ ہے اس میں بھی دیوار قبلہ کے بجائے کئی محراب نادرے بنا دیئے گئے ہیں جس کی وجہ سے باہر کے لوگوں کی آمد و رفت اور سب چیزیں نظر آ کر نماز میں خلل انداز ہوتی ہیں۔ تیسرے اس کی پہلی صف جو سب سے افضل ہے وہی سب سے چھوٹی صف ہے، صف اول کی فضیلت بہت کم لوگ حاصل کر سکتے ہیں اور اکثریت فضیلت سے محروم رہ جاتی ہے اس لئے سوال یہ ہے کہ:

(۱) جو مسجد بلا ضرورت کے دنیا کی عام مسجد کی ممتاز ہیئت و صورت کے خلاف اس طرح بنائی جائے کیا وہ مسجد شرعی ہے؟ اور اس میں نماز جائزہ اور اس کے احکام

مسجد شرعی کے احکام ہیں؟

(۲) اور اگر اس کو مسجد کا حکم دیا بھی جائے تو کیا منتظمین مسجد کے لئے یہ جائز ہے کہ عام مسلمانوں کے چندہ سے تعمیر ہونے والی مسجد کی شکل و صورت بگاڑ کر اس کو گرجا ہو یا دوسری عمارتوں کے مشابہ بنا دیں؟ اور مساجد کا اسلامی امتیاز ختم کر دیں؟

(۳) اور کسی فرد یا جماعت نے غفلت یا تاواقفیت سے ایسی شکل کی مسجد بنا دی ہے تو کیا شرعاً یہ واجب نہیں کہ اس کی اصلاح کر کے عام اسلامی مساجد کے مشابہ بنایا جائے؟

(۴) مستیع پہلو ہونے کی وجہ سے، نیز دیوار قبلہ نہ ہونے کی وجہ سے جو شرعی عیوب پیدا ہو گئے ہیں کیا تعمیر میں اس کی اصلاح و ترمیم ضروری نہیں؟ سائل

محمد عبداللہ چغتائی

۱۵، ایف، گلبرگ (D) نزد مارکیٹ لاہور

الجواب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(۱) جہاں تک مسجد کے شرعی ہونے کا معاملہ ہے اس میں تو کسی

دیوار اور پھت کی بھی ضرورت نہیں کوئی فرد یا جماعت اپنی ملوکہ زمین کو مسجد کے لئے وقف کر دے اور عام مسلمانوں کو اس میں نماز کی اجازت دے دے اور مسلمان اس میں نماز باجماعت ادا کرنے لگیں تو وہ کھلی زمین بھی مسجد شرعی ہو جاتی ہے، اس کے لئے نہ کوئی عمارت شرط ہے اور نہ کوئی ڈیزائن مقرر ہے، اس میں مسجد ہی کا ثواب ملتا ہے، اس کے تمام احکام مسجد ہی کے احکام ہو جاتے ہیں جیسا کہ عام کتب فقہ میں تصریحات موجود ہیں اس لئے مذکورہ سوال مسجد کے مسجد شرعی ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔

(۲) — دوسرا معاملہ مسجد کی تعمیر اس کی ہیئت اور شکل کا ہے اس میں یہ بات تو سب سے اہم اور ضروری ہے کہ اس کی تعمیر غیر مسلموں کے معاہدے کے مشابہ نہ ہو جائے، شریعت اسلام نے معاشرتی امور، لباس و طعام وغیرہ میں بھی غیر مسلموں کی مخصوص صورت اختیار کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے، قرآن و سنت کی بے شمار نصیحتیں اس پر شاہد ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے لا تتركوا الی الذین ظلموا فتمسکوا النار تم ظالموں یعنی کافروں کی طرف میلان نہ رکھو کہ اگر ایسا کیا گیا تو تم کو بھی جہنم کی آگ پہنچے گی اور حدیث میں ارشاد ہے من تشبه بقوم فهو منهم۔ او کہا قال علیہ السلام جس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص کسی قوم کی مخصوص چیزوں میں ان کی نقل اٹارتا ہے وہ اسی قوم میں داخل سمجھا جائے گا، یہ کس قدر وعید شدید ہے اور معاشرتی امور میں تشبہ بالکفار کا یہ حکم ہے تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عبادات اور معاہدے کے معاملہ میں تشبہ

بالکفار سے اجتناب کرنا کس قدر اہم اور ضروری ہوگا۔ کسی مسجد کی تعمیر، مندر، گرجا، صومعہ کی مخصوص شکل یا اس کا مشابہ صورت میں کرنا بالکل حرام ہے جو مسجدی بنا دی گئی ہو اس کو توڑ کر اس مشابہت کو دور کرنا واجب ہے اگر بنانے والوں نے عام مسلمانوں کی اہانت و مشورہ کے بغیر ایسا کیا ہے تو مصارف کی ذمہ داری بنانے والوں پر ہوگی۔

دوسری صورت ڈیرہ اٹن بدلنے کی یہ ہے کہ وہ غیر مسلموں کے معاہدے کے مشابہت نہیں مگر مساجد دنیا کی خصوصیات اور ہیئت صورت سے مختلف دوسری عمارتوں کی شکل میں ہے جس کو عام لوگ دور سے دیکھ کر مسجد نہیں سمجھ سکتے۔ یہ صورت اگرچہ تشبہ بالکفار سے تو نکل گئی مگر مسجد کی تعمیر میں بلا کسی شدید مجبوری کے ایسی ہیئت و شکل اختیار کرنا بھی بہت سے دینی مفاسد کی وجہ سے مکروہ و مذموم ہے اور اصل تعمیر کو توڑنے سے بغیر جس قدر اس کو مساجد دنیا کے ہم شکل بنایا جاسکتا ہے وہ اصلاح ضروری ہے۔

اس معاملے میں سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہر قوم دنیا میں اپنی خصوصیات اور

مخصوص شعائر سے زندہ رہتی ہے جو قوم اپنے خصوصی امتیازات اور شعائر کو فنا کر دے
اُس کو کسی مستقل قوم کی حیثیت سے دنیا میں زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جاتا۔

اسلام چونکہ مسلمانوں کو تمام اقوام عالم سے ممتاز ایک مستقل قوم بنانے کا داعی
ہے اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تعلیمات میں مسلمانوں کی سیرت و صورت
لباس اور وضع قطع، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے تمام طریقوں میں ایسی ہدایات
دی ہیں وہ ان سب چیزوں میں دوسری اقوام سے ممتاز ہیں۔

مدینہ طیبہ کے یہود وارٹھی بھی بڑھاتے اور منجھیں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
ہجرت کر کے وہاں پہنچے تو مسلمانوں کو حکم دیا کہ وارٹھی تو خود شعائر اسلام ہے تم اپنی منجھیں
ترشوا دیا کر دتا کہ یہود سے تمہاری شکل ممتاز ہو کر دور سے پہچانی جائے۔ اسی طرح
لباس اور کھانے پینے کے جو طریقے کسری و قیصر اور عجم میں رائج تھے ان سے جدا سدا
اور پاکیزہ طریقوں کی تعلیم دی، مسلمانوں کا یہ اسلامی امتیاز خود کفر و اسلام میں ایک حد
فاصل اور دوسری قوموں کے لئے رشک و حسد کا موجب تھا کہ دنیا میں مشرق و مغرب
کے مسلمان اپنی ان امتیازی خصوصیات میں مشترک اور متحد نظر آتے تھے۔

یہ تو معاشرتی امور کا معاملہ تھا، عبادات میں تو اسلام نے یہاں تک احتیاط کام
لیا کہ طلوع آفتاب، غروب آفتاب نصف النہار کے جو اوقات مشرکین کی عبادت
کے اوقات تھے ان اوقات میں ہر قسم کی نماز بلکہ سجدہ تک کو حرام قرار دے دیا۔

اقوام یورپ جب صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے عمدہ برآہ ہوئیں تو انہوں نے بڑی
گہری سازش سے جو سست رفتار زہر مسلم قوم کے لئے تیار کئے اُن میں سے ایک
یہ بھی تھا کہ ان پر مغربی معاشرت، مغربی فیشن مسلط کر دیا جائے جس کو یہ محض ایک ذیوی
اور معاشی چیز سمجھ کر اختیار کر لیں گے پھر معاشرت بدلنے کے بعد خیالات و عقائد و عادات
و اخلاق بدلنے کا راستہ آسان ہو جائے گا اس کا یہ فریب ہم پر چل گیا جس کا نتیجہ آج ہم
اس شکل میں دیکھ رہے ہیں کہ وہ قوم جو شعائر اسلام بلکہ اسلام کی یادگاروں پر جان دینے
والی تھی وہ خود ہی ان کو ایک ایک کر کے رخصت کر رہی ہے۔

غور کیا جائے تو ہماری نسل کی فیشن اور جدت پسندی کا یہ درجہ کہ مساجد معاہدہ کو بھی نئے فیشن میں دیکھنا چاہتے ہیں، غیر شعوری طور پر انگریزوں کی اس صد سالہ کوشش کا نتیجہ ہے جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کے ذہن کو اسلامی خصوصیات سے نہ صرف بیگانہ بلکہ پیرا دہنا بنا چاہتے تھے۔

اس کی کھلی ہوئی علامت یہ ہے کہ مسلمانوں کی قوم اور ان کی تاریخ تعمیر ترقیات میں بھی کوئی مفلس قوم نہیں۔ دنیا میں ان کی مساجد کسی کسی عالی شان حسین اور خوبصورت موجود ہیں، اگر کسی کو اپنے تعمیر ذوق ہی کو پورا کرنا ہے تو مساجد عالم میں اچھی سے اچھی مسجدیں موجود ہیں ان سب کو چھوڑ کر نئے فیشن اختیار کرنے کو غیر شعوری طور پر اسلام پیواری کے سوا کیا کہا جائے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ یہ مفسدہ بھی کچھ کم نہیں کہ مساجد کی ممتاز شکل و صورت اس کے منارے اور گنبد و در سے مسلمانوں کو اپنی طرف دعوت دینے کا کام بھی کرتے ہیں، ہر ناواقف، نو وارد یہ علامات دیکھ کر نماز کے وقت ان کی طرف دوڑتا ہے جب یہ نہ رہتا تو اجنبی لوگوں کو وہاں تک پہنچنا مشکل ہوگا اس کے علاوہ مسلمانوں کی تعمیر ترقیات کے دور میں مساجد کی یہ مخصوص ہیئت عملی طور پر اسلام کی شان و شوکت کا مظاہرہ بھی ہے ہر آنے والا اس کو دیکھ کر محسوس کر لیتا ہے کہ یہ مسلمانوں کا شہر ہے یہ جدت پسندی شہر کو اس سے بھی محروم کر دیتی ہے۔

اسی مغربی ذہن نے آج کل ہماری قوم کو قدامت پسند اور جدت پسند کے دو فرقوں یا جماعتوں میں بانٹ دیا جائے اگر اسلامی تعلیمات سے پہلے صرف عقل ہی سے دیکھا جائے تو یہ تفرقہ ہی بے عقلی پر مبنی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ نہ ہر نئی چیز اچھی مفید ہی ہوتی ہے اور نہ ہر پرانی چیز خراب یا مضر ہی۔ عقل کی بات تو یہ ہے کہ انسان کو نہ قدامت پسند ہونا چاہیے نہ جدت پسند بلکہ حقیقت پسند ہونا چاہیے جو چیزیں پرانی اچھی ہیں ان کو اختیار کرے جو چیزیں نئی اچھی اور نافع و مفید ہیں ان کو اختیار کرے۔

سب سے آخر میں ایک اہم بات قابلِ نظر یہ ہے کہ اسی فیشن پرستی اور جدت پسندی کے دور میں خود ان قوموں نے جو فیشن اور جدت پسندی کی داعی ہیں اپنے معاشرتی امور میں تو فیشن اور جدت اختیار کر لی ہے مگر انکے معابد اور گرجاؤں میں وہی قدیمت پسندی ہر جگہ دیکھی جاتی ہے۔

اس فیشن پرستی اور جدت پسندی سے نہ ہندوؤں نے اپنے مندروں کے ڈیزائن بدلے نہ نصاریٰ نے گرجاؤں کے نہ یہود نے صوامع کے کس قدر افسوس ہے کہ ہم مسلمان کہلانے والے ہی اس کے شکار ہو گئے اناتھروانا الیہ راجون۔

اس لئے مندرجہ سوال مفقوت پہلو مسجور چونکہ بن چکی ہے اب اس کی تعمیر کو نیا دسے توڑ کر نقشہ بدلتا تو مسلمانوں کی بڑی رقم کو ضائع کرنا ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ اندر سمت قبلہ میں مکمل دیوار کر دی جائے جس سے باہر کی چیزیں نمازی کے سامنے آکر خلل نماز کا سبب نہ بنیں۔ سمت قبلہ کو محراب معروف کی شکل دی جائے اس میں ممبر قائم کیا جائے اور باہر کے مینار وغیرہ کے ذریعہ جس قدر اس کو عام مساجد کے ہم شکل بنایا جاسکتا ہے بنا دیا جائے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

بندۃ محمد شفیع

دارالعلوم کراچی ۱۲
۱۵ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ



www.marfat.com

تَنْقِيهِ الْمَقَالِ
تَمْصِيحُهُ الْاِسْتِقْبَالَ

سمت قبلہ

سمت قبلہ کی شرعی حیثیت اور سمت معلوم کرنے کے طریقے

تاریخ تالیف _____ ۳ ربيع الثانی ۱۳۶۰ھ

مدت تالیف _____ آٹھ گھنٹے

مقام تالیف _____ دیوبند

طبع اول _____ ۱۳۶۰ھ

طبع دوم _____ بحیثیت فتاویٰ دارالعلوم

ص ۲۶۲ ج ۲

”قائد خاکسار مشرقی صاحب نے حسابات کے
ذریعہ سمت قبلہ متعین کر کے اعلان کیا کہ جو مسجدیں
اس کے خلاف بنی ہیں ان میں نماز نہیں ہوتی، یہ مقالہ
اس کی تردید میں لکھا گیا جس سے قبلہ رو ہونے کی شرعی
حیثیت اور اس کا فقہی مفہوم واضح کیا گیا اس مقالے
کو بھی حضرت تھانوی رحمہ کی نظر ثانی کا شرف حاصل
ہے اور عربی نام بھی انہی کا تجویز کر دیا ہے۔“

تہنید

(از جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب ام۔ اے، سابق وزیر تعلیم ریاست جونا گڑھ)
 ”اہل نظر“ بقول مرزا غالبؒ قبلہ کو قبلہ نہا کہتے ہیں۔ لیکن اہل دل ایما تو لووا فلتما
 وجہ اللہ ط کا جلوہ دیکھتے ہوئے جدھر حکم ہوتا ہے اسی سمت سر تسلیم خم کرتے ہیں
 مشرق و مغرب کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ مقصود اصلی رضائے مولیٰ ہے، اسی لیے اون
 کے قبلہ کو قبلہ نہا کے بجائے رضائے ما کہنا چاہیے۔ اور حیات ما کنتم فولوا وجہکم
 شطرہ ط کی تعمیل سمجھنا چاہیے، اب آئیے اسی رضائے ما کا ایک کرشمہ آج کل کے
 دور انقلاب میں دیکھیے۔

اودھ کے ضلع بارہ بنکی میں جہانگیر آباد ایک چھوٹا سا اسلامی راج ہے۔ جس
 کے فرمانروا عالی جناب راجہ سر محمد اعجاز رسول خاں صاحب کے، ٹی کے سی،
 آئی، ای، سی، اس، آئی، ام، ال، اے ہیں۔ ممدوح جو بڑھے بیدار مغز، مدبر، اور
 روشن دماغ ہیں۔ نہ صرف گورنمنٹ میں معزز و مقتدر ہیں، بلکہ برادران ملت اور
 ابناء وطن میں بھی محترم اور معتبر ہیں۔ اور آپ کے چشمہ فیض سے یگانہ و یگانہ
 سبھی سیراب ہو رہے ہیں۔

موصوف کو عمارات کا شوق ہے جو نہ صرف حفظ نفس ہے، خلق و ملت کی خدمت
 بھی ہے، لکھنؤ میں حضرت شاہ مینار رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر انوار کے متصل جو
 عالی شان مسجد ہے وہ آپ ہی کی احساس ملی کا ایک پائدار نقش ہے۔ دو سال کا

عہ غالب کا پورا مصرعہ یوں ہے ”قبلہ کو اہل نظر قبلہ نہا کہتے ہیں“ ۱۲ وصل۔

عہ ترجمہ ۱۔ تم لوگ جس طرف بھی رخ کرو، اللہ کا رخ ہے۔ ۱۲۔

عہ ترجمہ ۱۔ تم لوگ جہاں کہیں بھی موجود ہو، اپنے چہروں کو اسی طرف کیا کرو۔ ۱۲۔

عصرہ گزرتا ہے، جب ممدوح نے جہانگیر آباد میں ایک وسیع مسجد جامع کی بنیاد ڈالی، سمت قبلہ ایک ماہر سائنس دکتور نے علوم جدیدہ کی روشنی میں نکالی اور کام شروع ہو گیا، کئی ماہ میں جب بنیاد مستحکم ہو کر بھر گئی تو ممدوح کو عالم رویا میں دکھایا گیا کہ جیسے آپ جدید بنیاد پر کھڑے ہیں اور سامنے قلعہ کی مسجد ہے (جس کا سنگ بنیاد حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھا تھا، اور کوئی کہہ رہا ہے کہ یہ نئی مسجد کیوں بناتے ہو؟ جب آنکھ کھلی تو یہ تعبیر ذہن میں آئی، کہ شاید سمت قبلہ میں جو جدت کی گئی ہے، وہ درست نہیں، اب علماء سے تحقیق شروع ہوئی اور کام ملتوی کر دیا گیا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ جو اس زمانے میں ایک مشہور عالم باعمل اور مفتی دین ہیں، اذن کی خدمت میں مکرہی جناب وصل صاحب بگرامی بھیجے گئے مولانا نے ارشاد فرمایا کہ پہلے اسے علمائے اسلام سے جو علم ہیئت سے بھی واقف ہوں رجوع کیا جائے تاکہ وہ بتائیں کہ سمت قبلہ میں انحراف قلیل واقع ہے یا کثیر؟ اس کے بعد فتویٰ دیا جاسکے گا، تب جناب وصل نے ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) اور لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر جناب مولوی سید علی صاحب زینبی سے سمت قبلہ کے استخراج کے قواعد دریافت کر کے ثابت کئے پھر سر راجہ صاحب نے ایک دن مقرر کر کے جملہ حضرات کو انجینیر صاحب کی موجودگی میں جہانگیر آباد مدعو کیا اور صبح سے دوپہر تک اپنے سامنے دونوں فریق سے سمت قبلہ کی جانچ کرائی۔ معلوم ہوا کہ علوم جدیدہ کے حساب سے جہانگیر آباد کا سمت قبلہ مائل بجنوب نکالا گیا ہے۔ لیکن مولانا زینبی کے حساب سے مائل بشمال نکلتا ہے اور چند درجوں کا فرق ہے۔ صورت موجودہ کو بشکل استفتاء لکھ کر جناب وصل نے دیوبند سے جواب مفصل حاصل کیا۔ پھر حضرت مولانا اشرف علی صاحب مدظلہ کی خدمت میں مع چند مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے پیش کیا۔ حضرت مولانا مدظلہ نے فیصلہ فرمایا کہ بحالت موجودہ سمت قبلہ میں قلیل انحراف واقع ہوا ہے، اس لیے نماز تو جائز ہوگی، لیکن اولیٰ یہ ہے کہ قدیم مساجد سے سمت قبلہ درست کر لی جائے

سر راجہ صاحب نے جس وقت یہ فیصلہ پڑھا تو فرمایا کہ میں رخصتِ شرعیہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ترکِ اولیٰ گوارا نہیں کر سکتا، خواہ اس میں مالی نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ اب انجینئر صاحب حیران ہوئے کہ یہ گہری مستحکم بنیاد جس میں کئی ہزار روپیہ صرف ہو چکا ہے اور گویا لوہے کی دیوار ہے، کیونکر کھودی جائے گی اور کس طرح پیوند لگا کر سمت درست ہوگی؟ اس مشکل کو سر راجہ صاحب نے یوں حل فرمایا کہ جس قدر اوپر تعمیر ہو چکی تھی وہ منہدم کر کے بنیاد کے متصل، صحنِ مسجد کی جانب دوسری نئی بنیاد کھود جانے کا حکم دیا۔ پھر جناب وصل سے فرمایا کہ حضرت مولانا سے میری طرف سے عرض کریں کہ ایک لکھوری اینٹ دستِ مبارک سے مس کر کے بنیاد میں رکھنے کے لیے عطا فرمادیں جو بذریعہ پارسل روانہ کر دی جائے۔ چنانچہ مولانا نے مدوح نے بنیاد کعبہ کی دعائے ابراہیمی اور آیاتِ مسجد قبا کو ایک اینٹ پر دم کر کے اور محترم بانی مسجد کے حق میں دعائے خیر فرما کر روانہ کرنے کے لیے مع ایک صحیفہ گرامی کے جناب وصل کے حوالہ فرمادی۔ اور یہ پارسل مع گرامی صحیفہ مذکورہ کے سر راجہ صاحب کی خدمت میں پہنچ گیا، اب نئی بنیاد کھدی ہی ہے اور کام شروع ہو گیا ہے۔

مذکورہ بالا واقعہ اس دورِ فتنہ میں جبکہ علومِ جدیدہ کی جدت آفرینیوں نے تشکیکِ اباحت اور بے راہ روی کے خیالاتِ فاسدہ پیدا کر دیے ہیں۔ اور لَعْلَلِ وَجْهَةٌ هُوَ مَوْلَاهَا فَاَسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ اِنَّ مَا تَكُونُوا اٰيَاتٍ بِكُمْ اللّٰهُ جَمِيعًا۔ کی عملی تعلیم اور اتحادِ یک جہتی کو جو دینِ یسیر کا خاصہ ہے، لوگ بھول رہے ہیں آئندہ نسلوں کے لیے اسوۂ حسنہ کے طور پر ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ واقعہ کو محیطہ تحریر میں لایا جائے اور تحقیقِ سمتِ قبلہ کے موضوع پر یہ رسالہ جس کو جناب وصل نے مرتب کیا اور اپنا مقدمہ جس میں چند ضروری مکاتیب بھی شامل ہیں درج کیا جس کو سمتِ قبلہ کے نام سے موسوم کیا اور اس کا تاریخی نام قبلہ کے سمت کی پاکیزہ تحقیق

عہ ترجمہ:- اور ہر شخص کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے جس کی طرف وہ منہ کرتا رہا ہے، سو تم نیک کاموں میں تگاپو کرو، تم خواہ کہیں ہو گے، اللہ تعالیٰ تم سب کو حاضر کر دیں گے۔ ۱۲۔

یعنی الملقب بلقب تاریخی "سمت قبلہ کے لاجواب شرعی احکام رکھا، شائع کیا جائے۔
 اللہ تعالیٰ اس عجلہ نافعہ کو قبول فرمائے اور سر راجہ صاحب دام اقبالہ اور جن جن
 حضرات نے اس میں سعی فرمائی ہے، ان سب کو اجر عظیم عطا کرے۔ آمین یا الہ
 العالمین بخرمت سید المرسلین وآلہ واصحابہ اجمعین۔

نواب علی
 لکھنؤ۔ یکم جون ۱۹۲۱ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی حَبِیْبِہِ الْکَرِیْمِ

مقدمہ

ازدصل بلگرامی

حضرت نبی آخر الزمان علیہ التعمیۃ والثناء کے ظہور پر نور کے بعد سے اسلام کی بنیاد پڑی، اسلام کے نام لیا پیدا ہوئے۔ اور ایک زمانے تک خدا کے فضل سے روز افزوں اور حیرت انگیز ترقی کرتے رہے، زمانہ سدا راہ ہوا، دنیا نے اون کو قابو میں لانے کی کوشش کی۔ مگر وہ فدائیان اسلام دنیا اور زمانے کو نیچا دکھاتے ہوئے شاہراہ اسلام پر برابر گامزن رہے اور اس طرح نہ معلوم کتنے منزلی مقصود پر پہنچ گئے، اب جتنا زمانہ گزر رہا ہے، ہم دیکھتے ہیں مسلمانوں کے دلوں میں وہ اسلامی جوش، وہ خروش، وہ ولولہ نہیں ہے، دین کی طرف سے لاپرواہی، احکام شرع کی طرف اعتنا نہیں، نہ دین کی دل میں سچی محبت، نہ علماء کی قدر، نہ بزرگان دین کا وقار باقی ہے۔ اس کا باعث موجودہ زمانے اور موجودہ روش کا اثر۔ موجودہ تعلیم اور موجودہ معاشرت میں انہماک ہے۔ خاص کر اصحابِ دول کی حالت زیادہ قابل افسوس ہے۔ خدا ہر مسلمان کی حالت پر رحم فرمائے اور اعمال نیک کی توفیق عطا کرے۔

لیکن باوجود اس قدر زیادہ تغیر و انقلاب کے اب بھی ایسی بستیاں ہیں اور خدا کرے وہ قائم رہیں اور پختہ مسلمان ہو جائیں، جن میں باوجود تمول کے دینی خدمات کا جذبہ موجود ہے، وہ دین کے نام پر اپنا مال، اپنی دولت لٹانے کو تیار ہیں، وہ اسلام پر اپنی جان تک فدا کرنے کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔

انہیں معتنم ہستیوں میں عالی جناب راجہ سر محمد اعجاز رسول خاں صاحب بالقابہ و خطابہ دام اقبالہ و اعزانه کی فات والاصفات بھی ہے جو امور دینیہ اور نیک کاموں

کے لیے دامے، درمے، قدمے، سخی کبھی دریغ نہیں فرماتے، آپ کی یہ خدمات نام و
نمایش یا شہرت و نمود کے لیے نہیں ہوتیں، بلکہ صرف اللہ اور اس کی خوشنودی کے
لیے ہوتی ہیں، نہ معلوم کتنے اس طرح امداد پاس ہے۔ جس کی کسی دوسرے کو خبر نہیں۔
ابھی تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے، آپ کو محسوس ہوا کہ خاص جہانگیر آباد میں
ایک مسجد جامع کی ضرورت ہے۔ آپ نے اپنے اسلامی جذبات اور عالی ہمتی سے
ارادہ کر لیا کہ وہاں کے لحاظ سے ایک وسیع مسجد بنائی جائے۔ اس کا نقشہ باقاعدہ
بنوایا۔ علوم جدیدہ کے ذریعے سے سمت قبلہ کی تحقیقات ہوئی جس کا مفصل تذکرہ
تمہید رسالہ ہذا میں موجود ہے، اور اسی کے مطابق نئی مسجد کی بنیاد رکھ دی گئی۔ جب
مسجد کی بنیادیں بھر گئیں اور اون پر عمارت بننا شروع ہو گئی، اس وقت سننے میں
آیا کہ جس رُخ پر مسجد بن رہی ہے، یہ صحیح نہیں ہے، اس بنا پر جناب سر راجہ
صاحب بہادر نے سچ کے طور پر بہت کچھ تحقیقات فرمائی اور جب کامل اطمینان نہ
ہوا تو حضرت حکیم الامتہ مدظلہم العالی کی طرف رجوع کیا اور حسب ذیل تحریر میرے
پاس تھانہ بھون روانہ فرمائی :-

مکرمی وصل صاحب زاد عنایتکم! تسلیم میں جہانگیر آباد
میں ایک مسجد بنوا رہا ہوں۔ جس کے رخ کے متعلق کچھ اختلاف رائے ہے۔ میری
خواہش ہے کہ جناب مولانا حضرت مولوی اشرف علی صاحب سے بھی مشورہ
حاصل کروں، لہذا اگر آپ ایک روز کے لیے جہانگیر آباد چلے آویں تو میں
آپ کو سمجھا دوں۔ اور آپ کے ہمراہ اور سیٹر کروں تاکہ جو کچھ حضرت قبلہ
ارشاد فرمادیں آپ اس کو سمجھا دیجیے، دوبارہ آپ کو آنے کی زحمت نہ
ہوگی تاریخ اور وقت سے اطلاع دیجیے تاکہ اسٹیشن
جہانگیر آباد پر سواری بھیجی جاوے۔ جناب مولانا صاحب قبلہ کی خدمت میں
بصد تعظیم میرا سلام عرض کر دیجیے گا۔ فقط۔

نیاز مند (راجہ سر، اعجاز رسول (بالقائ)

حال معلوم ہونے پر لکھنؤ سے میں نے جناب سراجہ صاحب بہادر سے ملنے سے قبل حضرت اقدس مدظلہم العالی کی خدمت گرامی میں ایک درخواست بھیجی، جس کا خلاصہ یہ ہے:-

”جناب سراجہ صاحب بہادر جہانگیر آباد حضرت اقدس مدظلہم العالی سے ایک شرعی مسئلہ میں کچھ امداد لینا چاہتے ہیں۔ اور مجھے ارقام فرما رہے ہیں کہ میں مدوح سے مل کر اون کے اور سیئر کو ساتھ لے جاؤں اور حضرت اقدس سے اس کا جواب لے کر اور سیئر صاحب کو سمجھا دوں۔ چنانچہ میرا ارادہ جہانگیر آباد جانے کا ہے، لیکن اب حضور سے اس کی اجازت درکار ہے کہ میں سراجہ صاحب بہادر کے منشاء کے مطابق اون کے اور سیئر کو ساتھ لے کر وہاں حاضر ہوں اور حضرت اقدس کے حضور میں مدوح کا استفتاء پیش کروں۔ اور جو حضور ارشاد فرمائیں، وہ اور سیئر صاحب کو سمجھا دوں۔“

یہی میں جناب سراجہ صاحب بہادر سے کل کی ملاقات میں عرض کر دوں گا کہ میں نے اجازت طلب کی ہے۔ اجازت کے بعد جو جناب ارشاد فرمائیں گے، تعمیل کروں گا۔ جناب سراجہ صاحب بہادر کا منشاء زبانی سمجھنے سمجھانے کا ہے۔ اب جو حکم ہو تعمیل کی جائے۔ جناب سراجہ صاحب بہادر کے نامہ نامی کی نقل ارسال خدمت اقدس ہے (جو یہاں اس عریضہ سے پہلے درج ہو چکی ہے)۔

۱۲ اپریل ۱۹۲۱ء۔ ۹ قیصر باغ لکھنؤ۔

حضرت اقدس مدظلہم العالی نے حسب ذیل جواب ارقام فرمایا:-

”یہ مسئلہ سمت قبلہ کا ہیئت کا ہے۔ میں ہیئت کا ماہر نہیں۔ میرے خیال میں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے ذریعہ سے کسی ماہر ہیئت سے تحقیق فرانا مناسب ہے۔ پھر اون کی تحقیق سے مجھ کو اطلاع دیا جائے، میں رعایات فقہیہ سے

منطبق کر کے جواب عرض کروں گا۔

(۱۸ اپریل ۱۹۴۱ء)

اسی کے ساتھ ایک اور تحریر منسلک فرمادی، جس کی نقل ذیل میں درج ہے:-
تحقیق اجمالی سمت قبلہ۔

”چونکہ اہل ہند کا قبلہ مغرب میں ہے، اس لیے استقبال قبلہ کے معنی یہ ہیں کہ ایک خط جو کعبہ سے گزرتا ہو جنوب و شمال میں منتہی ہو جائے اور نمازی کی وسط جہہ سے ایک خط مغرب کی طرف نکل کر اس پہلے خط سے اس طرح تقاطع کرے کہ اس سے موقع تقاطع پر دو زاویہ قائمہ پیدا ہو جائیں وہ قبلہ مستقیم ہے اور اگر نمازی اتنا منحرف ہو کہ وسط جہہ سے نکلنے والا خط تقاطع کر کے زاویہ حادہ و منفرجہ پیدا کرے لیکن وسط جہہ کو چھوڑ کر طرفین جہہ کے کسی طرف سے نکلنے والا خط زاویہ قائمہ پیدا کرے، وہ انحرافِ قلیل ہے، اس سے نماز صحیح ہو جاوے گی۔ اور اگر جہہ کے کسی طرف سے بھی زاویہ قائمہ پیدا نہ ہو، وہ انحرافِ کثیر ہے، اس سے نماز نہ ہوگی۔“

اور اس قاعدہ مذکورہ کی تطبیق میں اگر کچھ تکلف ہو تو سہل طریق اس کی معرفت کا یہ ہے کہ:-

”موسم گرما کے سب سے بڑے دن میں (یعنی ۲۲ جون کو) اور اسی طرح موسم سرما کے سب سے چھوٹے دن میں (یعنی ۲۲ دسمبر کو) غروب شمس کا موقع دیکھا جاوے، قبلہ ان دونوں موقع کے درمیان میں ہوگا۔ یعنی ان دونوں موقع کے درمیان درمیان جس نقطہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاوے گی، صحیح ہو جاوے گی۔“

کما فی رسالۃ بغیۃ الاریب فی مسائل
القبلة والمحاریب تحت الاہر الخامس
جیسے رسالہ بغیۃ الاریب فی مسائل القبلة والمحاریب
میں خاتمہ کے امر پنجم کے ماتحت تنقیح طلب امور میں

من الخاتمة في الامور المنقحة صفحہ ۱۲۳۔ بعد بحث طویل۔ مانصہ فان الفساد بالخروج من جهة الربيع متعين بالاتفاق اما قول الفقهاء الكرام ان ما بين المغربين قبلة لانه ان الكعبة واقعة بين مغرب اقصي (يعني اطول) يوم الصيف وهو اول يوم السرطان وبين مغرب اقصي يوم الشتاء وهو اول الجدي جميع ما بينهما قبلة سمرقند و بخارا و ترمذ و نسف و مرو و سرخس و ما والاها و لجميع بلاد الهند مع رجبها و قولهم ذلك ذكره في التجنيس و الملتقط و امالي الفتاوى و البناء شرح الهداية من قول ابى منصور الماتريدي۔ انتهى۔

ص ۱۲۳ پر ایک طویل بحث کے بعد ہے۔ اس کے لفظ یہ ہیں کہ فساد نماز لیم دائرہ کی جہت سے نکل جانے سے ہے، بالاتفاق اور فقہائے کرام کا قول ہے کہ دونوں مغربوں کے درمیان قبلہ ہے۔ یعنی کعبہ مکرمہ گرمی کے سب سے بڑے دن یوم السرطان کے مقام غروب اور سردیوں کے سب سے چھوٹے دن اول جدی کے مقام غروب کے درمیان واقع ہے۔ ان دونوں کے درمیان کا سب حصہ سمرقند و بخارا اور ترمذ و نسف و مرو و سرخس اور ان کے قرب و جوار اور ہندوستان کے وسیع ممالک کا قبلہ ہے فقہاء کے اس قول کو تجنيس، ملتقط، امالی الفتاویٰ اور عینی شرح ہدایہ میں ابو منصور ماتریدی کے قول سے نقل کیا ہے۔

فقط

کتبہ :- اشرف علی عفی عنہ۔ من نصف ربيع الاول ۱۳۶ھ۔

مرقومہ بلا قادی صحیفہ اور اس تحریر کو لے کر میں جناب سر راجہ صاحب بہادر کی خدمت میں جہانگیر آباد سلیس لکھنؤ میں حاضر ہوا۔ اس وقت جناب انجینیر صاحب بھی تشریف

آئے یہاں نسخہ مطبوعہ میں غلطی سے اقصر لکھا گیا مگر اول تو خود بغیر کے ۱۲۵ پر اقصیٰ کا لفظ موجود ہے دوسرے بحر و خاوی نے جو ابو منصور کا قول نقل کیا ہے اس میں الطول موجود ہے۔ نیز ظاہر ہے کہ یوم سرطان الطول ہی ہوتا ہے ۱۲ منہ۔ اس کے بعد خود مصنف بغیۃ الارباب سے اس کی تحقیق کی گئی۔ اور ان کا جو جواب آیا ہے اس میں تصریح ہے کہ اصل میں اقصر تحریر ہے اقصیٰ کی جو یقیناً طباعت کی ہے ۱۲ منہ۔

رکھتے تھے اور جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم۔ اے سابق وزیر تعلیمات ریاست جو ناگڑھ و حال متوسل جناب سر راجہ صاحب بہادر جہانگیر آباد (جن کی تمہید رسالہ ہڈکے اس مقدمہ سے پہلے ناظرین نے ملاحظہ کی ہوگی) بھی موجود تھے۔ تحریر اقدس سنائی، آخر متفقہ رائے یہ ہوئی کہ جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے ذریعے سے کسی عالم ماہر ہیئت سے اس کی عقدہ کشائی کی جائے، اتفاق سے جناب مولوی عبدالباری صاحب ندوی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) لکھنؤ میں موجود تھے، میں اور جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب دونوں جناب مولوی عبدالباری صاحب کی کوٹھی پر گئے، اون سے یہ سب واقعات بیان کیے اور سب ہم رائے ہو کر جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے پاس آئے اور مفصل تذکرہ کیا۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جناب مولوی سید علی زبیدی صاحب جو لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں، اون سے بہتر یہاں علماء میں عملی طور سے ہیئت کا کوئی اور ماہر شاید نہیں ہے، لہذا اون سے اس کام کے لیے کہنا چاہیے۔ چنانچہ میں اور جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب دونوں جناب مولوی سید علی زبیدی صاحب سے جا کر ملے اور حالات بیان کیے، انھوں نے باوجود عدیم الفرستی کے وعدہ فرمایا کہ فلان دن میں جہانگیر آباد چل کر کچھ مجھ سے ہو سکے گا، خدمت بجالاؤں گا، جناب سر راجہ صاحب بہادر کو اس کی اطلاع کر دی گئی۔ ممدوح نے تین موٹرز بیچ دیے، ایک پر جناب انجینیر صاحب مع ضروری اسٹاف اور ضروری سامان اور باقی دو موٹروں پر جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب، جناب پروفیسر مولوی عبدالباری صاحب، جناب مولوی مسعود علی صاحب ندوی، جناب حکیم ڈاکٹر مولوی سید عبدالعلی صاحب، جناب مولوی مصطفیٰ حسین صاحب علوی کا کروی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی تھے۔ اور ان سب حضرات کے ہمراہ میں۔ وہاں پہنچنے پر جناب سر راجہ صاحب بہادر کی طرف سے جس قدر تواضع، خاطر مدارات اور مہمان نوازی کی گئی وہ ممدوح کی زبان کے شایان تھی۔ ناشتے اور چائے کے بعد سب لوگ موقع مسجد مذکورہ پر گئے۔ جناب مولوی

سید علی زینبئی صاحب نے جناب انجینئر صاحب کی امداد سے پیمائش کی، حساب لگائے اور ہر طرح سے جانچا اور فرمایا کہ میں اپنا حساب لگالایا ہوں۔ اور اس وقت موقع پر جانچنے کے بعد بھی میں اپنے حساب کو صحیح پاتا ہوں۔ میرے حساب سے جہانگیر آباد کا سمت قبلہ قطب سے جانب مغرب 32° — 89° ہے۔

جناب مولوی سید علی زینبئی صاحب نے جن کتابوں سے مدد لی وہ حسب ذیل

ہیں۔

THE WHERE IS IT REFERENCE INDEX PART 2ND. (۱)

PREPARED BY THE,

SURVEY OF INDIA,

PUBLISHED BY,

BRIGADIER E. A. TANOY R.E

SURVEYOR GENERAL OF INDIA

1928.

درجہ	دقیقہ	جس کے صفحہ ۲ میں بارہ بنکی کا عرض بلد
۲۶	۹	اور طول بلد
درجہ ہے۔	۸۱	اور صفحہ ۲۷ میں جہانگیر آباد کا عرض بلد
	۲۷	اور طول بلد
درجہ ہے۔	۸۱	

THE OXFORD INDIAN SCHOOL ATLAS,

(۲)

BY,

JOHN BARTHOLOMAW

درجہ
 دقیقہ || ۲۱ | ۲۰ |

میں مکہ معظمہ کا عرض بلد

اور طول بلد

۱۴ — ۲۰ درجہ ہے۔

انہیں عرض البلد اور طول البلد کو کام میں لاکر جناب مولانا زینبئی صاحب نے

جہانگیر آباد کا سمت قبلہ قطب سے جانب مغرب ۲۲ دقیقہ — ۸۹ درجہ نکالا۔

نتیجہ یہ معلوم ہوا کہ جناب مولانا زینبی صاحب کے نکالے ہوئے سمت قبلہ میں اختلاف ہے، علاوہ اس کے جناب انجینیر صاحب مائل بجنوب بتاتے ہیں۔ اور جناب مولانا زینبی صاحب مائل بشمال، ان حسابات سے جناب سر راجہ صاحب ہادر کی کسی طرح تسکین نہیں ہوئی بلکہ اس اختلاف سے اور بھی بے اطمینانی پیدا ہو گئی کیونکہ اب بھی اس امر کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ کس حساب کو صحیح اور قطعی مان لیا جائے اور جب مدوح کو اپنے اس خواب کا جس کو جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب نے اپنی تمہید میں نقل فرمایا ہے، خیال آیا تو اور بھی اضطراب پیدا ہوا۔ ان سب حالات پر نظر فرما کر مجھ سے فرمایا کہ میں حضرت اقدس مدظلہم العالی کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اور کل حالات کو بیان کر کے جو وہاں سے ارشاد ہو لکھوا کر لے آؤں۔ چنانچہ میں تھانہ بھون حاضر ہوا اور مفصل حالات عرض کیے۔ حضرت والا نے فرمایا کہ اس طرف علماء کی جماعت میں اگر کوئی صاحب ماہر بیٹت ہوں، ان سے بھی دریافت کر لیا جائے۔ چنانچہ میں حضرت اقدس مدظلہم العالی کا مکتوب گرامی لے کر محذومی جناب مولانا عبدالرحمن صاحب دام مجدہم مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ موصوف نے فرمایا کہ میں بیٹت جانتا تو ہوں اور پڑھاتا بھی ہوں۔ مگر عملی طریق سے واقف نہیں اور جناب مولوی اسعد اللہ صاحب نے بھی یہی فرمایا اور یہ رائے دی کہ میں محترمی جناب مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں حاضر ہو کر اس مشکل کو حل کراؤں۔ اس رائے کے بعد میں دیوبند گیا اور جناب مفتی صاحب سے کل واقعات بیان کیے۔ جناب موصوف نے فرمایا کہ بیٹت کی طرف زیادہ پڑنا اور حسابات ریاضیہ میں زیادہ کاوش کرنا نہایت غیر ضروری امر ہے۔ میں اس مسئلہ میں فقہائے سلف کے اقوال لکھے دیتا ہوں۔ یہ حضرت اقدس مدظلہم العالی کے حضور میں پیش کر دیے جائیں اور وہاں سے جو حکم ہو اس کی تعمیل کی جائے۔ جناب مفتی صاحب نے میری ضرورت کو دیکھ کر مجھ سے استفتاء لکھوایا اور اپنا نہایت قیمتی

وقت اس دینی کام میں صرف فرما کر ممنون منت بنایا، نہ معلوم کتنی کتابیں منگائیں۔ کتنی دیکھیں، کتنوں کے حوالے درج فرمائے۔ اور نہایت قلیل وقت میں ایک اچھا خاصہ رسالہ تحریر فرما کر دستخط و مہر سے مزین کر کے مجھے عطا فرمادیا۔ میں اس کو لے کر حضرت اقدس کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا اور وہ فتویٰ پیش کیا حضرت اقدس نے اس کو لفظ بہ لفظ ملاحظہ فرمایا اور چند سطور اس کے آخر میں اپنے قلم مبارک سے تحریر فرما کر اور بھی اس کو مستحکم فرمادیا۔ وہ سطور فتوے کے بعد منقول ہیں۔ اس کے بعد جو استفتاء جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوة العلماء (لکھنؤ) نے اپنے قلم سے لکھ کر اپنے خط کے ساتھ حضرت اقدس مدظلہم العالی کے حضور میں پیش کرنے کے لیے دیا تھا، اس پر حضرت اقدس نے جواب تحریر فرما کر مجھے عطا فرمایا۔ اس خط کی نقل مع استفتاء و جواب استفتاء ذیل میں درج ہے :-

● — نقل خط جناب مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوة العلماء (لکھنؤ)

بغالی خدمت حضرت حکیم لمت مدظلہم العالی

مخدوم محترم متعنا اللہ بجزائکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے

کہ جناب والا بخیریت و عافیت ہوں گے۔ میں نے سمت قبلہ مولانا سید علی

صاحب سابق مدرس ندوة العلماء لکھنؤ سے نکلوا یا ہے۔ ندوة العلماء کا سمت

قبلہ بھی موصوف ہی نے نکالا تھا۔ فن بیٹ میں مہارت رکھتے ہیں۔ انجینئر

صاحب نے جو سمت نکالا ہے، اس سے یہ بہت مختلف ہے، انجینئر صاحب

سے میں نے پوچھا کہ یہ کس اصول سے نکالا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ لکھنؤ یونیورسٹی

کے پروفیسر ڈاکٹر ولی محمد صاحب سے سمجھ کر مجھے تائیں گے۔ مگر کئی روز گزر

چکے ہیں وہ ابھی سمجھ کر مجھے بتانے نہیں آئے۔ استفتاء مرسل خدمت ہے

جواب ارسال فرمائیے۔ مزاج والا کی کیفیت سے مطلع فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ

جناب والا کو عرصہ دراز تک بعافیت رکھے۔ آمین۔

خاکسار عبدالعلی ۲۷ اپریل ۱۹۴۱ء

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ قصبہ جھانگیر آباد ضلع بارہ بنکی میں ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے جس کا سمت قبلہ ایک انجینیر صاحب نے نقطہ مغرب سے دس درجہ جانب جنوب قرار دیا ہے، ایک دوسرے عالم دین ماہر ہدیت نے سمت قبلہ نقطہ مغرب سے ۲۸ دقیقہ جانب شمال نکالا ہے، ان کا بیان ہے کہ جہاز رانی میں شہروں کی سمت بھی اسی قاعدے سے معلوم کی جاتی ہے، مسجد کا طول ۷۹ فیٹ ہے اور اس اختلاف کی بناء پر ۳ فیٹ ۹ انچ کا فرق نکلتا ہے، اس حالت میں جو حکم شرع شریف کا ہو۔ اس سے مطلع فرمایا جائے۔ بیٹنوا توجروا۔

الجواب

علمائے امت و فقہائے ملت نے قاطبہ بلا اختلاف تصریح فرمائی ہے کہ سمت قبلہ کا مدار آلات رصدیہ و حسابات ریاضیہ پر نہیں بلکہ اوس میں مساجد قدیمہ کا اتباع و توافق کافی ہے، جن کی بناء امارات و علامات عرفیہ پر ہے۔ اگرچہ قواعد ہدیت کی رو سے اولیٰ سمت حقیقی سے کچھ انحراف بھی ہو، جس میں اصل قاعدے سے ربع دائرہ (۹۰ درجہ) کے قریب تک یعنی دونوں جانب ثمن ثمن

عہ اور حدیث طہین المشرق والمغرب قبلتہ میں ایک سہل عنوان سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ پوری جہت جنوب قبلہ ہے۔ اصطلاح ریاضی پر نقطہ مشرق و مغرب کی درمیانی قوس مراد نہیں، جس سے نصف دائرے کا شبہ ہو سکے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا ہمارے بلاد میں تفہیم عوام کے لیے کہا جاوے کہ شمال و جنوب کے درمیان قبلہ ہے یعنی پوری جہت مغرب ۱۲ منہ

دائرة تک (۲۵-۲۵ درجہ) اور بنا بر امتیاط بین المغربین یعنی
ہر طرف ۲۲ درجہ مجموعہ ۲۸ درجہ تک گنجائش ہے اس بنا پر دونوں

عہ وذلك لما في رد المختار معن بالشرح زاد الفقير في بعض الكتب المعتمدة في
استقبال القبلة الى الجهة اقاويل كثيرة واقربها قولان الاول ان ينظر في مغرب الصيف
في طول ايامه ومغرب الشتاء في اقصر ايامه فليدع الثلثين في الجانب الايمن والثالث في
الايسر والقبلة عند ذلك ولولم يفعل هكذا وصل الى فيما بين المغربين يجوز (الى ان قال)
فلم ان الانحراف اليسير لا يضر وهو الذي يبقى مع الوجه او ثنى من جوانبه سامتاعين
الكعبة اولهاؤها (ثم قال) وعلى ما قدرنا يحمل ما في الفتح والبحر عن الفتاوى من ان الانحراف
المفسد ان يجاوز المشرق الى المغرب اه (شامى ص ۳۹۹) وقال الشامى في حاشية البحر تحت
قول في الفتاوى الانحراف المفسد ان يجاوز المشرق الى المغرب ما نصه كذا نقله في فتح
القدير وهو مشكل فان مقتضاه ان الانحراف اذا لم يوصله الى هذا القدر لا يفسد وعبارة
التجنيس التي نقلها المؤلف بعده اعم من ذلك فانه جعل المفسد انحراف الصدم فيصدق
بما دون ذلك اي بان ينحرف بصدرا بحيث لا يصل الى استقبال المشرق والمغرب ويؤيد ما في
منية المصلي عن امالي الفتاوى ونصه وذكر في امالي الفتاوى حذا القبلة في بلادنا يعني سمرقند
ما بين المغربين مغرب الشتاء ومغرب الصيف فان صلى الى جهة خرجت من المغربين فسدت
صلوته اه. (الى قوله) وقال ابو منصور ينظر الى اقصر يوم في الشتاء والى اطول يوم في الصيف
فيعرف مغربها ثم يترك الثلثين عن يمينه والثالث عن يساره ويصلي فيما بين ذلك وهذا
استجاب والاول للجواز ومشى على الاول الرستغنى وجعل في مجموع النوازل ما ذكره
ابو منصور هو المختار (حاشية البحر ص ۲۸۵)

قلت قد حصل من هذه العبارات ان ههنا قولان معجمان احدهما ان الانحراف
المفسد ان يجاوز المشرق الى المغرب. وقدره في الخيرية برابع الدائرة اعني خمسا
واربعين درجة من كل جانب يميناً ويساراً كما سياتى في الرسالة الملحقة الملقبة بتنقيح
المقال نصه والثاني ان المفسد من الانحراف اذا خرج من المغربين ومقدراً المغربين على

انحراف مذکور فی السؤال کے ہوتے ہوئے بھی نماز صحیح ہو جائے گی لیکن
 اولیٰ یہ ہے کہ دوسری مساجد قدیمہ خواہ اس بستی میں ہوں یا قرب و جوار
 میں ہوں، اون کے موافق اس مسجد کو درست کر لیا جاوے۔
 ان سب احکام کے دلائل دارالعلوم دیوبند کے فتوے میں منقول ہیں
 جس سے میں حرفاً حرفاً متفق ہوں۔

کتبہ:- اشرف علی عفی عنہ۔ ۴ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ

جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے استفتاء پر حضرت
 آقدس مدظلہم العالی کا گرامی فتویٰ اور اپنے استفتاء پر جناب مفتی صاحب دارالعلوم
 دیوبند کا جواب باصواب لے کر ۳ مئی ۱۹۴۱ء کو لکھنؤ آیا۔ جناب سر راجہ صاحب بہادر
 کو بمقام جہانگیر آباد اپنے آنے کی اطلاع کر دی اور محترمی جناب پروفیسر سید نواب علی
 صاحب سے مل کر ان کو وہ سب تحریریں دکھائیں، اس کے بعد ۹ مئی ۱۹۴۱ء کو
 جناب سر راجہ صاحب بہادر نے موٹروں کا انتظام فرما دیا، ایک پر جناب انجنیر
 صاحب مع اسٹاف کے تشریف لے گئے اور دوسرے پر میں اور جناب پروفیسر سید
 نواب علی صاحب مع اپنے ایک عزیز دوست جناب سید زاہد حسین صاحب گورنمنٹ
 پنشنز کے ایک ساتھ جہانگیر آباد گئے۔

بقیۃ الحاشیۃ ۱۵: قواعد الهندسة ثمان واربعون درجة لما في شرح الجعيني ان نهاية ميل
 دائرة البروج عن معدل النهار مقدارها كج ل اى ثلث وعشرون جزاً وخمس وثلاثون
 دقيقة على ما وجد بارصاد المأمون (ثم قال بعد ذكر الاقوال المختلفة فيه) لكن اكثر
 ما وجدوه لم يزد على اربعة وعشرين جزءاً (شرح جعيني باب رابع ص ۶۶) فعلى هذا القول
 يكون الانحراف الجائز في كل جانب من اليمين واليسار اربع وعشرون درجة ومجموع الجهة
 ثمان واربعون درجة وعلى القول الاول القدر الجائز خمس واربعون درجة في كل جانب و
 مجموع الجهة تسعون درجة وهو ربع الدائرة - واختار الشامي وغيره القول الثاني لما فيه
 من الاحتياط وكلا الحاشيتين من المولوى محمداً شفيح الداوييندى سلمه ۱۲ من

جناب سید نواب علی صاحب نے جناب سر راجہ صاحب بہادر کو حضرت اقدس مدظلہم العالی کا ارشاد گرامی اور جناب مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کے فتوے کا خلاصہ سنایا اور جو حضرت اقدس مدظلہم العالی کے ارشاد کا منشاء تھا وہ ظاہر کیا۔ جناب سر راجہ صاحب بہادر نے نہایت خوشی و انبساط سے منظور فرمایا کہ حضرت اقدس نے جو طریقہ اولیٰ کی طرف توجہ دلائی ہے میں اوس پر عمل درآمد کے لیے دل و جان سے تیار ہوں۔ اور اسی وقت انجنیئر صاحب وغیرہ سب کو لے کر جہاں نئی مسجد بن رہی تھی تشریف لے گئے اور اُس مسجد کی سمت قبلہ کے مطابق جو قلعہ جہانگیر آباد میں واقع ہے اور جس کی بنیاد حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دست مبارک سے رکھی تھی اور جس کو جناب سر راجہ صاحب نے خواب میں بھی دیکھا تھا کہ میں اس نئی مسجد کی بنیاد پر کھڑا ہوں۔ اور قلعہ والی مسجد میرے سامنے ہے، نشان ڈلوادیا اور حکم دے دیا کہ ہمیں سے بنیاد قائم کی جائے اور جو عمارت بن چکی تھی، اوس کو گرا دینے کے لیے حکم دے دیا، اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی، کہ کس قدر صرف ہو چکا ہے۔ کس قدر نقصان ہوگا۔ بس یہ چاہا کہ شرع شریف میں جو طریقہ اولیٰ ہے اوس کے سامنے سر جھکا دیں اور اوس کی تعمیل نہایت خوشی و مسرت سے کریں خدا کرے اس کا اجر عظیم راجہ صاحب بہادر کو ملے اور اون کا ہر کام خدا کی مرضی کے لیے ہو۔ اوس کے بعد فرمایا کہ یہ فتاویٰ وغیرہ سب مرتب کر لیے جائیں۔ اور طبع ہو جائیں تاکہ دوسروں کے لیے مفید و کارآمد ثابت ہوں۔ اسی کے ساتھ حضرت اقدس مدظلہم العالی کی خدمت گرامی میں پیش کرنے کے لیے ایک خط بھی دے کر مجھے رخصت فرمایا۔ وہ خط یہ ہے:-

جہانگیر آباد پولیس

۱۱ مئی ۱۹۴۱ء

جناب محترم دام بکاتہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مسجد جہانگیر آباد کے سمت قبلہ کے مسئلہ میں جس قدر جناب والانے توجہ فرمائی اور اوس کو واضح فرمادیا

اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ بڑے خیر عطا فرمائے، جناب کو مسجد تکلیف ہوئی، معافی کا طالب ہوں۔ اب جناب والا کے فتوے کے مطابق میں نے مسجد ٹیلہ لکھنؤ جو بعد شاہ عالمگیر بنی تھی اوس کے حساب سے نیز مسجد قلعہ جہانگیر آباد جس کی بنیاد حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ گنج مراد آبادی نے رکھی تھی، اوس کے حساب سے اس نئی مسجد کی بنیاد از سر نو رکھوادی ہے۔ خدائے پاک قبول فرمائے۔

بادب ایک استدعا ہے کہ ایک لکھوری اینٹ اپنے دست مبارک سے مس کر کے عطا فرمائیں، جس کو جناب وصل صاحب مسجدیں گے اور وہی بنیاد میں رکھ دی جاوے گی۔ اور اس طرح اس مسجد کی بنیاد جناب والا کی رکھی ہوئی باعث برکت ہوگی، جو فتوے اور کاغذات اس کے متعلق ہیں وہ میں نے جناب وصل صاحب کو دے دیے ہیں تاکہ وہ جناب کے ملاحظہ سے گزران کر بصورت ایک رسالہ مرتب کریں اور قلمی مسودہ پہلے مجھے بھیج دیں، تاکہ آئندہ اوس کے طبع کا انتظام ہو سکے۔

فقط والسلام مع الکرام

عریفہ۔ محمد اعجاز رسول عفی عنہ

اس کا جواب حضرت اقدس مدظلہم العالی نے اپنے دست مبارک سے تحریر فرما کر مع ایک لکھوری اینٹ کے جس پر بنائے کعبہ کی دعائے ابراہیمی واسمعیلی اور مسجد قبا کی آیتیں دم فرما کر عطا فرمائی۔ تاکہ میں بذریعہ پارسل جہانگیر آباد بھیج دوں۔ چنانچہ میں نے دونوں چیزیں جہانگیر آباد روانہ کر دیں، اس جواب کی نقل یہ ہے:-

ازناکارہ اشرف علی عفی عنہ۔ بگرامی خدمت محترم و محترم نیت دارجم و دامت معارفہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ الطاف نامہ نے ممنون یاد آوری فرمایا جو کچھ جناب

واللہ ازراہ قدر وانی تحریر فرمایا ہے، یہ سب آپ کی عنایتیں اور حسن

اخلاقت ہے۔ ورنہ اس دینی خدمت میں جو کچھ میں نے حصہ لیا واقعی میں تو

اپنے فرض منصبی کا تقی بھی ادا نہ کر سکا اور اگر فرضاً ادا بھی کر سکتا تب بھی اپنی آخرت کو درست کرتا، نہ کسی پر احسان تھا، نہ کسی کے شکر یہ کا مستحق تھا۔ بلکہ ایک درجہ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ مجھ کو باوجود میری نااہلیت کے ایک جزو میں علمی شرکت کا موقع عطا فرمایا۔ اور سب سے زیادہ اس سے ممنون ہوں کہ اس محروم و مہجور کی علمی شرکت کی ایک خاص صورت تجویز فرمائی۔ اگرچہ وہ صورت اصلی شرکت سے بدرجہا متاخر ہے۔ لیکن میری لیاقت سے بدرجہا فوق ہے۔ جس کا صلہ بجز دعا کے میں کیا پیش کر سکتا ہوں۔ اس تجزیہ کی بناء پر بامید قبول درگاہ الہی ایک اینٹ اپنے ہاتھ میں لے کر اس پر بناٹے کعبہ کی دعائے ابراہیمی و اسمعیلی اور بنائے مسجد قبا کی آیتیں دم کر کے وصل صاحب کے سپرد کرتا ہوں۔ شاید خریدارانِ یوسفی کی فہرست میں اس سوت والی بڑھیا کے نام کے نیچے اس ناکارہ بڑھے کا نام درج ہو جائے، اس کا خاص اثر میرے قلب پر ہے کہ آپ نے احتیاط کا پہلو پیش نظر کر کے مکرر صرف کا بار بخوشی گوارا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرماوے اور عالی ہمتی میں ترقی فرمائے، ترتیب رسالہ کی خدمت سے بھی غدر نہیں گو اس کی لیاقت نہیں لیکن میں دفعتاً بیمار ہو گیا اس لیے اس میں کسی قدر مہلت کی اجازت کا مستدعی ہوں۔

والسلام

اس کا جواب جو سر راجہ صاحب بہادر کی طرف سے آیا وہ درج ذیل ہے:-

جہانگیر آباد راج۔ اودھ

۲۶ مئی ۱۹۱۷ء

حضرت محترم دام ظلکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ صحیفہ گرامی دست مبارک سے لکھا ہوا مع ایک خشست پختہ آیات قرآنی دم کی ہوئی بیان موصوف کے لیے شرف صدور فرما کر باعث صداقت رہا۔ حقیقتاً یہ ایک دینی خدمت

تھی۔ جس کو جناب والائے باحسن و جوبہ خالصاً لوجه اللہ انجام دی۔ اب عملی کارروائی کے اجر سے بھی بمصدق اللال علی الخیر کفاعلہ ذات گرامی فائز ہوگی اور طفیل میں یہ خادم علمائے راسخین شریعت غراء شرف اندوز اور ماجور ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس توجہ خاص اور عنایت بے غایت کے اظہارِ شکر کے لیے زبان و قلم قاصر ہے۔ پس خاموشی حدِ شکر ہے۔ امید ہے مزاج اقدس بخیر ہوگا۔

فقط والسلام مع اکرام

طالب دعا۔ محمد اعجاز رسول عفی عنہ

اس کا جواب بھی حضرت اقدس مدظلہم العالی نے روانہ فرمایا جس کی نقل ملاحظہ ہو۔ از احقر اشرف علی عفی عنہ۔ بگرامی خدمت عالی درجبت مجمع الحسنات و منبع البرکات دامت محاسنہم و معالیم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ صحیفہ گرامی میں احقر کی محض لفظی خدمت و شرکت کو نظر خوردین خاصیت سے ملاحظہ فرما کر اس کا درجہ بڑھایا گیا تھا۔

ممنون یا دآوری فرمایا۔ اول تو خدمت ہی کیا تھی۔ پھر اس کے بادی بھی جناب

والا ہی تھے۔ جب اس کو شمار میں لایا گیا تو جناب کی جو حقیقی خدمت ہے یعنی

بقعہ مطہرہ مبارکہ کی تکمیل، مجھ پر بدرجہ اولیٰ تھی ہے کہ اس کی مقبولیت و

نافعیت اور باقیات صالحات میں ممتاز جگہ پانے کی دل سے دعا کرتا

ہوں۔ اور اس دعا کو بھی اپنی سعادت میں اضافہ سمجھوں۔

والسلام۔ خیر ختام۔

از تھانہ بھون۔ یکم جمادی الاول ۱۳۶۶ھ

یہ وہ ضروری واقعات تھے جو میں نے بیان کر دیے اور جو ضروری مکتوبات تھے وہ درج کر دیے۔ اب آخر میں ایک ضروری مکتوب اور درج کرتا ہوں جو معظمی جناب مولانا عبدالکریم صاحب گمستوی زید مجدہم کا ہے جس میں سمت بہ معلوم

کرنے کا ایک سہل ترین طریقہ مندرج ہے امید ہے کہ اس سے عام فائدہ پہنچے، اور لوگ اس سے مستفیض ہوں۔ وہ مکتوب یہ ہے :-

مکرم و محترم بندہ جناب وصل صاحب زاوالطافکم۔
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اب تک احقر کی طبیعت درست نہیں ہوئی، سابقہ عرینہ کے بعد دوبارہ اختلاج کی شدت ہو گئی تھی۔ آج قدرے سکون ہونے پر گرامی نامہ کا جواب معروضہ خدمت ہے اور انشاء اللہ اسی جمعہ تک حاضری خانقاہ کا ارادہ ہے اگر یہ معروض نا کافی ہو تو اس وقت زبانی عرض کروں گا۔

سمت قبلہ معلوم کرنے کا طریقہ

(جس کو صاحب تصریح نے سہل ترین قرار دیا ہے۔)
ان مقامات کے لیے جو مکہ معظمہ سے نوے درجے سے کم فاصلے پر مشرق میں واقع ہیں (یہ طریقہ صرف ۲۹ مئی اور ۱۴ جولائی کو کارآمد ہے) دو ایک یوم کی تقدیم تاخیر کا مضائقہ نہیں کہ تفاوت قلیل ہے۔
جس جگہ کا سمت قبلہ معلوم کرنا چاہیں وہاں کے طول البلد کو غیاث اللغات وغیرہ یا کسی اٹلس سے معلوم کر کے ۴۰ درجہ کو (جو طول البلد ہے مکہ مکرمہ کا) اس میں سے تفریق کر دیں۔ اور باقی کو ۴ میں ضرب دے کر حاصل ضرب

عہ مغرب میں بھی یہی طریقہ کام دے سکتا ہے۔ مگر مشرق میں نصف النہار۔ کہ موخر ہوگا اور مغرب میں مقدم اور جن مقامات کا بعد مکہ معظمہ سے نوے درجہ یا اس سے زیادہ ہو وہاں نصف النہار تک کے وقت رات ہوگی اور وہاں کے لیے مقاطر مکہ سے حساب کیا جاتا ہے۔ عدم ضرورت کے سبب یہاں نہیں لکھا گیا ۴۴ منہ عہ یہ دونوں تاریخیں جہنم کے قول کے مطابق ہیں موجود ماہرین فن کے اقوال ہیں اور بھی ہیں مثلاً ۲۴ مئی اور ۱۶ یا ۱۷ جولائی۔ لیکن یہ تفاوت قلیل قابل التفات نہیں، ان تاریخوں میں سے جس تاریخ میں بھی دیکھا جاوے گا، سمت قبلہ صحیح ہو جائے گی۔ ۲۴ مئی

کو ۶۰ تقسیم کر کے گھنٹے منٹ بنالیں۔ یہ فرق وقت ہوگا

مقامی نصف النہار اور نصف النہار مکہ مکرمہ میں مثلاً

جہانگیر آباد ۸۱

مکہ مکرمہ

۱۲۰

۱۲۰

۲۲

پس ۲ گھنٹے ۴۴ منٹ فرق وقت ہوا۔ یہ ۲۹ مئی یا ۱۴ جولائی کو ایک فٹ
یا کم و بیش مربع زمین کی سطح خوب ہموار کر کے اس کے درمیان ایک کیل
بالکل سیدھی نصب کی جاوے۔ (وہ کیل تخمیناً ۳ انچ ہو) اور مقامی دھوپ
گھڑی سے ۱۲ بجے وقت ملا لیں بعد ازاں فرق وقت کے مطابق یعنی جہانگیر آباد
میں ۲ بج کر ۴۴ منٹ پر اس کیل کے سایہ کے منتہی پر ایک نقطہ لگا دیں اور
اس نقطہ سے کیل کے سر پر ڈور تار کھ کر صحیح خط کشید کریں۔ اس خط کے
مطابق مسجد کی جنوبی یا شمالی دیوار قائم ہوگی۔ والسلام

احقر عبد الکریم گتسلوی مغلنی عنہ۔ از مدرسہ قدسیہ شاد آباد ضلع کرنال مورخہ ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ

عہ اور اگر وہاں دھوپ گھڑی موجود نہ ہو تو اس کیل کے گرد ایک فٹ کا دائرہ بنا کر اس سے دھوپ گھڑی کا
کام لیا جاسکتا ہے۔ تاریخ مذکور سے ایک دو دن پہلے صبح کے وقت دیکھیں کہ کیل کا سایہ دائرے میں کس جگہ
داخل ہوتا ہے وہاں پر بہت احتیاط سے ایک نقطہ لگا دیں (یہ مدخل ظل ہے) پھر شام کے وقت اس جگہ
ایک نقطہ لگائیں جہاں سے کیل کا سایہ دائرہ سے باہر نکلے (یہ مخرج ظل ہے) پھر مدخل ظل اور مخرج ظل کے
درمیان ایک خط کھینچ کر اس کے نصف پر ایک نقطہ لگائیں اور مدخل و مخرج کے درمیان جو دائرے کا
حصہ آیا ہے اس کے نصف پر بھی ایک نقطہ لگائیں اور پھر ان دونوں نقطوں پر سے گزرتا ہوا ایک خط کیل
تک کھینچ دیں یہ خط نصف النہار ہو جائے گا۔ اب ۲۹ مئی یا ۱۴ جولائی کو جب کیل کا سایہ نصف النہار
پر پڑے اس وقت گھڑی میں ۱۲ بجالیے جاویں ۱۲ منہ

اب میں اپنے مقدمہ کو ختم کرتا ہوں۔ اس کے بعد اول اصل فتویٰ بصورت رسالہ شروع ہوتا ہے پھر جمع ہے اس مجموعہ کی جس کا نام حضرت اقدس مدظلہم العالی نے تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال تجویز فرمایا ہے۔ اور آخر میں ایک بڑے نئے فتنہ کے انسداد کے لیے مولانا محمد ظفر الدین صاحب قادری رضوی استاذ مدرسہ شمس المدنی پٹنہ کا ایک محققانہ مضمون "مشرقی اور سمت قبلہ" رسالہ معارف اعظم گڑھ سے مجنسہ نقل کرتا ہوں۔ جس میں سمت قبلہ کے متعلق مشرقی کے بے اصل شبہات و اعتراضات کا شافی کافی جواب دیا گیا ہے۔

اس مکمل مجموعہ کو حضرت اقدس مدظلہم العالی نے تحقیق سمت قبلہ البلاد لسعی رئیس جہانگیر آباد کے نام سے موسوم فرمایا ہے، لوح کی کل عربی عبارت حضرت اقدس مدظلہم العالی کی ہے۔ اس سے پہلے ایک اور سرورق ہے جس کا نام میں نے عوام کے سمجھنے کے لیے سمت قبلہ اور تاریخی نام قبلہ کے سمت کی پاکیزہ تحقیق اور لقب تاریخی سمت قبلہ کے لاجواب شرعی احکام رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو مقبول فرمائیں، جن جن علمائے دین اور مفتیان شرع متین نے اس میں امداد فرمائی ہے اس کا ان کو نیک صلہ ملے اور اس مجموعہ کا ہر لفظ مسلمانوں کے لیے مفید اور سمت قبلہ کے دریافت کرنے والوں کے لیے کارآمد ثابت ہو اور جناب سر راجہ صاحب بہادر جہانگیر آباد بالقابہ کی عالی ہمتی، سعی تبلیغ، جذبہ اسلامی اور جوش ملی کا بہتر سے بہتر اجر اور اپنے اور اپنے حبیب حضرت نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر چلنے کی توفیق نیک عطا ہو، عمر و اقبال اور عدولت و اجلال میں ترقی ہو۔

ایں دعا از من و از جملہ جہان آیین باد !

اس سلسلے میں اگر میں اپنے محترم جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب ام اے کی مخلصانہ توجہات کا شکر یہ ادا نہ کروں تو کمال ناشکر گزاری ہوگی، آپ نے اس کار خیر میں جس قدر امداد فرمائی یہی ہمت افزائی کی اور اپنے مفید مشوروں سے مجھے سفر از کیا اوس کا میں شکر یہ ادا ہی نہیں کر سکتا، بجز اس کے کہ یہ کہوں۔ بجز اکم اللہ خیر الجزاء۔ اور

۱۵ جون ۱۹۳۱ء
احقر و نسل بگرامی

تنقیح المقال تصحیح الاستقبال

— ان —
جناب مولانا مولوی محمد شفیع صاحب زید مجدیم۔ مفتی دارالعلوم دیوبند (سہارنپور)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ قصبہ جہانگیر آباد ضلع بارہ بنکی میں ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے جس کا سمت قبلہ ایک انجینیر صاحب نے ایک انگریزی ماہر ہیئت کے ذریعے سے دس درجہ جانب جنوب قرار دیا ہے، ایک دوسرے عالم دین ماہر ہیئت نے سمت قبلہ اٹھائیس دقیقہ جانب شمال نکالا ہے۔ اس حالت میں جو حکم شرع شریف کا ہو، اس سے مطلع کیا جاوے اور عام طور سے مسجد کی تعمیر کے لیے سمت قبلہ کس طرح معلوم کی جائے اس کا شرعی طریقہ کیا ہے؟

الجواب

سمت قبلہ کی تعیین اور بنائے مسجد میں سنتِ سلف صحابہ و تابعین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین سے آج تک یہ ہے کہ جس بلذہ میں مساجد قدیمہ مسلمانوں کی تعمیر کر رہے موجود ہوں۔ اون کا اتباع کیا جائے۔ ایسے مقامات میں آلات رصدیہ اور قواعد ریاضیہ کی تہقیق میں پڑنا سنت کے خلاف اور نامناسب و باعث تشویش ہے۔ ہاں جنگلات اور ایسی نوآبادیات میں جن میں مساجد نہ ہو۔ نہ ہوں وہاں قواعد ریاضیہ سے مدولی

جاوے تو مضائقہ نہیں، گو اُن سے مدد لینا ضروری وہاں بھی نہیں، بلکہ وہاں بھی تھری اور تخمین قریبی آبادیوں کی مسجد کا کافی ہے اور اگر مساجد بلدہ کی سمتیں کچھ باہم متخالف ہوں تو بظن غالب، یا تجربہ کار مسلمانوں کے اندازہ سے جو اُن میں زیادہ اقرب معلوم ہوں، اس کا اتباع کر لیا جائے۔ البتہ اگر کسی بلدہ کی عام مساجد کے متعلق قوی شبہ ہو جائے کہ وہ سمت قبلہ سے اس درجہ منحرف ہیں کہ نماز ہی درست نہ ہوگی تو ایسی صورت میں اُن کا اتباع نہ کیا جاوے بلکہ قواعد ریاضیہ سے سمت قبلہ کا استخراج کیا جاوے۔ یا اس بلدہ کے قریب کی کسی مسجد سے تخمینہ کر کے سمت قبلہ متعین کیا جاوے۔ لہذا صورت مندرجہ سوال میں انجینیر صاحب اور دوسرے ماہر بیٹ صاحب نے جو متخالف سمتیں نکالی ہیں دونوں کو نظر انداز کر کے مساجد قدیمہ کے مطابق مسجد تعمیر کی جاوے۔ اصل سوال کا جواب اتنا ہی ہے جو مقتضای اولہ شرعیہ کا ہے۔ باقی مسئلہ سمت قبلہ کی تحقیق اور اس کے دلائل پر اجمالی نظر کے لیے سطور ذیل لکھی جاتی ہیں:-

اس مسئلہ میں اصل قابل نظر دو چیزیں ہیں۔

(۱) استقبال قبلہ جو نماز میں فرض ہے اس کی مدد ضروری کیا ہے؟

(۲) بلاوعدہ میں اس ضروری سمت قبلہ کے معلوم کرنے کا شرعی طریق کیا ہے۔ یہ دونوں مسئلہ جدا جدا سمجھ لیے جاویں تو مسئلہ زیر بحث خود بخود حل ہو جائے گا۔

پہلے مسئلہ کے متعلق مذہب مختار حنفیہ کا یہ ہے کہ جو شخص بیت اللہ شریف کے

سامنے ہو، اس کے لیے عین کعبہ کا استقبال فرض ہے اور جو اس سے غائب ہے اس

کے ذمہ جہت کعبہ کا استقبال ہے، عین کعبہ کا نہیں۔ کما فی البدائع۔ و تعتبر الجہۃ

دون العین کذا ذکر الکرنجی والرازی وهو قول عامۃ مشایخنا بما وراء النہر

ربدائع ج ۱۱، ومثلہ فی الہدایۃ وعامة المتون والشرح۔ جیسے کہ بدائع میں ہے

کہ اعتبار جہت کعبہ کا کیا جاتا ہے، نہ کہ عین کعبہ کا، ایسے ہی امام کرنجی اور امام رازی نے

بیان کیا ہے اور یہی ما وراء النہر کے ہمارے عام مشائخ کا قول ہے۔ بدائع جلد اول ص ۱۱۸

اور ایسے ہی ہدایہ اور عام متون و شروح میں ہے۔

پھر جہت قبلہ کے استقبال کے معنی یہ ہیں کہ ایک خط جو کعبہ پر گزرتا ہوا جنوب و شمال پر منتہی ہو جائے اور نمازی کے وسط جہہ سے ایک خط مستقیم نکل کر اس پہلے خط سے اس طرح تقاطع کرے کہ اس سے موقع تقاطع پر دو زاویہ قائمہ پیدا ہو جاویں وہ قبلہ مستقیم ہے۔ اور اگر نمازی اتنا منحرف ہو کہ وسط جہہ سے نکلنے والا خط تقاطع کر کے زاویہ قائمہ پیدا نہ کرے، بلکہ حادہ یا منفرجہ پیدا کرے لیکن وسط جہہ کو چھوڑ کر پیشانی کے اطراف میں کسی طرف سے نکلنے والا خط زاویہ قائمہ پیدا کر دے، تو وہ انحرافِ قلیل ہے، اس سے نماز صحیح ہو جاوے گی۔ اور اگر پیشانی کی کسی طرف سے بھی ایسا خط نہ نکل سکے جو خط مذکورہ پر زاویہ قائمہ پیدا کر دے تو وہ انحرافِ کثیر ہے اس سے نماز نہ ہوگی، اور علمائے ہیئت و ریاضی نے انحرافِ قلیل و کثیر کی تعیین اس طرح کی ہے کہ سینتالیس درجہ تک انحراف ہو تو قلیل ہے، اس سے زاید ہو تو کثیر، مفسدِ صلوة ہے (لما سیاقی عن الخیریة) چنانچہ عنقریب فتاویٰ خیریسے نقل ہو کر آتا ہے۔ انحرافِ قلیل و کثیر کی تعیین میں فقہائے کرام کا ایک دوسرا قول بھی ہے جس میں اس سے کم گنجائش ہے یعنی ما بین المغربین وہ احتیاط پر مبنی ہے، جیسا کہ آئندہ (۳۹) کے حاشیہ میں آتا ہے۔ اور علمائے ہیئت کے اور بھی اقوال ہیں جن میں سے بعض اس سے زیادہ وسعت کو چاہتے ہیں اور بعض میں اس سے کم گنجائش نکلتی ہے۔ اس جگہ ہم نے بنظر احتیاط اوسط سمجھ کر اس قول کو اختیار کیا ہے۔ قول اول کی دلیل عبارات ذیل ہیں:-

فی ردالمحتار بل المفہوم ما قدمنا
عن المعالج والدرر من التقیید
بحصول زاویتین قائمتین عند
انتقال المستقبل لعین الکعبۃ یمینا
اویسارا انہ لا یصح لو کانت احدھما
خامی میں لکھا ہے۔ بلکہ اس عبارت سے جس
کو ہم نے پہلے معراج اور درر سے نقل کیا
ہے کہ استقبال کرنے والے کے منتقل ہونے
کے وقت عین کعبہ پر دو زاویہ قائمہ حاصل
ہونے کی قید ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر

ایک عاودہ اور دوسرا منفرجہ ہوگا تو نماز صحیح نہ ہوگی
 (یہاں تک کہ) اس سے معلوم ہوا کہ انحرافِ
 قلیل مضر نہیں اور وہ وہ ہے جس کے وقت
 چہرہ یا اوس کے ہر دو جانب عین کعبہ، یا
 فضائے کعبہ کی سمت میں رہیں، اس طرح کہ
 چہرہ یا اوس کی کسی جانب سے اگر ایک خطِ مستقیم
 نکالا جائے تو وہ کعبہ یا فضائے کعبہ پر گزر جائے
 اور یہ ضروری نہیں کہ وہ خارج ہونے والا خط
 مستقیم نمازی کی پیشانی سے نکلے بلکہ پیشانی سے
 یا اوس کی ہر دو جانب سے (شامی ج ۱ ص ۲۸۸)
 اور فتاویٰ خیر یہ کی یہ عبارت بھی اس کی موید
 ہے کہ امام ابو حنیفہؒ سے روایت ہے کہ مشرق
 اہل مغرب کا قبلہ ہے۔ اور مغرب اہل مشرق
 کا، اور جنوب اہل شمال کا اور شمال اہل جنوب
 کا۔ اور اس کلام سے ثابت ہوا کہ انحرافِ قلیل
 مضر نہیں (خیر یہ ج ۱ ص ۱۷۷) اور بحر الرائق کی
 یہ عبارت بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ مثلاً
 کسی شہر میں ایک شخص صحیح طور سے کعبہ کا استقبال
 کیے ہوئے ہے اوس کے چہرہ سے ایک خط نکلتا
 ہوا فرض کریں ایک دوسرا خط اس کا قاطع فرض
 کریں کہ وہ پہلے خط کو قطع کرتا ہوا دائیں بائیں
 جانب دو زاویہ قائمہ بنائے (اس صورت میں جہت
 کعبہ کا، مقابلہ زائل نہ ہوگا۔ یہ وہ شخص اسی

جادة والاخرى منفرجة (الی ان
 قال) فعلم ان الانحراف اليسير لا
 يضر وهو الذي يبقى مع الوجه او
 شئ من جوانبه مسا متالعين الكعبة
 اولها ثانيا بان يخرج الخط من
 الوجه او من بعض جوانبه ويسر
 على الكعبة او هوائلها مستقيماً ولا
 يلزم ان يكون الخط الخارج على
 استقامته خارجاً من جهة المصلی
 بل منها او من جوانبها (شامی ہندی
 ج ۱ ص ۲۸۸) ویویدہ ما فی الفتاوی الخیریة
 وعن ابی حنیفۃ المشرق قبلۃ اهل
 المغرب۔ والمغرب قبلۃ اهل
 المشرق۔ والجنوب قبلۃ اهل الشمال
 والشمال قبلۃ اهل الجنوب وعلیہ
 فالانحراف القلیل لا یضرہ (خیریة
 ج ۱ ص ۱۷۷) وایضاً ویویدہ ما فی البحر فلو
 فرض مثلا خط من تلقاء وجه المستقبل
 للكعبة علی التحقیق فی بعض البلاد و
 خط اخر یقطعہ علی زاویتین قائمتین
 من جانب یمین المستقبل و شمال
 ولا ینزل تلك المقابلة بالانتقال
 الی الیمین والشمال علی ذلك الخط

خط پر میلوں دائیں بائیں جانب ہوتا بلٹے اور جگہ بدلتا ہے
اسی لیے علماء نے ایک شہر اور دو شہر اور کئی شہروں
کے قبلے ایک سمت پر قائم کیے ہیں (بحر ج ۱ ص ۳)
ایسے ہی فتح القدیرو شرح منیۃ المصلیٰ اور زاد الفقیر
وغیرہ سے شامی میں نقل ہے۔

اور فتاویٰ خیر یہ میں قول سئل کے تحت
میں ہے اور قواعد فلکیہ سے یہ بھی ثابت ہوتا
ہے کہ دائیں بائیں جانب کا انحراف (قبلہ سے)
بمحاذ دلائل (فلکیہ) ۴۵ درجہ سے زائد ہوتا
یہ انحراف بغیر اشکال مکہ مکرمہ کی سمت ریح
سے باہر ہوگا۔ (یعنی قبلہ کا استقبال نہ ہوگا)
(یہاں تک (الی) یعنی درمیانی عبارت چھوڑ کر)
حالات مذکورہ میں وہ مساجد جن کا انحراف (قبلہ
سے) حد سے زیادہ ہو تو کیا دن میں واجب ہوگا
کہ قواعد ریاضیہ کی رو سے جو سمت نکلے، اس
طرف مائل ہو جاویں یا نہیں۔ اگر انحراف کو واجب
کہتے ہو، اس صورت میں اگر کوئی معاند بعد ثبوت
دلائل ان محاریب منحرفہ کی طرف نماز پڑھے، کیا
اس کی نماز فاسد ہوگی۔ جواب۔ جب انحراف
مذکور سے اس طور پر کہ مقابلہ کعبہ بالکلیہ زائل
ہو گیا کہ چہرہ کے سامنے کا کوئی حصہ کعبہ کے
مقابل باقی نہ رہا، استقبال قبلہ مشروط صحت

بغیر نسخ کثیرہ دلذا وضع العلماء
قبلة بلد وبلدین وبلاد علی
سمت واحد (بحر ج ۱ ص ۳) ومثله
فی رد المحتار عن الفتح وشرح المنیۃ
وناد الفقیر وغیرہ۔

وفی الخیریۃ تحت قولہ (سئل)
ومن القواعد الفلکیۃ اذا کان
الانحراف عن مقتضی الأدلۃ اکثر
من خمس واربعین درجۃ یمتد
ادیسرة یکون ذلک الانحراف
خارجاً عن جهة الربع الذی فیہ
مکة المشرفۃ من غیر اشکال (الی)
فہل ہذہ المحاریب الستی
انحرافها کثیر فاحش یجب الانحراف
فیہا یسرة الی جهة مقتضی الأدلۃ
والمحالة ما ذکرنا ام لا۔ واذ اقلتم
یجب فہل اذا عاند شخص وصلی
فی ہذہ المحاریب بعد اثبات ما
ذکرنا تکون صلوتہ فاسدۃ الخ
(اجاب) حیث زالت بالانحراف
المذکور المقابلة بالکلیۃ بحیث لم
یبق شیء من سطح الوجه مسامتا

عہ فیصیر مجموعہ ۶ سمت تسعون درجۃ وهوربع الدائرة ۱۲۔ محمد شفیع عفا عنہ۔

للکعبة عدم الاستقبال المشروط للصحة نازکے لیے اجماعاً نہ پایا گیا۔ جب شرط (یعنی
 الصلوة بالاجماع و اذا عدم الشرط استقبال قبلہ) نہ پایا گیا، مشروط (یعنی نماز)
 عدم المشروط (خیریتہ صلیم) بھی نہ ہوگی۔

عبارات مذکورہ سے سمت قبلہ اور استقبال قبلہ کی جو حد ضروری معلوم ہوئی ہے
 اس کا حاصل سہل اور عامیانه عبارت میں یہ ہے کہ انسان کے چہرہ کا کوئی ذرا سا
 ادنیٰ حصہ خواہ وسط چہرہ کا ہو یا دایم یا بائیں جانب کا، بیت اللہ شریف کے کسی
 ذرا سے حصے کے ساتھ مقابل ہو جاوے۔ اور فن ریاضی کی اصطلاحی عبارت میں
 یہ ہے کہ عین کعبہ سے پینتالیس درجہ تک بھی انحراف ہو جاوے تو استقبال فوت
 نہیں ہوتا اور نماز صحیح ہو جاتی ہے۔ اس سے زائد انحراف ہو تو استقبال فوت ہو
 کر نماز فاسد ہو جائے گی، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انحراف قلیل جو عام طور پر
 کہیں جنوباً کہیں شمالاً واقع ہو جاتا ہے۔ یہ ناقابل التفات ہے۔ اس کی وجہ سے
 نہ کسی مسجد کی جہت بدلنے کی ضرورت ہے نہ اس کو قائم رکھتے ہوئے کسی طرف
 مائل ہونے کی ضرورت ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بلاذ بعیدہ میں سمت قبلہ اور جہت استقبال معلوم
 کرنے کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ صحابہ و تابعین اور جمہور امت کا اس میں تعامل کس
 طرح ہے؟ اور یہ کہ قواعد ریاضیہ کا استعمال اس کام کے لیے جائز و معتبر ہے یا نہیں
 اور ہے تو کس درجہ میں؟

اس بارے میں پہلے بطور مقدمہ یہ بتلا دینا مناسب ہے کہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا
 الصلوة والسلام کے تمام احکام کی بنیاد ریسر و سہولت اور سادگی دہے تکلفی پر ہے۔
 فلسفیانہ تدقیقات پر نہیں۔ کیونکہ دائرہ حکومت اس شریعت کا تمام عالم کے بحر و بر،
 اسود و احمر، شہری و دیہاتی آبادیوں اور اذن کے سکان پر عادی ہے، اسلامی قوانین

۳۱
 اس مسئلہ کی ایک مزید و مفید توضیح خود حضرت مولف کی لکھی ہوئی بعنوان سمت قبلہ اور استقبال قبلہ

سالہ ۱۳۶۶ء، صفحہ ۲۷، ۲۸ میں ملحق ہے جو واجب الملاحظہ ہے۔ ۱۲ دسمبر

ناز و روزہ وغیرہ جس طرح شہریوں اور تعظیم یافتہ طبقات پر عائد ہیں۔ اسی طرح دیہاتیوں اور پہاڑ کے دتوں اور جزائر کے رہنے والے ناخواندہ و ناواقف لوگوں پر بھی عائد ہیں۔ اور جو احکام اس درجہ عام ہوں، اون میں مقتضائ عقل و حکمت و رحمت کا یہی ہے کہ اون کو تدقیقات اور قواعد ریاضیہ یا آلات رصدیہ پر موقوف نہ رکھا جائے۔ تاکہ ہر عام و خاص، خواندہ و ناخواندہ باسانی اپنے فرائض انجام دے سکے۔ شریعتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ترا احکام اسی نظریہ کے ماتحت بالکل آسان اور سادہ طریق پر آئے۔ روزہ رمضان کا مدار چاند دیکھنے پر رکھا گیا ہے، حسابات ریاضیہ پر نہیں مہینے قمری رکھے گئے ہیں جن کا مدار رویت ہلال پر ہے۔ شمسی مہینے جن کا مدار خاص حساباً ریاضیہ پر ہے، عام احکام شرعیہ میں اون کو نہیں لیا گیا۔ اسی طرح احکام اسلامیہ کے تتبع سے بکثرت اس کے نظائر معلوم کیے جاسکتے ہیں۔

اس مختصر مقدمہ کے بعد مسئلہ زیر بحث میں یہ فیصلہ کر لینا آسان ہو گیا کہ سمتِ قبلہ اور استقبالِ قبلہ جس کا ہر مسلمان دن میں پانچ مرتبہ مامور ہے، اوس کے لیے شریعت نے ضرور کوئی آسان اور بالکل سادہ طریقہ اختیار کیا ہوگا۔ جس کو ہر شہری و دیہاتی باسانی عمل میں لاسکے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس کے متعلق یہ ہے۔ ما بین المشرق والمغرب قبلۃ رواہ الترمذی عن ابی ہریرہ۔ یعنی مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ (اس کو ابو ہریرہؓ سے ترمذی میں روایت کیا، یہ ارشاد اگرچہ تمام عالم کے لیے نہیں بلکہ خاص اہل مدینہ اور اوس کے قرب و جوار کے لیے ہے۔ لیکن اتنی بات اس میں عام ہے کہ سمتِ قبلہ کی تعیین میں زیادہ تدقیق کا تکلف نہیں بتایا بلکہ بین المشرق والمغرب (مشرق و مغرب کے درمیان) فرما کر پوری جہت جنوب کو قبلہ قرار دے دیا اور اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس حدیث میں بین المشرق والمغرب سے اصطلاح ریاضی پر نقطہ مغرب و مشرق کی درمیانی قوس یعنی نصف دائرہ مراد نہیں جس سے ربع دائرہ کا قول جو بحوالہ خیر یہ ذکر کیا گیا ہے، اوس کے مخالف حدیث ہونے کا شبہ ہو سکے، بلکہ محاورے کے مطابق پوری جہت جنوب کا بتلانا مقصود ہے

تو جس طرح مدینہ طیبہ میں مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے، اسی طرح ہندوستان میں جنوب و شمال کے درمیان قبلہ کہا جاسکتا ہے یعنی پوری جہت مغرب۔

وقد نص عليه احمد بن خالد بان قول عمر ما بين المشرق والمغرب قبله قاله بالمدينة فمن كانت قبلته مثل قبله المدينة فهو في سعة مما بين المشرق والمغرب ولسائر البلدان من السعة في القبلة من ذلك بين الجنوب والشمال وقال ابو عمر بن عبد البر لا خلاف بين اهل العلم فيه (كتاب المخطط ص ۲۵۱)

اور احمد بن خالد نے تصریح فرمائی ہے کہ حضرت عمر نے ”ما بين المشرق والمغرب قبله“ مدینہ منورہ میں فرمایا تھا۔ لہذا جس کا قبلہ مدینہ کے قبلہ کی طرح ہو، اوس کو مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ کی گنجائش ہے، باقی شہروں میں جنوب و شمال کے درمیان کی وسعت ہوگی۔ ابو عمر بن عبد البر (مالکی) فرماتے ہیں کہ اہل علم اس بارے میں اختلاف نہیں رکھتے (یعنی سب متفق ہیں) کتاب المخطط ج ۱ ص ۲۵۱۔

پھر حضرات صحابہ و تابعین اور اون کے بعد عامہ مسلمین کے تعامل نے اوس کو بالکل واضح کر دیا کہ بلاد بعیدہ میں جہاں کہیں حضرات صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں، یا آپ کے بعد پہنچے ہیں، وہاں نمازیں ادا کرنے اور مستقل قیام کی صورت میں مساجد بنانے میں ان حضرات سے کہیں منقول نہیں کہ آلاتِ رصدیہ سے کام لے کر سمتِ قبلہ متعین کی ہو، بلکہ موٹے موٹے آثار و نشانات اور اور شمس و قمر اور قطب وغیرہ مشہور و معروف ستاروں کی پہچان سے ایک اندازہ قائم کر کے محض تخری و تخمینہ سے سمتِ قبلہ متعین فرمائی ہے۔ علامہ مقریزی نے کتاب المخطط میں نہایت کافی تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرات صحابہ نے مصر اور دوسرے بلاد میں اسی طرح موٹے موٹے آثار و نشانات کے ذریعہ اندازہ و تخری سے کام لے کر مساجد بنائی ہیں، اور عام مسلمانوں نے ان کا اتباع کیا ہے۔ اور احمد بن طولون نے جب مصر میں اپنی مسجد کی بنا ڈالی تو مدینہ طیبہ آدمی بھیج کر مسجد نبوی کی سمتِ قبلہ خاص طریق پر دریافت کرائی اور اوس کے موافق

مسجد بنائی جو جامع عمرو بن عاص فاتح مصر سے کسی قدر منحرف ہے، لیکن علماء نے جامع عمرو بن عاص کے اتباع کو ہی اولیٰ قرار دیا ہے اور مصر و اطراف مصر کی مساجد اسی کے مطابق ہیں۔ کتاب المخطوط کی بقدر ضرورت عبارت یہ ہے کہ :-

قال الکندی وقال یزید بن ابی جیب سمعت اشیاخنا ممن حضر مسجد الفتح (یعنی جامع عمرو بن العاص) یقولون وقف علی اقامة قبلۃ المسجد لجامع ثمانون رجلا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منهم الزبیر بن العوام والمقداد وعبادۃ بن الصامت والوالدرداء وفضالة بن عبید وعقبة بن عامر و فی روایة اسس مسجدنا هذا اربعة من الصحابة ابو ذر والوبصيرة ومحمدة بن جزء الزبیدی ونبیه بن صواب قال عبد اللہ بن ابی جعفر اقام محر ابنا هذا عبادۃ بن الصامت و رافع بن مالک وهما نقیبان^{عہ} وقال داؤد بن عقبۃ ان عمرو بن العاص

کندی کا قول ہے کہ یزید بن حبیب فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے اہل شیوخ (واساتذہ) سے جو مسجد الفتح (یعنی جامع عمرو بن العاص) کے تعمیر کے وقت موجود تھے۔ یہ سنا ہے کہ جامع مسجد کے قبلہ کی تصحیح کے واسطے اسی صحابہؓ مقرر کیے گئے تھے، اہل میں حضرت زبیر بن العوام، مقداد عبادہ بن الصامت، ابودرداء، فضالہ بن عبید عقبہ بن عامر تھے، اور ایک روایت میں ہے کہ ہماری اس مسجد کی بنیاد چار صحابہؓ نے رکھی۔ ابودر و ابوبصیرہ و محمۃ ابن جزالہ بیدی و نبیہ بن صواب۔ نیز عبد اللہ بن ابی جعفر فرماتے ہیں کہ ہماری اس محراب کو عبادہ بن الصامت رافع بن مالک نے قائم فرمایا۔ اور یہ دونوں مفتش تھے۔ داؤد بن عقبہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاص نے ربیع بن شریب بن حسنہ اور عمرو بن علقمہ قرشی عدوی کو قبلہ کے قائم کرنے کے

عہ قال فی مجمع البحار وكان ای عبادۃ من النقباء هو جمع نقیب وهو كالعریف علی القوم المقدم علیہم یتعرف اخبارہم وینقب عن احوالہم ای یفتش اہل^{۲۸۶} حضرت عبادہ نقباء میں سے تھے، نقباء جمع نقیب کی ہے اور نقیب و عریف قوم کے اس سوار کو کہتے ہیں جو ان کے حالات سے باخبر رہے اور ان کے واقعات کی تفتیش کرے۔ ۱۲۰ منہ

واسطے بھیجا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ وہاں کھڑے رہو۔ جب سورج ڈھلے یا یہ فرمایا کہ نصف النہار پر پہنچے تو سورج کو حاجبین (بھوؤں) پر لینا۔ ہر دو نے ایسا ہی کیا اور زامام (لیث فرماتے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاص نے رسی تان کر (پھیلا کر) قبلہ مسجد کو قائم فرمایا اور حضرت عمرو بن العاص نے فرمایا کہ قبلہ مشرق کے طرف رکھو تو حرم کعبہ کا صحیح استقبال ہوگا۔ (لیث نے) فرمایا کہ اسی لیے میں نے (قبلہ کو) مشرق کی طرف زیادہ مائل کر دیا۔

بعث ربیعة بن شرحبیل بن حسنة
وعمر بن عبدالمطلب القرشي ثم العدي
يقعان القبلة وقال لهما قوما اذا
زال الشمس او قال انتصفت الشمس
فاجعلها على حاجبيكما ففعلا۔
وقال الليث ان عمرو بن العاص
كان يمد الحبال حتى اقيمت قبلة
المسجد۔ وقال عمرو بن العاص
شرقوا القبلة تصيبوا الحرم قال
فشرقت جدا الخ۔

کتاب النخط للمقریزی ج ۲ ص ۲۲۶، ۲۲۷

کتاب النخط للمقریزی ص ۲۲۶، ۲۲۷

روایات مذکورہ میں اگرچہ بظاہر قدرے اختلاف نظر آتا ہے، لیکن اول تو غور کرنے کے بعد یہ تعارض رفع ہو جاتا ہے، کیونکہ صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت کی شرکت میں یہ کام ہوا، روایت کرنے والوں نے اپنے اپنے علم کے مطابق خاص خاص صحابہؓ کی طرف منسوب کیا، جس میں دوسروں کی نفی نہیں، ثانیاً یہ سب روایات اتنی بات پر متفق ہیں کہ سمت قبلہ کی تعیین میں آلات رصدیہ اور قواعد ریاضیہ سے کام نہیں لیا گیا۔ حالانکہ مصر جیسا شہر اس کے جاننے والوں سے خالی نہیں ہو سکتا، بلکہ محض تحری و تخمین سے سمت قبلہ مقرر کی گئی وہو المراد۔ اور اسی لیے صاحب بحر الرائق فرماتے ہیں:-

دلائل ظاہرہ عادیہ مثل سورج چاند وغیرہ سے
جہل کی معذوری کسی شخص کی بھی قابل قبول
نہیں۔ (البتہ) علم ہیئت اور صورتارگان
غیر سیارہ کے دقائق کو باننا غدر صیح ہے۔

لا عذر لاحد في الجهل بالادلة
الظاهرة المعتادة كالشمس و
القمر وغير ذلك اما دقائق علم
المهية وصور النجوم الثوابت

(یہ بھی کہا، کہ دنیا کی مساجد کے تمام محرابین یہاں تک کہ (مسجد) منیٰ کی بھی تخری و اندازے سے قائم کی گئی ہیں۔ تخری کے علاوہ کوئی زیادتی نہیں کی گئی۔ (یعنی آلاتِ رصدیہ سے کام نہیں لیا گیا)۔ (البتہ، اس عموم سے وہ مستثنیٰ ہے جو کہ ابو بکر رازی سے منقول ہے کہ محراب مدینہ قطعی اور یقینی ہے (تخمینی نہیں) کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے ذریعہ قائم فرمایا ہے۔ بخلاف باقی شہروں کے (کہ تخری و علامات سے ہوئے) محراب منیٰ جو خانہ کعبہ سے قریب ہے وہ بھی تخری و علامات پر قائم کی گئی۔ (بحر ص ۳۱۲) اور شامی میں بھی اسی طرح بیان ہے۔

فہو معذور فی الجہل بہا (الی ان قال) قال و محاریب الدنیا کلہا نصبت بالتخری حتی منی و لم یزد علیہ شیء و ہذا خلاف ما نقل عن ابی بکر الرازی فی محراب المدینۃ انہ مقطوع بہ فانما نصب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالوحی بخلاف سائر البقاع حتی قیل ان محراب منی نصبت بالتخری و الامارات و ہوا قریب المواضع الی مکة (بحر ص ۳۱۲) و مثلہ فی رد المحتار۔

اور ملک العلماء صاحب بدائع فرماتے ہیں:-

ان کان ناٹیا عن الکعبۃ غائباً عنہا یجب علیہ التوجہ الی جہتہا و ہی المحاریب المنصوبۃ بالامارات الدالۃ علیہا لا الی عنہا رثم قال، اما اذا جعلت قبلۃ الجہۃ و ہی المحاریب المنصوبۃ لا یتصور ظہور الخطاء فنزلت الجہۃ فی ہذہ الحالۃ منزلة عین الکعبۃ فی حال المشاہدۃ و لله

اگر (مصلی) کعبہ سے دور اور اوس سے غائب ہو، اوس وقت جہت کعبہ کی طرف توجہ کرنا واجب ہے۔ نہ عین کعبہ کی طرف اور جہت کعبہ وہ محرابین ہیں جو علامات والہ سے قائم کی گئی ہیں۔ (پھر فرماتے ہیں، کہ جب نمازی کا قبلہ محراب بلے قائم مقرر کر دی گئی ہیں، اوس میں خطا و غلطی ظاہر نہ ہوگی، کیونکہ جہت قبلہ اس وقت بمنزلہ عین کعبہ کے قرار دے دی

گئی۔ حالات کے بدلنے میں حق تعالیٰ کو اختیار ہے کہ بندوں کے واسطے جس چیز کو (چاہیں) قبلہ توجہ بنا دیں۔ حق تعالیٰ شانہ کے اس قول میں اشارہ اسی طرف ہے۔ اب تو یہ ہے، بے وقوف ضرور کہیں ہی گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق سمت) قبلہ سے (کہ بیت المقدس تھا) جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے۔ کس (بات) نے بدل دیا۔ آپ فرمادیں گے کہ سب مشرق اور مغرب اللہ ہی کی ملک میں ہیں جس کو خدا ہی چاہیں (یہ) سیدھا طریق بتلا دیتے ہیں (دوسری وجہ) یہ ہے کہ کعبہ سے دور ہونے کی صورت میں عین کعبہ کو تحری و اندازہ سے قبلہ بنایا گیا ہے اور تحری کا مدار عین شہادت قلب پر ہے (جس میں علامات سے استدلال کا دخل نہیں) اور جہت کعبہ کو قبلہ بنانے کا مدار شمس و قمر وغیرہ علامات والہ سے استدلال پر ہے اسی لیے بذریعہ امارات و علامات جہت کو قبلہ قرار دینا اس سے بہتر ہے کہ محض تحری و اندازہ سے عین کعبہ کی طرف استقبال کیا جاوے۔ اسی لیے جو شخص کسی شہر میں داخل ہوا اور وہاں کی قائم شدہ محرابین دیکھے اس کو (مازکے واسطے) اسی طرف توجہ

تعالیٰ ان يجعل ای جهة شاء
قبلة لعباده علی اختلاف
الاحوال والیہ وقعت
الإشارة فی قوله تعالیٰ سيقول
السفهاء من الناس ما
ولمهم عن قبلتهم التي
كانوا علیها قل لله المشرق
والمغرب یهدی من
یشاء الی صراط مستقیم
ولأنهم جعلوا عین
الكعبة قبلة فی هذه
الحالة بالتحری وانه
مبنى علی مجرد شهادة
القلب من غیر امارة و
الجهة صارت قبلة باجتہادهم
المبنى علی الامارات الدالة
علیها من النجوم والشمس
والقمر وغیر ذلك فكان
فوق الاجتہاد بالتحری و
لهذا من دخل بلدة و
عاین المحاریب المنصوبة
فیها یجب علی التوجه الیها
ولا یجوز له التحری الخ (بدا ئع

واجب ہے تحری و اجتہاد جائز نہیں۔ الخ
 ربدائع ج ۱۰ ص ۱۱۱ اور فتاویٰ قاضی خان
 میں ہے کہ جہت کعبہ دلیل سے معلوم کی جاتی
 ہے اور شہر اور آبادی میں دلیل (قبلہ) وہ
 محرابین ہیں جن کو صحابہؓ و تابعینؓ نے قائم
 فرمایا ہے۔ اس لیے ہمارے ذمہ واجب ہے
 کہ محرابہائے قائمہ میں انھیں کا اتباع کریں
 ہاں اگر کسی جگہ ایسی محرابین موجود نہ ہوں
 اوس وقت جو اس کے اہل ہوں اوس سے
 دریافت کیا جائے۔

۱۱۱) وفي فتاوى قاضى خان
 وجهة الكعبة تعرف
 بالدليل والدليل في
 الامصار والقرى المحاريب
 التي نصبها الصحابة
 والتابعون فعلينا اتباعهم
 في استقبال المحاريب
 المنصوبة فان لم تكن
 فالسؤال من الاهل
 - ۵۱ -

عبارتِ مذکورہ سے ثابت ہوا کہ بلا و بعیدہ میں سمتِ قبلہ معلوم کرنے کا
 صحیح طریقہ جو سلف سے چلا آتا ہے یہ ہے کہ جن بلاد میں مساجد قدیمہ موجود ہوں
 ان کا اتباع کیا جائے، کیونکہ اکثر بلاد میں تو خود حضراتِ صحابہؓ و تابعینؓ نے
 مساجد کی بنیادیں ڈالی ہیں۔ اور سمتِ قبلہ متعین فرمائی ہے اور پھر انھیں کو
 دیکھ کر دوسری بستیوں میں مسلمانوں نے اپنی اپنی مساجد بنائی ہیں۔ اس لیے یہ
 سب مساجد مسلمین سمتِ قبلہ معلوم کرنے کے لیے کافی و وافی ہیں ان میں
 بلا وجہ شبہات فلسفہ نکالنا شرعاً محمود نہیں، بلکہ مذموم اور موجب تشویش
 ہے۔ بلکہ بسا اوقات ان تشویشات میں پڑنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ حضراتِ
 صحابہؓ و تابعینؓ اور عامۃ المسلمین پر بدگمانی ہو جاتی ہے کہ ان کی نمازیں اور
 قبلہ درست نہیں۔ حالانکہ یہ باطل محض اور سخت جسارت ہے۔ آٹھویں
 صدی ہجری کے مشہور و معروف عالم ابن رجب حنبلی اسی بناء پر سمتِ
 قبلہ میں آلاتِ رصدیہ اور تدقیقاتِ ریاضیہ میں پڑنے کو منع فرماتے ہیں
 و لفظہ :-

لیکن علم تیسیر سوا اس کو اس قدر حاصل کرنا
 جمہور کے نزدیک جائز ہے جس سے راہ یابی اور قبلہ
 اور راستوں کی شناخت ہو سکے۔ اس سے
 زیادہ کی ضرورت نہیں کہ وہ (یعنی زیادہ
 سیکھنا) امور ضروریہ سے غافل کر دے
 گا۔ اور بعض مرتبہ تدقیقات فلکیہ میں پڑنا
 عامہ بلاد اسلامیہ میں جو مسلمانوں کی مسجدیں
 ہیں، اون کے متعلق بدگمانی پیدا کر دیتا ہے
 اس فن میں مشغول ہونے والوں کو ہمیشہ
 اس قسم کے شبہات پیش آئے ہیں اس سے
 یہ بھی اعتقاد پیدا ہوگا کہ بہت سے شہروں
 میں صحابہ و تابعین کی نمازیں غلط طریقہ پر
 تھیں۔ اور یہ بالکل لغو و باطل ہے۔ امام
 احمد نے (ستارہ) جدی (جس کو ہمارے
 بلاد میں قطب کہتے ہیں) سمت قبلہ میں اس
 سے بھی استدلال کرنے کو منع کیا اور فرمایا

واما علم التیسیر فاذا
 تعلم منه ما یحتاج
 الیہ للاستهداء ومعرفۃ
 القبلة والطرق کان
 جائزاً عند الجمہور و
 ما زاد علیہ فلا حاجة
 الیہ وهو یشغل عما
 ہواہم منہ وربما ادى
 التذقیق فیہ الی اساءة
 الظن بمحاریب المسلمین
 فی امصارہم کما وقع فی
 ذلک کثیر من اہل هذا
 العلم قدیماً و حدیثاً و
 ذلک یغضی الی اعتقاد
 خطاء الصحابة و التابعین
 فی صلواتہم فی کثیر من

لہ علم تیسیر فن نجوم کے ایک خاص عمل سے متعلق ہے جس کی توضیح قاضی محمد اعلیٰ صاحب
 تھانوی نے کشاف اصطلاحات الفنون میں اس طرح کی ہے اعلم انہم یحکون دلائل
 الطالع من درجۃ الطالع والعاشر وغیرہا ای یعتبرون حوکتها فی السنة الشمسیة
 بمقدار درجۃ واحدة من المعدل ویسمون هذا العمل تیسیراً و اذا بلغ التیسیر یجد
 کوكب ما من الخمسة المتحیرة یسمی موضعه بدرجۃ القسمة (ص ۲۸۵ ج ۴۰)
 (یہ عبارت چونکہ فن نجوم کے مخصوص عمل سے متعلق ہے، ترجمہ ہونے کے بعد بھی عوام نہیں سمجھ
 سکتے۔ اس لیے ترجمہ نہیں کیا گیا۔)

الامصار وهو باطل وقد انكر
 الامام احمد الاستدلال بالمجدي
 وقال انما ورد ما بين المشرق
 والمغرب قبله - (ص ۱۱)

کہ حدیث شریف میں (صرف) مابین المشرق
 والمغرب قبلہ آیا ہے۔ یعنی مشرق و
 مغرب کی درمیانی پوری جہت قبلہ
 ہے۔

اور جن جنگلات یا نوآبادیات وغیرہ میں مساجد قدیمہ موجود نہ ہوں وہاں شرعی
 طریقہ جو سنت صحابہؓ و تابعین سے ثابت ہے یہ ہے کہ شمس و قمر اور قطب وغیرہ
 کے مشہور و معروف ذرائع سے اندازہ قائم کر کے سمت قبلہ متعین کر لی جاوے
 اگر اس میں معمولی میلان و انحراف بھی رہے تو اس کو نظر انداز کیا جاوے کیونکہ
 حسب تصریح صاحب بدائع ان بلاد بعیدہ میں تحری اور اندازہ سے قائم کردہ
 جہت ہی قائم مقام کعبہ کے ہے اور اسی پر احکام و اثر ہیں۔ جیسے شریعت نے
 نیند کو قائم مقام خروج ریح کا قرار دے کر اسی پر نقض و ضو کا حکم کر دیا، یا سفر کو
 قائم مقام مشقت کا قرار دے کر مطلقاً سفر پر رخصتیں مرتب کر دیں۔ حقیقتہً مشقت
 ہو یا نہ ہو، اسی طرح بلاد بعیدہ میں مشہور و معروف نشانات و علامات کے ذریعہ
 جو سمت قبلہ تحری و اندازہ سے قائم کی جائے گی، وہی شرعاً قائم مقام کعبہ کی ہو
 گی۔

علامہ بجز العلوم نے رسائل الارکان میں اسی مضمون کو بالفاظ ذیل بیان کیا ہے:-

والشروط وقوع المسامحة على
 حسب ما يرد المصلي ونحن
 غير ما مورين بالمسامحة على
 ما يحكم به الالات
 الرصدية و لهذا فتوا
 ان الانحراف المفسدان
 يتجاوز المشارق المغارب

اور استقبال قبلہ میں شرط و ضروری صرف یہ ہے
 کہ نمازی کی رائے اور اندازہ کے موافق کعبہ کے
 ساتھ مسامحت (محاذات) واقع ہو جاوے
 اور ہم اس کے مکلف نہیں کہ وہ درجہ مسامحت
 و محاذات کا پیدا کریں۔ جو آلات رصدیہ کے
 ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے اسی لیے عام علماء
 کا فتویٰ یہ ہے کہ انحراف مفسد (صلوٰۃ) وہ ہے

(رسائل الارکان ص ۵۳) جس میں مشرق و مغرب کا تفاوت ہو جاوے۔

(رسائل الارکان ص ۵۳)

اور بلاد ہندوستان میں سہل^{۱۵} اور احوط طریق سمت قبلہ معلوم ہونے کا یہ ہے کہ موسم گرما کے سب سے بڑے دن (یعنی ۲۲ جون) اور اسی طرح موسم سرما کے سب سے چھوٹے دن (یعنی ۲۲ دسمبر) میں غروب شمس کا موقع دیکھا جاوے۔ قبلہ ان دونوں موقعوں کے درمیان ہوگا۔ یعنی ان دونوں موقعوں کے درمیان درمیان جس نقطہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاوے گی، صحیح ہو جاوے گی۔ افادہ سیدی حکیم الامتہ التھانوی متعنا اللہ تعالیٰ ببرکاتہ نقل عن رسالۃ بغیۃ الاریب وهو الذی صرح بہ الشامی فی مواضع و ذکرہ فی البحر وغیرہ۔ سیدی حکیم الامتہ التھانوی نے (ہم کو اللہ تعالیٰ آپ کے برکات سے نفع پہنچائے)، اس کو بغیۃ الاریب سے نقل کر کے ارشاد فرمایا ہے۔ اور یہ وہی ہے جس کی علامہ شامی نے چند مواضع میں تصریح فرمائی ہے اور بحر وغیرہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

یہاں تک تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ سمت قبلہ میں آلات رصدیہ اور حسابات ریاضیہ سے کام لینا سلف کا طریقہ نہیں تھا۔ اور نہ شریعت نے اس کا امر کیا ہے۔ اور نہ کسی حال میں اس کی ضرورت ہے بلکہ طریقہ معروفہ سلف کا یہ ہے کہ جن بلاد میں مساجد قدیمہ موجود ہوں اور ان کا اتباع کیا جاوے۔ جہاں نہ ہوں وہاں مشہور و معروف ستاروں اور دوسرے آثار جلیہ سے کام لے کر اندازہ قائم کر کے بہت متعین کر لی جاوے۔ بڑی وجہ ان آلات و حسابات کے استعمال نہ

۱۵ رسائل الارکان کی مذکورہ عبارت سے نیز فتاویٰ خیر یہ کی عبارت سابقہ سے ہر دو جانب سے ۴۵، ۴۵ درجہ تک انحراف کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ اور بین المغربین کے قول پر صرف ۲۴، ۲۴ درجہ تک انحراف ہر دو جانب میں جواز معلوم ہوتا ہے۔ قول اول اوسع اور ثانی احوط ہے کما فی حاشیۃ البحر للشامی بعد نقل القولین و هذا استعجاب والاول للجواز (حاشیہ بحر ص ۲۸۵) ۱۲۔ محمد شفیع غفاعنہ۔

کرنے کی تو یہی ہے کہ یہ چیزیں اتنی عام نہیں ہیں کہ ہر شخص کو ہر جگہ میسر آسکیں دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ درجہ ان آلات و حسابات کا بھی تخمینہ و تحسری، اور اندازہ اور اٹکل سے زائد نہیں، جس طرح تحری و اندازہ میں خطا ہو سکتی ہے، ان آلات و حسابات میں بھی خطا ہو جانا ممکن بلکہ واقع ہے۔ جیسا کہ خود واقعہ مندرجہ سوال میں دو ماہرین ہیئت کے اتنے عظیم اختلاف سے ظاہر ہے کہ ایک دس درجہ مائل بجنوب قرار دیتے ہیں اور دوسرے کچھ دقیقہ مائل بشمال بتلاتے ہیں۔

اور ان دونوں حضرات کا یہ اختلاف بھی کوئی اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ اون سے پہلے ارباب تصنیف میں بھی اس قسم کے اختلافات واقع ہوئے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت دو رسالہ اس موضوع کے موجود ہیں، ایک رسالہ قلمی جناب بشیر الدین صاحب کا کوری کا ہے۔ جس کا ماخذ ایک قدیم ہندس کا رسالہ ہے، جو عہد شاہجہان میں لکھا گیا ہے۔ اس میں لکھنؤ کی سمت قبلہ کو نقطہ مغرب سے سات درجہ گیارہ دقیقہ مائل بجنوب قرار دیا ہے اور دوسرا رسالہ ضوابط سمت ہے۔ اس میں لکھنؤ کی سمت قبلہ کو نقطہ مغرب سے ۹ درجہ ۲۵ دقیقہ مائل بشمال بتلایا ہے۔ اور دونوں قواعد ریاضیہ سے استدلال کر رہے ہیں۔ الغرض جبکہ حسابات ریاضیہ اور آلات رصدیہ کا انجام وہی غلبہ ظن بامارات و علامات ہے اور احتمال خطا و صواب اوس میں بھی یکساں تو سادہ و سہل طریقہ سلف کو کیوں چھوڑا جائے۔

اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ آلات رصدیہ اور حسابات ریاضیہ سے اگر اس میں کام لے لیا جاوے تو جائز بھی ہے یا نہیں؟ اور جوہت ان حسابات کے ذریعہ متعین کی جاوے وہ شرعاً معتبر ہوگی یا نہیں؟ اس کے متعلق فیصلہ علامہ شامی کا یہ ہے کہ جس جگہ مساجد قدیمہ موجود نہ ہوں، وہاں تو باتفاق علماء ان آلات و حسابات سے کام لینا جائز ہے۔ بلکہ جس شخص کو یہ فن آتا ہو، اس کے لیے ایسے مواقع میں جہاں مساجد قدیمہ موجود نہ ہوں، ضروری ہے کہ بجائے دوسری علامات و نشانات کے ان آلات و حسابات سے کام لے کیونکہ ہر شخص تحری و تخمینہ سے

زیادہ مفید نکلن غالب ہیں۔ اور جس جگہ مساجد قدیمہ موجود ہوں وہاں آلات و حسابات کے ذریعہ سمت قبلہ نکالنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض جائز قرار دیتے ہیں۔ بعض ناجائز۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا قول عدم جواز کا اسی تحریر میں گزر چکا ہے۔

نہر الفائق (نام کتاب) میں بیان کیا ہے کہ ایک جماعت کے نزدیک دلائل نجوم معتبر ہیں۔ اور دوسروں کے نزدیک معتبر نہیں۔ اسی (عدم اعتبار) پر عام متون ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے متون میں ایسی کوئی عبارت نہیں دیکھی جس سے دلائل نجوم کے عدم اعتبار پر دلالت ہو۔ ہمارے لیے یہ جائز ہے کہ ہم نجوم سے وہ چیزیں حاصل کریں جن سے قبلہ کی رہنمائی ہو۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ستاروں کو پیدا کیا تاکہ اون کے ذریعہ سے ہدایت پاؤ۔ اس کے علاوہ یہ ہے کہ جس قدر دنیا کی محرابیں ہیں۔ یہاں تک کہ منیٰ کی بھی، وہ سب بذریعہ اجتناد و تحری رکھی گئی ہیں۔ جیسا کہ بحر الائق میں نقل کیا ہے۔ یہ امر پوشیدہ نہیں کہ اجتناد و تحری کے لیے امارات و علامات والہ میں سب سے زیادہ قوی اور ظاہر وہ ستارے ہیں جن سے سمتوں پر استدلال کیا جاتا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ علامات اور نجوم سے استدلال میں خلاف اس

افاد فی النہر ان دلائل النجوم معتبرة عند قوم وعند آخرین لیست معتبرة قال وعلیہ اطلاق عامۃ المتون اھ۔ اقول لمار فی المتون ما یدل علی عدم اعتبارھا و لنا تعلم ما نہتدی بہ علی القبلة من النجوم وقال تعالیٰ والنجوم لتہتدوا بما علی ان محاریب الدنیا کلھا نصبت بالتحری حتی منیٰ کما نقلہ فی البحر ولا یخفی ان اقوی الادلة النجوم والظاہر ان الخلاف فی عدم اعتبارھا انما هو عند وجود المحاریب القدیمۃ اذ لا یجوز التحری معھا کما

صورت میں ہے جبکہ محاریب قدیمہ موجود ہوں۔
 کیونکہ اون کے ہوتے ہوئے تحری و تخمینہ لگانے
 کی اجازت نہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے بیان
 کیا ہے تاکہ اس سے سلف صالحین و جمہور
 مسلمین کا تخطیہ لازم نہ آئے۔ بخلاف جنگل و میدان
 کے کہ اوس میں نجوم وغیرہ کا اعتبار حسب تصریح
 علمائے حنفیہ وغیر حنفیہ واجب ہے لہذا ایسے
 مواقع میں جہاں مساجد قدیمہ موجود نہ ہوں اوقات
 صلوة و قبلہ میں اوس تحقیق پر اعتماد کرنا چاہیے
 جو کتب مواقیت میں قابل اعتماد علماء نے
 ذکر کی ہے نیز ایسے جنگلات وغیرہ میں اون
 قواعد پر بھی اعتماد چاہیے جو علماء نے زیچ و
 اصطلاب وغیرہ آلات رسد یہ کے وضع و
 مقرر کیے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ یقین کا فائدہ نہ
 دے سکیں تو اُس فن کے جاننے والے کے
 لیے غلبہ ظن کو تو ضرور مفید ہوں گے۔ اور اس
 میں غلبہ ظن کافی ہے۔

(شامی ص ۲۸۹ طبع ہند)

فتاویٰ خیر یہ میں اس قول کے بعد کہ فلکی مذکور
 کے قول پر عمل جائز نہیں (یہ بیان کیا ہے)
 خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے حنفیہ
 کا مذہب یہ ہے کہ محاریب مذکور پر عمل
 کیا جائے گا۔ طعن مذکور کا کوئی اعتبار نہ ہوگا

تقدمناہ اشلا يلزم
 تخطئة السلف الصالح
 وجماهير المسلمين بخلاف
 ما اذا كان في المفازة
 فينبغي وجوب اعتبار
 النجوم ونحوها في
 المفازة لتصريح علماءنا
 وغيرهم لكونها علامة
 معتبرة فينبغي الاعتماد
 في اوقات الصلوة و في
 القبلة على ما ذكره
 العلماء الثقات في كتب
 المواقيت وعلى ما وضعوه
 لها من الألات كالزيج
 والاصطلاب فانها ان لم
 تفد اليقين تفيد غلبة
 الظن للعالم بها وغلبة

الظن كان في ذلك (شامی ص ۲۸۹ طبع ہند)

وفي الفتاوى الخيرية بعد قوله
 ولا يجوز العمل بقول الفلكي
 المذكور والحاصل ان المسئلة
 خلافية فمذهب الحنفية
 يعمل بالمحاريب المذكورة

ولا ياتفت للطن المذكور ومذ
 الشافعية يلتفت اليه ويعمل
 به اذا كان من عالم بصير
 ثقة ولاخفاء ان مذهبنا سمح
 سهل حنيفي ميسر غير معسر
 فان الطاعة بحسب الطاقة
 وفي تعيين عين الكعبة حرج
 وهو مرفوع عنا بالنص
 الشریف (ج - ۱ ص ۷)

اور شافعیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر وہ کسی
 عالم ماہر ثقہ کی طرف سے ہو تو اس کی طرف اتقا
 اور اس کے قول پر عمل کیا جائے اور اس میں شبہ
 نہیں کہ ہمارا (حنفیہ کا) مذہب نرم و سہل و صاف
 ہے جس میں کچھ دشواری نہیں کیونکہ طاعت
 بقدر طاقت ہے۔ اور عین قبلہ کی تعیین میں
 حرج ہے۔ جو کہ بتصریح شارع علیہ السلام
 ہم سے دور کیا گیا۔

(ج - ۱ ص ۷)

هذا اخر ما اردت جمعه في هذه العجالة لعل الله تعالى ينفع بها المسلمين
 ويحجبهم عن طرق التعمق والتكلف في امور الدين. والله سبحانه وتعالى اعلم بالصواب
 واليه المرجع في كل باب.

کتبہ الاحقر محمد شفیق عفا اللہ عنہ۔ فی ثمان ساعات من تالیشریع الثانی سن۱۳۶ھ



بعد الحمد والصلوة میں نے اس فتوے کو دیکھا مسئلہ زیر بحث میں کافی دوامی
 پایا۔ جس سے میں حرفاً حرفاً متفق ہوں اور سہولت تعبیر کے لیے اس کو تنقیح المقال
 فی تصحیح الاستقبال سے مطب کرتا ہوں۔

کتبہ اشرف علی عفی عنہ۔ ۴ ربیع الثانی ۱۳۶ھ

الجواب حق

محمد حسن مدرس مدرسہ نعمانیہ امرتسر

الجواب صواب

احقر محمد طیب غفرلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

مُلَخَّصٌ تَحْرِیرِ جَنَابِ حَافِظِ مَوْلَانَا مَوْلَوِی زَکَرِیَّا مُحَمَّدٌ صَادِقُ عَسْثَمَانِی

تَھَاوِی زَیْدٌ مَجْدِہِمُ پَرِوِزِی (عَرَبِی) دُھَاکِہِ نَوِیوِی (بَنگَال)



بعد الحمد والصلوة آوارہ ناکارہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ عرض کرتا ہے کہ اس ناچیز نے رسالہ تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال مولفہ مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی دام فیضہ کا مطالعہ کیا۔ میں اس تحقیق سے لفظ بلفظ متفق ہوں۔ اللہ تعالیٰ مولف فاضل کو جزائے خیر عطا فرمائیں اور ان کے فیض ظاہری و باطنی کو عام و تمام بنائیں۔ آمین۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

حررہ الاحقر الافقر۔ ظفر احمد عفا عنہ تھاوی۔ ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ۔



تَصَدِیقِ قَوِیِّ مَذْکُورِ اَزْ جَنَابِ مَوْلَانَا خَیْرِ مَجْدِہِمُ زَیْدٌ مَجْدِہِمُ

مُنْفَتِحِ مَدْرَسَةِ خَیْرِ الْمَدَارِسِ جَالِدِہِ شَہْرِ

۷۸۶

بعد الحمد والصلوة۔ احقر بعنایت سراپا اخلاص و محبت حضرت وصل صاب بگرامی زید مجدہم مجموعہ رسالہ تحقیق سمت قبلۃ البلاد، بسعی رئیس جہانگیر آباد کے مطالعہ سے مشرف ہوا۔ جس میں اکابر علمائے کرام متعنا اللہ بطول بقائہم نے مسئلہ سمت قبلہ کو ایسی تحقیقات و تنقیحات سے واضح فرمادیا ہے کہ اس کا کوئی شرعی پہلو تشنہ تحقیق مزید نہیں رہا۔ حق تعالیٰ حضرات موصوفین کے افاضہ و افادہ کو ہمیشہ جاری رکھتے ہوئے عامہ مسلمین کو استفادہ و استفادہ کی توفیق عطا فرمائیں۔ اور حضرات

محرکین و ساعین کو جزائے وارین سے مالا مال کریں۔

خادم الطلبة

خیر محمد عفی عنہ جالندھری مفتی مدرسہ خیر المدارس جالندھر شہر ۲۲/ بیح الثانی ۱۳۶۰ھ

ملخص تحریر جناب الحاج مولانا مولوی محمد یوسف صاحب بنوری زید مجدّم مدرس ڈابھیل (سورت) مؤلف کتاب بغیۃ الاریب فی مسائل القبۃ و الماریت

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، اما بعد استفتائے سمت قبلہ
جہانگیر آباد اور اس کے جوابات سے محفوظ اور مستفید ہوا۔ اصل مسئلہ بہت صاف
اور منقح ہے، زیادہ تفصیل کی اب کوئی حاجت نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔
محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ

از

ڈابھیل (ضلع سورت) ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ

ضَمِيمَةٌ سَالَةٌ

مِنْتَقِحِ الْمَقَالِ فِي مَبْرِحِ الْأَسْتِقْبَالِ

ایک مفید اور مزید توضیح حضرت مؤلف کی لکھی ہوئی جس کا عنوان ہے

سَمَرَاتِ قِبْلَةٍ أَوْرِ اسْتِقْبَالِ قِبْلَةٍ

میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہؓ کا طرز عمل

(جو رسالہ مرقومہ بالا کے صفحہ ۲۹ سطر ۱۴ کے بعد سے متعلق ہے جو مجھے اصل رسالہ کے وصول ہونے کے بہت بعد حاصل ہوئی۔ وصل)

(۱) اس پر اتفاق ہے کہ مسجد بیت اللہ کے بعد سب سے پہلی مسجد جو اسلام میں بنائی گئی وہ مسجد قبا ہے (قبا مدینہ طیبہ سے چند میل کے فاصلہ پر ایک مشہور مقام کا نام ہے) اس مسجد کی بنیاد تو اس وقت پڑی تھی جبکہ مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ پھر جب تحویل قبلہ کی آیت نازل ہوئی تو اس کی خبر لے کر ایک روز قبا میں ایک صحابی ایسے وقت پہنچے کہ اس مسجد میں نماز ہو رہی تھی۔ یہ خبر سنتے ہی امام اور پوری جماعت بیت اللہ کی سمت پھر گئی۔ یہ واقعہ عام کتب تفسیر و حدیث میں منقول ہے اور اس واقعہ کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپ نے ان لوگوں کے اس فعل کی تصویب فرمائی۔

ظاہر ہے کہ حالت نماز میں جو سمت قبلہ اہل قبائے اختیار کی، نہ اُس میں آلاتِ رصدیہ اور اصطلاب کا دخل ہو سکتا ہے نہ کسی قطب نما اور ستارہ کا، محض تخمینہ و تخری سے سمت قائم کی گئی۔ پھر نماز کے بعد بھی کہیں منقول نہیں کہ اس تخری و تخمینہ کے سوا کوئی دوسرا انتظام و اہتمام یا حسابات ریاضیہ کا استعمال استخراج سمت قبلہ کے لیے کیا گیا ہو۔

(۲) حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں تمام اسلامی قلمرو میں ہر صوبہ کے عامل کے نام فرمان بھیجے کہ ہر محلہ میں مسجد بنائی جاوے۔ عمال حکومت نے حکم کی تعمیل کی۔ مگر سمت قبلہ قائم کرنے کے لیے نہ تو حضرت فاروق ہی نے کوئی انتظام آلاتِ رصدیہ اور حسابات ریاضیہ کا کیا اور نہ عمال حکومت نے بلکہ تخمینہ و تخری سے سمت قبلہ متعین کر کے مسجدیں تعمیر کی گئیں۔

(۳) آلات و حسابات سے نکالی ہوئی سمت قبلہ میں بھی اکثر اہل فن کا اختلاف رہتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ طول بلد اور عرض بلد کے معلوم کرنے میں ذرا سا فرق رہ گیا تو سمت کہیں سے کہیں پھونچ جاتی ہے۔

لطیفہ عجیبہ۔ علماء کا اتفاق ہے کہ دنیا کی تمام مساجد تخری و تخمینہ سے قائم کی گئی ہیں۔ لیکن مسجد نبویؐ کی سمت قبلہ بطور وحی و مکاشفہ قائم کی گئی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیت اللہ کو بطور معجزہ سامنے کر دیا تھا۔ اوس کو دیکھ کر آپ نے مسجد مدینہ کی سمت قبلہ قائم فرمائی (کذا فی البحر الرائق و رد المحتار) اس لیے باجماع امت مسجد نبویؐ کی سمت قبلہ بالکل یقینی ہے۔ لیکن حسابات ریاضیہ سے جانچا گیا تو وہ بھی صحیح نہیں اترتی۔ چنانچہ امیر مصر ابن طولون نے جب مصر میں اپنی جامع مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو چند ماہرین ہندسہ کو مدینہ طیبہ بھیج کر پہلے مسجد نبویؐ کی سمت قبلہ کو آلاتِ رصدیہ کے ذریعہ جانچا تو معلوم ہوا کہ آلات کے ذریعہ نکالے ہوئے خط سمت قبلہ سے مسجد نبویؐ کی سمت دس درجہ مائل بجنوب ہے۔ جیسا کہ مقریزی نے کتاب المحطط میں بالفاظ ذیل

ذکر کیا ہے:-

ان احمد بن طولون لما عزم ببناء هذا المسجد بعث الى محراب مدينة رسول الله صلى الله عليه وسلم من اخذ سمت فاذا هو مائل عن خط سمت القبلة المستخرج بالصناعة نحو عشر درج الى جهة الجنوب (خط ص ۲۵۶)

احمد بن طولون نے جب اپنی جامع مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو چند اہل فن کو مدینہ طیبہ بھیج کر مسجد نبویؐ کی سمت قبلہ بذریعہ آلات رصدیہ نکلوائی دیکھا تو وہ حسابات کے ذریعہ نکالے ہوئے سمت قبلہ سے دس درجہ مائل بجنوب ہے۔ (خط طبع ۲۰-۲۵۶)

اب وہ لوگ جو آلات رصدیہ پر سمت قبلہ کا مدار رکھنا چاہتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں وہ دیکھیں کہ ان کی تجویز پر تو مسجد نبویؐ کی سمت قبلہ بھی درست نہیں ہوتی معلوم نہیں کہ عنایت اللہ مشرقی جو ہندوستانی مسجدوں میں انھیں حسابات کی بناء پر نماز ناجائز قرار دیتے ہیں وہ مسجد نبویؐ کے متعلق کیا فتویٰ صادر فرمائیں گے، مشرقی کچھ کہیں، مذکورہ صدر تعامل مسلمانوں کے اطمینان کے لیے انشاء اللہ کافی و دانی ہے۔ والحمد للہ اولہ و آخرہ۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ۔

مشرقی اور سمت قبلہ

۱۰

(مولانا محمد ظفر الدین صاحب قاضی رضوی استاد مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ)

علمی حلقہ میں جناب عنایت اللہ صاحب مشرقی کا تعارف سب سے پہلے ان کی تصنیف ”تذکرہ“ کے ذریعہ سے ہوا تھا، اب ان کی تحریک خاکساریت نے ان کی شہرت عام کر دی ہے۔ وہ یورپ کی درجنوں ڈگریوں کے مالک اور مختلف فنون میں علم و کمال کے مدعی ہیں، اسے دیکھ کر یہ خیال تھا کہ مذہب کے متعلق ان کے معلومات و خیالات کیسے ہی ناقص و غلط ہوں۔ لیکن جدید علوم سے ضرور ان کو واقفیت ہوگی، لیکن ان کے بعض علمی مضامین کو دیکھ کر یہ حسن ظن بھی غلط ثابت ہوا۔ عرصہ ہوا انھوں نے علم ہیئت کی رو سے ہندوستان کی مسجدوں کی سمت قبلہ کے غلط ہونے پر ایک مضمون لکھا تھا، اس کے علاوہ ”مولویوں کی جہالت“ کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً جن علمائے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید علوم میں بھی ان کا پایہ مذہبی علوم سے کم نہیں ہے۔ اس مضمون میں ریاضی و ہیئت اور تاریخ علوم میں ان کے علمی کمالات پر تبصرہ مقصود ہے۔ مولویوں کی جہالت کے سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں:-

”آپ کی بلا جانتی ہے کہ مکہ کا رخ دریافت کرنا کسے کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے، جغرافیہ کس بیل کا نام ہے، علم نجوم کسے کہتے ہیں، دُور بین کیا ہوتی ہے، خط سرطان کس مرض کو کہتے ہیں، آپ صرف اپنی رات کی باسی روٹیاں گن کر بیچنا نہیں جانتے اور اگر روٹیاں نیا وہ ہوں اور آنے پورے نہ بیچیں تو حساب میں گھنٹوں غلطی نہیں کرتے، بلکہ انوں کو اور“

روٹیوں پر بٹھالیتے ہیں، آپ کو اس کا پتہ ہے کہ مغرب اور شمال کے دو طرفوں کے درمیان خود مسلمانوں ہی نے ۹۰ درجہ قائم کیے تھے۔ ہر درجہ کو ساٹھ دقیقہ (منٹ)، اور دقیقہ کو ساٹھ ثانیوں (سیکنڈ) میں تقسیم کیا تھا۔

مشرقی صاحب کی ریاضی و اقیسیت کا نمونہ | مشرقی صاحب کو اس دعوائے ہمہ دانی کے باوجود یہ بھی

نہیں معلوم کہ مسلمانوں سے بہت پہلے یونانیوں نے اس فن کو مرتب کیا تھا۔ بطليموس کی کتاب ”مجسطی“ اس فن میں معروف و مشہور ہے، اس بارہ میں آپ بھی اور ملاؤں کے نقش قدم پر نکلے، مغرب اور شمال کے دو طرفوں کے درمیان تخصیص بھی عجیب ہے، کیا مغرب اور جنوب کے دو طرفوں کے درمیان ۹۰ سے کم یا زیادہ درجے قائم کیے تھے۔ یا اس کے درجوں کو ساٹھ دقیقوں سے کم و بیش پر تقسیم کیا تھا اور پھر ان دقیقوں کی ساٹھ ثانیہ (سیکنڈوں) سے کم و بیش پر قسمت کی تھی۔ علیٰ بن ابی القیس نقلہ شمال و مشرق کے دو طرفوں اور نقطہ مشرق و جنوب کے دو طرفوں کو کے درجوں اور ان درجوں کو کتنے دقیقہ و ثانیہ پر تقسیم کیا۔ جب اس فن میں ہر دائرہ ۳۶۰ درجہ پر منقسم ہے تو ہر ربع ۹۰ درجہ کا ہوا، خواہ وہ نقطہ مغرب و شمال کے درمیان ہو یا نقطہ شمال و مشرق کے درمیان نقطہ مشرق و جنوب کے درمیان ہو یا نقطہ جنوب و مغرب کے درمیان کسی دو نقطوں کے درمیان جس کا فصل ربع دور ہو لا محالہ ۹۰ درجہ ہو گا۔ اور ہر درجہ ۶۰ دقیقہ اور ہر دقیقہ ۶۰ ثانیہ اور ہر ثانیہ ۶۰ ثالثہ اور ہر ثالثہ ۶۰ رابعہ اور ہر رابعہ ۶۰ خامسہ اور ہر خامسہ ۶۰ سادسہ اور ہر سادسہ ۶۰ سابعہ اور ہر سابعہ ۶۰ ثامنہ اور ہر ثامنہ ۶۰ ناسعہ اور ہر ناسعہ ۶۰ عاشرہ پر منقسم ہوتا ہے۔ اس لیے یہ تخفیس بالکل غلط اور بے معنی ہے۔ ایک اور نا در تحقیق :- مشرقی صاحب فرماتے ہیں :-

”مغرب اور شمال کی دو سمتوں میں تین لاکھ چوبیس ہزار مختلف طریق مسلمانوں

نے خود اسی قرآن کی تعلیم کو صحیح سمجھ کر قائم کی تھیں۔

کیا فن کا حساب ثانیہ ہی تک محدود ہے جو تین لاکھ چوبیس ہزار سمتیں ہوں گی۔ اس کا حساب تو درحقیقت عاشرہ سے بھی متجاوز ہے۔ اگر عاشرہ ہی تک مانا جائے جب بھی ہر ربع کی دو سمتوں میں پندرہ سیکھ ستائیس پدم چھبیس نیل چونسٹھ کھرب مختلف سمتیں متعین ہوتی ہیں، ایسی حالت میں ان کو صرف تین لاکھ چوبیس ہزار سمتیں بتانا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ میں مشرقی صاحب کی اس خوش اعتقادی کی ضرور تعریف کروں گا کہ قرآن شریف خواہ پڑھتے ہوں یا نہ پڑھتے ہوں اور سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں مگر زبان پر دعویٰ قرآن شریف ہی کا ہے، ربع دائرہ کو ۹۰ حصہ اور ہر حصہ کو ۶۰ دقیقہ اور ہر دقیقہ کو ۶۰ ثانیہ پر تقسیم کو قرآن شریف کی صحیح تعلیم کا نتیجہ بتانا بھی عجیب دعویٰ ہے۔ کاش مشرقی صاحب نے ان آیتوں کو بھی تحریر فرما دیا ہوتا جن سے مسلمانوں نے یہ حساب قائم کیے کہ اس سے اوروں کو بھی فائدہ پہنچتا۔ آپ کے نزدیک گویا قرآن شریف فقہ و مسائل دینی کی بجائے ہندسہ و ہیئت کی تعلیم کی کتاب ہے۔ اسی لیے فقہی مسائل جو قرآن شریف سے مستنبط ہوئے ہیں وہ ان کے نزدیک مولوی اور ملا کا بتایا ہوا دین ہے اور ہیئت و ہندسہ کے مسائل قرآن کی تعلیم ہیں۔ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ اس چہ بوا لعجبی است

ایک دعویٰ میں چار غلطیاں | آپ نے اپنے ایک دعوے میں چار غلطیاں کیں (۱) شمال مغرب کے دو طرفوں میں ۹۰ درجہ مسلمانوں کا قائم کرنا۔ (۲) مغرب و شمال دو سمتوں کی تخصیص۔ (۳) ان دو سمتوں کے درمیان تین لاکھ چوبیس ہزار سمت بتانا۔ (۴) اس تقسیم کو قرآن کی تعلیم کا نتیجہ ظاہر کرنا۔ ایک اور غلطی | پھر کہتے ہیں:-

”اسی مغرب اور شمال کی سمتوں کے درمیان صرف ایک درجہ ۱/۴ حصہ پھر

جانے سے دو ہزار تین سو میل کی دوری پر پورے چالیس میل کا فرق پڑ

جاتا ہے۔

یہاں بھی مغرب و شمال کی تخصیص بے معنی ہے، جن لوگوں کا سمت قبلہ منحرف
بجنوب ہے، ان میں جو لوگ مکہ معظمہ سے دو ہزار تین سو میل کی دوری پر ہیں۔ وہ
اگر ایک درجہ صحیح سمت سے پھر جائیں تو کیا ان لوگوں کو چالیس میل کا فرق نہ پڑے
گا۔ اسی طرح جو لوگ مکہ معظمہ سے پچھم ہیں اور ان کا سمت قبلہ نقطہ مشرق سے منحرف
بہ شمال یا جنوب ہے وہ اگر دو ہزار تین سو میل کی دوری پر ہوں اور سمت قبلہ سے
ایک درجہ پھر جائیں تو ان لوگوں کو بھی صحیح سمت سے چالیس میل کا فرق ہوگا یا نہیں؟
اگر نہیں تو وجہ فرق کیا ہے، اور اگر ہوگا تو یہ تخصیص غلط ہے اور بے معنی ہوئی۔ پھر
مکہ معظمہ سے لاہور کا فصل دو ہزار تین سو میل بتانا بھی صحیح نہیں اس لیے کہ فصل طول
ت ٹو ہے۔ اگر بالفرض اسے صحیح مان لیا جائے جب بھی ایک درجہ پر چالیس میل
کا فرق بتانا غلط ہے، ورنہ ۶۰ درجہ کے زاویہ پر جہاں مثلث متساوی الاضلاع ہوتا
ہے اور شکل ترسی نمودار ہوتی ہے جس جگہ کرہ عالم پر کھڑے ہونے والے دو متساوی
القد انسانوں کے سروں کا فاصلہ قدموں کے فاصلہ سے بقدر ایک قامت زائد
ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس شکل سے ظاہر ہے) و تراسی قدر ہونا
چاہیے۔ حالانکہ اس حساب سے و تر دو ہزار چار سو میل ہوتا
ہے۔



مکہ سے سورت کی سمت کی تعیین میں غلطی فرماتے ہیں:-

مکہ معظمہ سے سورت جہاں عرب پہلی صدی میں سب سے پہلے اترے

تھے، ٹھیک مشرق کی طرف تھا۔

یہ بھی محض رجماً بالغیب اور بالکل غلط، مکہ معظمہ کا ۲۱ درجہ ۴۰ دقیقہ ہے اور
سورت کا عرض کا ۲۱ درجہ ۱۲ دقیقہ ہے الخ ۲۸ دقیقہ کا فرق ہے اور مکہ معظمہ کا
طول م ل ح یعنی ۴۰ درجہ ۱۳ دقیقہ اور سورت کا ع ۵ یعنی ۴۳ درجہ ۵ دقیقہ ہے۔ مابین
الطولین ل ن ق اس حساب سے دونوں شہروں میں شرقی غربی فرق دو ہزار

ایک سو ستاسی میل ہوا۔ اتنی دوری پر ۲۸ دقیقہ یعنی تقریباً نصف درجہ فرق ہونے سے مشرقی صاحب ہی کے حساب سے سمت قبلہ میں ۱۹ میل کا فرق ہو جائے گا۔ پھر ٹھیک مشرق کہاں ہوا کہ سمت قبلہ ان کے خیال کے مطابق ٹھیک نقطہ مغرب ہو۔

تاریخی غلطی | مشرقی صاحب فرماتے ہیں کہ:-

”عرب جیسی جاہل اور اُجڑ قوم چند برسوں کے اندر اندر دو ہزار میل دور مقام کی صحیح سمت دریافت کر سکی، حالانکہ اس وقت جغرافیہ کا نام و نشان موجود نہ تھا۔ اور نہ سطح زمین پر طول بلد و عرض بلد کے خطوط کوئی متنفس جانتا تھا۔“

بے خبری بھی کیا چیز ہے، اس کے طفیل میں انسان جو جی میں آٹے کہہ دے کوئی ذمہ داری نہیں، پڑھا لکھا آدمی ایسی بات لکھنی درکنار اسے بولتے، بلکہ تصور کرتے شرمائے گا۔

علم جغرافیہ کب وجود میں آیا؟ موجد کون ہے؟ طول بلد، عرض بلد کے خطوط اسلام سے کتنے پہلے کھینچے گئے؟ ان کے لیے کشف الظنون اور دائرة المعارف دیکھیے صاحب کشف الظنون علم جغرافیہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:-

هو علم يعرف منه احوال الاقاليم
السبعة الواقعة في الربع المسكون
من كورة الارض و عرض البلدان
الواقعة فيها و اطوالها و عدد
مدنها و جبالها و براريها و
بحورها و انهارها الى ذلك
من احوال الربع و اول من
صنف فيه بطليموس الفلوزي
علم جغرافیہ وہ علم ہے جس کے ذریعہ کرۃ
ارض کے ربح مسکون کی ساتوں اقلیموں کے
حالات اور ان کی آبادیوں کے عرض البلد
اور طول البلد ان کے شہروں، ان کے
پہاڑوں، ان کی خشکی، ان کے دریاؤں ان
کی نہروں وغیرہ ربح مسکون کے حالات
معلوم ہوتے ہیں۔ اس فن میں سب سے پہلے
بطليموس فلوزی نے تصنیف کی۔ نسطلی کے

فان صنف کتابہ المعروف بعد اس نے اس فن پر ایک کتاب لکھی۔
 بجغرافیا ایضاً بعد ما صنف جو جغرافیہ کے نام سے مشہور ہے۔
 المجسطی۔

اس سے معلوم ہوا کہ فن جغرافیہ پر جس میں طول و عرض بلد وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے، سب سے پہلے بطلمیوس نے کتاب لکھی جس کا زمانہ دوسری صدی عیسوی ہے۔ دائرۃ المعارف میں ہے:-

بطلمیوس کلودیوس ریاضی فلکی بطلمیوس کلودیوس، عالم ریاضی فلکی جغرافی
 یونانی مصری دوسری صدی عیسوی میں یونانی یونانی یقال انہ ولد
 فی بیلوسوم و نشأ فی الاسکندریۃ فی قرن الثانی المیلاد۔
 نشوونما حاصل کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ بطلمیوس دوسری صدی عیسوی میں پیدا ہوا۔ جبکہ مشرقی صاب کے خیال کے مطابق جغرافیہ کا نام و نشان نہ تھا اور سطح زمین پر طول بلد عرض بلد کا کوئی جاننے والا نہ تھا۔

رباعیوں کا صحیح سمت دریافت کر لینا، اگر درحقیقت سورت کی مسجدیں عربوں کی بنائی ہوئی ہیں یا اسی بنیاد پر ہیں اور بالکل صحیح سمت قبلہ کی طرف ہیں تو محض نور اسلام کی وجہ سے ہے ورنہ اگر ٹھیک نقطہ مغرب کو ہیں تو ان کے قاعدہ سے ۱۹ میل خانہ کعبہ سے منحرف ہیں۔

سمت قبلہ کی تعیین کا مشہور طریقہ | آگے چل کر مشرقی صاحب فرماتے ہیں:-

”میں نے ایک شخص کو لاہور کے ملاؤں اور معماروں کے پاس بھیجا کہ وہ مسجد بناتے وقت قبلہ کا رخ کیونکر مقرر کرتے ہیں۔ ایک بڑی عمر کے جاہل نے کہا۔ واہ جی یہ تو بہت آسان ہے۔ قطب تارے کی طرف ہاتھ پھیلا کر اور کندھے کی طرف دیکھ کر کھڑے ہو گئے تو ناک کی سیدھ میں قبلہ ہے۔ خیر میں سمجھ گیا کہ ملا کی نجوم دانی کس قدر بے خطا ہے۔ اور

اس کا مطلب یہی ہے جو آپ کہتے ہیں کہ شمالی ہندوستان کا قبلہ مغرب
ہی کی طرف ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ مشرقی صاحب کی ساری پرواز اور ہندوستان کی مسجدوں
کے سمت قبلہ سے انحراف کی ساری عمارت ادھنوں نے کسی ملا کے بیان پر قائم
کی ہے اور اسے غایت دیانت سے تمام مولویوں کی جہالت کے سر منڈھ دیا ہے
لیکن افسوس ہے کہ وہ اُس ملا یا اُس جاہل معمار کی موٹی بات کو بھی نہ سمجھ سکے۔ اگر
وہ اس کے الفاظ پر غور فرماتے تو آسانی سے سمجھ میں آجاتا کہ ہندوستان کے
شہروں کی سمت قبلہ تین طرح کی ہے۔ بعض کا قبلہ ٹھیک نقطہ مغرب بلا انحراف
نقطہ شمال یا جنوب ہے اور بعض کا منحرف شمال، اور بعض کا منحرف بجنوب، اور
ان سب کی پہچان قطب تارہ ہے۔ جہاں کا قبلہ ٹھیک نقطہ مغرب ہے۔ وہاں
مرکز قطب کو مونڈھے کی بڈی کے مرکز کے سیدھ میں رکھنا ہوتا ہے اور جس جگہ کا
قبلہ منحرف شمال ہے، وہاں قطب تارے کو مونڈھے کے اگلے حصہ کی طرف کرنا ہوتا
ہے اور جہاں کا قبلہ منحرف بجنوب ہو وہاں قطب تارے کو مونڈھے کی پشت پر رکھنا
ہوتا ہے مگر جسے اس کا علم ہی نہ ہو اور اس تفصیل سے ناواقف ہو تو وہ لا محالہ اپنی
جہالت کا الزام دوسرے کے سر تھوپے گا۔

امام رازی کا طریق تعیین سمت قبلہ | امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں۔

چونکہ مسئلہ دلائل قبلہ کے بیان میں ہے۔
دلائل قبلہ تین قسم کے ہیں۔ ارضی، ہوائی،
سماوی۔ ارضی اور ہوائی کا کوئی قاعدہ کلیہ
نہیں ہے۔ سماوی دلیلیں دو قسم کی ہیں۔
تقریبی۔ تحقیقی۔ تقریبی بھی دو طرح کی ہیں۔
نہاری اور لیلی۔ نہاری تو آفتاب ہے اور
لیلی یہ ہے کہ سمت قبلہ پر اس کو کب سے

المسئلة الرابعة في دلائل القبلة اعلم
ان الدلائل اما ارضية او هوائية
او سماوية اما الارضية والهوائية
فهي غير مضبوطة ضبطا كلياً اما
السماوية فادلتها منها تقريبية و
منها تحقيقية اما التقريبية فقد
قالوا هذه الادلة اما ان تكون

نہاریۃ اولیلیۃ اما نہاریۃ فالشمس
 واما الیلیۃ فہوان یستدل علی القبلة
 بالکوکب الذی یقال لہ المجدی فانہ
 کوکب کالثابت لاتظہر حرکتہ من
 موضعه واما الطریقۃ الیقینیۃ وہی
 الوجہ المذکورۃ فی کتب الہیئۃ۔
 ۵۱۔ مختصراً۔

استدلال کیا جائے جسے جدی الفرقد
 کہتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ کوکب اگرچہ
 حرکت کرتا ہے مگر اتنی کم کہ بمنزلہ ثابت
 کے ہے۔ اس کی حرکت ظاہر نہیں
 ہوتی۔ اور تحقیقی دلائل وہ وہ ہیں جو
 ہیئت کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ۱۷
 مختصراً۔

نجوم اور ہیئت کیا ایک ہیں | اس سے معلوم ہوا کہ کوکب جدی الفرقد یعنی قطب
 تارہ سے استدلال صرف لاہور کے بڑی عمر
 کے جاہل کی جدت نہیں بلکہ اکابر علماء کرام امام فخر الدین رازی جیسے مشہور و مستند
 عالم دینی کی تحقیق ہے۔ بالفرض اگر جاہل تارہ کا یہ جواب غلط بھی مان لیا جائے تو اس
 سے اس کی نجوم دانی سے ناواقفیت کا حکم کس طرح مشرقی صاحب نے لگا دیا۔ کیا
 ان کے نزدیک علم ہیئت اور نجوم دونوں ایک چیزیں ہیں کہ ایک کی ناواقفیت سے
 دوسرے کی ناواقفیت لازم آتی ہے، حالانکہ اتنا تو سب پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ
 علم ہیئت افلاک کی حرکات اور کوکب کے اوضاع و اطوار سے بحث کرتا ہے
 اور علم نجوم میں ان اوضاع و حرکات کے آثار سے بحث ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر
 ہوتا ہے کہ مشرقی صاحب علم ہیئت و نجوم کے فرق سے بھی واقف نہیں پھر اس
 غلط جواب سے یہ نتیجہ کہاں سے نکلا کہ شمالی ہندوستان کا قبلہ مغرب ہی کی
 طرف ہے؟

ایک ملا کے نہ جاننے سے تمام شمالی ہندوستان کا قبلہ مغرب کی سمت کس
 طرح ہو گیا۔ کیا شمالی ہندوستان کی تمام مسجدیں آپ کے بڑی عمر والے جاہل ہی
 کی رائے اور نقشہ سے بنی ہیں؟

بے بنیاد دعویٰ | اس کے بعد آپ کے قیمتی افادات یہ ہیں:-

”نقشہ کے موٹے خط ارب سے معلوم ہوگا کہ لاہور کی مسجدوں کا رخ صحیح رخ سے قریباً ۲۵ درجہ جنوب کی طرف ہٹا ہے، ایک درجہ کا فرق دو ہزار تین سو میل، پر میں نے ابھی چالیس میل بتایا ہے تو اس حساب سے ۲۵ درجوں کا فرق ۲۵×۴۰ یعنی ایک ہزار میل ٹھہرا۔“

یہ دونوں باتیں بالکل غلط ہیں۔ اگر یہ بیان صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے کہ لاہور کی تمام مسجدیں نقطہ مغرب کو ہیں، حالانکہ نقطہ مغرب سے منحرف بجنوب ہونا چاہیے، تو لاہور کی مسجدوں کا رخ صحیح رخ سے جتنے درجے بھی ہو شمال کو ہٹا ہوگا، نہ جنوب کو۔ پھر اسے ۲۵ درجہ جنوب کو ہٹا ہوا بتانا بھی غلط ہے۔ لیکن اگر اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بیت المقدس کی سمت میں نہ ہوں گی بلکہ اوس شہر کی سمت میں ہوں گی جو لاہور سے جنوب کی طرف واقع ہوگا۔

ایک ہزار میل کا فرق بتانا بھی غلط اور بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔ لاہور کی مسجدوں کا رخ اگر ٹھیک نقطہ مغرب مان لیا جائے، تب بھی مشرقی صاحب کے اصول کے مطابق جو صرف عرض البلد کا اعتبار کرتے ہیں اور اسی بنا پر وہ ہندوستان میں سورت، ناگپور، کٹک وغیرہ کا قبلہ جو ان کے خیال میں عرض البلد مکہ معظمہ پر واقع ہیں، نقطہ مغرب صحیح خیال کرتے ہیں، بالکل غلط ہے، سمت قبلہ جاننے کے لیے صرف عرض البلد کافی نہیں، اس کے ساتھ طول البلد کا معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔ کہ طول البلد سے عرض موقع معلوم ہوتا ہے۔ جس سے سمت اطراف پہچانی جاتی ہے۔ مشرقی صاحب چونکہ صرف عرض البلد کا لحاظ کرتے ہیں اس لیے گزارش ہے کہ لاہور کا عرض البلد لائق ہے یعنی ۳۱ درجہ ۳۰ دقیقہ اور مکہ معظمہ کا گام قم یعنی ۲۱ درجہ ۴۰ دقیقہ مابین العرضین طاق ۹ درجہ ۵۰ دقیقہ ہے۔ اس حساب سے ۲۵ درجہ کا فرق بتانا بالکل بے اصل اور غلط ہے، کیا ۳۱ سے ۲۱ کی تفریق کرنے سے سچپس بچتے ہیں۔ جب یہ فرق ہی غلط ٹھہرا تو ۴۰ میں ضرب دے کر ہزار میل کا فرق بتانا بھی غلط ہوا۔ صحیح ۳۹۳ میل ہے۔

سب سے بڑی غلطی مشرقی صاحب کی یہ ہے کہ انھوں نے جواب دینے سے قبل لاہور کی مسجدوں کو خود نہیں جانچا۔ صرف مستفتی کے کہنے پر ایمان لے آئے۔ کاش اس شخص کو لاہور کے ملاؤں اور معماروں کے پاس بھیجنے کے بجائے آپ خود اس کی تحقیق کر لیتے تو اتنی ٹھوکریں نہ کھاتے، یا کسی ایسے شخص کو بھیجتے جو یہ معلوم کر سکتا کہ کون کون مسجدیں ٹھیک قبلہ کی سمت ہیں اور کون کون کس قدر اور کس جانب منحرف ہیں تو بھی غلطیوں میں مبتلا نہ ہوتے، لیکن یہ ہوتا کیونکر، مشرقی صاحب کو خود ہی نہیں معلوم کہ سمت قبلہ کے معلوم کرنے کا کیا قاعدہ ہے اور مسجدوں کی صحت اور غلطی معلوم کرنے کا کیا اصول ہے۔

غلط سمتیں | آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں:-

”اس نکتے سے صاف ظاہر ہے کہ تمام ہندوستان میں ماسوا سورت ناگپور، کلک وغیرہ کے جو اسی عرض البلد پر واقع ہیں جس پر کہ مکہ معظمہ ہے۔ ہندوستان کی تمام نئی مسجدوں کا قبلہ غلط ہے، ایک مسجد ایسی نہیں جس کے نمازیوں نے آج تک ایک نماز قبلہ رو ہو کر پڑھی ہو۔ لاہور اور امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس ہے، راولپنڈی والوں کا بغداد اور دمشق، پشاور والوں کا بیروت، دہلی والوں کا بوشہر، ملتان کا کوفہ، کراچی والوں کا مدینہ، مدراس والوں کا عدن، بمبئی والوں کا بندرگاہ سواکن وغیرہ وغیرہ۔“

یہ آپ کے معلومات کا بچوڑ ہے جس کا ایک لفظ بھی صحیح نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سرے سے سمت قبلہ کے معنی ہی سے ناواقف ہیں، اور نہ آپ کو اس کے جاننے کا اصول معلوم ہے، آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ نمازی کا منہ نماز میں جس سمت کو ہو جائے وہی سمت قبلہ ہے اسی سے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ لاہور اور امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس، راولپنڈی والوں کا بغداد اور دمشق ہے۔ اول دو شہروں کا جو طول و عرض میں مختلف ہیں، ایک قبلہ یعنی بیت المقدس بتانا بالکل غلط

ہے۔ جب دو شہر طول و عرض دونوں میں مختلف ہوں گے تو ان کا قبلہ بھی مختلف ہوگا۔ ایک ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس سے بھی بڑھ کر پُر لطف بات راولپنڈی کا قبلہ بغداد اور دمشق بتانا ہے جو طول و عرض دونوں میں مختلف ہیں، کوئی ایسے دو شہر جو طول و عرض دونوں میں مختلف ہیں، ایک شہر کا قبلہ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ راولپنڈی کا قبلہ آپ نے صرف دو ہی شہروں بغداد اور دمشق ہی کو بتایا ورنہ آپ کے عامیانہ اصول پر تو مصلیٰ کے سامنے جتنے شہر، درخت، مکان، پہاڑ، مندر، گرجا وغیرہ واقع ہوں وہ سب اس کے قبلہ ہیں ورنہ تخصیص بلا تخصیص لازم آئے گی۔

سطحی نقشہ سے تعیین سمت کی سطحی غلطی | سمت قبلہ میں مشرقی صاحب کی غایت

معلومات یہ ہیں کہ :-

”نقشہ اصلاح یا اس سے بہتر صحیح نقشہ یعنی اسکولوں کا نکالو اور جس شہر کا سمت قبلہ معلوم کرنا چاہتے ہو، اس شہر اور مکہ معظمہ کے درمیان خط کھینچ کر جو سمت معلوم ہو ٹیڑھا یا سیدھا جس طرح کا خط ہو، اسی طرح راست یا کج سمت قبلہ ہے۔“

مشرقی صاحب نے اسے اپنے رسالہ ”مولوی کا غلط مذہب نمبر ۹“ کے نقشہ میں خطاب ج ۷ دے کر سمجھایا ہے۔ شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ ان کے رسالہ یا اخبار ”اصلاح“ کا نقشہ تو درکنار بڑے بڑے نقشوں میں سیکڑوں کیا ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں جگہیں دنیا بلکہ ہندوستان کی ایسی ہیں کہ جن کا نام و نشان تک نہیں۔ اس کے لیے ساری دنیا کا نقشہ نہ سہی، ہندوستان کے لیے کم از کم ایشیاء کا نقشہ ضرور ہونا چاہیے۔ جس میں ایک طرف تو وہ شہر ہو جس کی سمت مطلوب ہے، دوسری طرف مکہ معظمہ، اسے تو جغرافیہ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ ایشیاء کے نقشہ میں ہندوستان کے سب بڑے بڑے شہر بھی نہیں ہوتے۔

اس کے بعد مشرقی صاحب نے اپنی خیالی سمتوں کی تعیین میں سخت غلطیاں | بنیاد پر چند شہروں کی سمت قبلہ بتائی ہے۔

اس کی واقعی صحت تو الگ رہی خود ان کے خود ساختہ اصول کے مطابق صحیح نہیں ہے۔
سورت، ناگپور اور کٹک کا قبلہ نقطہ مغرب کو صحیح بتانا بھی غلط ہے۔

سورت کے متعلق اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ مشرقی صاحب کے قاعدہ سے ۱۹ میل سمت قبلہ سے فرق ہے، ناگپور کا عرض 15° یعنی ۲۱ درجہ ۵ دقیقہ ہے اور مکہ معظمہ کا عرض 21° یعنی ۲۱ درجہ ۴۰ دقیقہ مابین العرضین کہ یعنی ۳۵ دقیقہ۔ طول ناگپور 75° یعنی ۷۹ درجہ ۵ دقیقہ مابین الطولین بح نوبت یعنی ۳۸ درجہ ۵۲ دقیقہ۔ فصل طول ۲ گھنٹہ ۳۵ منٹ ۳۸ سکند فرق دو ہزار پانچ سو چورانوے میل۔ جب آپ کے حساب سے دو ہزار تین سو میل پر ایک درجہ کے حساب سے پورے ۴۰ میل کا پڑتا ہے، تو دو ہزار پانچ سو چورانوے میل ۳۵ دقیقہ پر ۲۸ میل کا فرق ہوگا۔ پھر ٹھیک نقطہ مغرب کہاں ہوا۔

علیٰ بن ابی القیاس کٹک کا عرض 20° یعنی ۲۰ درجہ ۳۰ دقیقہ ہے۔ مابین العرضین اسی ایک درجہ دس دقیقہ اور کٹک کا طول نوآ ۸۶ درجہ ایک دقیقہ ہے مابین الطولین مکہ 75° درجہ ۴۸ دقیقہ ہے۔ فصل طول ۳ گھنٹہ ۳ منٹ فرق مسافت تین ہزار بیالیس میل، تو کٹک کا فرق نقطہ مغرب سے آپ ہی کے حساب سے ۷۰ میل ہوا۔ پھر کٹک کا سمت قبلہ نقطہ مغرب بتانا کس طرح صحیح ہوگا۔

نیز انھوں نے ہندوستان کے جن جن شہروں کا قبلہ غیر مالک کے جن جن شہروں کو بتایا ہے وہ جس طرح واقعہ کے خلاف ہے خود ان کے اصول و قاعدہ کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان شہروں کے عرض میں بھی فرق ہے اور طول کا فرق اس پر مستزاد ہے۔

اگر بالفرض ان شہروں کے مسلمان ٹھیک نقطہ مغرب کی طرف بھی منہ کر کے نماز پڑھتے ہوں، تب بھی سمت قبلہ کی طرف ٹھیک رخ نہ سہی مگر ان شہروں کی طرف بھی (جنہیں مشرقی صاحب نے ان شہروں کا قبلہ بتایا ہے) رخ نہ ہوگا۔ وہ لاہور اور امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس بتاتے ہیں۔ اولاً لاہور اور امرتسر دونوں ایک عرض

پر نہیں ہیں، لاہور کا عرض البلد ۳۱ درجہ ۳۰ دقیقہ ہے اور امرتسر کا ۳۱ درجہ ۳۷ دقیقہ ہے اس حساب سے اگر بیت المقدس لاہور والوں کا قبلہ ہوگا یعنی ان کے نقطہ مغرب کے ٹھیک بہت میں ہوگا تو امرتسر والوں کا قبلہ نہ ہوگا۔ اور اگر امرتسر والوں کا قبلہ ہوگا تو لاہور والوں کا نہ ہوگا۔ حالانکہ واقعہ کے لحاظ سے بیت المقدس نہ لاہور والوں کا قبلہ ہے اور نہ امرتسر والوں کا۔ اس لیے کہ بیت المقدس کا عرض لاہور ۳۱ درجہ ۴۰ دقیقہ ہے۔ جس سے لاہور سے پورے دس دقیقہ اور امرتسر سے تین دقیقہ کا فرق ہے۔ اور بیت المقدس کا طول گدیہ ۳۵ درجہ ۱۲ دقیقہ ہے اور لاہور کا طول عکج ۴۴ درجہ ۲۳ دقیقہ، مابین الطولین لٹ ط ۳۹ درجہ ۹ دقیقہ، فصل طول دو گھنٹہ ۳۶ منٹ ۳۶ سکند، فرق مسافت دو ہزار چھ سو میل، گویا خود ان کے قاعدہ سے ۱۰ میل کا فرق ہوا۔ پھر لاہور والوں کا قبلہ بیت المقدس کس طرح ہوگا۔

علیٰ بذالقیاس طول امرتسر عکج ۴۲ درجہ ۴۸ دقیقہ ہے تو بیت المقدس اور امرتسر کا مابین الطولین لٹ ط ۳۹ درجہ ۳۲ دقیقہ، اور فصل طول دو گھنٹہ ۳۸ منٹ ۱۶ سکند ہوا۔ اور فرق مسافت دو ہزار چھ سو تیس میل ہوا۔ اس لیے مشرقی صاحب کے قاعدہ سے نقطہ مغرب سے ۳ میل کا فرق ہوگا۔ پھر امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

اسی طرح راولپنڈی والوں کا قبلہ بھی بغداد نہ ہوگا۔ کیونکہ راولپنڈی کا عرض لٹ ط ۳۵ درجہ ۳۷ دقیقہ ہے اور بغداد لٹ ط ۳۷ درجہ ۲۷ دقیقہ اور راولپنڈی کا طول عکج ۴۳ درجہ ۶ دقیقہ ہے۔ اور بغداد کا مکہ ۴۲ درجہ ۲۵ دقیقہ، مابین الطولین عکج ط ۲۸ درجہ ۴۱ دقیقہ، فصل طول ایک گھنٹہ ۴۲ منٹ ۴۲ سکند، فرق مسافت ایک ہزار نو سو سترہ میل۔ یہ فرق اگرچہ طول میں اور شہروں کے اعتبار سے کچھ کم ہے پھر بھی تقریباً دو ہزار میل ہے۔ مگر عرض کا فرق ۲ درجہ ۱۷ دقیقہ ہے۔ جب ایک درجہ پر آپ کے حساب سے ۴۰ میل کا فرق پڑ جاتا ہے تو دو درجہ سے زائد پر ۹۱ میل فرق ہوگا۔ پھر راولپنڈی والوں کا قبلہ بغداد کو بتانا

کس قدر غلط ہے اور دمشق اور راولپنڈی کا مابین العرضین ب ۲۰ درجہ اور ۷ دقیقہ ہے اور مابین الطولین ل ۳۶ درجہ ۵۲ دقیقہ ہے۔ فصل طول ۲ گھنٹہ، ۳۱ منٹ ۲۸ سکند اور فرق مسافت ۲ ہزار پانچ سو چودہ میل ہے، اس میں بھی ان کے حساب سے ۲۸ میل فرق ہوا، نہ ٹھیک نقطہ مغرب ہوگا کہ راولپنڈی والوں کا قبلہ دمشق قرار دیا جائے۔

پشاور کا قبلہ بیروت بتانا بھی صحیح نہیں، اس لیے کہ پشاور کا عرض البلد لذیہ دقیقہ ۳۴ درجہ ۴۵ دقیقہ ہے۔ اور بیروت کا ل ۳۳ درجہ ۵۲ دقیقہ، مابین العرضین کا یعنی ۲۱ دقیقہ، طول پشاور ع ۱، ۷۱ درجہ ۳۰ دقیقہ، طول بیروت ل ۳۵ درجہ ۳۱ دقیقہ، مابین الطولین ل ۳۵ درجہ ۵۹ دقیقہ، فصل طول ۲ گھنٹہ ۲۳ منٹ ۵۶ سکند، فرق مسافت دو ہزار چار سو میل تو ۲۱ درجہ پر ۱۲ میل کا فرق ہوگا۔ اسی طرح دہلی کا قبلہ بوشہر نہیں ہو سکتا، دہلی کا عرض البلد کج مہ ۲۸ درجہ ۴۲ دقیقہ ہے بوشہر کا کطام ۲۹ درجہ ۵۰ دقیقہ، مابین العرضین ا ج ۱ ایک درجہ آٹھ دقیقہ۔ طول دہلی ع ۷۷ درجہ ۲۰ دقیقہ، طول بوشہر ۵۰ درجہ، مابین الطولین کنڑ ک ۲۷ درجہ ۲۰ دقیقہ، فصل طول ایک گھنٹہ ۴۹ منٹ ۲ سکند، فرق مسافت ایک ہزار چھ سو بیاسی میل۔ پس ۲۵ میل فرق ہوگا۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ ملتان کا قبلہ کوفہ ہے۔ ملتان کا عرض ل ج ۳۰ درجہ ۳ دقیقہ کوفہ کا عرض ل ب ۳۴ درجہ ۴۲ دقیقہ ہے۔ مابین العرضین ب ۴، ۲ درجہ ۲۱ دقیقہ، طول ملتان ع ۱، ۷۱ درجہ ۳۰ دقیقہ، طول کوفہ کد ۲۴ درجہ مابین الطولین م ۷۷ درجہ ۳۰ دقیقہ۔ فصل طول ح ی ۳ گھنٹہ دس منٹ، فرق مسافت تین ہزار ایک سو چھیاسٹھ یعنی مشرقی صاحب کے قاعدہ سے ایک سو باسٹھ میل فرق ہوگا۔ پھر ملتان کا قبلہ کوفہ بتانا کیسے صحیح ہوا۔ کراچی کا قبلہ مدینہ طیبہ بھی عجیب ہے کراچی کا عرض البلد کد ۲۵ درجہ، مدینہ منورہ کا عرض کد ۲۴ درجہ ۲۰ دقیقہ ہے۔ مابین العرضین م ۴۰ دقیقہ۔ طول کراچی ع ۷۷ درجہ، طول مدینہ طیبہ م ۲۰ درجہ

۵۵ دقیقہ، فصل طول ایک گھنٹہ ۲۵ منٹ ۲۰ سکنڈ، فرق مسافت ۱۷۳۲ میل، تو ۲۰ دقیقہ پر ۲۲ میل کا فرق ہوگا۔

مداس کا قبلہ عدن بھی نہیں ہو سکتا، عرض مداس بیچم تبت ۱۳ درجہ ۲ دقیقہ، عرض عدن یب ۱۲ درجہ ۲۵ دقیقہ، مابین العرضین ۱۷ دقیقہ، طول مداس ۲۰ کتب ۸۰ درجہ ۲۲ دقیقہ، طول عدن ۲۵ درجہ ۳ دقیقہ، مابین الطولین لہ یط ۳۵ درجہ ۱۹ دقیقہ، فصل طول ۲ گھنٹہ ۲۱ منٹ ۱۶ سکنڈ، فرق مسافت ۲۳۳۳ میل یعنی ان ہی کے حساب سے ۱۱ میل کا فرق ہوگا۔ مداس کا قبلہ عدن بتانا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

بمبئی کا قبلہ بندرگاہ سواکن بتانا اگر مجذوب کی بڑ نہیں تو اور کیا ہے؟ عرض بمبئی بیچ تبت ۱۸ درجہ ۵۵ دقیقہ ہے۔ عرض سواکن یطال ۱۹ درجہ ۳۰ دقیقہ، مابین العرضین لہ لہ ۳۵ دقیقہ، فصل طول دو گھنٹہ ۲۲ منٹ ۲۰ سکنڈ۔ فرق مسافت ۲۳۷۵ میل تو آپ ہی کے حساب سے ۲۸ میل کا فرق ہوا۔ ایسی صورت میں بمبئی کا قبلہ سواکن بتانا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

غرض جہاں جہاں کا قبلہ مشرقی صاحب نے جن جن شہروں کو بتایا ہے، کل کا کل غلط ہے، نہ واقعہ کے اعتبار سے یہ شہر قبلہ ہیں اور نہ مشرقی صاحب کے قاعدہ کے مطابق، سب سے کم فرق امرتسر اور بیت المقدس کے نقطہ مغرب میں ہے۔ وہ بھی ۳ میل ہے۔ اور سب سے زیادہ ملتان اور کوفہ میں ہے، جس میں ایک سو پچاسٹھ میل کا فرق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مشرقی صاحب کو نہ سمت قبلہ کی تعریف اور اس کے معلوم کرنے کے طریقہ سے ناواقفیت

معلوم کرنے کا قاعدہ جانتے ہیں۔ نہ سمت قبلہ کے فقہی مسائل سے واقف ہیں۔ سمت قبلہ کی تعریف علامہ بیہت کے نزدیک یہ ہے۔

ھی نقطۃ فی الافق من واجہہا سمت قبلہ افق میں اس نقطہ کا نام ہے کہ جو اس کے واجہ الکعبۃ .
مواجهہ میں ہوگا وہ کعبہ کے مواجهہ میں ہوگا۔

اسی نقطہ پر دائرۃ الافق اس دائرۃ العظیم سے تقاطع کرتا ہے جو اس البلد اور اس مکہ معظمہ پر ہوتا ہوا گذرے اور قوس سمت قبلہ کی تعریف ہے:-

واما سمت قوس سمت القبلة فہی قوس من الافق تقم بین ہذا النقطة واحدى نقطى الشمال و الجنوب بشرط ان لا یكون اکثر من الربع او احدى نقطى المشرق والمغرب كذلك وقد قوس انحرافها ایضا و ہى قدر ما یجب ان يتحرک المصلی من مواجہة احدى النقاط الاربع لیواجه البیت۔

اور قوس سمت قبلہ افق کی وہ قوس ہے جو اس نقطہ اور نقطہ شمال یا جنوب کے درمیان یا اس نقطہ اور نقطہ مغرب و مشرق کے درمیان واقع ہو، بشرطیکہ ربع دور سے زیادہ نہ ہو۔ اس کو قوس انحراف بھی کہتے ہیں۔ یعنی مصلی کو نقاط اربعہ مغرب مشرق اور شمال و مغرب سے کسی قدر انحراف کرنا چاہیے کہ وہ بیت اللہ کے مواجهہ میں ہو۔

ہندوستان کے مختلف مقامات کے سمت قبلہ کا اختلاف | ہندوستان مکہ معظمہ سے مشرق میں ہے۔

اس لیے ہندوستان کے قبلہ کی تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، ٹھیک نقطہ مغرب میں ہو یا اس قدر کم فرق ہو کہ قابل التفات نہ ہو، جیسے اٹاوا، اناؤ، بہراج، جالون سیتاپور، فرخ آباد، کانپور، کھیری، لکھنؤ، ہرودئی وغیرہ کہ ان کا انحراف ایک درجہ سے بھی کم ہے۔ خصوصاً اناؤ، اس کا انحراف فقط ۳ دقیقہ ہے، دوسرے انحراف شمالی ہو، جیسے بنگال، بہار، اڑیسہ کے تمام شہر اور صوبجات متحدہ کے بعض اضلاع، تیسرے انحراف جنوبی ہو جیسے پنجاب کے تمام شہر اور یوپی کے بعض اضلاع۔

لیکن کن کن شہروں میں کس قدر انحراف شمالی یا جنوبی ہوگا۔ اس کا جاننا مسلمانوں کے لیے از حد ضروری ہے۔ افسوس کہ نہ صرف عام مسلمان بلکہ علماء تک اس سے

غافل ہیں، اسی ضرورت کو محسوس کر کے راقم الحروف نے اپنے رسالہ مؤذن الاوقات میں ہر عرضی کے ایک مشہور مقام کے ہر مہینہ اور ہر دن کے جملہ اوقات روزہ و نماز ہیئت و توقیت کے قاعدہ جدید و قدیم سے استخراج کر کے دے دیے ہیں نیز اس عرض کے تمام اضلاع و قصبات اور مشہور دیہاتوں کا تفاوت جن کا طول و عرض مجھے اٹلس یا انڈکس آف میپ سے معلوم ہو سکا دے دیا ہے۔ اس لیے اس کتاب کا افادہ بہت بڑھ گیا ہے، شائقین اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ شہروں اور آبادیوں میں تو مسجدیں ایک حد تک اس سے مستغنی کر دیتی ہیں۔ مگر جہاں مسجدیں نہیں ہیں یا نئی مسجد بنانی ہے یا کسی کی سمت قبلہ غلط ہے وہاں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے صوبہ جات بنگال، بہار، اڑیسہ، مالک متحدہ آگرہ و اودھ اور پنجاب کے اضلاع کا سمت قبلہ و قدر انحراف بقید درجہ و دقیقہ مع سمت انحراف لکھ دیا ہے۔ اس کے بعد دائرہ ہندیہ یا قطب نما سے سمت قبلہ نکال لینا بہت آسان ہے جس شہر میں نقطہ مغرب سے جس قدر شمال یا جنوب کو انحراف لکھا گیا ہے، اسی قدر شمال یا جنوب کو دیتے ہوئے نماز میں کھڑا ہونا چاہیے

واللہ الموفق۔

نام شہر	قوس انحراف		نام شہر	قوس انحراف	نام شہر	قوس انحراف		
	درجہ	دقیقہ				درجہ	دقیقہ	درجہ
صوبہ بنگال			شمالی	۶	۲۶	بوگرا		
			"	۶	۵۲	پینہ		
			"	۴	۱۵	جلیانی گوری		
باقر گنج	۸	۳۹	"	۷	۲۵	جیسور	شمالی	
بانکورا	۷	۷	"	۹	۱۲	چانگام	"	
بردوان	۷	۹	"	۳	۲۳	دارجلنگ	"	

نام شہر	قوس انحراف		نام شہر	قوس انحراف	نام شہر	قوس انحراف	درجہ	دقیقہ
	درجہ	دقیقہ						
مرشد آباد	۲۷	۶	شمالی	۲۶	۶	شمالی	۲۶	۶
مدناپور	۲	۸	"	۳۴	۵	"	۳۴	۵
میں سنگھ	۳۴	۶	"	۱۰	۷	"	۱۰	۷
نادیا	۱۷	۶	"	۲۵	۳	"	۲۵	۳
نواکھالی	۳۶	۸	"	۳۹	۲	"	۳۹	۲
بوڑھ	۵	۸	"	۴۸	۵	"	۴۸	۵
ہوگلی	۴۷	۷	"			"		
صوبہ بہار و اڑیسہ								
ممالک مغربی و شمالی								
آرہ	۴۶	۳	"	۳	۱	جنوبی	۳	۱
ادکپور	۵۷	۶	"	۵۲	۲	شمالی	۵۲	۲
بالاسور	۵۴	۸	"	۲۳	۳	جنوبی	۲۳	۳
بھاگلپور	۴۶	۳	"	۵۲	۲	شمالی	۵۲	۲
پٹنہ	۵۶	۳	"	۳	۰	جنوبی	۳	۰
پلامون	۲۳	۴	"	۱۸	۱	"	۱۸	۱
پوری	۲۹	۱۰	"	۵۴	۲	شمالی	۵۴	۲
پورینہ	۳۴	۴	"	۲۶	۲	"	۲۶	۲
پھیرا	۳۷	۳	"	۴۳	۰	"	۴۳	۰
درجننگہ	۳۳	۳	"	۸	۴	جنوبی	۸	۴
راہنچی	۳۰	۶	"	۱۰	۲	"	۱۰	۲

نام شہر	قوس انحراف		جہت	نام شہر	قوس انحراف		جہت	نام شہر	قوس انحراف		جہت
	درجہ	دقیقہ			درجہ	دقیقہ			درجہ	دقیقہ	
فتح پور	۵۲	۱	شمالی	ہمیر پور	۳۲	۱	شمالی	سیالکوٹ	۱۱	۱۵	جنوبی
فرخ آباد	۳۸	۰	جنوبی					شاہ پور	۱۲	۲۹	"
فیض آباد	۱۹	۱	شمالی	صوبہ پنجاب				شملہ	۴	۱۲	"
کانپور	۵۹	۰	"					فیروز پور	۸	۲۹	"
کھیری	۲۴	۰	جنوبی	امرتسر	۲۰	۹	جنوبی	کرنال	۵	۱۷	"
گورکھ پور	۵۷	۱	شمالی	بنوں	۲۷	۵	"	کوباٹ	۱۵	۲۲	"
گوندہ	۲۰	۱	"	پشاور	۱۶	۱۶	"	گجرات	۱۱	۲۳	"
لکھنؤ	۲۱	۰	"	جسلم	۳۶	۱۲	"	گجرانوالہ	۱۱	۰	"
مراد آباد	۲	۳	جنوبی	جالندھر	۲۵	۸	"	گڑگاؤں	۲	۵۶	"
میرٹھ	۵۰	۳	"	جھنگ	۱۱	۶	"	لاہور	۱۰	۰	"
مین پوری	۲۲	۰	"	حصار	۱۷	۵	"	لودھیانہ	۷	۵۳	"
متھرا	۲۰	۱	"	ڈیرہ اسماعیل خان	۱۰	۱۳	"	منظر نگر	۹	۵۲	"
مرزا پور	۲۸	۲	شمالی	ڈیرہ غازی خان	۱۰	۱۰	"	ملتان	۹	۵۳	"
نینی تال	۲۶	۳	جنوبی	راولپنڈی	۱۳	۱۲	"	ننگرہ	۹	۲۳	"
ہروئی	۲۳	۰	"	رہتک	۲۲	۲	"	ہوشیار پور	۸	۲۸	"

پنجاب اور یو۔ پی کے جن شہروں کا سمت قبلہ جنوبی ہے، اسے تو مشرقی صاحب شاید تسلیم کر لیں، مگر یو۔ پی کے جن شہروں کا قبلہ شمالی ہے یا بنگال، بہار، اڑیسہ کے تمام شہروں کا جن کا قبلہ شمالی ہے، اس کو تسلیم کرنے میں شاید ان کو تامل ہو، اور وہ یہ خیال کریں کہ یہ سب شہر مکہ معظمہ سے زاوۃ العرض ہیں، اس لیے کہ ان کے دیسے ہوئے نقشہ کے مطابق خط ملانے سے کعبہ معظمہ جنوب کی طرف آتا ہے نہ شمال کو۔

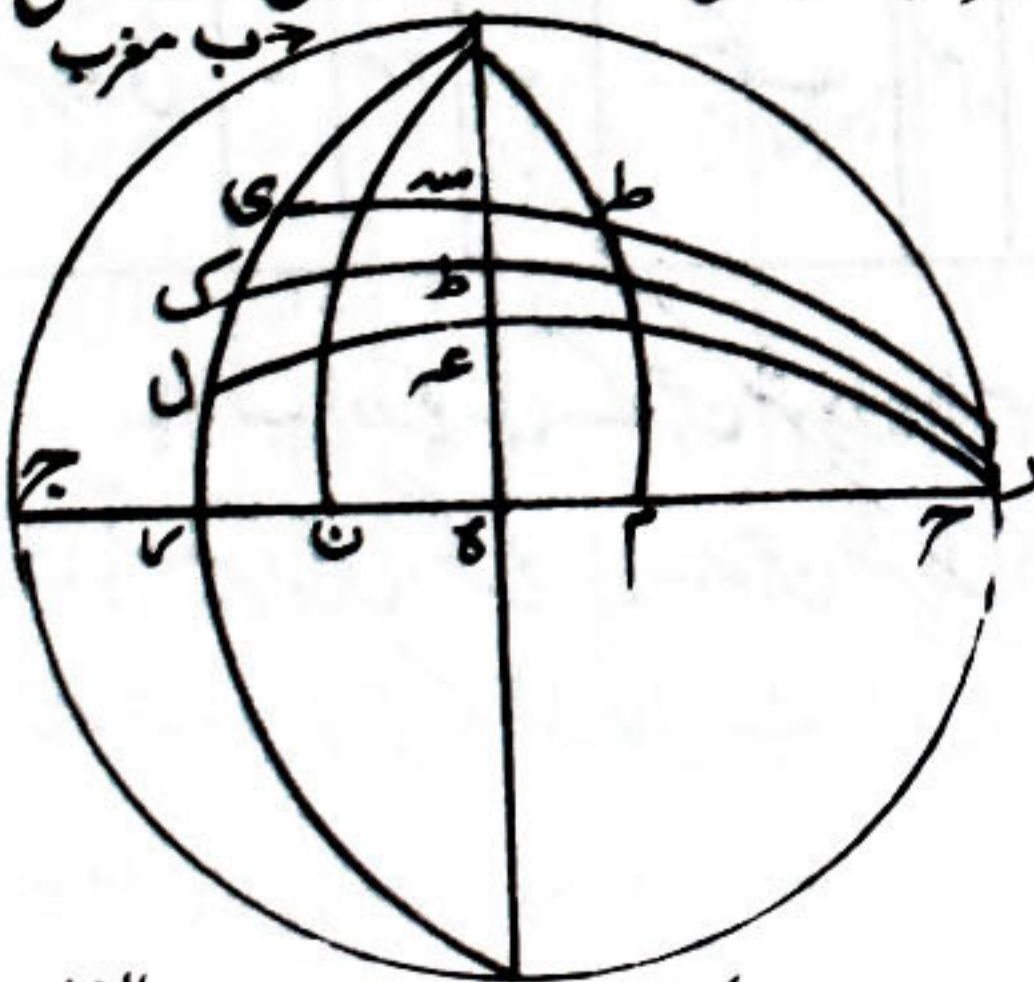
اس لیے فقیر اس مسئلہ کو مدلل کرنے کے لیے سمت قبلہ معلوم کرنے کا قاعدہ لکھے دیتا ہے۔

فصل طول مکہ معظمہ اور بلد مفروض جس کی سمت قبلہ معلوم کرنا ہو، اگر وہ ۹۰ درجے سے کم ہے تو عرض

سمت قبلہ معلوم کرنے کا طریقہ

جنوبی میں وہ عمود جو سمت الراس مکہ معظمہ پر گزرتا ہو، نصف النہار بلدی پر قائم کریں۔ (یعنی نقطہ اعتدال سے ایک دائرہ عظیم مکہ مکرمہ کی سمت گزاریں کہ نصف النہار پر آپ ہی عمود ہوگا) کیونکہ اس کے دونوں قطب اعتدالین پر گزرتا ہے،

یہ سمت الراس سے ہمیشہ شمال کو گزرے گا کہ اس عرض میں معتدل سمت الراس شمالی ہے اور سمت الراس مکہ معظمہ معتدل سے تو عمود جو نقطہ اعتدال سے نکل کر سمت الراس مکہ معظمہ پر گزرتا ہو نصف النہار سے ملا ہو، قطعاً سمت الراس بلد سے شمالی ہوگا۔ مگر عرض شمالی میں تینوں حالتیں ہوتی ہیں۔ اگر عرض عمود عرض البلد کے برابر ہے تو موقع عمود میں سمت الراس بلد ہے، یعنی بلد کا دائرہ اول السموت ہی سمت الراس مکہ پر گزرتا ہوا ہے۔ اور اگر اس کا عرض عرض البلد سے زائد ہے تو موقع عمود سمت الراس سے شمالی ہوگا۔ اور اگر عرض البلد سے کم ہے تو جنوبی ہوگا، جیسا کہ اس شکل سے ظاہر ہے۔ اب ۶۷ افق شمالی ہے ب ۵ د اس کا اول السموت ب رد معدل النہار ۷ قطب شمالی ظاہر ہے کہ اول السموت کا معدل سے فصل اعظم دائرہ نصف النہار پر ۵ س ہے کہ



عرض البلد سے پھر کم ہوتا گیا ہے یہاں تک کہ نقطہ ب پر معدوم ہو گیا، ۷ س حل ۷ ک ح ی دائرہ میلیہ میں جو قطب سے نکل کر معدل سے ملے ہیں اور اول السموت کے نقاط ۵ ع ط سہ کا معدل سے عرض

بتاتے ہیں، جن میں سب سے بڑا ۵ س ہے پھر عدل پھر ط ک پھر س ی ب عرض نصف النہار

سے جتنا فضل بڑھتا گیا ہے عرض اول السموت گھٹتا گیا ہے۔ فرض کیجیے کہ تین شہر مساوی العرض ہیں، جن کا عرض عرض حرم سے زیادہ ہے۔ اور فصل طول ۹۰ سے کم تو بوجہ تساوی عرض مواقع مذکورہ پر ان کے اول السموت کے عرض یکساں ہوں گے۔ فرض کیجیے عرض عدل عرض حرم سے زائد ہے تاک مساوی اور سیا پھوٹا تو ان تین شہروں میں مکہ معظمہ سے جس کا فصل طول ل سا ہے وہاں سمت الراس مکہ معظمہ ط نصف النهار ح ل پر ہے اور چونکہ عدل عرض حرم سے زائد ہے، ط اول السموت اور معدل کے بیچ میں پڑے گا۔ تو عمود ب ن نقطہ اعتدال سے نکل کر سمت الراس حرم پر ہوتا ہوا نصف النهار سے ملا ہوا سمت الراس بلد سے جنوب کو پڑے گا۔ اور جس کا فصل طول ک سا ہے وہاں ط نصف النهار ح ک پر ہے۔ اور چونکہ ط ک مساوی عرض حرم ہے اس لیے ط خاص اول السموت پر واقع ہوگا۔ اور ب ح جو اول السموت ہے عمود ہوگا کہ ب سے نکل کر ط پر گزرتا اور نصف النهار سے ملا ہوا ہے اور جس کا فصل طول ی سا ہے، وہاں ط نصف النهار ح ی پر ہے۔ چونکہ سیا عرض حرم سے چھوٹا ہے اس لیے ط اول السموت سے باہر شمال میں رہے گا۔ اور عمود ب م سمت الراس بلد سے شمال کو پڑے گا۔ علامہ موسیٰ رومی شارح بیغنی فرماتے ہیں:-

”اعلم ان راس مکتہ فی هذا القسم (الذی طولہ و عرضہ اکثر من طول مکتہ و عرضہا) یکن ان یقع علی دائرۃ اول السموت البلد فیكون سمت القبلة نقطۃ المغرب والمخط الذی علی صوبہا خط المشرق والمغرب وان یقع شمالیا منها فیكون سمت فی الربع الغربی الشمالی من الافق وان یقع جنوبیا عنها فیكون سمت فی الربع الغربی الجنوبی کما یقتضیہ العمل بما فی الكتاب الا انه لا یمیب ان یكون المخط المذكور علی صوبہ“

علامہ ربیع بن حجاج اس کے حاشیہ میں ارقام فرماتے ہیں:-

”توضیح المقام ان دائرة اول السموت تقطع معدل النهار
 على نقطتي المشرق والمغرب وغاية البعد بينهما انما هي
 بقدر عرض البلد وكل من القسي الواقعة بينهما من دوائر
 الميل بل من انصاف نهار سائر الافاق اصغر من عرض
 البلد وكل قوس ابعدها من غايتها البعد اصغر من الاقرب
 ويجوز ان يكون عرض مكة في هذا القسم بقدر قوس من
 هذه القسي فيكون سمت راس مكة على اول السموت و
 سمت البلد وسمت القبلة نقطة المغرب ويجوز ان يكون
 عرض مكة اعظم من تلك القوس فيكون سمت راس
 مكة في شمال اول السموت وسمت القبلة في الربيع
 الغربي الشمالي من الافق ويجوز ان يكون عرض مكة
 اصغر من تلك القوس فيكون سمت راس مكة في جنوب
 اول السموت وحينئذ يكون سمت القبلة في الربيع
 الغربي الجنوبي من الافق كما هو مقتضى العمل الذي
 ذكره المصنف“

اسی سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ جس طرح یہ خیال غلط ہے کہ زاہد العرض شہروں کا سمت قبلہ مطلقاً جنوبی ہوتا ہے، اسی طرح مشرقی صاحب کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ جو شہر مکہ معظمہ سے ٹھیک پورب واقع ہیں، ان کا قبلہ نقطہ مغرب ہوگا۔ جس بناء پر انھوں نے سورت کو جہاں عرب پہلی صدی میں سب سے پہلے اترے تھے، مکہ معظمہ سے مشرق کی سمت بتایا۔ اور سورت، ناگپور، کلک وغیرہ کو جو اسی عرض بلد پر واقع ہیں، جس پر ان کے خیال میں مکہ معظمہ واقع ہے، ان کا قبلہ ٹھیک نقطہ مغرب کو صحیح بتایا۔ امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں دلائل قبلہ بیان کرتے

ہوئے فرماتے ہیں:-

امام رازیؒ کے دلائل قبلہ | واما الطريقة اليقينية المذكورة
في كتب الهيئة قالوا سمت القبلة نقطة التقاطع بين دائرة
الافق وبين دائرة العظيمة، ثم سمت رؤسنا و رؤس
اهل مكة و انحراف القبلة قوس من دائرة الافق ما
بين سمت القبلة و دائرة نصف النهار في بلدنا و ما
بين سمت القبلة و مغرب الاعتدال تمام الانحراف قالوا
ويحتاج في معرفة سمت القبلة الى معرفة طول مكنته
عرضها فان كان طول البلد مساويا لطول مكة و عرضها
مخالف لعرض مكة كان سمت قبلتها على خط نصف النهار
فان كان البلد شماليا فالى الجنوب و ان كان جنوبيا فالى
الشمال و اما اذا كان عرض البلد مساويا لعرض مكة و
طوله مخالفا لطولها فقد يظن ان سمت قبلته ذلك البلد
على خط الاعتدال و هو ظن خطأ.

دیکھیے کس قدر روشن تصریح ہے کہ جب عرض بلد عرض مکہ کے مساوی اور
طول بلد طول مکہ کے مخالف ہو تو خیال کیا جاتا ہے کہ اس شہر کا خط اعتدال یعنی
ٹھیک مغرب کو ہے۔ جیسا مشرقی صاحب نے خیال کیا۔ مگر امام رازیؒ فرماتے
ہیں کہ یہ خیال غلط ہے۔

استخراج سمت قبلہ کا قاعدہ | اس تمہید کے بعد استخراج سمت قبلہ کا قاعدہ
وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

قاعدہ یہ ہے کہ ظم عرض حرم + جم فصل طول = ظم عرض موقع جم عرض موقع + ظل
فصل طول = محفوظ۔ جیب تفاضل = ظل انحراف۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ جس مقام کا سمت قبلہ معلوم کرنا ہو پہلے اس کے طول کا

مکہ معظمہ کے طول سے تفاضل لے لیا جائے۔ اس کے بعد ظل تمام عرض مکہ کو جیب تمام فصل طول کے ساتھ جمع کیا جائے، حاصل جمع کی قوس معلوم کر کے اس کا کُل لے لیا جائے کہ عرض موقع ہے۔ پھر اس کو عرض بلد سے تقسیم کیا جائے، اگر عرض بلد عرض موقع سے کم ہے تو انحراف شمالی ہوگا، اور زائد ہے تو انحراف جنوبی ہوگا اور برابر میں کوئی انحراف نہ ہوگا بلکہ سمت قبلہ ٹھیک نقطہ مغرب کو ہوگا، اس کے بعد جیب تمام عرض موقع کو ظل فصل طول کے ساتھ جمع کیا جائے، حاصل جمع کو جیب تفاضل عرض موقع و عرض البلد سے کم کر کے اس ظل کی قوس لے کر ۹۰ تک اس کا تمام لیا جائے، یہ قدر انحراف ہوگا۔ سمت قبلہ معلوم کرنے کا یہ آسان طریقہ ہے۔

اس قاعدہ کے بعد اب میں پھر مشرقی صاحب کے افادات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ فرماتے ہیں:-

”یہ کہنا کچھ بے جا نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی پچھلی کئی قرون کی نمازیں اور نقطوں کے علاوہ یقیناً اسی لیے قبول نہیں ہوئیں کہ وہ دین اسلام کے مقرر شدہ قبلہ کی طرف نہ تھیں۔ خدا اس کم نگاہ اور اندھی امت سے بجا ناراض ہے۔“

اور کمالات کے ساتھ اس دعوے سے مشرقی صاحب عالم غیب بھی ہو گئے، کہ انھوں نے مسلمانوں کی قرون کی نمازوں کو اکارت کر دیا، دیکھیے ان کی پرواز کہاں تک لے جاتی ہے۔ لیکن یہ دعویٰ بھی ان کے تصور علم کا نتیجہ ہے۔

ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ استقبال قبلہ عام ہے، خواہ عین کعبہ کی طرف رخ ہو، جیسے مکہ مکرمہ والوں کے لیے یا محض اس جہت کی سمت ہو، جیسے اوروں کے لیے کلام اللہ کے یہ الفاظ ہیں۔ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اور فَوَلِّوْا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔ اگر عین کعبہ سے استقبال کا حکم

لے ظل اور ظل تمام، جیب اور جیب تمام وغیرہ کی لوکار تھی اعداد میتھ ٹیکل ٹیلیس لوکار تھس چمبر صاحب میں ملیں گے۔ یہ کتاب رٹر کی ٹامسن کالج سے مل سکتی ہے۔ ۱۲ منہ

ہوتا تو لفظ شطر کے بجائے فولوا جو حکم الی بیت اللہ فرمایا جاتا، تفسیر کبیر میں ہے:-

فی الآية قولان الاول وهو قول جمهور المفسرين من الصحابة والتابعين والمتأخرين واختيار الشافعي رضي الله عنه في كتاب الرسالة ان المراد جهت المسجد الحرام وتلقائ وجانبه وقرائة ابى ابن كعب تلقاء المسجد الحرام۔

یعنی شطر کی تفسیر میں دو قول ہیں، پہلا جمهور مفسرین، صحابہ و تابعین و علمائے متاخرین اور امام شافعیؒ کا کتاب الرسالة میں پسندیدہ قول یہ ہے کہ مراد جہت مسجد حرام ہے، اور اس کے مقابل و محاذی ہے۔ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت ہی تلقاء المسجد الحرام ہے۔

امام رازی نے اس کے بعد دوسرا قول معتزلہ کا بیان کیا ہے کہ شطر سے مراد نصف ہے، اس کے بعد دو دلیلوں سے اسے روکیا ہے، فرماتے ہیں اگر شطر سے مراد طرف ہو تو لفظ شطر بڑھانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، اس لیے اگر فول وجہک المسجد الحرام کہا جائے، جب بھی یہی مطلب ہوگا، البتہ اگر شطر کے معنی جہت لیے جائیں، تو بے شک اس لفظ کے بڑھانے کا فائدہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ البيت قبلۃ لاهل المسجد والمسجد قبلۃ لاهل المنکة والحرم قبلۃ لاهل المشرق والمغرب۔

آگے مشرقی صاحب کی خوش اعتقادی مغربی قوم
ایک خوش اعتقادی کے متعلق ملاحظہ ہو:-

”اگر یہی فولوا جو حکم شطر المسجد الحرام کا حکم کسی مغربی قوم پر نازل ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ یورپ کے ہر حصہ میں کھڑوں نہایت باریک بین رصدی آلات اس مطلب کے لیے شہر بشہر نصب ہو جاتے کہ خدانے عزوجل کے آسمانی حکم کی رو سے شطر المسجد الحرام صحیح طور پر دریافت کریں، وہ قوم ایسے دقیقہ رس اور نازک آلات ایجاد کرتی کہ

شمال و مغرب کے درمیان تین لاکھ چوبیس ہزار سمتوں سے ایک گز کا بھی فرق نہ آنے پاتا، ان کے قبلہ کی سمت عین کعبہ کے سیاہ غلاف کے نصف پر آکر پڑتی ہے۔ جو پھٹ لبا اور پھٹ چوڑا ہے۔

مشرقی صاحب نے خوش اعتقادی کی بھی حد کر دی۔ ان کو ہمیشہ ایسی ہی باتوں کا یقین ہوا کرتا ہے جو بالکل واقعہ کے خلاف ہوں، جنہیں اصلیت سے دور کا بھی علاقہ نہ ہو۔ مغربی قوموں کو فولو واد جو حکم شطر المسجد الحرام کا حکم تو نہیں، لیکن فولو واد جو حکم شطر البیت المقدس کا حکم تو ہے کہ وہ ان کا بھی قبلہ ہے۔ میں مشرقی صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ مغربی قوموں نے یدپ میں کتنے کروڑ باریک بین رصدی آلات بیت المقدس کی سمت معلوم کرنے کے لیے شہر بھر نصب کر دیے، کیا مسلمانوں کے لیے خانہ کعبہ کی جواہریت ہے مغربی قوموں کے لیے بیت المقدس کی اس سے کم ہے؟

مشرقی صاحب باوجود دعویٰ ہمہ دانی اپنے

سمت قبلہ معلوم کرنے کے طریقوں اور آلات سے ناواقفیت

گھر کی دولت سے محروم ہیں، انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ مسلمانوں کے پاس سمت قبلہ معلوم کرنے کے کیسے باریک آلات ہیں۔ آپ کے تنخیل میں تو صرف مغربی قوم ایسے آلات ایجاد کرتی کہ شمال و مغرب کے درمیان تین لاکھ چوبیس ہزار سمتوں سے ایک گز کا بھی فرق نہ آنے پاتا اور مسلمانوں کے پاس اس گئی گزری حالت پر بھی ایسے ایسے آلات و معلومات ہیں کہ نقطہ شمال و مغرب کے درمیان پندرہ سنکھ ستائیس پدم چھبیس نیل چونسٹھ کھرب مختلف طریقوں کے درمیان ایک گز تو درکناً ایک انچ کا بھی فرق نہیں پڑ سکتا، اگر جناب کو اس کی خبر نہ ہو تو اس کا کیا علاج، میں بتاتا ہوں کہ اس آلہ کا نام اسطرلاب ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ اور آگ سمت قبلہ کے طریقہ یقینیہ کے بیان میں فرماتے ہیں:-

”ولذلك طرق اسهلها ان يعرف الجزء الذي يسامت

رؤس اهل المكة من فلك البروج وهو رسم من الجوزاء
 ومم ح من السرطان فيضم ذلك الجزء على خط وسط
 السماء في الاسطرلاب المعمول لعرض البلاد ويعلم على
 المرئي علامة ثم يدور العنكبوت الى ناحية المغرب ان
 كان البلد شرقيا عن مكة كما في بلاد خراسان والعراق
 بقدر ما بين الطولين من اجزاء الحجرة (الى قوله)
 ويخط على ظل المقياس خطا من مركز العمود الى اطراف
 الظل فذلك الخط خط الظل فيبني عليه المحراب“

یہ آلہ آپ کی مغربی قوم کے آلات کی طرح بہت بیش قیمت بھی نہیں جس کا
 حصول ہر شخص کے لیے ممکن نہ ہو، رامپور لائبریری اور کتب خانہ خدابخش مرحوم
 کے علاوہ دوسرے کتب خانوں میں بھی بہترے اسطرلاب ہیں۔ اسطرلاب کے
 علاوہ میں مشرقی صاحب کو ایک اور آلہ بتاتا ہوں، جس سے نہایت آسانی کے
 ساتھ سمت قبلہ معلوم کی جاسکتی ہے اور مغرب و شمال کے پندرہ سنکھ حصول میں
 اس کے ذریعہ بھی ایک انچہ کا فرق نہیں پڑسکتا، یہ آلہ خاص ہندوستان کی ایجاد
 ہے جس کی وجہ سے اس کا نام دائرۂ ہندیہ رکھا گیا۔

علامہ ریاضی بہاء الدین محمد عالمی اپنی کتاب ”تشریح الافلاک“ میں اسطرلاب
 والا طریقہ بتا کر لکھتے ہیں:-

”طریق آخر سهل من الاول تاخذ يوم كون الشمس في احد
 الجزئين السابقين (اي ثامته الجوزاء والثالثة والعشرين
 من السرطان) لكل خمس عشر درجة من التفاوت بين
 الطولين ساعة ولكل درجة اربع دقائق فاذا مضى من
 نصف النهار بقدر ما معك من الساعات والدقائق
 ان زاد طول البلد او بقى له يقدره ان نقص فظل لمقياس

ح خط سمت القبلة وهى على خلاف جهت الظل :-
 علامہ عصمت اللہ اس کی شرح میں اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں :-
 ”وذلك لان دائرة الارتفاع تمر حينئذ بسمت راس مكة
 ايضا والظل يكون في سطحها فخط الظل هو خط سمت
 القبلة فما يمازى احد طرفي هذا الخط من اجزاء الدائرة
 الهندية يكون نقطة سمت القبلة :-“

سمت قبلہ معلوم کرنے کا ایک اور آسان طریقہ | یہ تو مشرقی صاحب کو سمت
 قبلہ کے معلوم کرنے کے

آلات کا پتہ بتانا تھا۔ اب عام مسلمانوں کے لیے سمت قبلہ نکالنے کی سہل ترین
 ترکیب لکھتا ہوں۔ ۲۹ مئی اور ۱۴ جولائی کو تاریخوں میں اپنے شہر اور مکہ معظمہ میں
 جتنے گھنٹہ اور منٹ کا فرق ہو، نصف النہار کے بعد اتنے گھنٹہ اور منٹ پر کسی
 عمود یا پایہ کا سایہ دیکھیں۔ یا خود سیدھے دھوپ میں کھڑے ہو جائیں۔ اس
 وقت کا سایہ ٹھیک سمت قبلہ کو بتائے گا۔ مکہ معظمہ اور کسی شہر کے وقت میں گھنٹہ
 اور منٹ کا فرق اس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ اطلس کے آخر میں شہروں کا طول
 و عرض دیا ہوتا ہے، اس سے مکہ معظمہ اور اس شہر کا طول معلوم کر کے چھوٹے کوٹے
 سے تفریق کریں۔ حاصل تفریق کو چار میں ضرب دے کر ساٹھ پر تقسیم کریں، اس سے
 گھنٹہ منٹ معلوم ہو جائے گا۔

کاش مشرقی صاحب لاہور کی مساجد کو کم از کم اسی قاعدہ سے دیکھنے کے بعد
 ان کی سمت قبلہ کے غلط ہونے کا حکم لگاتے۔
 آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے :-

”میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سب نمازی مسلمان اگر اپنی نازوں کو
 بارگاہ خداوندی میں پھر قبول کرانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے غلط
 قبلوں کو اس صحیح نقشہ سے درست کر لیں جو میں نے الاصلاح میں دیا ہے

یا اس سے بہتر نقشہ سے درست کر لیں۔ غلط قبلوں والی مسجدوں پر آلاتِ رصدیہ کے ذریعہ سے صحیح قبلوں کے نشان از سر نو لگوائیں۔ حتیٰ الوسع پرانی مسجدوں میں جن کے قبلے یقیناً درست ہوں گے، اپنی نمازیں علیٰ الخصوص جمعہ کی نماز ادا کریں۔

نماز کی قبولیت اور عدم قبولیت اور چیز ہے اور شرائط و ارکان کے مطابق ہونا اور چیز۔ ٹھیک سمت قبلہ پر نہ ہونے سے عدم قبولیت کا حکم لگانا ہرگز صحیح نہیں۔

مشرقی صاحب کے نقشہ کی غلطیاں | اس سلاح کے نقشوں سے قبلوں کی درستگی کی بھی ایک ہی کپی، آپ حکم تو تمام ہندوستان

کے مسلمانوں کو دے رہے ہیں اور نقشے میں صرف چند جگہوں کے نام دیے ہیں اور وہ بھی غلط، مثلاً پٹنہ کا طول ۸۵ ہے، آپ کے نقشہ میں ۹۰ درجہ سے بھی پورب یعنی ۹۲ درجہ ہے۔ در عرض ۲۵ درجہ ہے۔ مگر آپ کے نقشہ میں خط سرطان کے قریب یعنی ۲۲ درجہ ہے۔ اولاً تو یہ قاعدہ ہی غلط ہے۔ اگر قاعدہ صحیح بھی ہو تو مشرقی صاحب کے نقشہ میں ایسی فاش غلطیاں ہیں کہ ان پر بنیاد رکھنا کسی طرح صحیح نہیں اگر صحیح نقشہ بھی دستیاب ہو جائے تو اس میں گنتی کی چند جگہوں کے سوا تمام آبادیوں کے نام نہیں ہوتے۔ پھر نقشہ میں اگر وہ جگہ جس کی سمت قبلہ معلوم کرنی ہے مل بھی گئی، تو نقشہ میں مکہ معظمہ اور اس شہر کے درمیان خط بھینچ دینے سے اس شہر کی مسجدوں کی سمت قبلہ کس طرح معلوم ہوگی پھر سطحی خط اور بے کردی خط اور نقشہ میں ان دونوں شہروں کے درمیان خط ملا دینے سے اس دائرہ کے مساحت پر کس طرح ہوگا، جو سمت الراس مکہ معظمہ پر گزرتا ہو اور افق بلد سے متقاطع ہو۔

ہزار نکتہ باریک ترزمو اینجاست
مہر کہ مو بترا شد قلندری داند

سب سے پر لطف آلاتِ رصدیہ کے ذریعہ مسجدوں کے صحیح
ایک پر لطف تجویز | قبلوں کا نشان بنانے کی تجویز ہے۔ اولاً ہر مسجد کے لیے قیمتی
آلات آئیں گے کہاں سے۔ پھر ہر جگہ کے عوام ان کے استعمال سے واقف نہیں، مولویوں

اور ملاؤں کو آپ ناواقف بنا چکے ہیں تو کیا ہر جگہ آپ خود زحمت گوارا فرمائیں گے، جن جن مسجدوں میں آپ نے نمازیں پڑھی ہیں، کیا ان کی سمت قبلہ آپ نے آلات کے ذریعہ سے درست کر لی تھی، اچھرہ کی مسجد کا جہاں آپ چار سال سے مقیم ہیں اور جس میں آپ نے ہزاروں نمازیں پڑھی ہوں گی سمت قبلہ کیا ہے، نقطہ مغرب سے کس قدر اور کس جانب انحراف ہے، کسی ایسی تجویز کا جس پر خود عمل نہ ہو پیش کرنا مضحکہ انگیز ہے۔

مشرقی صاحب نے | کیا مسجد کی قدامت اس کے سمت قبلہ کی صحت کی دلیل ہے | لاہور کے مسلمانوں کو

مشورہ دیا ہے کہ ”وہ اپنی تمام نئی مسجدوں کو چھوڑ کر شاہی مسجد بسنہری مسجد اور وزیر مسجد وزیر خاں میں نماز ادا کریں“

کیا مشرقی صاحب نے ان مسجدوں کی سمت قبلہ کی تحقیق کر لی ہے یا محض قدامت کی بناء پر ان کی صحت تسلیم کرتے ہیں، ان کے بیان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قدامت کی بناء پر ان کا قبلہ صحیح سمجھتے ہیں، اس لیے کہ لاہور کی تمام مسجدوں کے سمت قبلہ سے منحرف ہونے کا فتویٰ دے چکے ہیں۔

مشرقی صاحب کا رسالہ ”مولوی کا غلط مذہب نمبر ۹“ شروع سے آخر تک خاتمہ | بالکل غلط ہے جو مسجدیں سمت قبلہ کے مطابق ہیں خواہ وہ نئی ہوں یا پرانی،

ان کی نمازوں کے سمت قبلہ کے موافق ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں اور جن مسجدوں کے قبلے صحیح سمت میں نہیں ہیں تو اگر وہ ۴۵۰ درجہ کے اندر تک ہیں جب بھی نماز صحیح ہو جائے گی۔ گو ہمارے بتائے ہوئے قاعدہ کے مطابق اون کی سمت قبلہ صحیح کر لینا ضروری ہے لیکن اگر اون کی موجودہ حالت میں بھی ان میں نمازیں پڑھی جائیں، جب بھی ہو جائیں گی، و سمت کعبہ کی جانب رخ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ رخ کا کوئی جزو کعبہ کی سمت میں واقع ہو، پس اگر کعبہ سے خفیف انحراف بھی ہو لیکن رخ کا کوئی جزو کعبہ کے مواجہ میں ہو تو نماز ہو جائے گی۔ البتہ اگر وہ ۹۰ درجہ سے زیادہ انحراف ہوگا تو استقبال نہ ہوگا۔ اور اس صورت میں نماز نہ ہوگی، جیسا کہ اس

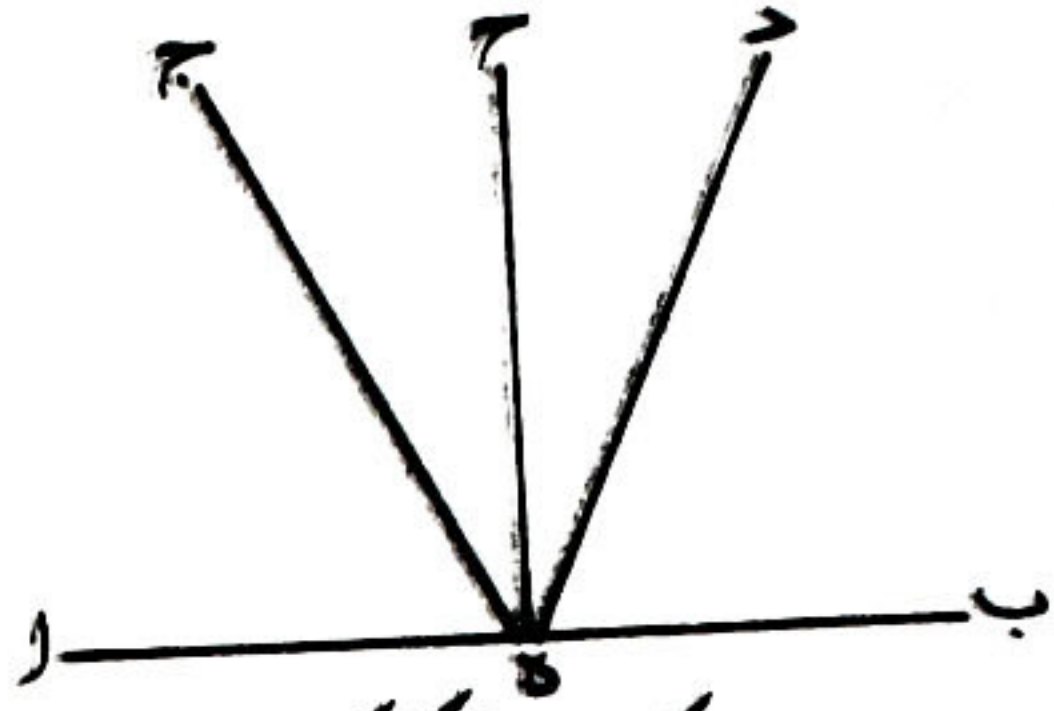
شکل سے واضح ہوگا مثلاً اب ایک

خط ہے اس پر ۲۵ عمود ہے فرض

کیجیے کہ کعبہ معظمہ میں نقطہ ۲ کے

محاذی ہے دونوں قارئین ۱۵۲ .

اور ۲۵ ب کی تصحیف کرتے ہوئے



خطوط ۲۵ اور ۲۵ ج کھینچے تو یہ زاویے ۲۵، ۲۵ درجے کے ہوتے کیونکہ قائمہ ۹۰ درجہ کا ہوتا ہے۔ اس شکل کے مطابق جو شخص مقام ۵ پر کھڑا ہے، اگر نقطہ ۲ کی طرف رخ کرے تو عین کعبہ کی جانب ہوگا اور اگر ماہی یا بائیں دیا ج کی طرف جھکے تو جب تک ۲۵ یا ۲۵ ج کے اندر ہے، بہت کعبہ میں ہے اور جب دسے بڑھ کر د ب یا ج سے گزر کر ج کے درمیان ہو جائے گا تو بہت بالکل بدل جائے گی اور نماز نہ ہوگی۔

(منقول از رسالہ معارف اعظم کتب بابت ماہ جنوری و فروری ۱۹۳۷ء)

رفع الملامة
عن
القيام عند اول القيامة

اقامت کے وقت مقتدی

کب
کھڑے ہوں؟

”اس موضوع پر حضرت مفتی صاحب مدظلہم کا ایک رسالہ پہلے بھی دیوبند میں شائع ہو چکا ہے بعد ازاں موصوف کو نظر ثانی کا موقع ملا تو بہت سی ترمیم و اضافہ کے بعد یہ ایک نیا رسالہ بن گیا، جو ترمیم کے بعد پہلی بار السبلغ صفحہ ۳۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔“



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله وكفى وسلا على عبادة الذين اصطفى

اما بعد . اقامتِ نماز کے وقت امام اور مقتدی کس وقت کھڑے ہوں ؟ شروع اقامت سے یا بعد میں موذن کے کسی خاص کلمہ پر یہ ایک ایسا فروعی مسئلہ ہے کہ اُس کی جانب میں گناہ نہیں . دونوں ہی طریقے شرعاً جائز ہیں فرق اور اختلاف صرف اس میں ہے کہ افضل اور اولیٰ کون سا طریقہ ہے . اگر کچھ کراہت ہے تو وہ صرف اس صورت میں ہے کہ امام کے مسجد میں آنے سے پہلے اقامت شروع کر دیں اور سب مقتدی کھڑے ہو کر امام کے آنے کا انتظار کرتے رہیں . یہ صورت عموماً کس ہوتی نہیں ، اور جو صورت عام طور پر پیش آرہی ہے کہ امام بھی موجود مقتدی بھی ، اس میں شروع سے کھڑا ہو جانا بھی بغیر کسی کراہت یا اختلاف کے جائز ہے اور کچھ تاخیر سے کھڑا ہونا بھی کسی کے نزدیک مکروہ نہیں . اس مسئلے کو بحث و مباحثہ اور باہمی جدال جھگڑے کا ذریعہ بنا لینا کوئی کارِ خیر نہیں بلکہ باہمی جدال اور جھگڑے سے جو فساد پیدا ہو جاتے ہیں . اُن میں فریقین سخت گناہوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں . ایک دوسرے کی توہین کرنے لگتے ہیں ، باہمی منافرت پیدا ہو جاتی ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی سختی کے ساتھ روکا ہے . حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا کل المسلم علی المسلم حرام دمه وماله وعرضه یعنی ایک مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لئے حرام ، اُس کا خون بھی ، اُس کا مال بھی اُس کی آبرو بھی . توہین اور سخت کلامی میں ایک دوسرے کی آبرو پر حملہ ہوتا ہے جو از روئے حدیث مذکور حرام ہے . دوسری حدیث میں ارشاد ہے سباب المسلم فسوق ، یعنی کسی مسلمان کو گالی دینا بُرا کتنا فسق ہے . اب سمجھنے کی بات ہے کہ ایک اولیٰ و افضل پر عمل کرنے کے لئے اتنے حرام

اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا وانشتمندی ہے خصوصاً اس زمانے میں کہ پورے عالم اسلام کو صرف مسلمانوں کے باہمی تفرقہ نے تباہی کے کنارے پر لگا دیا ہے۔ اس زمانے میں تو ایسے مسائل میں ہر مسلمان کو چاہیے کہ جس عالم بزرگ پر اعتماد ہو اس کے سنتوں کے مطابق اپنے عمل میں افضل کو تلاش کر کے اس پر عمل کرے، دوسرے اگر اس کے خلاف عمل کرتے ہیں، بغیر کسی جھگڑے کے زمی سے سبھا دینے کا موقع ہو تو سبھا دے ورنہ اُس کو اُس کے طریقہ پر چھوڑ دے۔

مندرجہ رسالہ سوال و جواب اب سے تیس سال پہلے دارالعلوم دیوبند میں لکھا گیا تھا چونکہ عوام یہاں بھی اس مسئلہ میں الجھتے رہتے ہیں اس لئے مسئلہ کی پوری حقیقت واضح کرنے کے لئے اس کو کسی قدر اضافہ و ترمیم کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ مگر یہ پھر سرد من ہے کہ اگر سمجھ میں آجائے تو خود عمل کریں، دوستوں کو بتلا دیں، جو لوگ اس کے خلاف کریں، اُن سے کوئی جھگڑے کی صورت ہرگز نہ بننے دیں۔

واللہ المستعان

بندگ محمد شفیع، دارالعلوم کراچی

۲۴/ربیع الاول ۱۳۹۲ھ

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ بوقت قیام الی الجماعت امام اور مقتدین کا ابتداء اقامت سے کھڑا ہونا مستحب ہے یا حی علی الفلاح پر، اگر مقتدین بغیر امام یا مع الامام ابتداء اقامت سے کھڑے ہو جائیں تو کیا ان کا یہ عمل کراہت میں داخل ہے۔ اگر کراہت میں داخل ہے تو سیدنا فاروق اعظمؓ کا ابتداء اقامت سے کھڑے ہو کر صفوف کو استوار کرنا اور اس پر عمل کی تلقین کرنا کراہت کے خلاف ہے اور اگر قیام من ابتداء الاقامت مکروہ نہیں تو حاشیہ طحاوی میں تحریر کردہ حکم کراہت قیام من ابتداء الاقامتہ کا کیا جواب ہے۔ مع حوالہ کتب بیان فرما کر تشفی بخشیں مینو او توبرہ

الجواب وباللہ التوفیق

سوال کے جواب میں پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس معاشرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا تعامل کیا اور کس طرح رہا ہے اسی کے سمجھنے سے سب سوالات کا خود بخود حل ہو جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل :

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن سمرہ سے روایت ہے کہ

۱ — کان بلال یؤذن اذا دحضت الشمس فلا یقیم حتی یرج

النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاذا اخرج الامام اقام الصلوٰۃ۔

(مسلم باب متى یقوم الناس فی الصلوٰۃ، ص ۱۲۰ ج ۱)

حضرت بلالؓ اذان ظہر اُس وقت دیتے تھے جب آفتاب کا زوال ہو جاتا، پھر اقامت اُس وقت تک نہ کہتے تھے جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکان سے باہر نہ آجاتے، جب باہر تشریف لاتے تو نماز کی اقامت کہتے تھے۔

نیز صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ،

۲ — ان الصلوٰۃ كانت تقام لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فياخذ الناس مصافهم قبل ان يقوم النبي صلی اللہ علیہ وسلم

مقامه (مسلم ص ۱۲۰ ج ۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کے لئے نماز کھڑی کی جاتی تھی، اور لوگ آپ کے کھڑے ہونے سے پہلے اپنی اپنی جگہ صفوں میں لے لیتے تھے۔

۳ — عن ابی ہریرۃ رضی یقول اقیمت الصلوٰۃ فقمنا فعادنا

الصفوف قبل ان یرج الینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

المحدث (مسلم ص ۱۲۰)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ: ایک بار نماز کھڑی کی گئی تھی، ہم کھڑے ہوئے اور

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہماری طرف نکلنے سے پہلے ہی ہم نے صفیں درست کر لیں۔
 ۴ — عن ابی قتادۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 اذا اقيمت الصلوة فلا تقوموا حتى ترونی رنجاری باب متی یقوم
 الناس اذا راوا الامام عند الاقامة و هذا کما رواه مسلم
 فتح الباری ج ۲ ص ۹۴

حضرت ابو قتادہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب
 نماز کھڑی ہو جائے تو تم کھڑے نہ ہو جب تک مجھے اپنی طرف آنا ہوا نہ دیکھ لو۔
 ۵ — روى عبد الرزاق عن ابن جریر عن ابن شہاب ان
 الناس كانوا ساعة يقول المؤذن الله اكبر يقومون الى الصلوة
 فلا ياتي النبي صلی اللہ علیہ وسلم مقامه حتى تعتدل الصفوف۔
 ابن شہاب سے مروی ہے کہ جس وقت مؤذن اللہ اکبر کہتا تھا لوگ نماز کے لئے
 کھڑے ہو جاتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے تک صفیں
 درست ہو جاتی تھیں (فتح الباری ص ۹۵، ج ۲)

۶ — عن عبد اللہ ابن اوفی رضی اللہ عنہ قال کان بلال اذا قال قد قامت
 الصلوة نهض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ذکرہ فی مجمع الزوائد
 عن مسند عبد الرزاق)

حضرت عبد اللہ بن اوفی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جب قد قامت الصلوة
 کہتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوتے تھے۔

مسئلہ زیر بحث کے متعلق یہ چھ احادیث ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
 اپنا عمل اس مسئلے کے متعلق بیان فرمایا ہے۔ ان میں پہلی حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت
 بلال رضی اللہ عنہ کی عام عادت یہ تھی کہ حجرہ شریفہ کی طرف نظر رکھتے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کو دیکھتے کہ آپ باہر تشریف لے آئے تو اقامت شروع کرتے تھے، زرقانی
 نے شرح موطا میں اور قاضی عیاض نے شرح شفا میں اس حدیث کا یہی مفہوم لکھا ہے،

ان کے الفاظ یہ ہیں -

ان بلا لا کان یراقب خروج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاؤل
ما یراہ یشرع فی الاقامة قبل ان یراہ غالب الناس ثم اذا راوه
قاموا فلا یقوم مقامہ حتی تعدل صفوفہم -

درنار قاتی علی الموطاء ص ۱۳۴، ج ۱

حضرت بلال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکلنے کا انتظار کرتے تھے اور آپ پر
نظر پڑتے ہی اقامت شروع کر دیتے تھے اور ابھی اکثر لوگوں کی نظروں کے سامنے
آپ نہ آنے پاتے تھے۔ پھر جب لوگ آپ کو دیکھتے تھے تو کھڑے ہو جاتے تھے اور
آپ صفیں درست ہونے سے پہلے اپنی جگہ نہیں کھڑے ہوتے تھے۔

دوسری اور تیسری حدیث سے بھی یہ ثابت ہوا کہ صحابہ کرام کی عام عادت یہ تھی
کہ جب مؤذن تکبیر شروع کرے تو سب لوگ کھڑے ہو کر صفوف کی درستی کر لیتے تھے
امام نوویؒ نے شرح مسلم میں تیسری حدیث کے جملہ فعدا لنا الصفوف پر فرمایا کہ،
اشارۃ الی انہ ہذا سنتہ معہودۃ عندہم وقد اجمع العلماء

عمل استجاب تعدیل الصفوف -

اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ یہ ان کے نزدیک سنت ہے اور علماء کا اجماع
ہے کہ صفیں سیدھی کرنا مستحب ہے، چوتھی حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات ایسا
بھی ہوا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے باہر تشریف لانے
سے پہلے ہی اقامت شروع کر دی اور حسب دستور سب صحابہ اقامت شروع ہوتے
ہی کھڑے ہو گئے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ دیر لگی تو آپ نے یہ ہدایت
دی کہ میرے نکلنے سے پہلے کھڑے نہ ہوں۔ مقصد اس کا ظاہر ہے کہ لوگوں کو مشقت
سے بچانے کے لئے فرمایا ہے اور اس حدیث کے الفاظ لاقہ وواحتی تروقی یعنی
اس وقت تک کھڑے نہ ہو جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ میں گھر سے باہر آ گیا ہوں۔ اس لفظ
سے بھی یہ مفہوم ہوتا ہے کہ میرے باہر جانے کے بعد کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

کما قال الزرقانی فی شرح الموطا راتہ منی عن القیام قبل خروجه وتسیغ

لا عند رؤیتہ - ص ۱۳۳ ج ۱

پانچویں حدیث میں اصل عادت اور عام تعامل یہ معلوم ہوا کہ حضرت بلال اقامت اس وقت شروع کرتے، جب دیکھ لیتے کہ آپ حجرہ شریفہ سے باہر تشریف لے آئے اور اقامت شروع ہوتے ہی حسب دستور صحابہ کرام کھڑے ہو کر صفوف کی درستی کر لیتے تھے۔

پھٹی حدیث سے ایک خاص صورت یہ بھی معلوم ہوئی کہ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے پہلے ہی مسجد میں تشریف فرما ہوتے تھے تو آپ اس وقت کھڑے ہوتے تھے، جب مؤذن قد قامت الصلوٰۃ پر پہنچتا تھا، اس سے ظاہر یہ ہے کہ عام صحابہ کرام بھی آپ کے ساتھ اسی وقت کھڑے ہوتے ہوں گے۔

ان سب روایات حدیث کے مجموعہ سے ایک بات قدر مشترک کے طور پر یہ ثابت ہوئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی مسجد میں تشریف فرما ہوتے بلکہ گھر میں سے تشریف لاتے تھے تو آپ کو دیکھتے ہی حضرت بلال اقامت شروع کرتے اور سب صحابہ کرام شروع اقامت سے کھڑے ہو کر تعدیل صفوف کرتے تھے، آپ نے اس کو کبھی منع نہیں فرمایا، البتہ گھر میں سے باہر تشریف لانے سے پہلے اقامت کہنے اور لوگوں کے کھڑے ہونے سے منع فرمایا ہے وہ بھی از روئے شفقت ممانعت تھی جس کو فقہاء کرام کی زبان میں مکروہ تنزیہی کہا جاسکتا ہے۔

تابع سنت خلفاء راشدین کا تعامل :

۱۔ عن نعمان بن بشیر رضی قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم یسوی صفوفنا اذا قمنا الى الصلوٰۃ فاذا استوینا صعب

(مواہج الوداد)

حضرت نعمان بن بشیر رضی سے مروی ہے کہ جب ہم نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفیں درست کرتے تھے اور جب ہم

سیدھے ہو جاتے تھے تو تکبیر تحریمہ کہتے تھے۔

۲ ————— روى عن عمر بن الخطاب انه كان يوكل رجلاً باقامة الصفوف
فلا يكبر حتى يخبر ان الصفوف قد استوت (اخرجه الترمذى و
قال دروى عن على وعثمان انهما كانا يتعاهدان ذلك) یہ دونوں حدیثیں
نیل الاوطار کی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صفیں درست کرنے کے لئے لوگ متعین کر دیئے تھے اور صفیں
درست ہونے کی خبر جب تک نہ دی جاتی تکبیر تحریمہ نہیں کہتے تھے (امام ترمذی نے
اس حدیث کی روایت کی ہے اور فرمایا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی
اس امر کا اہتمام کرتے تھے۔

ان میں پہلی حدیث سے خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور دوسری حدیث
سے خلفاء راشدین میں سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کا یہ
تعالل اور عام عادت معلوم ہوئی کہ وہ صفوں کی درستی کی خود بھی نگرانی کرتے تھے اور
جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ صفیں سب درست ہو گئیں یعنی نہ صف کے درمیان میں کوئی
جگہ چھوڑی گئی اور نہ آگے پیچھے رہے اس وقت تکبیر نماز کی شروع فرماتے تھے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ صحیح ہو سکتا ہے جب لوگ شروع اقامت سے کھڑے ہو
جائیں جیسا کہ اوپر احادیث مرفوعہ سے صحابہ کرام کی عام عادت بھی ثابت ہو چکی
ہے درتہ اگر حی علی الصلوٰۃ یا حی علی الفلاح یا قد قامت الصلوٰۃ پر لوگ کھڑے ہوں
تو اس کے بعد یہ تسویہ صفوں کا انتظام کیا جائے تو یہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ اقامت
ختم ہو جانے کے کافی دیر بعد نماز شروع ہو جاوے یہ باتفاق علماء مذہب موم ہے۔

مذہب فقہاء

حضرات فقہاء نے اس مسئلہ کو بعنوان آداب الصلوٰۃ لکھا ہے اور آداب سے مراد
وہ افعال ہیں جن کا چھوڑ دینا کسی کراہت یا عتاب کا موجب نہیں ہوتا، کرنا اس کا فضل
ہے، نہ کرنے والے پر بھی نیکر کرنا جائز نہیں بلکہ نیکر کرنا بدعت ہے۔ در مختار میں فصل

صفة الصلاة سے پہلے لکھا ہے:

ولها آداب تركها لا يوجب اساءة ولا اعتبارا بترك سنة
الزوائد و فعله افضل -

اور نماز کے کچھ آداب ہیں جن کے چھوڑنے سے گناہ نہیں ہوتا اور نہ ملامت
ہوتی ہے مثلاً سنن زوائد کو ترک کرنا، ہاں اس کا کرنا افضل ہے۔ اس استحباب میں
مذاہب ائمہ مجتہدین امام نووی نے شرح مسلم میں اس طرح لکھا ہے:

مذاہب الشافعی رحمہ و طائفة انه يستحب ان لا يقوم احد حتى
يقع المؤذن من الإقامة و نقل القاضی ^{عیاض} عن مالك و عامة العلماء
انه يستحب ان يقوموا اذا اخذ المؤذن في الإقامة و كان النس يقيم
اذا قال المؤذن قد قامت الصلاة و به قال احمد و قال
ابو حنيفة و الكوفيون يقومون في الصف اذا قال حي على الصلاة -

(نووی شرح مسلم، ص ۳۲۱، ج ۱)

امام شافعیؒ اور ان کے علاوہ ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ مؤذن کے اقامت
سے قانع ہونے تک کسی کا کھڑا نہ ہونا مستحب ہے۔ قاضی عیاض نے امام مالکؒ
اور عامۃ العلماء سے نقل کیا ہے کہ مؤذن کے اقامت شروع کرتے وقت لوگوں کا
کھڑا ہو جانا مستحب ہے اور جب مؤذن قد قامت الصلاة کہتا تھا تو حضرت انسؓ
کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ حضرت امام احمدؒ بھی اسی کے قائل ہیں اور حضرت امام ابو حنیفہؒ
اور دیگر اہل کوفہ نے فرمایا ہے کہ حی علی الصلاة کہتے وقت صف میں کھڑے ہو جائیں۔

اور مذہب حنفیہ کی پوری تفصیل عالمگیری اور بدائع میں حسب ذیل ہے۔

ان كان المؤذن غير الامام وكان القوم مع الامام في المسجد فانه
يقوم الامام والموقف اذا قال حي على الفلاح عند علمائنا الثلاثة وهو
الصحيح فاما اذا كان الامام خارج المسجد فان دخل من قبل الصفوف
فكلما جاوزه صف قائم ذلك الصف و اليه مال شمس الائمة السرخسي

و شیخ الاسلام خواہر زادہ وان کان الامام دخل المسجد من
 قدامہم یقومون کما راوا الامام ولا یقومون مالہ یدخل المسجد
 (عالمگیری، ص ۳۵، ج ۱)

اگر مؤذن امام کے علاوہ ہو اور مقتدی حضرات امام کے ساتھ مسجد میں ہوں تو
 امام اور مقتدی حی علی الفلاح کہتے وقت کھڑے ہو جائیں ہمارے آئمہ ثلاثہ کا مذہب
 یہی ہے اور یہی قول صحیح ہے اور اگر امام خارج مسجد ہو تو دیکھا جائے اگر امام صفوں
 کی طرف سے داخل ہو تو امام جس صف سے آگے بڑھتا جائے اس صف کے لوگ
 کھڑے ہوتے جائیں۔ اسی طرف شمس الائمہ سرخسی اور شیخ الاسلام خواہر زادہ بھی مائل
 ہوئے ہیں اور اگر امام مقتدیوں کے سامنے سے داخل ہو تو امام کو دیکھتے ہی سب کھڑے
 ہو جائیں اور جب تک مسجد میں داخل نہ ہو کھڑے نہ ہوں۔

اور بدائع میں اس تفصیل مذکور کی یہ حکمت بھی بیان فرمائی ہے کہ:

لان القيام لاجل الصلوة ولا یکن ادائها بدون الامام فلم یکن
 القيام مفیداً ثم ان دخل الامام من قدام الصفوف کما راوا ولا قاموا
 لانه کما دخل المسجد قام مقام الامامة وان دخل من وراء
 الصفوف فالصیبر انه کما جاوز صفاً قام ذک الصف لانه صا
 بجال لواقته و ابہ جار فصار فی حقہم کانه اخذ مکانہ۔

(بدائع، ص ۲۰۰، ج ۱)

اس لئے کہ قیام نماز ادا کرنے کے لئے ہے اور نماز ادا کرنا بدون امام کے ممکن نہیں
 لہذا قیام (بغیر امام کے) مفید نہ ہوگا، پھر اگر امام صفوں کے سامنے سے مسجد میں داخل
 ہو تو امام کو دیکھتے ہی سب کھڑے ہو جائیں کیونکہ امام مسجد میں داخل ہوتے ہی امامت کی
 جگہ کھڑا ہو گیا، اور اگر امام صفوں کے پیچھے سے داخل ہو تو صحیح قول کے مطابق امام
 جس صف سے آگے بڑھتا جائے اسی صف کے لوگ کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ امام جس
 صف سے آگے بڑھ گیا، ان کے حق میں اسی حالت پر ہو گیا کہ اگر اس کے پیچھے اقتدار

کریں تو کر سکتے ہیں۔ لہذا امام گویا ان کے حق میں اپنی جگہ پر آ گیا۔
اور مذہب مالکیہ کی تشریح خود امام مالکؒ نے جو موطا میں ایک سوال کے جواب میں
فرمائی وہ یہ ہے،

متی يجب القيام على الناس حين تمام الصلاة قال مالك و اما
قيام الناس حين تمام الصلاة فاقى لم اسبح في ذلك بعد يقام له
الا اى اذ لك على قدر طاقة الناس فان منهم الثقيل و الخفيف
ولا يستطيعون ان يكونوا كرجل و احدا (موطاء امام مالك)

ناز شروع ہوتے وقت لوگوں پر قیام کب واجب ہے؟ حضرت امام مالک
نے فرمایا کہ ناز شروع ہوتے وقت لوگوں کے قیام کے بارے میں کوئی حد متعین نہیں
سُنی کہ اس وقت کھڑے ہوں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگوں کی طاقت کے مطابق
ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ان میں بعض بیماری میں اور بعض ٹکے ہوتے ہیں۔ اور سب ایک
طرح کے نہیں ہو سکتے۔

مسئلہ زیر بحث کے متعلق ائمہ اربعہ کے مذاہب مذکورہ صدر عبارات میں آگئے
ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک تو اقامت ختم ہونے کے بعد کھڑا ہونا
مستحب ہے۔ امام مالک کے نزدیک حسب روایت قاضی عیاض شروع اقامت ہی
سے کھڑا ہونا مستحب ہے، البتہ موطا کی تشریح سے یہ معلوم ہوا کہ کسی خاص حد پر یہی
قیام واجب نہیں بلکہ لوگوں کو ان کی سہولت پر چھوڑا جائے۔ بیماری بدن کمزور آدمی
ویر میں اٹھتا ہے بلکہ آدمی ویر میں اٹھتا ہے بلکہ آدمی جلدی اٹھ جاتا ہے۔

امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ معلوم ہوا کہ جب مؤذن قدامت الصلاة کہے اس وقت
کھڑا ہونا چاہیے۔

امام عظیم ابو حنیفہ کے مذہب میں وہ تفصیل ہے جو عالمگیری اور بدائع کے حوالہ
سے اوپر مذکور ہوئی کہ امام اور مقتدی اگر اقامت سے پہلے ہی مسجد میں موجود تھے تو صحیح
روایت کے مطابق حی علی الفلاح پڑھا جانا چاہیے اور اگر امام باہر سے آ رہا ہے تو اگر

وہ محراب کے کسی دروازے سے یا اگلی صف کے سامنے سے آئے تو جس وقت مقتدی امام کو دیکھیں اس وقت کھڑے ہو جائیں اور اگر وہ پہلی صفوف کی طرف سے آ رہا ہے تو جس صف سے گزرے وہ صف کھڑی ہوتی پہلی جائے۔
ایک تشبیہ:

البحر الرائق میں حنفیہ کے مذہب کی تفصیل لکھتے ہوئے جہاں یہ بیان کیا ہے کہ جب امام اقامت سے پہلے ہی مسجد میں موجود ہو تو حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا چاہیے اس کی علت یہ بیان فرمائی ہے:

والقیار حین قیل حی الفلاح لانه امر يستجب المسارعة اليه
(بحر ص ۲۳۱، ج ۱)

حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا اس لئے افضل ہے لفظ حی علی الفلاح کھڑے ہونے کا امر ہے اس لئے کھڑے ہونے کی طرف مسارعت کرنا چاہیے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات نے حی علی الفلاح پر یا قدامت الصلوة پر کھڑے ہونے کو مستحب فرمایا ہے۔ ان کے نزدیک استحباب کا مطلب یہ ہے کہ اس امر کے بعد بیٹھے رہنا خلاف ادب ہے نہ یہ کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا خلاف ادب ہے؛ کیوں کہ پہلے کھڑے ہونے میں تو اور بھی زیادہ مسارعت پائی جاتی ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ جن حضرات ائمہ نے حی علی الصلوة پر کھڑے ہونے کو مستحب فرمایا ہے اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا استحباب کے خلاف ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد بیٹھے رہنا خلاف ادب ہے کیونکہ وہ مسارعت الی الطاعت کے خلاف ہے۔

اس میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مذاہب ائمہ اربعہ میں دو باتیں متفق علیہ ہیں، ایک یہ ہے کہ یہ سب اختلاف محض افضلیت و اولویت کا ہے۔ اس میں کوئی جانب ناجائز یا مکروہ نہیں اور کسی کو کسی پر نکیر و اعتراف کرنے کا حق نہیں۔ اسی لئے مذاہب اربعہ کے متبعین میں کبھی اس پر کوئی جھگڑا نہیں سنا گیا۔

دوسرے یہ کہ باجماع صحابہ و تابعین و اتفاق آئمہ اربعہ صفوں کی تعدیل و درستی واجب ہے جو نماز شروع ہونے سے پہلے مکمل ہو جانا چاہیے اور یہ اس صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ عام آدمی شروع اقامت سے کھڑے ہو جائیں، بقول امام مالکؒ کوئی مکروہ و ضعیف بعد میں بھی کھڑا ہو تو مضائقہ نہیں۔

جیسا کہ خلفاء راشدین اور عام صحابہ کرام کا تعامل اس کے مطابق اور معلوم ہو چکا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس وقت امام اور مقتدی سب اقامت سے پہلے مسجد میں موجود ہوں تو امام عظیم ابو حنیفہ امام احمد بن حنبل کے نزدیک حی علی الفلاح اور قد قامت الصلوٰۃ پر کھڑا ہونا اور امام شافعی کے نزدیک آخر اقامت پر کھڑے ہونا افضل ہے اور امام مالک کے نزدیک شروع ہی سے کھڑا ہونا افضل ہے اور خلفاء راشدین اور عام صحابہ کرام کا تعامل بھی اس پر شاہد ہے اور اسی تعامل کی بناء پر حضرت سعید بن مسیب کا مذہب یہ ہے کہ شروع اقامت ہی سے سب کو کھڑا ہو جانا صرف مستحب نہیں بلکہ واجب ہے۔

مگر یہ امت میں کسی کا مذہب نہیں کہ امام اقامت کے وقت باہر سے آکر مصلیٰ پر بیٹھ جائے اور بیٹھنے کو ضروری سمجھے کھڑے ہونے والے مقتدیوں کو کھڑے ہونے سے روکے۔ جو کھڑا ہو اس کو برا سمجھے، پہلے کھڑے ہونے کو مکروہ اور برا سمجھنا اور بڑا کہنا آئمہ اربعہ میں سے کسی کا مذہب نہیں۔ مذہب حنفیہ کی مستند روایات بحوالہ عالمگیری و بدائع اور پرگز رچکی ہیں جن کو شمس لائٹہ شرحی اور دوسرے آئمہ حنفیہ نے اختیار کیا ہے۔ حنفیہ کی کتابوں کے متون و شروح اور فتویٰ کی کتابوں میں بجز ایک مضمرات کی روایت کے جس کو طحادی نے نقل کیا ہے کسی نے پہلے کھڑے ہونے کو مکروہ نہیں کہا اور کیسے کہہ سکتے تھے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین اور عام صحابہ و تابعین کے تعامل سے ابتداء اقامت میں کھڑا ہونا ثابت ہے اور آئمہ حنفیہ میں کسی نے اس کو مکروہ نہیں کہا۔

ابراہیم مضمورات کی روایت کا معاملہ تو اس روایت کے الفاظ طحاوی نے یہ نقل کئے ہیں:

وَاِذَا اخَذَ الْمُؤَذِّنُ فِي الْاِقَامَةِ وَدَخَلَ رَجُلُ الْمَسْجِدِ فَانْهَ يَقْعُدُ
وَلَا يَنْتَظِرُ قَائِمًا كَمَا فِي مَضْمَرَاتِ قَهْستَانِي

جب مؤذن اقامت شروع کرے اس حالت میں کوئی شخص مسجد میں داخل ہوا تو وہ شخص بیٹھ جائے، کھڑے ہو کر انتظار نہ کرے۔

اس روایت کا صاف مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اس صورت سے متعلق ہے جب کہ امام کے آنے سے پہلے اقامت شروع کر دی ہو جس کی ممانعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے کما ہوا اور اس کا لفظ لا ینتظر اس مفہوم کا قریب ہے کیوں کہ انتظار سے مراد انتظار امام ہے اس صورت میں یہ روایت عام روایات حنفیہ اور تمام کتب حنفیہ کے مطابق بھی ہو جاتی ہے اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت صحابہ کے بھی خلاف نہیں اور اگر اس کا مفہوم یہ لیا جائے کہ امام کے موجود ہونے پر اقامت کسی جا رہی ہو تو باہر سے آنے والے کے لئے کھڑا ہونا مکروہ ہے تو یہ خود مذہب حنفیہ کی تمام مستند روایات اور کتب حنفیہ کے متون و شروح کے خلاف ہونے کی وجہ سے بھی قابل ترک ہوگی اور خلاف سنت ہونے کی وجہ سے بھی اور جب کہ مضمورات کی اس روایت کا ایسا مفہوم بے تکلف بن سکتا ہے جو اوپر بیان کیا گیا۔ البتہ طحاوی نے اس کا یہ مفہوم قرار دیا جو سب متون شروح حنفیہ سے مختلف اور سنت صحابہ کے معارض ہے علامہ طحاوی کی جلالت قدر اور علمی عظمت اپنی جگہ ہے مگر مضمورات کی روایت کا یہ مفہوم قرار دینا خود اس روایت کے سقوط کا موجب بنتا ہے۔

اور خود علامہ طحاوی نے در مختار کی شرح میں وہی لکھا ہے جو اوپر عالمگیری اور بدائع کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ امام باہر سے اگر اگلی صف کی طرف سے آئے تو اس کو دیکھتے ہی سب کھڑے ہو جائیں اور پہلی صف کی طرف سے آئے تو جس

صن سے گزرے وہ کھڑی ہوتی جائے، البتہ در مختار میں ایک اور مسئلہ یہ لکھا ہے کہ اگر امام خود ہی اقامت کرنے لگے تو مقتدی اُس وقت تک نہ کھڑے ہوں، جب تک کہ اقامت پوری نہ ہو جائے۔ در مختار نے یہ مسئلہ طبریہ کے حوالے سے بیان کیا اور اس خاص مسئلہ کے تحت طحاوی نے لکھا ہے۔

در بیایو اخذ منہ کراہتہ تقدیم الوقوف فی البعث السابق

(طحاوی علی الدر ص ۲۳۵، ج ۱)

بسا اوقات لوگ اس سے تقدیم وقوف کی کراہت کا مفہوم نکالتے ہیں۔ اس کے الفاظ در بیایو اخذ سے خود اس کراہت کے مفہوم کے صنعت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس مفہوم کو طحاوی نے بھی اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہیں کیا، بلکہ یہ فرمایا کہ بعض لوگ اس سے یہ مفہوم مراد لیتے ہیں۔ حاصل یہ کہ تمام کتب حنفیہ میں سے ایک روایت مضمورات قمستانی کے الفاظ مشکوک ہیں اُن کا وہ مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے جو جمہور سلف اور تمام کتب حنفیہ کی تصریحات کے مطابق ہے اور دوسرا مفہوم کراہت تقدیم بھی لیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر روایت مضمورات کا یہی مفہوم لیا جائے تو وہ ائمہ مذہب کی تصریحات اور تمام متون و شروح حنفیہ کے مخالف ہونے کی وجہ سے قابل ترک اترتی ہے۔

خلاصہ کلام سے یہ بات واضح ہو گئی کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کا عمل پھر خلفاء راشدین مذکور الصدر تصریحات اور جمہور صحابہ و تابعین کا تعامل اس پر شاہد ہے کہ ان حضرات کا معمول و دستور یہی تھا کہ امام جب مسجد میں آجائے تو اول اقامت ہی سے سب لوگ کھڑے ہو کر صفوف کی درستی کریں اور جس صورت میں امام پہلے سے محراب کے قریب بیٹھا ہو اس میں بھی جماعی السلام پر کھڑے ہونے کو مستحب کہنا بھی بایں معنی ہے کہ اس کے بعد بیٹھے رہنا خلاف ادب ہے کیونکہ سارے امتی الی الطاعت کے خلاف نہ یہ کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا خلاف ادب ہے کیوں کہ ان میں

تو مساعرت اور زیادہ ہے اور یہ کہ جو طریقہ بعض مسجدوں میں اختیار کیا جاتا ہے کہ اقامت کے وقت امام باہر سے یا مسجد کے کسی گوشہ سے چل کر آئے اور آکر مصلتے پر بیٹھ جائے اور اس بیٹھنے کو اس درجہ ضروری سمجھے کہ جو لوگ پہلے کھڑے ہوں ان کو بھی بیٹھ جانے کی تاکید کرے جو نہ بیٹھے اس پر طعن کرے۔ یہ امت میں کسی امام و فقیہ کا مذہب نہیں خالص بدعت ہے۔

تنبیہ:

یہ تفصیل مسئلے کی اصل حقیقت واضح کرنے کے لئے لکھی گئی ہے اور آخری طریقہ جو جمہورِ آئمہ فقہاء کے خلاف ہے وہ اگرچہ مذموم ہے مگر مسلمانوں میں باہمی جھگڑا اور جنگ و جدال اس سے زیادہ مذموم و منحوس ہے اس لئے اس پر بھی کسی سے جھگڑانا مناسب نہیں۔ ہمدردی، خیر خواہی اور نرمی کے ساتھ مسئلے کی حقیقت ایسے لوگوں کو بتلا دیں جن سے امید قبول کرنے کی ہو ورنہ سکوت بہتر ہے خود اپنا عمل سنت کے مطابق رکھے دوسروں سے تعرض نہ کرے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم



رفع التّضاد

عن

احكام الضّاد

حرفِ ضاد کا صحیح صحیح مخرج

اور

اس کے احکام

مقام تالیف	دیوبند
تاریخ تالیف	۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۱ھ
مدت تالیف	پانچ گھنٹے
اشاعت اول	کتب خانہ اشرفیہ راشد کمپنی دیوبند

”حرفِ ضاد کا مخسرج ظار کے مشابہ ہے یا
 دال کے؟ نیز جن لوگوں سے حرفِ ضاد صحیح طور
 پر ادا نہیں ہوتا ان کی نمازوں کا کیا حکم ہے؟
 ان مسائل کی تحقیق اس مقالہ کا موضوع ہے
 اور اس میں دوسرے اکابر علماء کے فتاویٰ
 بھی شامل ہیں۔“

مفتی بغداد علامہ سید محمود الوسی کا فتویٰ

مُتَعَلِّقَةٌ حَرْفُ ضَادٌ

علامہ موصوف نے اپنی تفسیر روح المعانی میں آیت کریمہ وما هو علی الغیب بضنین کے تحت میں اس مسئلہ پر ایک جامع و مختصر کلام کے ساتھ اسی مضمون پر فتویٰ دیا ہے جو اس رسالہ کا لب لباب ہے اور بعض الفاظ ان کے یہ ہیں:-

وَالْفَرْقُ بَيْنَ الضَّادِ وَالطَّاءِ
مَخْرَجًا أَنَّ الضَّادَ مَخْرَجًا مِنْ أَصْلِ
حَافَةِ اللِّسَانِ وَمَا يَلِيهَا مِنَ
الْأَصْرَاسِ مِنْ يَمِينِ اللِّسَانِ أَوْ
يَسَارِهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَتَمَكَّنُ مِنْ
إِخْرَاجِهَا مِنْهُمَا وَالطَّاءَ مَخْرَجًا
مِنْ طَرَفِ اللِّسَانِ وَأَصُولِ التَّنَائِي
الْعُلْيَا وَاخْتَلَفُوا فِي رِبْدَالِ
أَحَدِهِمَا بِالْآخِرَى هَلْ يَمْتَنِعُ
وَتَفْسُدُ بِهِ الصَّلَاةُ أَمْ لَا فُقِيلَ
تَفْسُدُ قِيَاسًا وَنَقَلَهُ فِي الْمُحِيطِ
الْبُرْهَانِي عَنْ عَامَّةِ الْمُشَافِحِ وَ
نَقَلَهُ فِي الْخُلَامَةِ
عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ وَ
مُحَمَّدٍ وَقِيلَ لَا تَفْسُدُ اسْتِحْسَانًا
وَنَقَلَهُ فِيهَا عَنْ عَامَّةِ الْمُشَافِحِ

ضاد اور طاء میں مخرج کے اعتبار سے یہ فرق ہے کہ ضاد کا مخرج اصل حافہ لسان اور اس کے متصل کی دائیں ہیں بخواہ زبان کی داہنی جانب سے نکال جائے یا بائیں جانب سے اور بعض لوگ دونوں جانب سے نکالنے پر بھی قدر رکھتے ہیں۔ اور طاء کا مخرج طرف لسان اور تنایا علیا کی جڑ میں ہے اور علماء کا ان کے آپس میں ایک دوسرے سے بدل دینے کے بارہ میں اختلاف ہے کہ کیا یہ ابدال ناجائز اور مفسد نماز ہے یا نہیں بعض نے کہا ہے کہ اس سے نماز قاسد ہو جاتی ہے اور یہی قیاس ہے اور اسی کو محیط برہانی میں عامہ مشائخ سے نقل کیا ہے اور اسی کو خلاصہ میں امام ابو حنیفہ رح اور امام محمد رح سے نقل کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نماز قاسد نہ ہوگی اور یہی استحسان ہے اور اسی کو اُس میں عامہ مشائخ سے نقل کیا ہے مثل ابو مطیع بلخی اور محمد بن سلمہ اور ایک جانتا

نے یہ کہا ہے کہ جب دونوں میں فرق کرنے پر قدرت ہو اور پھر عمداً غلط پڑھے اور کسی قراءت میں یہ تبدیل منقول نہ ہو جیسے ولا الضالین اور غدا المفضوب علیہم میں ہے اور معنی بھی بدل جائیں تو ان تمام شرطوں کے ساتھ فساد نماز کا حکم کیا جائے گا ورنہ نہیں کیونکہ دونوں میں تیز دشوار ہے۔ خصوصاً اہل عجم پر اور واقعہ یہ ہے کہ بہت سے اہل عجم قرن اول میں مسلمان ہوئے اور کہیں منقول نہیں کہ صحابہ و تابعین نے ان کو فرق کرنے کی تحریص و تاکید کی ہو یا اس کے تعلیم حاصل کرنے کا امر کیا ہو اور اگر اہل عجم پر یہ فرق اور اس کی تعلیم واجب ہوتی تو وہ صحابہ ضرور اس کی تاکید کرتے اور ان سے اس کی نقل ہم تک پہنچتی اور یہی وہ چیز ہے کہ جس پر اعتماد کرنا اور مستوی دینا مناسب ہے۔

اور بعض لوگوں نے ایک مستقل رسالہ میں ان الفاظ کو جمع کر دیا ہے جن کے معنی ضاد اور ظلہ ہو کے آپس میں بدلنے سے بدلتے نہیں اور یہ رسالہ بہت اچھا ہے اس کو دیکھنا چاہیے۔

روح المعانی ص ۶۱ ج ۳۰

كَأَبِي مُطِيعِ الْبَلْبَعِيِّ وَمُحَمَّدِ بْنِ سَلَمَةَ
وَقَالَ جَمْعٌ إِذَا آمَنَ الْفَرْقُ بَيْنَهُمَا
فَتَعَمَّدَ ذَلِكَ وَكَانَ مِمَّا يَقْرَأُ بِهِ
كَمَا هُنَا وَغَيْرِ الْمَعْنَى أَفْسَدَتْ صَلَواتَهُ
وَالْأَفْلاَءُ لِعُسْرِ التَّمْيِيزِ بَيْنَهُمَا خُصُوصًا
عَلَى الْعَجَمِ وَقَدْ اسْلَمَ كَثِيرٌ مِنْهُمْ
فِي الصَّدْرِ الْأَوَّلِ وَكَمْ يُنْقَلُ عَنْهُمْ
حَثْمٌ عَلَى الْفَرْقِ وَتَعْلِيمًا مِنَ
الصَّحَابَةِ وَكَوْكَانَ لَا رِمًا لِفَعْلُوهُ وَ
نُقِلَ هَذَا هُوَ الَّذِي يُثْبِتِي أَنَّ
يَعُولُ عَلَيْهِ وَيُفْتِي بِهِ وَقَدْ جَمَعَ
بَعْضُهُمُ الْأَلْفَاظَ الَّتِي لَا يَخْتَلِفُ
مَعْنَاهَا ضَادًّا وَظَاءً فِي رَسَائِلِي
صَغِيرَةٍ وَقَدْ أَحْسَنَ بِذَلِكَ
فَلْيُرَاجِعْ فَإِنَّهُ مُهِمٌّ - (روح المعانی ص ۶۱ ج ۳۰)

رَفَعُ التَّضَادِّ

أَحْكَامُ الصَّادِّ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

العهد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

أَمَّا بَعْدُ

اہل عجم عربی حروف کے ادا کرنے میں جو غلطیاں کرتے ہیں ان میں سب سے زیادہ اشکال کی چیز حرف ضاد ہے کیونکہ اول تو حسب تصریح علماء قرأت و تجوید اس حرف کا ادا کرنا فی نفسہ مشکل ہے۔ مشاق اور ماہر قاریوں کو بھی اس میں مشقت کرنی پڑتی ہے عوام کا تو پوچھنا کیا (صَرَحَ بِهَا الْمُرْعَشِيُّ وَسَيَّاقِي عَنَّقِيَّيَا) پھر یہ حرف عام اتنا ہے کہ اس کے بغیر کوئی نماز ادا نہیں ہو سکتی سورہ فاتحہ جو واجباً صلوٰۃ میں ہے اس میں ہی دو جگہ واقع ہے اس لئے حرف ضاد کے تلفظ میں مانہ طویل سے عجم و عرب میں اختلاف چلا جاتا ہے تقریباً سیکڑوں رسائل و اشتہارات وغیرہ اس مسئلہ کے متعلق شائع ہوئے ہوں گے اور ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں اس لئے ضرورت نہ تھی کہ اس مسئلہ پر کوئی رسالہ لکھا جائے۔ لیکن جب دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کی خدمت اس ناکارہ کے سپرد کر دی گئی اور اس مسئلہ میں بھی سوالات کی کثرت ہوئی تو مناسب معلوم ہوا کہ ایک مختصر رسالہ جو افراط و تفریط سے خالی ہو اس موضوع میں لکھ دیا جائے جس میں اکابر دارالعلوم کی رائے اس مسئلہ کے متعلق فقہی روایات کی تائید کے ساتھ واضح کر دی جائے اس لئے یہ چند ورق سیاہ کئے گئے ہیں خدا کرے کہ طالبین حق کے لئے اطمینان کا اور خواہ مخواہ جھگڑنے والوں کے لئے اسکات کا سبب بن جائے

اور احقر کے لئے اور سب مسلمانوں کے لئے مفید ہو وَمَا ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ

سوال :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ لوگ اکثر دیا میں حرف

ضاد کی صوت میں اختلاف کرتے ہیں۔ بعض اس کو مشتبہ الصوت بطور کہتے ہیں گو فرق ضرور ہے بعض صوت متعارف یعنی دُواد کو صحیح کہتے ہیں۔ ان دونوں میں کون صحیح ہے؟ نیز جو شخص حرف ضاد کو صوت متعارف (دُواد) کے ساتھ پڑھے تو اس کی نماز بجا نہ ہوگی یا فاسد؟

الجواب مسئلہ ضاد کے اختلافات دو قسم پر منقسم ہیں۔ اول یہ کہ حرف ضاد کی صوت مشابہ ظاہر ہے یا دال مہملہ کے مشابہ ہے۔ دوسرے یہ کہ جو شخص بجائے ضاد کے نماز میں ظاہر معجمہ یا دال مہملہ پڑھے اس کی نماز ہو جاتی ہے یا نہیں۔ دونوں امر کے متعلق مختصر عرض ہے کہ امر اول فن تجوید و قرأت کا مسئلہ ہے جس سے احقر زیادہ واقف نہیں پوری تحقیق اس کی کسی صاحب فن سے کر لی جائے اور جس قدر مشہور و معروف اور عام کتب فن میں موجود ہے وہ یہ ہے کہ جمہور قرآن و فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ مخرج ضاد جاذب لسان اور اس کی متصل کی وارڈھیں ہیں اور اس کی آواز ظاہر معجمہ کی آواز کے مشابہ ہے دال مہملہ کے مشابہ نہیں جیسا کہ اکثر کتب فقہ و قرأت میں اس کی بے شمار تصریحات موجود ہیں منجملہ ان کے شیخ مکی نصرانی نے رسالہ **نَهَايَةُ الْقَوْلِ الْمَفِيدِ فِي عِلْمِ التَّجْوِيدِ** ص ۵۸ مطبوعہ مہر میں فرماتے ہیں:-

انَّ الضَّادَ وَالظَّاءَ الْمُعْجَمَتَيْنِ
إِشْتَرَكَتَا جَهْرًا وَرَخَاوَةً وَإِسْتِعْلَاءً
وَالْبَاقَا وَافْتَرَقَتَا مَخْرَجًا وَ
وَالْفَرْدَتِ الضَّادَ بِالِاسْتِطَالَةِ وَ
فِي الْمَرَعَشِيِّ نَقْلًا عَنِ الرَّعْمَانِيِّ
مَا مُخْتَصَرُهُ أَنَّ هَذَيْنِ الْحَرْفَيْنِ
أَعْنَى الضَّادِ وَالظَّاءِ مُتَشَابِهَانِ
فِي السَّمْعِ وَلَا تَفْتَرِقُ الضَّادُ إِلَّا
بِاخْتِلَافِ الْمَخْرَجِ وَالِاسْتِطَالَةِ

ضاد معجمہ اور ظاہر معجمہ صفات جہر و رخوت و
استعلاء و اطلاق میں دونوں شریک ہیں اور
مخرج کے اعتبار سے دونوں جدا جدا ہیں اور ایک
صفت یعنی استطالات میں ضاد ممتاز ہے (ظاہر میں
یہ صفت نہیں) اور مرعشی میں رعایہ سے نقل کیا ہے جس
کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دونوں حرف یعنی ضاد اور ظاہر سننے
میں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اور ان دونوں میں کوئی
فرق اس کے سوا نہیں کہ ایک تو مخرج ان دونوں
کا الگ الگ ہے اور دوسرے ضاد میں صفت استطالات

فِي الضَّادِ وَكَوْلَاهُمَا لَكَاتٍ إِحْدَاهُمَا
عَيْنَ الْأَخْرَجِي قَالَ الضَّادُ اعْظَمُ
كُلْفَةً وَاشْتَقُّ عَلَى الْقَارِي مِنَ
لِطَاءٍ وَحَتَّى لَوْ قَصَرَ الْقَارِي فِي
تَجْوِيدِ اللِّطَاءِ جَعَلَهَا ضَادًّا
نہی۔

ہے۔ جو ظاہر میں نہیں اور اگر یہ دو باتیں فارق
نہ ہوتیں تو دونوں حرف ایک ہی ہو جاتے پس
ضاد بہ نسبت ظاہر کے قاری پر زیادہ مشکل اور
شاق ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر قاری حرف ظاہر کی
تجوید میں ذرا کوتاہی کرتا ہے تو وہ ضاد میں
جاتا ہے۔

اور اردوم کے متعلق خلاصہ فتویٰ تو یہ ہے کہ جو شخص باوجود قادر بالفعل ہونے
اور ضاد کا مخرج صحیح جاننے کے بے پروائی سے یا جان بوجھ کہ حرف ضاد کے بجائے ظاہر
فالحس پڑھے یا دال پڑھے خواہ تغنیم کے ساتھ یا بلا تغنیم کے تو دونوں صورتوں میں جس
جگہ معنی میں تغیر فاحش ہو جائے گا نماز فاسد ہو جائے گی لیکن عوام جو مخارج و صفات
سے واقف نہیں احد بوجہ عدم تمیز و نادانیت کے ضاد کے بجائے ظاہر یا دال پڑ
پڑھتے ہیں ان کی نماز بلا کسی تفصیل کے مطلقاً صحیح و درست ہو جاتی ہے۔

اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس بارہ میں فقہائے متقدمین و متاخرین کے اقوال
مختلف ہیں۔ متقدمین کا مذہب تو یہ ہے اگر قرآن میں کوئی حرف دوسرے حرف
سے بدل جائے خواہ ضاد ظاہر سے بدلے یا دال سے یا اس کا عکس اور اسی طرح
دوسرے حرف میں اگر تبدیلی واقع ہو جائے تو فساد یا عدم فساد نماز کے متعلق یہ
ضابطہ ہے۔

ضابطہ متقدمین

اگر ان دونوں حرفوں کا مخرج ایک یا متقارب ہو اور ایک حرف کا دوسرے سے
بدل لینا بقواعد عربیت جائز بھی ہو۔ یعنی بدلنے سے معنی مراد میں زیادہ تغیر فاحش نہ
پیدا ہوتا ہو تو ان کے باہمی تبدیل سے نماز فاسد نہ ہوگی۔ خواہ کوئی حرف ہو اور کسی
طرح بدل جائے مثلاً قاف اور کاف اور سین اور صاد وغیرہ۔ صَوَّرَ يَهْدِي فِي شَرْحِ

المنیۃ الکبیر - ص ۲۲۸ -

اور اگر ایک حرف کو دوسرے حرف سے بدل دیا تو ضابطہ اس بارہ میں یہ ہے کہ اگر ان دونوں حرفوں میں قرب مخرج ہو یا دونوں ایک ہی مخرج سے ہوں تو نماز فاسد نہ ہوگی اور محیط میں اس کے ساتھ ایک تید کا اضافہ کیا ہے جس کی سخت ضرورت ہے وہ یہ کہ ان دونوں میں سے ایک کا دوسرے سے بدلنا جائز بھی ہو ورنہ اگر یہ قید لگائی جائے تو یہ ضابطہ بہت سے مسائل احکام میں ٹوٹ جائے گا (کبیری شرح منیہ ص ۲۲۸)

وَلَفْظُهُ وَإِنْ بَدَّلَ حَرْفًا
مَكَانَ حَرْفٍ كَانَ الْأَصْلُ فِيهِ
إِنَّ إِنْ كَانَتْ بَيْنَهُمَا قُرْبُ الْمَخْرَجِ
أَوْ كَانَتْ مِنْ مَخْرَجٍ وَاحِدٍ لَأَنْفُسَهُ
صَلَوَاتُ (رَمْنِيَّة) وَزَادَ فِي الْمَحِيطِ
قَيْدًا لَا يَدَّ مِنْهُ وَهُوَ أَنْ يَجُوزَ
إِبْدَالُ أَحَدِهِمَا مِنَ الْآخَرِ وَ
إِلَّا فَهُوَ مُنْقَرِضٌ بِمَسْأَلِ كَثِيرَةٍ
(کبیری شرح منیہ ص ۲۲۸)

اور جہاں یہ صورت نہ ہو بلکہ اس کی تبدیل سے معنی میں تغیر فاحش پیدا ہو جائے وہاں نماز فاسد ہو جائے گی۔

اور مسئلہ زیر بحث یعنی ضاد کی تبدیل ظا سے یا دال سے یہ دونوں اسی قسم میں داخل ہیں۔ تو متقدمین کے قول کے موافق جب کوئی شخص ضاد کو ظا خالص سے بدل دے یا دال پڑھے دونوں صورتوں میں معنی پر غور کیا جائے گا۔ اگر تغیر فاحش پیدا ہو گیا کہ مراد قرآن بالکل بدل گئی تو فساد نماز کا حکم کیا جائے گا ورنہ نہیں شرح منیہ میں ہے۔

لیکن اگر ذال معجمہ کی جگہ ظا معجمہ یا ضاد معجمہ کے بجائے ظا معجمہ پڑھ دی یا اس کے برعکس کر دیا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ اکثر ائمہ کا یہی مذہب ہے بوجہ بعید اور فاحش تغیر کے نیز شرح منیہ میں ہے کہ اگر خضرًا کو بجائے ضاد کے دال سے پڑھ دیا تو نماز فاسد ہو

أَمَّا إِذَا قَرَأَ مَكَانَ الذَّالِ
الْمُعْجَمَةَ ظَاءً مُعْجَمَةً أَوْ قَرَأَ
الظَّاءَ الْمُعْجَمَةَ مَكَانَ الضَّادِ
الْمُعْجَمَةِ أَوْ عَلَى الْقَلْبِ رَأَى
قَوْلَهُ، فَتَفْسُدُ صَلَاتُهُ وَعَلَيْهِ
اِحْتِثَانٌ لِتَغْيِيرِ الْفَاحِشِ

البعید رکبیری مجتہاتی ص ۴۴۸ وَمِنْهَا جائے گی بوجہ بعد فاحش کے۔

(رکبیری شرح منیر ص ۴۴۸)

خُذْ بِاللَّيْلِ الْمُهْمَلَةِ مَكَانَ الضَّادِ
الْمُعْجَمَةِ تَفْسُدُ لِلْبُعْدِ الْفَاحِشِ۔

پھر شرح منیر میں بحوالہ قاضی خاں قاعدہ مذکورہ کے بہت سے جزئیات نقل کر کے ثابت کیا کہ جس جگہ ضاد کو ظا سے یا دال وغیرہ سے بدلنے میں تغیر فاحش معنی میں پیدا ہو گیا وہاں فسادِ صلوة کا حکم دیا گیا ورنہ نہیں۔

ثُمَّ وَالْعَادِيَاتِ صَبْحًا فِي ظَا بَدَلِ كَرْتَبًا پڑھے يَا غَيْرِ الْمُغْضُوبِ عَلَيْهِمْ كَبَجَائِ غَيْرِ الْمُغْضُوبِ ظَا پڑھے طَلَعَهَا هَضِيمٌ كَبَجَائِ هَضِيمٌ بِالظَّاءِ پڑھے۔ فَتَرْضَى فِي ظَا بَدَلِ كَرْتَبًا پڑھے۔ صَعَفَ الْحَيَاةِ فِي ظَعْفَ بِالظَّاءِ پڑھے۔ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ فِي قَرَضَ بِالظَّاءِ پڑھے۔ ان سب صورتوں میں امام الفقہ والفتاویٰ قاضیخان نے فسادِ نماز کا حکم دیا ہے۔
(ص ۴۴۸ فی شرح المنية ص ۴۴۸)

تیز فتاویٰ قاضی خاں میں ہے :-

وَكَذَا لَوْ قَرَأَ غَيْرَ الْمُغْضُوبِ بِالظَّاءِ أَوْ بِاللَّيْلِ تَفْسُدُ صَلَاتُهُ
وَلَوْ قَرَأَ الظَّالِمِينَ بِالظَّاءِ أَوْ بِاللَّيْلِ لَا تَفْسُدُ صَلَاتُهُ وَلَوْ قَرَأَ
الدَّالِينَ بِاللَّيْلِ تَفْسُدُ صَلَاتُهُ (قاضیخان ص ۱، جلد ۱)

اور جو شخص صحیح لفظ نکالنے پر قادر نہ ہو خواہ اس وجہ سے کہ زبان میں کوئی نقص ہے جس کو الشخ کہا جاتا ہے یا اس وجہ سے کہ بوجہ ناواقفیت غلط پڑھتے

مذہب متقدمین کے موافق
الشخ یا غیر قاری کا حکم

پڑھتے وہی زبان پر اس طرح چڑھ گیا کہ اب اس کے خلاف نکالنے کی قدرت نہ رہی جیسے اکثر عورتوں اور بوڑھوں کو پیش آتا ہے اس کا حکم متقدمین کے مذہب پر یہ ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ واجب ہے کہ دن رات ان حرفوں کی تصحیح کی کوشش کرتے رہیں جب تک یہ کوشش جاری رکھیں گے ان کی نماز صحیح قرار دی جائیگی۔

اگرچہ حرف غلط ہی نکلے، لیکن جب کوشش کرنا چھوڑ دیں تو نماز فاسد قرار دی جائے گی۔

اور یہ اس لئے کہ شرح منیرہ میں بحوالہ المعیط مذکور ہے کہ مختار للفتویٰ اس جیسے مسائل میں یہ ہے کہ اگر یہ شخص شب و روز تصحیح حروف کی کوشش میں لگا رہے۔ اس کے باوجود بھی قدرت نہ ہو تو اس کی نماز جائز ہے اور اگر کوشش چھوڑ بیٹھے تو اس کی نماز غلط فاحش معیر للمعنی ہونے کی صورت میں، فاسد ہے (اس کے بعد کہا، اور فتویٰ حجتہ میں بھی معیط کے موافق ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ عورتوں اور غلاموں (یا خدمت پیشہ جاہل لوگوں) کی زبان پر جو غلط حروف چڑھے ہوئے ہوتے ہیں اول نماز سے آخر تک بہت سے اغلاط ان سے سرزد ہوتے ہیں جیسے شیتان۔ الین۔ الاک ناہد۔ ایاک نستئین۔ السرات۔ انامت تو ان سب اغلاط کا حکم فتاویٰ حصابیہ کے موافق یہ ہے کہ یہ لوگ جب تک تصحیح حروف اور اصلاح و تعلم میں رات دن کوشش کرتے رہیں اور اس پر بجا ان کی زبان سے صحیح حروف نہ نکلیں تو ان کی نماز جائز ہے جیسے تمام شروط نماز کا حکم ہے کہ جب ان سے عابز ہو تو معاف ہو جانا میں جیسے وضو یا کپڑے کی پاکی یا قیام سے عاجز ہونے کی صورت میں فقہاء نے لکھا ہے (پھر سرمایا)

وَذَلِكَ لِمَا فِي شَرْحِ الْمُنِيرَةِ
وَقَالَ صَاحِبُ الْمُعَيْطِ وَالْمُخْتَارِ لِلْفَتْوَى
فِي جِنْسِ هَذِهِ الْمَسَائِلِ إِنَّهُ إِنْ
كَانَ يَجْتَهِدُ إِتَاءَ اللَّيْلِ وَاطْرَاقِ
النَّهَارِ فِي التَّصْحِيحِ وَلَا يَقْدِرُ عَلَيْهِ
فَصَلَوَتُهُ جَائِزَةٌ وَإِنْ تَرَكَ
جَهْدَهُ فَصَلَوَتُهُ فَاسِدَةٌ
رَالِي قَوْلَهُ، وَذُكِرَ فِي فِتَاوَى
الْمُجْتَمِعِ مَا يُؤَافِقُ قَوْلَ صَاحِبِ
الْمُعَيْطِ فَإِنَّهُ قَالَ مَا يَجْرِي عَلَى
السَّنَةِ النِّسَاءِ وَالْأَرْقَاءِ الْغُلَّاءِ
الْكَثِيرِ مِنْ أَوَّلِ الصَّلَاةِ إِلَى
آخِرِهَا كَالشَّيْثَانِ وَالْأَلْمِينِ وَإِيَّاكَ
تَأْتِدُ وَإِيَّاكَ تَسْتَيْنِ الْبِرَاتُ
أَنَا مَتَّ فَعَلَى جَوَابِ الْفِتَاوَى
الْحَسَامِيَّةِ مَا دَامُوا فِي التَّصْحِيحِ
وَالْتَعَلُّمِ وَالِإِصْلَاحِ بِاللَّيْلِ
وَالنَّهَارِ وَلَا يُطَاوَعُهُمْ لِيَا أَنَّهُمْ
جَازَتْ صَلَوَتُهُمْ كَسَائِرِ
الشُّرُوطِ إِذَا تَجَرَّعَتْهَا مِنَ
الْوَضُوءِ وَتَطْهِيرِ الشُّبُوبِ
وَالْقِيَامِ رَالِي قَوْلَهُ، أَمَا إِذَا تَرَكَوْا

التَّحْيِيهِ وَالْجَهْدِ فَسَدَّتْ صَلَاتُهُمْ
لیکن اگر وہ صحیح اور کوشش کو چھوڑ دیں تو اس
کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ (کبیری ص ۲۵۲ و ۲۵۳)

اور یہ سب بیان مذکور مذہب فقہاء متقدمین کا ہے جیسا کہ شارح منیر نے اس
بیان کو نقل کر کے فرمایا ہے۔ (وہذا ابناء علی مختار المتقدمین ص ۲۵۳)

ضابطہ متاخرین

اور فقہائے متاخرین نے جب اس مسئلہ میں عموم بلوی اور سہولت کی سخت نجات
کا مشاہدہ کیا اول تو عرب میں بھی بوجہ اختلاط لہجہ اب ان چیزوں کی رعایت کا
حقہا نہیں رہی پھر علم تو اس سے عموماً تا واقعہ میں مذہب متقدمین کی بنا پر تو شاید
کسی کسی کی ہی نماز صحیح رہے۔ عام قسرا اور مجرورین کی نماز بھی صحیح نہیں رہ
سکتی۔ بیچارے عوام تو کس حساب میں ہیں۔

اس لئے انہوں نے اولاً شرعیہ کی حدود میں رہ کر جس قدر گنجائش سہولت کی
نکل سکتی تھی۔ اس کے موافق فتویٰ دیا اور مسئلہ زیر بحث کے متعلق یہ ضابطہ قرار دیا
کہ

حروف کی باہمی تبدیل مطلقاً مقصد نماز نہیں خواہ اتنا دور قرب منسرج ہو یا نہ ہو
اور معنی میں تغیر فاحش ہو یا نہ ہو جیسا کہ شامی بحث زلہ العاری میں بجا لیتا تا رخانیہ
نقل کیا ہے۔

وَفِي التَّارِخَاتِ يَتَّبِعُ عَنِ الْحَاوِي
حِكْمِي عَنِ الصَّفَّارِ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ
الْخَطَاءُ إِذَا دَخَلَ فِي الْحُرُوفِ لَا
تَفْسُدُ لِأَنَّ فِيهِ بَلْوَى عَامَّةَ
النَّاسِ لِأَنَّهُمْ لَا يُقْبِلُونَ
الْحُرُوفَ إِلَّا بِشَقَّةٍ وَفِيهَا إِذَا
اور تارخانیہ میں بحوالہ حاوی صفار سے
نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ خطا جب حروف
میں واقع ہو تو نماز فاسد نہیں ہوتی اس لئے کہ
اس میں عام لوگوں کا ابتلا رہے کیونکہ وہ حروف
کو بغیر مشقت کے درست نہیں کر سکتے۔
نیز تارخانیہ میں ہے کہ جب دو حروف میں

لَمْ يَكُنْ بَيْنَ الْحَرْفَيْنِ اتِّحَادٌ مُخْرَجٌ
وَلَا قُرْبٌ إِلَّا إِنَّ فِيهِ بَلْوَى
الْعَامَّةُ كَالذَّالِ مَعَ الضَّادِ وَالذَّاءِ
الْمُحْضِ مَكَانَ الذَّالِ وَالطَّاءِ مَكَانَ
الضَّادِ لَا تَفْسُدُ عِنْدَ بَعْضِ الْمَشَاطِرِ
قُلْتُ فَيَنْبَغِي أَنْ لَا يَفْسُدَ فِي
إِبْدَالِ الشَّاءِ سَيْنًا وَالْقَاتِ
هَمَزَةٌ كَمَا هُوَ لُغَةٌ عَوَامٍ زَمَانِنَا
رشامی مصری ص ۵۹۲ ج ۱) وَرَوَى عَن
مُحَمَّدِ بْنِ سَلَمَةَ مِثْلَهُ - (شرح منیر ص ۴۴)

نہ اتحاد مخرج ہو اور نہ قرب مخرج مگر اس میں
ابتلاء عام ہو جیسے ذال بجائے ضاد یا زائے
خالص بجائے ذال یا ظا بجائے ضاد تو بعض
مشائخ کے نزدیک نماز فاسد نہ ہوگی اور میں
کہتا ہوں کہ اس قاعدہ کی بنیاد پر ثناء کو سین سے
اور قات کو ہمزہ سے بدلتے میں بھی نماز فاسد
نہ ہوگی۔

جیسا کہ ہمارے زمانے کے اکثر عوام میں
رایج ہے۔

رشامی مصری ص ۵۹۲ ج ۱)

علامہ شامی اور حلبی شارح منیہ نے متقدمین و متاخرین کے اقوال نقل کرنے
کے بعد فرمایا ہے۔ اِنَّ مَذَاهِبَ الْمُتَأَخِّرِينَ اَوْسَعُ وَمَذَاهِبَ الْمُتَقَدِّمِينَ
اَحْوَطُ فَاعْمَلْ بِمَا تَخْتَارُ وَالْاِحْتِيَاظُ اَوْلَى۔ اس سے علمائے محققین نے فتویٰ
ایک ایسے قول پر دیا ہے جو متقدمین و متاخرین دونوں کے اقوال کو جامع ہے جس میں
ضرورت کا بھی پورا لحاظ کر لیا گیا ہے اور زیادہ آزادی بھی نہیں دی گئی وہ یہ ہے:-

قول مختار یا عدل الاقابیل

چونکہ متاخرین کے ضابطہ مذکورہ کی بنیاد پر عوام میں زیادہ بے پردائی پیدا ہو جانے
کا احتمال تھا اس لئے محققین متاخرین نے ایک بین بین اور متوسط ضابطہ تجویز فرمایا جس
میں عوام پر تنگی بھی نہیں اور اصل حکم سے زیادہ بے رحمی نہیں وہ یہ ہے کہ:-

عوام جو مخارج اور صفات سے واقف نہیں بوجہ ناواقفیت یا عدم التمييز کے اگر ان
کی زبان سے ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف نکل جائے (خواہ کوئی حرف ہو) اور وہ یہ سمجھے کہ
میں نے وہی حرف نکالا ہے جو قرآن شریف میں ہے تو اس کی نماز فاسد نہ ہوگی۔

(حسب ضابطہ متاخرین)۔

اور جو شخص واقف ہے اور صحیح حرف نکالنے پر قادر بالفعل ہے اور پھر بھی جان بوجھ کر یا بے پردائی سے غلط حرف نکالتا ہے تو جس جگہ معنی میں تغیر فاحش پیدا ہو جائیگا حسب ضابطہ متقدمین اس کی نماز فاسد قرار دی جائے گی۔

الغرض عوام کے حق میں متاخرین کے قول پرستوئی ہے اور خواص فقہاء و قراء کے حق میں متقدمین کے قول پر جو شخص مخارج و صفات سے واقف ہو وہ خواص میں داخل ہے خواہ عرف عام میں اس کو قاری نہ کہتے ہوں اور جو اس سے ناواقف ہے وہ اس بارہ میں عوام میں داخل ہے۔ اگرچہ کتنا ہی بڑا عالم ہو۔

اور یہ قول منیہ اور شرح منیہ میں بالفاظ ذیل مذکور ہے :-

اور قاضی امام شہید حسن فرماتے تھے کہ بہتر جواب
اس قسم کے تفسیرات مذکورہ میں یہ ہے کہ لغتی
یہ جواب دے کہ اگر ایک حرف کی جگہ دوسرا
حرف بلا قصد اس کی زبان سے نکل گیا اور
اس کو صحیح حرف اور غلط حرف میں امتیاز نہ ہوا
اور اس کا گمان یہی رہا کہ میں نے وہی حرف
ادا کیا ہے جو قرآن کا اصل حرف ہے تو اس کی
نماز فاسد نہ ہوگی۔ اور جو قول امام حسن کا ذکر
کیا گیا ہے یہی محمد بن مقاتل اور امام اسمعیل زاہد
سے بھی منقول ہے اور یہی مراد ہے اس کلام
کی جو فتاویٰ جمعہ میں مذکور ہے کہ فقہاء و علماء
کے حق میں اعادہ نماز کا حکم کیا جائے اور عوام
کے حق میں جواز کا مثل قول محمد بن سلمہ کے تاکہ
احتیاط کے موقع میں احتیاط کو اختیار کیا جائے

وَكَانَ الْقَاضِي الْإِمَامُ الشَّهِيدُ
الْحَسَنُ يَقُولُ الْأَحْسَنُ فِيهِ آيٌ
فِي الْجَوَابِ فِي هَذِهِ الْأَبْدَالِ الْمَذْكُورَةِ
أَنَّ يَقُولَ الْمُفْتِيِّ إِنَّ جَرَى ذَلِكَ
عَلَى لِسَانِهِ، وَلَمْ يَكُنْ مُسْتِزًّا
بَيْنَ بَعْضِ هَذِهِ الْحُرُوفِ وَبَعْضِ
وَكَانَ فِي زَعْمِهِ أَنَّ أَدَى الْكَلِمَةَ
عَلَى وَجْهِهَا لَا تَفْسُدُ صَلَوَتُهُ
وَكَذَا آيٌ مِثْلُ مَا ذَكَرَ الْحَسَنُ
رَوَى عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ مُقَاتِلٍ وَعَنْ
الشَّيْخِ الْإِمَامِ إِسْمَاعِيلِ الزَّاهِدِ
وَهَذَا مَعْنَى مَا ذَكَرْتُ فِي تَأْوِيلِ
الْحُجَّةِ أَنَّ يُفْتَى فِي حَقِّ الْفُقَهَاءِ
بِإِعَادَةِ الصَّلَاةِ وَفِي حَقِّ الْعَوَامِ

بِالْجَوَازِ كَقَوْلِ مُحَمَّدٍ بْنِ سَلَمَةَ اِخْتِيَارًا
اور تنگی کے موقع میں تنگی کر

دکبیری شرح منیہ ص ۴۴۸

مَوْضِعَهَا (دکبیری مجتہاتی ص ۴۴۸)

اور یہی قول علامہ شامی نے قاضی امام ابو عاصم سے بالفاظ ذیل بحوالہ خزائن نقل

فرمایا ہے اور علیہ اور بزاز یہ سے اُس کا مختار اور عادل الاقاول ہونا نقل کیا ہے

اَنْ تَعَدَّ ذٰلِكَ تَفْسُدُ وَاِنْ جَرَى عَلَى لِسَانِهِ اَوْ لَا يَعْرِفُ
التَّمْيِيزَ لَا تَفْسُدُ وَهُوَ الْمُخْتَارُ (رحلیہ) وَفِي الْبَزَازِيَّةِ وَهُوَ اَعْدَالُ
الْاَقَاوِيلِ وَهُوَ الْمُخْتَارُ - (شامی ذلّة القاری ص ۵۹۲ جلد ۱ مصری)

اور یہی مضمون عالمگیری کتاب الصلوة باب رابع میں بحوالہ جیز کردری نقل
کیا اور مختار ہونا بیان فرمایا ہے۔

مُخْلِصَاتُ فُتُوٰی

الغرض حرف ضاد اپنے مخرج وصفات کے اعتبار سے ظاہر خالص اور دال پر دونوں
سے بالکل جدا ایک مستقل حرف ہے اُس کو جس طرح دال سے بدل کر عوام کی طرح پر پھینکا
غلطی ہے اسی طرح ظاہر خالص سے بدل کر (بعض قرآن زمانہ کی طرح) پر پھینکا بھی غلطی صریح
ہے لیکن فساد نماز کے بار میں فتویٰ اس پر ہے کہ اگر جان بوجھ کر یا بے پروائی سے
باوجود قادر بالفعل ہونے کے ایسا تغیر کرے کہ ضاد کی جگہ دال یا ظاہر خالص پڑھے تو
نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر بوجہ نادانیت اور عدم تمیز ایسا سرزد ہو جائے اور وہ
اپنے نزدیک ہی سمجھے کہ میں نے حرف ضاد پڑھا ہے تو نماز صحیح ہو جائے گی۔

جس کا حاصل یہ ہوا کہ عوام کی نماز تو بلا کسی تفصیل و تفتیح کے بہ حال مسح ہو جاتی ہے

خواہ ظاہر پڑھیں یا دال یا زاد وغیرہ کیونکہ وہ قادر بھی نہیں اور سمجھتے بھی یہی ہیں کہ ہم نے

اصلی حرف ادا کیا ہے اور قرآن مجودین اور علماء کی نماز کے جواز میں تفصیل مذکور ہے کہ اگر

غلطی قصد یا بے پروائی سے ہو تو نماز فاسد ہے اور سبقت لسانی یا عدم تمیز کی وجہ

سے ہوتا جو بلا صحیح ہے۔

تنبیہ

لیکن نماز کے جواز و عدم فساد کے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بے وسر ہو کر ہمیشہ غلط پڑھتے رہنا جائز ہو گیا اور پڑھنے والا گناہ گار بھی درجے کا۔ بلکہ اپنی قدرت و گنجائش کے موافق صحیح حروف پڑھنے کی مشق کرنا اور کوشش کرتے رہنا ضروری ہے ورنہ گناہ گار ہوگا۔ اگرچہ نماز فاسد نہ ہو۔ کما فی العالمگیریۃ فی الباب الرابع ومن لا یحسن بعض الحروف ینبغی ان یجہد ولا یعدا فی ذلک دعا لگیری مصری ص ۳۲، جلد ۱۱۔

اور مقدمہ جزیریہ میں ہے

وَالْأَخْذُ بِاللُّجُودِ حَتْمٌ لَّازِمٌ
لأنه به الاصل انزل
وهو إعطاء الحروف حقها
من لم یجود القرآن اثم
وهكذا امته الینا وصلا
من صفة لها ومستحقها

اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں قولہ 'وَالْأَخْذُ وَالْأَظْهَرُ' ان یقال تقیدہ و'وَأَخْذُ الْقَارِئِ بِتَجْوِیدِ الْقُرْآنِ وَهُوَ تَحْسِينُ الْفَاطِمِ بِأَخْرَاجِ الْحُرُوفِ مِنْ تَخَارِجِهَا وَإِعْطَاءِ حُقُوقِهَا مِنْ صِفَاتِهَا قَرْضٌ لَازِمٌ وَحْتَمٌ دَائِمٌ وَأَمَّا دَقَائِقُ التَّجْوِیدِ عَلَى مَا سَبَقَتْ بَيَانُهُ فَإِنَّمَا هُوَ مِنْ مُسْتَحْسَنَاتِهِ رَأْسُ الْمَثَلِ الْقَارِئِ شَرْحُ الْمَقْدَمَةِ الْجَزْرِيَّةِ لِعَلِيِّ الْقَارِئِ

کتبہ احقر محمد شفیع رح الدیوبند غفرلہ

خادم دارالافتاء بدارالعلوم الدیوبندیۃ فی خمس ساعات

من یوم الخمیس لعشر یقین من اولی الجادین ۱۳۵۱ھ

تَصَدِيقٌ وَتَمَّتْهُ

حضرت مجدد الملة حکیم الامت امام الترمذی الفقیہ

محمد اشرف علی تھانوی دامت برکاتہم

بعد الحمد والصلوة اشرف علی عنی عنہ عرض رسا ہے کہ رسالہ دفع التصناد بہت بہت دلچسپی سے دیکھا دلچسپ اور مطابق ضرورت کے پایا جزی اللہ تعالیٰ مؤلفہا خیر الجزاء چونکہ ایسے شخص کے پیچھے صحیح خواں کے اقتدار کا واقعہ بھی کثیر الوقوع ہے اس لئے اس کے متعلق فتویٰ ذیل بطور ضمیمہ بلکہ تتمہ کے ملحق کر دیا۔ میرا عمل بھی اسی فتوے پر ہے۔ وَهِيَ هِدَاةٌ -

فِي الدُّرِّ وَلَا غَيْرِ الا لَشَغِ بِهَا اَيُّ بِالْاَلْتِغِ عَلَى الْاَصْحِي كَمَا فِي
الْبَحْرِ عَنِ الْمُجْتَبِي وَحُورِ الْحَلَبِيِّ وَابْنِ الشُّخْنَةِ اِنَّهُ بَعْدَ
بَدْلِ الْجَهْدِ دَائِمًا حَسْمًا كَالْاُتْمِي فَلَا يَوْمَ الْاَمِثْلَهُ اِلَى اَنْ قَالَ
هَذَا هُوَ الصَّحِيحُ الْمُخْتَارُ فِي حُكْمِ الْاَلْتِغِ وَكَذَا مَنْ لَا يَقْدِرُ
عَلَى التَّلْفِظِ بِحَرْفٍ مِنَ الْحُرُوفِ اِه (ص ۶۰۸ و ۶۰۹ جلد ۱
مع الشافعي)

وَفِي رَدِّ الْمُخْتَارِ تَحْتَ قَوْلِهِ عَلَى الْاَصْحِي اَيُّ خِلَافًا لِيَا فِي الْخُلَاصَةِ
عَنِ الْفَضْلِ مِنْ اَنَّهَا جَائِزَةٌ لِاَنَّ مَا يَقُولُهُ صَارَ لُغَةً لَهُ وَمِثْلُهُ
فِي اَنَّ تَارِيخِيَّةً وَفِي التَّهْمِيَّةِ وَامَامَةُ الْاَلْتِغِ لِغَيْرِهِ وَقِيلَ لَا
وَنَحْوَهُ فِي الْخَانِيَّةِ عَنِ الْفَضْلِ وَظَاهِرٌ اَنَّ اِعْتِمَادَهُمُ الصَّحِيحَةَ وَكَذَا
اِعْتِمَادَهَا صَاحِبِ الْحَلِيَّةِ قَالَ لَمَّا اَطْلَقَهُ غَيْرُ وَاحِدٍ مِنَ الْمَشَافِيحِ
مِنْ اَنَّهُ يَتَّبِعِي لَهُ اَنَّ لَا يَوْمَ غَيْرَهُ وَكَذَا فِي خِرَاطَةِ الْاَلْتِغِ
تَكَرَّرَ اِمَامَةُ اَلْنَا وَكَذَا اِه وَلَكِنَّ الْاَحْوَاطَ عَدَمَ الصَّحِيحَةِ الْخَرَصِ ۶۰۸ ج ۱

ان عبارات سے امور ذیل مستفاد ہوئے۔

(۱) اللشخ کی امامت کے جواز میں اختلاف ہے بعض نے اس کی امامت کو سب کے حق میں جائز رکھا ہے۔

(۲) اللشخ صرف وہی نہیں جس میں پڑھنے کی قابلیت ہی نہ ہو کیونکہ جلیبی اور ابن شحنہ نے اس پر بذل جہد واجب کیا ہے اور وجوب جہد فرع ہے قدرت کی پس اللشخ سے مراد وہ اللشخ ہے جو اس وقت حالت موجودہ میں صحیح پڑھنے پر قادر نہیں۔

(۳) جو شخص اللشخ نہ ہو لیکن اس وقت کسی حرف کے صحیح تلفظ پر قادر نہ ہو وہ بھی بحکم اللشخ ہے۔ پس ہر چند کہ صحیح و مختار قول یہی ہے کہ اللشخ کی امامت غیر اللشخ کے لئے درست نہیں اور اس کا مقتضی یہ ہے کہ صحیح خواں کی اقتدا لیکر شخص کے پیچھے جائز نہ ہو جو حرف کو صحیح ادا نہ کرتا ہو مگر اس وقت ضرورت کی وجہ سے امام فضلی کے قول پر استوی دینے کو جی چاہتا ہے خصوصاً حرف ضاد کے مسئلہ میں کیونکہ عام طور پر قرأت تک اس کو غلط پڑھتے ہیں لہذا قاری کی اقتدا غیر قاری کے پیچھے درست ہے البتہ ایسے شخص کے پیچھے صحیح نہیں جو بحالت موجودہ صحیح حرف پر قادر ہے مگر غفلت یا بے توجہی یا رعایت عوام کی وجہ سے کسی حرف کو مثلاً ضاد کو اصلی مخرج سے نہیں نکالتا کیونکہ وہ بحکم اللشخ نہیں بلکہ عمداً غلط پڑھنے والا ہے۔ واللہ اعلم۔

حرف ضاد کا صحیح مخرج احمدی ۱۹ ج ۱۲۲

صحیح الجواب

اشرف علی ۱۹ ج ۱۲۲

تقریظ و تصدیق از حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب

رحمۃ اللہ علیہ محدث دارالعلوم دیوبند
رسالہ اور فقہیمہ احقر کے نزدیک نہایت دل پسند اور صحیح اور مفید ہے حتیٰ تعالیٰ
مؤلف صاحب کو جزائے خیر اور مزید توفیق اس قسم کے افادات کی عطا فرمائیں۔

بند کا اصغر حسین عفا اللہ عنہ

(مدس حدیث دارالعلوم دیوبند)

تخریر جناب قاری عبد الوحید خاں صاحب مدظلہ العالی

تخریر بذمہ تنبیر ضروری مؤلف جناب مولانا الحاج مفتی محمد شفیع صاحب مفتی حال دارالعلوم
دیوبند کو امتثالاً دیکھانی زمانہ مناسب و غنیمت سمجھتا ہوں فن تجوید کے متعلق جناب
موصوف نے خود ہی تخریر فرمادیا باقی رہا عدم فساد و فساد نماز کے متعلق اصحاب فتویٰ
جائیں احقر کا منصب نہیں۔

احقر عبد الوحید النابادی غفرلہ

یوم جمعہ ۲۸-۵-۵۱ھ

فتاویٰ از حضرت قطب الارشاد امام ربانی فقیر العصر حضرت مولانا

رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

منقول از دستوری رشیدیہ ص ۱۱۳ و ۱۱۴ حصہ دوم مطبوعہ دہلی

استفتاء { کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس بارہ میں کہ

چند اشخاص حرف (ض) دو آد قرآن شریف میں پڑھنے سے اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم قرآن شریف میں (دو آد) پڑھتے ہو تو عربی لفظ جو بزبان اردو بولتے ہو تو وضو کو (دو) کیوں نہیں کہتے اور ضیاء الدین کو (دیار الدین) کیوں نہیں کہتے یہ بھی تو عربی لفظ ہیں تو قرآن شریف میں (دو آد) کا پڑھنا صحیح ہے یا (دو آد) پڑھنا چاہیے۔

زیادہ سلام

راستم احقر العباد و حمايت الله

ساکن شمس پور ضلع ایٹہ پر گنہ پٹیالی معرفت جناب عبدالعلیم خان صاحب

بھونگامی - فقط

الجواب

اصلی حرف ضاد ہے اس کو اصلی مزج سے ادا کرنا واجب ہے اگر نہ ہو سکے تو بحالت معذوری دال پر کی صورت سے بھی نماز ہو جاوے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

الجواب صحیح عنایت الہی عفی عنہ مدرس مدرسہ

منظاہر علوم

عنایت الہی

سہارنپور

الجواب صحیح بندہ عزیز الرحمن عفی عنہ

مفتی دارالعلوم

دو تامل علی
العزیز الرحمن

دیوبند

الجواب صحیح بندہ محمود عفی عنہ مدرس اول

مدرسہ دیوبند

الہی عاقبت محمود گرواں

الجواب صحیح احقر الزمان گل محمد خاں مدرس مدرسہ

دیوبند

گل محمد خاں

الجواب صحیح خلیل احمد مدرس اول مدرسہ

منظاہر علوم

خلیل احمد

سہارنپور

الجواب صحیح اشرف علی عفی عنہ

اذکر وہ اذیاء اشرف علی

رشید
احمد

غلام رسول

الجواب صحیح غلام رسول عفی عنہ مدرس مدرسہ دیوبند

سؤال

(فتاویٰ رشیدیہ حصہ سوم — ص ۹۳ و ۹۴)

گزارش یہ ہے کہ میں تجوید سے واقف ہوں اور قراءت سیکھی ہے تو جو لوگ معذور بھی نہیں ہیں اور قراءت کا مخارج حروف کی جانب ان کا خیال ہی نہیں تو ایسے شخصوں کے پیچھے نماز ہوگی یا نہ؟ اور میری نماز یا قاری کامل کی نماز ایسے شخصوں کے پیچھے ہو جاوے گی یا نہیں یا ترک جماعت کی جاوے اور اعادہ نماز ہر وقت کا نہایت مشکل ہے کیونکہ عام طور سے ضاد کو مشابہ بالذال ہی پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ذال نہیں پڑھی بلکہ ایک مخرج علیحدہ ادا کیا ہے دیگر حروف کا فرق کرنا اس سے آسان ہے؟

الجواب

د۔ ظ۔ ض کے حرف جداگانہ اور مخارج جداگانہ ہونے میں تو شک نہیں ہے اور اس میں بھی شک نہیں ہے کہ قصداً کسی حرف کو دوسرے مخارج سے ادا کرنا سخت بے ادبی اور بسا اوقات باعث فساد نماز ہے مگر جو لوگ معذور ہیں اور ان سے یہ لفظ اپنے مخرج سے ادا نہیں ہوتا اور وہ حتی الوسع کوشش کرتے رہتے ہیں ان کی نماز بھی درست ہے اور ذال پڑھا ہر ہے کہ خود کوئی حرف نہیں ہے بلکہ ضاد ہی ہے اپنے مخرج سے پورے طور پر ادا ہی نہیں ہوا تو جو شخص ذال خالص یا ظاد خالص عمداً پڑھے اس کے پیچھے تو نماز نہ پڑھیں مگر جو شخص ذال پڑ کی آواز میں پڑھتا ہے آپ اس کے پیچھے نماز پڑھ لیا کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

سؤال

(فتاویٰ رشیدیہ حصہ سوم — ص ۱۰۷)

قاری عبدالرحمن صاحب مرحوم پانی پتی نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ حرف ضاد

کو مشابہ بالبدال و ظار نہ پڑھے ورنہ نماز نہ ہوگی کیوں کہ نماز میں قرآن کا صحیح پڑھنا فرض ہے لہذا ہر ایک شخص کو مخرج سے ادا کرنے کی ہر حرف کی کوشش ہونی چاہیے اگر کوشش کرتا ہے تب بھی پورا حرف صحیح نہ ادا ہو تو اس میں مواخذہ دار نہ ہوگا اگر بلا سعی مشابہ بالبدال و ظار پڑھے گا تو معنی میں فرق آوے گا۔ لہذا اس تحریر میں حضور کیا فرماتے ہیں اور جو شخص کہ قاری ہو یا علم قرأت سیکھتا ہو تو وہ شخص کہ مشابہ ببدال و ظار پڑھے اس کے پیچھے اس کی نماز ہوگی یا نہیں؟ یا یہ اپنی نماز لوٹا دے یہ میں نے بھی دیکھا کہ اگر حرف ضاد کو مخرج سے ادا کرے تو ہرگز مشابہ بالبدال نہیں نکلتا مشابہ بالظا ادا ہوتا ہے اور باوجودیکہ یہ حرف شفیہ میں سے نہیں ہے مگر ہونٹ ملتے ہیں اور زبان وہاں سے مہٹی ہے تب مشابہ بالبدال نکلتا ہے اصل مخرج سے مشابہ بالظا مع تمامی شرائط کے ادا ہوتا ہے۔ قیاساً؟

الجواب

یہ قول قاری صاحب کا درست ہے کہ جو شخص باوجود قدرت کے ضاد کو ضاد کے مخرج سے ادا نہ کرے وہ گناہگار بھی ہے اور اگر دوسرا لفظ بدل جانے سے معنی بدل گئے تو نماز بھی نہ ہوگی اور اگر باوجود کوشش و سعی ضاد اپنے مخرج سے ادا نہیں ہوتا تو معذور ہے اس کی نماز ہو جاتی ہے اور جو شخص خود صحیح پڑھنے کا قادر ہے ایسے معذور کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے۔ مگر جو شخص قصد ادا یا ظار پڑھے اس کے پیچھے نماز نہ ہوگی۔ فقط

رشتید احمد عفا اللہ عنہ

الاجویة فی عربیة
خطبة العربیة

خطبہ عربیہ

عربی زبان میں کیوں ہے :

تاریخ تالیف _____ دو شنبہ ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۵۰ھ
 مدت تالیف _____ پانچ گھنٹے متفرق اوقات میں
 مقام تالیف _____ دیوبند ضلع سہارنپور یوپی
 طبع اول _____ دیقعدہ ۱۳۵۰ھ
 از دارالاشاعت دیوبند

”کہا جاتا ہے کہ غیر عرب مسلمانوں کے سامنے
 جمعہ کا خطبہ عربی میں کیوں دیا جاتا ہے، ہر ملک
 کی اپنی مادری زبان میں کیوں نہیں؟ یہ سوال دارالعلوم
 دیوبند کے دارالافتاء میں بھی آیا تھا۔ یہ رسالہ اس
 کا مفصل جواب ہے جس پر حضرت تھانویؒ نے
 نظر ثانی فرما کر اس کی تصدیق فرمائی۔“

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى ولا سيما على
سیدنا و مولانا محمد المجتبی ومن بهدایه اهتدای

امّا بعد

استفتاء

شریعتِ مطہرہ کا اس بارہ میں کیا حکم ہے کہ خطبہ جمعہ عربی کے سوا دوسری ملکی زبانوں
میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں اور اگر خطبہ عربی زبان میں پڑھ کر ترجمہ اردو وغیرہ میں کر دیا
جائے تو یہ بھی جائز ہے یا نہیں۔ اگر دونوں صورتیں ناجائز ہوں تو اس مسئلہ کا مفصل
جواب عنایت فرمایا جائے کہ جب خطبہ کا مقصود وعظ ہے تو عربی زبان سے ناواقف
لوگوں کے سامنے عربی میں پڑھنے سے کیا فائدہ۔

الجواب

چونکہ مسئلہ عامۃ الورد اور کثیر الوقوع ہے اس لئے جواب کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا
ہے۔ پہلے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ خطبہ جو نماز جمعہ کے لئے ایسا لازم کر دیا گیا
ہے کہ اس کے بغیر نماز جمعہ ہی ادا نہیں ہوتی اور جس طرح نماز جمعہ ظہر کے وقت سے پہلے
درست نہیں اسی طرح خطبہ بھی اگر زوال سے پہلے پڑھ لیا جائے تو شرعاً معتبر نہیں۔
اس کا اعادہ ضروری ہے (کما هو مصرح فی عامۃ کتب الفقہ) اس خطبہ کی شرعی غرض
اور اس سے اصلی مقصود کیا ہے تاکہ آگے یہ فیصلہ کرنا سہل ہو جائے کہ وہ کس زبان میں ہونا
چاہئے اور اگر عربی میں پڑھیں تو اس کا ترجمہ ملکی زبان میں کرنا چاہئے یا نہیں۔ اس کو سمجھنے
کے لئے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ خطبہ کے لئے کچھ تو ارکان و فرائض ہیں جن پر خطبہ کی صحت و
عدم صحت کا مدار ہے اور کچھ آداب و سنن ہیں جو اس کے مکملات میں سے ہیں۔

خطبہ کے ارکان اور آداب

فرض صرف دو ہیں۔ ایک وقت جمعہ، دوسرا مطلق ذکر اللہ۔ خواہ کسی لفظ سے ہو۔ پھر امام صاحبؒ کے مذہب پر طویل ہر یا مختصر اور ما جیسی کے مذہب پر ذکر طویل جس کو عرفاً خطبہ کہا جاسکے شرط ہے کذافی الہدایہ والفتح والبحر۔

ادب آداب سنسن پندرہ ہیں:-

ایک طہارت اسی لئے بلا و منو خطبہ پڑھنا مکروہ اور ابو یوسفؒ کے نزدیک ناجائز ہے دوسرے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھنا اس کے خلاف مکروہ ہے۔

تیسرے قوم کی طرف متوجہ ہو کر خطبہ پڑھنا۔

چوتھے خطبہ سے پہلے آہستہ آواز ڈالنا پڑھنا (علی قول ابی یوسفؒ)

پانچویں خطبہ کا لوگوں کو سنانا اس لئے اگر آہستہ پڑھ لیا تو اگرچہ فرض ادا ہو گیا مگر کراہت رہی۔

چھٹے یہ کہ خطبہ مختصر پڑھنا جو دس چیزوں پر مشتمل ہو۔

(۱) حمد سے شروع کرنا (۲) اللہ تعالیٰ کی ثنا کرنا (۳) کلمہ شہادتین پڑھنا (۴) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا (۵) وعظ و نصیحت کرنا (۶) کوئی آیت قرآن مجید کی پڑھنا (۷) دونوں خطبوں کے درمیان تقوڑا سا بیٹھنا (۸) دوسرے خطبہ میں دوبارہ الحمد اور ثناء اور درود پڑھنا (۹) تمام مسلمان مرد و عورت کے لئے دعا مانگنا (۱۰) دونوں خطبوں کو مختصر کرنا جس کی انتہا یہ ہے کہ طوالت مفصل کی سورتوں میں سے کسی سورت کے برابر ہو

اس طرح پر یہ پندرہ سنتیں خطبہ کے لئے ہو گئیں جن کے خلاف کرنا مکروہ ہے مگر خطبہ ادا ہو جاتا ہے اور نماز جمعہ صحیح ہو جاتی ہے (بحر)

اسی کے ساتھ ایک سو لھویں سنت اور ہے جو انھیں دلائل سے ثابت ہے جن سے مذکورہ پندرہ سنتیں ثابت ہیں۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعامل اور مواظبت

کہ اسی سے اکثر سنن مذکورہ ثابت ہوئی ہیں اور اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خطبہ صرف عربی زبان میں ہو غیر عربی میں نہ ہو۔ کیونکہ نہ تمام عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے خلاف ثابت ہوا اور نہ آپ کے بعد صحابہ کرام سے کبھی غیر عربی میں خطبہ پڑھا ثابت ہوا حالانکہ ان میں بہت سے حضرات عجمی زبانوں سے واقف تھے اور بیان مذکورہ پر مندرجہ ذیل عبارات شاہد ہیں۔ امر اول کے دلائل کہ خطبہ جمعہ کی اصل حقیقت اور رکن صرف ذکر اللہ ہے یہ ہیں:-

خطبہ کی اصل حقیقت ذکر ہے و عطف تکرار اس کا

رکن نہیں

قال الله تبارك و تعالیٰ فاسعوا
إلى ذكر الله قلت وقد صرح عامة
المفسرين بان المراد من التكرار الخفية
ويؤيداه مارواه الشيخان عن
ابن هريرة رضي في حديث طويل
فاذا خرج الامام حضرت
الملائكة يستمعون الذكر
(از تفسیر ابن کثیر ص ۴۵۶ ج ۱) قال
ابن کثیر ای ترک عم البیع
واقبالعم الی ذکر اللہ والی الصلوة
وفی مبسوط السنخسی رحمہ اللہ
ولتان الخطبة ذکر والمحدث والجنب
لا یستعان من ذکر اللہ مبسوط ص ۲۶
ج ۲ ثم قال بعد ذلك ولان المنصوص

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب اذان جمعہ پڑھائی جائے
تو اللہ کے ذکر کی طرف چلو۔ عامہ مفسرین نے
اس آیت کے تحت میں تصریح فرمائی ہے کہ ذکر
سے آیت میں خطبہ جمعہ مراد ہے۔ اور بخاری و مسلم
کی روایت اس کی تائید کرتی ہے جو حضرت ابو ہریرہ
رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث کے ذیل میں مروی
ہے الفاظ اس کے یہ ہیں پس جب کہ امام خطبہ کے لئے
نکلتا ہے تو طائفہ ذکر سننے کے لئے اندر آجاتے ہیں
(تفسیر ابن کثیر ص ۴۵۶ ج ۱) نیز ابن کثیر کہتے ہیں یعنی تھارا
بیع کو چھوڑ دینا اور ذکر اللہ اور نماز کی طرف متوجہ ہونا
اور مبسوط امام سرخسائی ہے اور ہماری دلیل یہ ہے
کہ خطبہ ذکر ہے اور بے وضو اور غسل کی حاجت والا
ذکر اللہ سے ممنوع نہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ منصوص علیہ قرآن میں ذکر

ہے۔ اور یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ذکر بالخطبہ نص سے ثابت ہے اور ذکر لفظ الحمد شرکینے سے ادا ہو جاتا ہے اور علی نے شرح منیر میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فاسوا الی ذکر اللہ عام ہے کہ ذکر طویل ہو یا مختصر۔ پس شرط صلوات اتنی ہے کہ جو قرآن سے ثابت ہے۔

ہاں! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر مطلق کی ایک فرد یعنی ایسا ذکر طویل جس کو خطبہ کہہ سکیں اختیار کرنا اور اسی پر دوام سرمانا حدیث میں منقول ہے اس لئے ایسے ذکر طویل کو واجب یا سنت کہیں گے فرض نہیں۔

بلکہ فرض تو مطلق ذکر سے ادا ہو جاتا

ہے۔

عیدہ الذکر قال اللہ تعالیٰ فاسعوا الی ذکر اللہ وقد بینا ان الذکر بہا ای بالخطبہ ثبت بالنص الذکر تحصل بقوله الحمد لله ميسوط مفری ص ۳۱ ج ۲۔ وقال الحلبي في شرح المنية الكبير وقوله تعالیٰ فاسعوا الی ذکر اللہ من غیر فصل بین کونہ ذکر طویلا او قصیرا فالشرط الذکر الاعمال لقطعی غیر ان الما ثور عنہ صلی اللہ علیہ وسلم اختیار احد لفردین اعنی الذکر المسی خطبہ والمواظبہ علیہ فكان ذلک واجبا او سنة۔ (کبیری لاہوری ص ۴۷)

خطبہ جمعہ غیر عربی میں جائز نہیں

آمدوم یعنی سنن اور آداب خطبہ کا ثبوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے تعامل سے جس کی بنا پر فقہانے ان آداب کی تصریح فرمائی ہے عالمگیری کتاب الصلوات باب سادس ص ۱۳۷ ج ۱ مصری اور بحر الرائق ص ۱۵۹ ج ۲ میں ان کو مفصل لکھا ہے عبارت بحر کے بعض الفاظ یہ ہیں:-

خطبہ دو چیزوں پر مشتمل ہے ایک فرض دوسری

سنت۔ فرض تو صرف دو چیزیں ہیں ایک

وقت جمعہ دوسرے ذکر اللہ تعالیٰ اور سنتیں

پندرہ ہیں۔ اس کے بعد وہی پندرہ سنتیں یا

اما الخطبة فتشتمل علی

فرض وسنة فاما الفرض

فشیان الوقت و ذکر اللہ تعالیٰ

واما سنة فخمسة عشر ثم شرحا

مفصلاً کہا کرنا

بیان میں جو اوپر مذکور ہو چکیں۔

پندرہ سنتوں کی تصریح کتب مذکورہ کی عبارتوں میں ہے اور سوطیوں سنت یعنی خاص عربی میں ہونا حضرت امام ابو یوسفؒ و محمدؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ اور امام نووی و رافعی وغیرہم نے اسی دلیل سے ثابت کیا ہے جس سے پندرہ سنتیں ثابت ہیں یعنی عمل اور مواظبتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر صحابہ کرام کی باوجودیکہ جس طرح آج تبلیغ احکام اور ادن کی تعلیم و اشاعت کی حاجت ہے اوس وقت اس سے زیادہ تھی کیوں کہ اب تو کتب و رسائل ہر قوم کی زبان میں ہزار ہا موجود ہیں اور اوس وقت سلسلہ تصنیف بالکل نہ تھا۔ نیز یہ بھی نہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب ہمیشہ اہل عرب ہی ہوں بلکہ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ روم و فارس اور مختلف بلاد عجم کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس خطبہ میں شریک ہوتے تھے اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حضور صلعم بوجہ مادری زبان عربی ہونے کے دوسری زبان میں خطبہ نہ دیتے تھے تو اگر مقصود خطبہ و غلط و تبلیغ ہی تھا اور تبلیغ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہر ہے کہ تمام اقوام عالم عرب و عجم کے لئے عام ہے تو عجمیوں کی رعایت سے ایسا کیا جاسکتا تھا کہ کسی صحابی کو حکم نہ دیتے تو خطبہ کے بعد ہی اوس کا ترجمہ عجم کی زبان میں سنا دیتے جیسا کہ بعض وفود وغیرہ سے مکالمہ کے وقت ترجمان سے کام لیا جاتا تھا۔

لیکن تمام عمر نبوی میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مروی نہیں۔ آپ کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک سیل رواں کی صورت میں بلاد عجم میں داخل ہوئے اور دنیا کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا جہاں اسلام کا کلمہ نہیں پہنچا دیا اور شعائر اسلام نماز اور حج و اعیاد قائم نہیں کر دیے۔ ان حضرات کے خطبے تاریخ کی کتابوں میں آج بھی بالفاظہا مذکور و مدون ہیں ان میں کسی ایک نے بھی کبھی بلاد عجم میں داخل ہونے کے بعد اپنے مخاطبین کی ملکی زبان میں خطبہ نہیں دیا حالانکہ وہ ابتداء فتح اور اسلامی تعلیمات کی اشاعت کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ جب کہ تمام لوگ تبلیغ احکام کے لئے آج سے کہیں زیادہ محتاج تھے۔

یہاں یہ شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اون کو عجمی زبان کی واقفیت نہ تھی کیونکہ بہت سے صحابہ کرام کے متعلق ادن کی سوانح و تذکروں میں تصریح ہے کہ وہ فارسی یا رومی یا ہندی

وغیرہ زبانیں جانتے اور ان میں بخوبی تقریر کرتے تھے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کے متعلق ثابت ہے کہ وہ بہت سی مختلف زبانیں جانتے تھے۔ اسی طرح حضرت سلمانؓ تو خود فارس کے رہنے والے اور حضرت بلالؓ حبشہ کے اور حضرت صہیبؓ روم کے باشندے تھے اسی طرح بہت سے حضرات صحابہ میں جن کی مادری زبانیں عربی کے علاوہ دوسری تھیں۔

اس کے علاوہ اگر معانی خطبہ کو عجمیوں کے علم میں لانا بوقت خطبہ ہی ضروری سمجھا جاتا، اور خطبہ کا مقصد صرف تبلیغ ہی ہوتی تو جو سوال آج کیا جاتا ہے کہ خطبہ عربی میں پڑھنے کے بعد اس کا ترجمہ اردو یا دوسری ملکی زبانوں میں کر دیا جائے۔ یہ کیا اس وقت ممکن نہ تھا؟ جیسا کہ دوسری ملکی اور سیاسی ضرورتوں کے لئے ہر صوبہ میں عمال حکومت اپنے پاس ترجمان رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک مستقل ترجمان انہیں ضرورتوں کے لئے اپنے پاس ملازم رکھا ہوا تھا رواہ البخاری فی الوفود، لیکن اس کے باوجود کبھی نہ حضرت ابن عباس سے یہ منقول ہے کہ آپ نے عربی خطبہ کا ترجمہ ترجمان کے ذریعہ ملکی زبان میں کرایا ہوا اور نہ کسی دوسرے صحابی سے۔ اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ خطبہ کے لئے سنت یہی ہے کہ صرف عربی زبان میں پڑھا جاوے اور بوقت خطبہ کوئی ترجمہ وغیرہ بھی اوس کا نہ کیا جائے۔ عبارات ذیل اس مقصد کی دلیل ہیں محدث اللہ، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ اپنی شرح موطا میں تحریر فرماتے ہیں:-

و لما لاحظنا خطب النبي	اور جب ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے
صلى الله عليه وسلم وخلفائه رضی اللہ عنہم	خطبوں پر نظر ڈالی تو اون میں چند چیزوں کا غور
وهلم جرافتنقناً وجود اشيا ومنها	ملاحظہ میں سے حمد و ثنا اور کلمہ شہادت اور درود
الحمد والشهادتين والصلوة على	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور تقویٰ کا امر کرنا
النبي والامر بالتقوى وتلاوة آية	اور کسی آیت کا پڑھنا۔ اور تمام مسلمانوں کے
والدعاء للمسلمين والمسلمات و	لئے دعا کرنا۔ اور خطبہ کا عربی زبان میں ہونا
كون الخطبة عربية (الی قوله) واما	پھر فرمایا کہ خطبہ خاص عربی زبان میں ہوتا
كونها عربية فلا ستم اراهل المسلمين	اس لئے ہے کہ تمام مسلمانوں کا مشرق و مغرب

فی المشارق والمغرب بہ مع ان فی کثیر من
الاقالیم کان المخطبون اعمجیین و قال

ہمیشہ ہی غسل رہا ہے۔ ہا وجودے کہ بہت سے
ممالک میں مخاطب عمی لوگ تھے۔

التوفی کتاب لاذکا حمد اللہ تعالیٰ ویشرط
کو نہا ای خطبۃ الجمعة وغیرها) بالعربیۃ

اور امام نووی رح نے کتاب الماذکار میں تحریر
فرمایا ہے کہ خطبہ کے شرائط میں یہ بھی ہے کہ وہ عربی زبان میں ہو۔

اور در مختار میں شروع فی الصلوٰۃ کے بیان میں لکھتے ہیں:-

وعلیٰ هذا الخلاف الخطبة و
جميع الاذکار

یعنی خطبہ اور تمام اذکار اور اد میں بھی یہی اختلاف
ہے کہ امام صاحب غیر عربی میں جائز فرماتے ہیں اور

صاحبین نا جائز (لیکن امام صاحب سے صاحبین کے قول کی طرف رجوع منقول ہے)
اور ائمہ شوافع میں سے امام رافعی فرماتے ہیں:-

وهل یشرط كون الخطبة
کھا بالعربیۃ وجہان الصحیح اشتراطہ

اور کیا خطبہ کا عربی میں ہونا شرط ہے
اس میں دو وجہ ہیں صحیح یہ ہے کہ عربی میں ہونا شرط
ہے۔ پس اگر کوئی ایسا آدمی حاضرین میں نہ ہو جو
عربی پڑھ سکے تو عربی کے سوا دوسری زبان میں
خطبہ پڑھے۔ اور پھر امن پر واجب ہوگا کہ عربی
سکھیں ورنہ گناہ گار ہوں گے۔

یہاں تک کل تقریر کا حاصل یہ ہوا کہ خطبہ جمعہ کا اصلی رکن اور مقصد صرف ذکر اللہ ہے
تبلیغ یا وعظ و تذکیر اس کے فرائض اور مقاصد میں داخل نہیں اس مضمون کے لئے مندرجہ
ذیل مؤیدات مزید شہادت کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:-

(الف) خطبہ جمعہ کو باتفاق فقہاء شرائط جمعہ میں شمار کیا گیا ہے۔

نقل الدلائل ابن الہمام فی
فتح القدیر الاجماع علی اشتراط

علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں نفس خطبہ
کے اشتراط پر اجماع نقل کیا ہے۔

نفس الخطبة (من البحر ص ۱۰۸ ج ۳)

اگر خطبہ کا مقصد وعظ و تبلیغ ہی تھا تو جمعہ کے شرائط میں داخل کرنے کے کوئی معنی

نہ تھے کہ ادائے جمعہ اوس پر موقوف ہو جائے۔

(ب) خطبہ جمعہ کے لئے وقت ظہر ہونا شرط ہے۔

کما فی عامة الكتب و لفظ
البحر لا نہ (یعنی وقت الظہر) شرط
حتی لو خطب قبلہ و صلی فیہ رای
فی وقت الظہر) لم تصح
بحر الرائق کے الفاظ یہ ہیں کہ وقت ظہر خطبہ
کے لئے شرط ہے یہاں تک کہ اگر قبل ظہر خطبہ پڑھ
لیا اور نماز جمعہ وقت ظہر کے اندر پڑھی تو یہ
خطبہ اور نماز دونوں صحیح نہ ہوئے۔

بحر الرائق ص ۱۵۸ ج ۲

اگر خطبہ کا مقصد ذکر محض نہ تھا بلکہ وعظ و تبلیغ مقصود تھی تو وقت ظہر کی کیا تخصیص ہے
اگر زوال سے پہلے کوئی خطبہ پڑھ لے اور نماز بعد زوال پڑھے تو کیا مقصد وعظ ادا نہ ہوگا
کہ فقہاء اس صورت میں جمعہ کو بھی ناجائز قرار دیتے ہیں۔

(ج) ادائے خطبہ کے لئے صرف پڑھ دینا کافی ہے کسی کا سنا ضروری نہیں اگر
چند ہرے آدمیوں کے سامنے یا سوئے ہوئے لوگوں کے سامنے خطبہ پڑھ دیا گیا اور
پھر نماز جمعہ پڑھی تو خطبہ ادا ہو گیا اور نماز جمعہ صحیح ہو گئی۔

کما فی البحر وان كانوا
صما و نياما۔
بحر الرائق میں ہے کہ اگرچہ حاضرین خطبہ ہرے
ہوں یا سو رہے ہوں۔

اگر مقصود خطبہ وعظ و تذکیر تھا تو صورت مذکورہ کے جواز کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

(د) اگر خطبہ پڑھنے کے بعد امام کسی کام میں مشغول ہو گیا اور نماز میں کوئی معتد بہ فصل
ہو گیا تو قول مختار کے موافق خطبہ کا اعادہ کرنا ضروری ہے اگرچہ سننے والے دوبارہ
بھی وہی لوگ ہوں گے جو پہلے سُن چکے ہیں۔

کذا ذکرہ فی البحر عن الخلاصة
ثم قال وقد صرح فی السراج الوهاج
بلزوم الاستیناف و بطلان الخطبة
بحر میں بحوالہ خلاصہ مذکور ہے کہ سراج و واج
میں اس صورت میں بطلان خطبہ اور اس کی تجدید
کے لازم ہونے کی تصریح ہے اور یہی ظاہر
دھذا هو الظاهر (بحر ص ۱۵۹ ج ۲) ہے۔

اگر وعظ و پند ہی خطبہ کا مقصد ہوتا تو اس اعادہ سے کیا فائدہ متصور ہے۔

(۵) بہت سے فقہاء نے خطبہ جمعہ کو دو رکعتوں کے قائم مقام قرار دیا ہے۔

ذکرہ فی البحر الرائق و فی البیان اس کو بحر میں ذکر کیا اور پھر فرمایا کہ بدائع میں

ثم ہی وان کانت قاشمة مقام ہے کہ خطبہ (اگرچہ) دو رکعتوں کا قائم مقام ہے

الرکعتین (ص ۱۰۸ ج ۲) الخ (بحر)

(۹) خطبہ جمعہ کے لئے جو پندرہ سنتیں اوپر مذکور ہوئی ہیں وہ بھی یہی بتلاتی ہیں کہ

خطبہ کا اصلی مقصد ذکر اللہ ہے وعظ و تبلیغ اوس کے مقاصد اصلیہ میں داخل نہیں

ورنہ ان آداب و سنن کا وعظ و تذکیر سے کوئی علاقہ معلوم نہیں ہوتا۔ امور مذکورہ

سے یہ بات اچھی طرح روشن ہو گئی کہ خطبہ جمعہ کا مقصد اصلی شریعت کی نظر میں صرف

ذکر اللہ ہے وعظ و تذکیر اوس کی حقیقت و مقصد کا جز و نہیں البتہ اس کے ساتھ ہی

یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ خطبہ میں کلمات وعظ و تذکیر کا ہونا سنت ہے لیکن ساتھ ہی

یہ بھی ثابت ہوا کہ اون تمام کلمات کا خاص عربی زبان میں ہونا سنت ہے تو جس

طرح وعظ و تذکیر وغیرہ کے کلمات کا خطبہ میں پھوڑ دینا خلاف سنت ہوا اسی طرح

غیر عربی زبان میں پڑھنا یا عربی میں پڑھ کر اوس کا ترجمہ سنانا خلاف سنت اور

مکروہ ٹھہرا۔

اس شبہ کا جواب کہ جب مخاطب سمجھتے اور جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ خطبہ جمعہ

کا مقصد اصلی صرف وعظ و تذکیر نہیں

بلکہ ذکر اللہ اور ایک عبادت ہے اور

ایک جماعت فقہاء کی اسی وجہ سے اس کو دو رکعتوں کا قائم مقام کہتی ہے تو اب یہ سوال

سے منقطع ہو گیا کہ جب مخاطب عربی عبارت کو سمجھتے ہی نہیں تو عربی میں خطبہ

پڑھنے سے کیا فائدہ؟ کیونکہ اگر یہ سوال خطبہ پر عائد ہوگا تو پھر صرف خطبہ پر نہ رہے

گا بلکہ نماز اور شراۃ قرآن اور اذان و اقامت اور تکبیرات نماز وغیرہ سب پر

یہی سوال عائد ہو جائے گا بلکہ قرأت قرآن پر بہ نسبت خطبہ کے زیادہ چسپاں ہوتا ہے

کیونکہ قرآن مجید کی غرض و غایت تو اول سے آخر تک ہدایت ہی ہدایت ہے اور وہ تبلیغ احکامِ الہیہی کے لئے نازل ہوا ہے اور پھر اذان و اقامت اور تکبیرات جن کا مقصد محض لوگوں کو جمع کرنا یا کسی خاص عمل کا اعلان کرنا ہے یہاں بھی یہ سوال بہ نسبت خطبہ کے زیادہ وضاحت کے ساتھ عائد ہوگا کہ حی علی الصلوٰۃ - حی علی الصلوٰۃ کون جانتا ہے - نماز کو چلو - نماز کو چلو کی آواز دینی چاہیے یا کم از کم ترجمہ کر دینا چاہیے۔ اور اگر یہ شبہ کیا جائے کہ اذان تو کلمات مقررہ میں ایک اصطلاح سی ہو گئی ہے باوجود معانی نہ سمجھنے کے بھی مقصد اعلان حاصل ہے تو صحیح نہیں کیونکہ نفس اعلان اور اصطلاح کے لئے تو چند کلمات تکبیر و شہادتین بھی کافی تھے اور ان سے اعلان کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر سرے سے باقی الفاظ کا کتنا ہی فضول ہوگا۔

لیکن غالباً کوئی سمجھ دار مسلمان اس کو تجویز نہ کرے گا کہ نماز مع قرأت و تکبیرات کے اور اسی طرح تمام شعائر اسلامہ اذان و اقامت وغیرہ کو اردو یا دوسری ملکی زبانوں میں پڑھا جائے یا کرے۔ بلکہ سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی اصلی غرض اگرچہ تبلیغ احکام ہی ہے لیکن نماز میں اس کے پڑھنے کی غرض اصلی یہ نہیں بلکہ وہاں صرف ادائیگی عبادت اور ذکر اللہ مقصود ہے اور نماز میں اسی حیثیت سے قرآن کی جاتی ہے تبلیغ و وعظ مقصود نہیں ہوتا اور اگر حاصل ہو جائے تو وہ صمننا ہے۔

ٹھیک اسی طرح خطبہ جمعہ کو سمجھنا چاہئے کہ اس کا مقصد اصلی ذکر و عبادت ہے اور وعظ و پند جو اس میں ہے تبعاً ہی حاصل ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ کوئی حرج نہیں اس لئے قرآن اور تکبیرات و اذان وغیرہ کی طرح خطبہ جمعہ کو بھی خالص عربی میں پڑھنا چاہئے دوسری زبان میں پڑھنا یا عربی میں پڑھ کر ترجمہ کرنا خلاف سنت بلکہ بدعت و ناجائز ہے اور نماز تو اس طرح ادا ہی نہ ہوگی۔

یہاں تک اصل مسئلہ کا جواب تو صاف ہو گیا کہ خطبہ عربی کے سوا کسی زبان میں پڑھنا یا عربی میں پڑھ کر دوسری زبان میں اسی وقت ترجمہ کرنا بدعت و ناجائز ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام خلفاء راشدین اور تمام صحابہ کرام کے عمل اور قرون مشہود لہما بالآخر کے

تعالیٰ کے خلاف ہے اور اول عربی میں پڑھ کر پھر ملکی زبان میں ترجمہ کرنے میں ایک دوسری قباحت بھی ہے وہ یہ کہ ادھر گزر چکا ہے کہ خطبہ کا مختصر ہونا اور اختصار کے ساتھ اس امور مذکورہ پر مشتمل ہونا سنت ہے اب اگر اس طرح کا خطبہ مسنونہ عربی میں پڑھنے کے بعد ترجمہ کیا جائے گا تو مجموعی مقدار خطبہ کی خطبہ مسنونہ کے دو گنے سے بھی کچھ زیادہ ہو جائے گی اور اگر امور مذکورہ مسنونہ میں سے کسی کو کم کیا تو دوسری طرح خلاف سنت ہو جائے گا بہر حال ترجمہ اردو پڑھنے میں یا تو تطویل خطبہ لازم آئے گی جو تبص حدیث ممنوع ہے۔ مؤطا امام مالکؒ میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ قرن سہمیاہ کے خصوصی فضائل میں اختصار خطبہ کو اور آخر امت کے فتن و مفاسد میں تطویل خطبہ کو شمار فرماتے ہیں مؤطا مجتہبی ص ۶۱ اور اگر تطویل نہ ہوگی تو خطبہ کے امور مسنونہ میں سے کوئی چیز ضرور باقی رہے گی اور اس طرح خلاف سنت ہو جائے گا۔

اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے جو اگرچہ شرعی حیثیت سے کوئی قابل التفات سوال نہیں لیکن موجودہ حالات کے لحاظ سے وہ کس قدر اہم ہو گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب خطبہ کا مقصد اصلی وعظ و پند نہیں بلکہ ذکر و عبادت ہے تو امام کو چاہئے تھا کہ نازکی طرح مستقبل قبلہ ہو کر خطبہ دیتا قوم کی طرف متوجہ ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی بلکہ قوم کی طرف متوجہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ خطبہ کی اصلی غرض وعظ و نصیحت ہے۔ نیز جب کہ اس ذکر کا خاص عربی میں رکھنا مسنون ہے تو اس میں وعظ و پند کے کلمات اور مخاطبات کا رکھنا اکثر بلاد کے اعتبار سے بے فائدہ ہو گیا۔ پھر خطبہ میں وعظ و تذکیر کے کلمات کا تمام بلاد و عجم میں مسنون ہونا کس حکمت پر مبنی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ احکام الہیہ اور تشریحات نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حکمتوں کو تو حق تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں لیکن سرسری نظر میں جو بات سامنے ہے وہ بھی ایک عظیم الشان حکمت پر مشتمل ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

زبان کا اثر معاشرت اور اخلاق اور اس کے سمجھنے کے لئے یہ معلوم کرنا چاہئے عقل و دین پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ کہ رذمہ کے تجربہ اور عقائد کی تصریحات

سے ثابت ہے کہ ہر قوم کی زبان اور لغت کو طرزِ معاشرت اور اخلاق اور عقل و دین میں نہایت قوی دخل ہے اور ہر لغت اور زبان کے کچھ اثراتِ مخصوصہ ہیں کہ جب کسی قوم اور کسی ملک میں وہ زبان پھیلتی ہے تو وہ اثرات بھی ساتھ ساتھ عالمگیر ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ حالت کو اب سے پچاس برس پہلے کی حالت کے ساتھ اگر موازنہ کیا جائے تو اس کی تصدیق آنکھوں کے سامنے آجائے گی کہ جس وقت تک ہندوستان میں انگریزی زبان کی یہ کثرت نہ تھی اس دہریت و تفریح اور آزادی و بے قیدی کی بھی یہ کثرت نہ تھی سرکاری اسکولوں کے ذریعہ ملک میں اس زبان کو عام کیا گیا تو ایسا ہو گیا کہ گویا ہندوستان کے طرزِ معاشرت اور اخلاق و تمدن سب ہی پر ڈاکہ ڈال دیا۔

زبان کی اشاعت و عموم کے ساتھ ہی ساتھ انگریزی معاشرت یورپین خیالات۔ یورپین آزادی و دھرمیت و باہر کی طرح پھیل گئی اور جس وقت مسلمانوں کی قسمت میں ترقی لکھی تھی تو ان کے لئے بھی زبانِ عربی کی اشاعت نے وہی کام کیا تھا جو آج غیر عرب کی زبان کر رہی ہے بلکہ اگر تاریخ دیکھی جائے تو بلاشبہ مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ عربی زبان نے تمام دنیا کو ایسا مفتوح کیا تھا کہ کوئی خطہ بھی اس کے حلقہ اثر سے خارج نہ رہا تھا اور تقریباً ایک ہزار سال کامل تمام عالم پر ایسی حکومت کی کہ دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے یقیناً عاجز ہے۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم میں عرب و عجم کی زبان پر مفصل کلام کرتے ہوئے فرمایا ہے:

واعلم ان اکتیاد اللغۃ
مؤثر فی العقل والخلق والذین تاثیراً
بمعہ لو کہ کسی خاص زبان کی عادت ڈال لینا
عقل اور اخلاق اور دین میں بہت بڑی قوی تاثیر
قویا بینا۔
رکھتا ہے جو بالکل ظاہر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر بادشاہ اپنی قومی زبان کو اپنی مملکت میں رائج کرنے کے لئے طرح طرح کی کوشش کرتا ہے۔

اس سے یہ غرض نہیں کہ انگریزی زبان سیکھنا مطلقاً ناجائز ہے بلکہ ایک مشاہدہ کا تبنا ہے اور اگر کوئی انگریزی زبان ان مفاسد سے عکادہ ہو کر سیکھے تو بلاشبہ جائز اور نیک نیت ہو تو ثواب ہے

ہندوستان میں زبان انگریزی کی ترویج اور اس کا سیاسی مقصد! یورپین اقوام جو آزادی و حریت کی بہت وعیدیں

ہیں اور مساوات کا دم بھرتی ہیں جس وقت ہندوستان پر قبضہ کرتی ہیں تو ہزاروں طرح کی کوشش کر کے اور کروڑوں روپیہ خرچ کر کے اپنی خاص قومی زبان کو ہندوستان کی معاشرت کا جزو اعظم بنا دیتی ہیں۔ ہندوستان میں اب اگرچہ زبان انگریزی کا عموم و شیوع بہت کچھ ہو چکا ہے۔ لیکن اب بھی اگر مجموعی حیثیت سے مردم شماری پر نظر ڈالی جائے۔ کل ہندوستانی قلمرو میں شاید پانچ فیصدی اشخاص بھی انگریزی جانتے والے نہ نکلیں گے۔ لیکن اس کے باوجود حکومت کی طرف سے جو پرزہ کاغذ چلتا ہے تو انگریزی زبان کے سکہ کے ساتھ چلتا ہے۔ ڈاکخانہ کے تمام کاغذات ریلوے کے ٹکٹ بلیٹیاں اور تمام کاغذات تمام عدالتوں کے عام کاغذات جو خاص طور سے ہندوستانیوں ہی کی اطلاع و کاروبار کے لئے جاری کئے جاتے ہیں وہ سب انگریزی زبان میں لکھے جاتے ہیں خلیق اللہ اس غیر زبان کی وجہ سے پریشان ہوتی ہے اور اصحاب معاملہ کو محض اس زبان کی دقت کی وجہ سے دوگنا خرچہ کر جاتی وغیرہ میں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مگر حکومت اس کی پروا نہیں کرتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا اس پر مجبور ہو گئی کہ انگریزی زبان حاصل کرے اس کے بغیر زندگی بسر کرنا مشکل ہو گیا۔ کوئی پوچھے کہ اس میں کوئی اہل ملک کی مصلحت تھی ہرگز نہیں محض سیاسی اور وہ یہ کہ اپنے حلقہ اثر کو وسیع کرنا اور طرز معاشرت و تمدن اور اپنی نام نہاد تہذیب کو دنیا میں رواج دینا۔ ہمارے روشن خیال برادر جو علماء سے یہ سوال پیش کرتے ہیں کہ عربی زبان میں خطبہ پڑھنے سے کیا فائدہ۔ کبھی اس طرف بھی نظر عنایت متوجہ فرمائی ہے کہ انگریزی زبان میں ڈاک ادویل کے ٹکٹ اور ریل کی بلیٹ وغیرہ چھاپنے سے کیا فائدہ۔ سفر کرنے والے عموماً انگریزی دان نہیں۔ اگر وہ حکومت کی اس گہری چال پر نظر ڈالتے تو انھیں خطبہ کی عربی ہونے کی حکمت خود بخود معلوم ہو جاتی

عربی زبان کی بعض خصوصیات اس کے بعد اس پر غور کیجئے کہ یہی وہ بات ہے جس کو یورپ بہت پہلے مسلمانوں نے سمجھا تھا اور چونکہ یہ

ایک فطری اور طبعی طریقہ اسلامی شعائر کی اشاعت کا تھا۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے طرز عمل سے اس کو اتنا موکد کر دیا کہ تمام عمر اس کے خلاف کی ایک نظیر بھی ظاہر نہیں ہوتی۔

اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں عربی زبان نے تمام عالم کو فتح کر لیا اور اس طرح فتح کیا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ کیونکہ تاریخ اقوام پر نظر ڈالنے والوں سے پوشیدہ نہیں کہ جس وقت عربی زبان ممالک عجم میں مسلمانوں کی فاتحانہ مداخلت کے ساتھ داخل ہوئی تو بغیر کسی ایسے ناجائز جبر و تشدد کے جو آج ہم پر روا رکھا جاتا ہے عربی زبان کی جاذبہ محبوبیت نے اس طرح لوگوں کے قلوب میں جگہ کر لی کہ تھوڑی ہی مدت میں بہت سے ممالک عجم کی اپنی اصلی زبانیں بالکل متروک ہو کر عربی زبان ہی ملکی زبان ہو گئی۔

مصر اور شام میں اسلام سے پہلے رومی زبان رائج تھی مسلمانوں کے داخل ہوتے ہی عربی زبان نے ملکی زبان کی جگہ لے لی۔ اسی طرح عراق اور خراسان کی وطنی زبان فارسی تھی کچھ عرصہ کے بعد متروک ہو کر عربی رائج ہو گئی۔ چنانچہ عراق کا ایک بہت بڑا حصہ آج تک عربی زبان کا پابند ہے جس کو عراق عرب ہی کے نام سے موسوم کرتے ہیں البتہ خراسان میں انقلابات و حوادث کی بنا پر پھر فارسیت غالب ہو گئی۔ ممالک مغربی یورپ وغیرہ میں بربر ہی زبان رائج تھی وہاں بھی عربی زبان نے اپنا سکہ جمایا اور اگرچہ آج مدت مدیدہ کے بعد اب عربیہ وہاں باقی نہیں رہی لیکن عربی لغت کے بہت سے آثار آج بھی انگریزی اور جرمنی اور فرانسیسی زبان میں موجود ہیں جیسا کہ انگریزی مؤرخوں اور بعض منصف مستفین نے اس کا اقرار کیا ہے۔

الغرض شعائر اسلامیہ نماز اور اذان نماز اور اذان اور خطبہ وغیرہ کو خاص عربی زبان میں رکھنا اسلام کا ایک اہم مذہبی اور سیاسی مقصد ہے۔

تکبیرات اور خطبے جو مشاہد عام میں پڑھے جاتے ہیں ان کو عربی

۱۵ صرح بہ ابن تیمیہ رحمہ فی اقتضائ الصراط المستقیم ۱۲

زبان میں کرنے کا سیاسی مقصد ہی یہ تھا کہ جب لوگ نہ سمجھیں گے اور ہر وقت اس سے سابقہ پڑے گا تو خواہ مخواہ عربی زبان سیکھنے کی طرف توجہ ہوگی۔ جو کہ قرآن و حدیث اور علوم شرعیہ کی ترجمان زبان ہے۔ اور جس کا سیکھنا مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے چنانچہ ہی ہوا۔ اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ زبان کا اثر اخلاق و عادات اور معاشرت و معاملات پر بہت گہرا ہوتا ہے عربی زبان کے بھی اہم شمار مخصوصہ اس کے ساتھ ساتھ ہی عالمگیر ہو گئے۔

الغرض ان شعائر اسلامیہ کو عربی زبان میں رکھنے کی حکمت ایک سیاسی غرض ہے اور خطبہ جمعہ میں خصوصیت سے سیاست کا بھی مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

خطبہ جمعہ میں سیاست کا مظاہرہ | چنانچہ دارالاسلام میں خطبہ جمعہ کے خطیب کے لئے یہ بھی مستحب ہے کہ اون ممالک میں جو جہاں جنگ کے ذریعہ فتح ہوئے ہیں خطبہ کے وقت خطیب تلوار باندھ کر خطبہ دے گا صرح بہ فی الدرامختار والشامی ص ۵۵۳۔ اور سنن ابوداؤد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تلوار لے کر خطبہ دینا روایت کیا گیا ہے۔ اور اسی حکمت عملی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی باوجودیکہ مسلمان مذہب اور مذہبی علوم سے کوسوں دور جا پڑے ہیں لیکن ہنوز اون میں قرآنی زبان کے ساتھ ایک خاص تعلق باقی ہے کہ ادنیٰ اشارہ سے مطلب سمجھ لیتے ہیں اور اس طرح عام مسلمان اپنے مرکز کے ساتھ مربوط ہیں۔ تعجب ہے کہ مسلمان اس حکمت کو نہیں سمجھتے بلکہ اعتراضات کرتے ہیں اور دوسری قومیں اس کا احساس کرتی ہیں اور اقرار کرتی ہیں۔

ڈاکٹر گستاویں بان کہتا ہے کہ زبان عربی کی نسبت ہم کو وہی کہتا ہے جو ہم نے عرب کی نسبت کہا ہے۔ یعنی جہاں پہلے ملک گیر

عربی زبان کے آثار خاصہ اور بعض یورپین موزخوں کا اعتراف

اپنی زبان کو مفتوحہ ممالک میں جاری نہ کر سکے تھے عربوں نے اس میں کامیابی حاصل کی اور مفتوحہ اقوام نے ان کی زبان کو بھی اختیار کر لیا۔ یہ زبان ممالک اسلامی میں اس درجہ پھیل گئی

کہ اوس نے یہاں کی قدیم زبانوں یعنی سریانی۔ یونانی۔ قبطنی۔ بربری وغیرہ کی جگہ لے لی۔ ایران میں ایک مدت تک عربی زبان قائم رہی اور اگرچہ اوس کے بعد زبان فارسی کی تجدید ہو گئی۔ لیکن اس وقت تک علماء کی تحریریں اوسی زبان میں ہوتی ہیں۔ ایران کے کل علوم و مذہب کی کتابیں عربی میں لکھی گئی ہیں۔ ایشیا کے اس خطہ میں زبان عربی کی وہی حالت ہے جو ازمنہ متوسطہ میں زبان لاطینی کی حالت یورپ میں تھی۔

ترکوں نے بھی جنہوں نے عربوں کے ملک فتح کئے اور انہیں کی طرز تحریر اختیار کر لی اور اس وقت تک ترکوں کے ملک میں کم استعداد لوگ بھی ستران کو بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔ یورپ کی لاطینی اقوام کی البتہ ایک مثال ہے جہاں عربی زبان نے اون کی قدیم السنہ کی جگہ نہیں لیکن یہاں بھی اونہوں نے اپنے تسلط کے بین آثار چھوڑے ہیں۔ موسیو ڈوز اور موسیو انگلمین نے مل کر زبان اندلس اور پرتگال کے اون الفاظ کی جو عربی سے مشتق ہیں ایک لغت تیار کر لی ہے۔ سترانس میں بھی عربی زبان نے بڑا اثر چھوڑا ہے۔ موسیو سدی پو نہایت درست لکھتے ہیں کہ ادورن اور سوثر میں کی زبان بھی عربی الفاظ سے زیادہ معمور ہو گئی ہے اور ادون کے ناموں کی صورت بھی بالکل عربی ہے۔

فرانسیسی زبان کے ایک لغت نویس جنہوں نے الفاظ کا اشتقاق دیا ہے لکھتے ہیں کہ جنوبی فرانس میں عربوں کے قیام کا کوئی اثر نہ محاورہ پر رہا ہے اور نہ زبان پر۔ جو فرست اوپر لکھی جا چکی ہے اوس سے معلوم ہو گا کہ اس رائے کی کس قدر وقعت ہے۔ نہایت تعجب کی بات ہے کہ اب بھی ایسے تعلیم یافتہ لوگ موجود ہیں جو اس قسم کے مہل اقوال کا اعادہ کرتے ہیں۔ "انتہی۔" (منقول از تحقیق الخطیبہ لمحضرۃ الاستاد مولانا شبیر احمد عثمانی الدیوبندی مدظلہم) دیکھیے اگر اگلے زمانہ کے مسلمان بھی ہماری طرح یہی رائے رکھتے کہ خطبات و کبیرات وغیرہ شعائر اسلامیہ کو ملکی زبان میں کر دیا جائے تو آج عربی زبان کی وہ امتیازی خصوصیات جن کا سکہ دوسری اقوام کو بھی ماننا پڑ گیا ہے کس طرح محفوظ رہ سکتیں۔

کلام اگرچہ طویل ہو گیا لیکن یہ بات عقلاً و نقلاً منقطعاً اوصاف ہو گئی کہ خطبات کو اور بالخصوص خطبہ جمعہ کو عربی زبان ہی میں رکھنا چاہیے۔ اوس کا ترجمہ کرنا بھی مناسب نہیں۔

خطبہ جمعہ وعیدین میں فرق

خطبہ جمعہ وعیدین و نکاح وغیرہ اس بات میں قول مختار کے موافق سب شریک ہیں کہ جب خطیب خطبہ پڑھے تو کلام و سلام یہاں تک کہ ذکر و تسبیح وغیرہ سب ناجائز ہو جاتے ہیں بلکہ چپ بیٹھنا اور خطبہ سنا ضروری ہو جاتا ہے۔

قال فی الدار المختار و کذا یجب الاستماع لساائر الخطب کخطبة نکاح و خطبة عید و نحتہ۔
اور ایسے ہی تمام خطبوں کا سنا ضروری ہے مثل خطبہ نکاح و خطبہ عید وغیرہ۔

لیکن چند امور میں خطبہ جمعہ وعیدین میں فرق ہے۔ (۱) خطبہ عیدین جمعہ کی طرح نماز کے لئے شرط نہیں بلکہ بلا خطبہ بھی نماز عیدین صحیح ہو جاتی ہے (۲) خطبہ عیدین فرض و واجب نہیں بلکہ سنت ہے (۳) خطبہ عیدین بعد عید پڑھا جائے پہلے نہیں۔

قال الشامی بیان للفرق وهو انها فیہما سنة لا شرط و انها بعدھا لا قبلھا بخلاف الجمعة قال فی البحر حتی لو لم یخطب اصلا صم و اساء لترك السنة و لو قد ما علی الصلوة صحت و اساء و لا تعاد الصلوة۔
علامہ شامی فرماتے ہیں کہ فرق درمیان خطبہ جمعہ و عیدین کے یہ ہے کہ خطبہ عیدین میں سنت ہے شرط نہیں اور یہ کہ عیدین میں بعد نماز ہے بخلاف جمعہ کے بحر الرائق میں ہے کہ اگر عیدین میں بالکل خطبہ نہ پڑھا جائے تو نماز صحیح ہو جائے گی اگرچہ ترک سنت سے گناہ گار ہوں گے اسی طرح نماز سے پہلے خطبہ پڑھنے میں خلاف سنت کا گناہ ہو گا مگر نماز درست ہو جائے گی۔

امور مذکورہ پر نظر کرتے ہوئے اگر خطبہ عیدین میں عربی خطبہ پڑھ کر اردو ترجمہ بھی سنا دیا جائے تو مضائقہ نہیں کیونکہ اول تو اس خطبہ کی وہ شان نہیں کہ شرط صلوٰۃ اوقائم مقام رکعتین ہو۔ ثانیاً چونکہ خطبہ عید نماز کے بعد ہوتا ہے تو جب خطبہ عربی سے فراغت ہو گئی نماز عید اور اس کی سنت ادا ہو گئی اب خالی دقت ہے اس میں بطور تبلیغ احکام کے ترجمہ سنادیں تو کچھ مضائقہ نہیں اور تطویل خطبہ بھی لازم نہیں آتا کیونکہ ترجمہ کے وقت اگر

کوئی شخص جانا چاہے تو کوئی حرج شرعی اون پر عائد نہیں ہوتا بخلاف خطبہ جمعہ کے کہ وہاں ابھی تک نماز نہیں ہوئی۔ نماز کا انتظار لامحالہ ضروری ہے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

خلاصہ احکام الخطبہ

- (۱) خطبہ جمعہ شرط نماز ہے بغیر خطبہ کے نماز جو ادا نہیں ہوتی اور یہ شرط صرف ذکر اللہ سے ادا ہو جاتی ہے۔ (بحر الرائق)
- (۲) خطبہ جمعہ وعیدین وغیرہ کا عربی میں ہونا سنت اور اس کے خلاف دوسری زبانوں میں پڑھنا بدعت ہے (مصنفی شرح مؤطا للشاہ ولی اللہ رحمہ و کتاب الاذکار للنووی و در مختار شروط الصلوٰۃ (شرح الاحیاء للزبیدی)
- (۳) اسی طرح عربی میں خطبہ جمعہ پڑھ کر اس کا ترجمہ ملکی زبان میں قبل از نماز سنانا بھی بدعت ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔ البتہ نماز کے بعد ترجمہ سناویں تو مضائقہ نہیں، بلکہ بہتر ہے (لما مر)
- (۴) البتہ خطبہ عیدین وغیرہ میں اگر خطبہ کے بعد ہی ترجمہ سنا دیا جائے تو مضائقہ نہیں اور اس میں بھی بہتر یہ ہے کہ منبر سے اٹھ کر ترجمہ سناویں تاکہ امتیاز ہو جائے (کما صرح بہ فی تقریظ الرسالۃ العجوبۃ بنیاء علی حدیث مسلم)
- (۵) سنت ہے کہ خطبہ با وضو پڑھا جائے بلا وضو پڑھ کر نماز کے لئے پھر وضو کرنا مکروہ ہے۔ (بحر)
- (۶) سنت ہے کہ خطبہ کھڑے ہو کر پڑھا جائے بیٹھ کر مکروہ ہے (عالمگیری و بحر الرائق)
- (۷) سنت ہے کہ قوم کی طرف متوجہ ہو کر خطبہ پڑھیں رو بقبلہ یا کسی دوسری جانب کھڑے ہو کر پڑھنا مکروہ ہے۔ (عالمگیری۔ بحر)

(۸) سنت ہے کہ خطبہ سے پہلے آہستہ اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ پڑھا جائے (علی قول ابی یوسف، کذا فی البحر)۔

(۹) سنت ہے کہ خطبہ بلند آواز سے پڑھا جائے تاکہ لوگ سنیں۔ آہستہ پڑھنا مکروہ ہے (بحر - عالمگیری)۔

(۱۰) سنت ہے کہ خطبہ مختصر پڑھا جاوے۔ زیادہ طویل نہ ہو اور حد اوس کی یہ ہے کہ طوالت مفصل کی سورتوں میں سے کسی سورت کے برابر ہو۔ اس سے زیادہ طویل پڑھنا مکروہ ہے (شامی - بحر - عالمگیری)۔

(۱۱) سنت ہے کہ خطبہ دس چیزوں پر مشتمل ہو:

اوّل: حمد سے شروع کرنا۔

دوم: اللہ تعالیٰ کی ثناء کرنا۔

سوم: کلمہ شہادتین پڑھنا۔

چہارم: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا۔

پنجم: وعظ و نصیحت کے کلمات کہنا۔

ششم: کوئی آیت قرآن مجید کی پڑھنا۔

ہفتم: دونوں خطبوں کے درمیان تھوڑا سا بیٹھنا۔

ہشتم: تمام مسلمان مرد و عورت کے لئے دُعا مانگنا۔

نہم: دوسرے خطبے میں دوبارہ الحمد للہ اور ثناء اور درود پڑھنا۔

دہم: دونوں خطبوں کو مختصر کرنا، اس طرح کہ طوالت مفصل کی سورتوں سے نہ بڑھے۔

(بحر الرائق - عالمگیری)

تمت الرسالة الامجوبة في عربية خطبة العروبة مع احكام الخطبة في خمس ساعات متفرقة من يوم

الاثنين لعشر بقين من جمادى الثانية سنة ۱۳۵۰ھ

حدره العبد الضعيف محمد شفيق غفر له

خادم دار الافتاء دار العلوم ديوبند ضلع سہارن پور

تقریظ از حضرت سراج السالکین امام العارفین مجدد المذہب حکیم الامت

سیدی وسیدی حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم

بعد الحمد والصلوة میں نے رسالہ مؤلفہ جامع الکمالات العلمیہ مولانا محمد شفیع صاحب مدرس مفتی مدرسہ دارالعلوم دیوبند دام فیضہ نہایت شوق و رغبت سے دیکھا بیحد پسند کیا۔ بلا تکلف کہہ سکتا ہوں کہ اس موضوع میں بے نظیر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو نافع اور شہادت کا دافع فرمادے۔ بطور تذنیب میں بھی بعض فوائد مناسبہ اس کے ساتھ ملحق کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) بڑی بنا عقلی غیر عربی میں خطبہ جائز رکھنے والوں کی یہ ہے کہ یہ تذکیر ہے اور تذکیر مخاطبین کی زبان میں ہونا چاہیے ورنہ عبث ہے۔ اس کا ایک حقیقی جواب ہے اور ایک الزامی تحقیقی یہ ہے کہ اس کا تذکیر ہونا مسلم نہیں خود قرآن مجید میں اس کو ذکر فرمایا گیا ہے قال تعالیٰ: فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ الْإِيَّهِ خصوص مذہب حنفی کی اس تصریح پر دکت تسبیحہ او تحمیدۃ، اور تسبیح و تحمید کا تذکیر نہ ہونا ظاہر۔ معلوم ہوا کہ وہ صرف ذکر ہے تذکیر نہیں الاتبعاً۔ اور الزامی یہ ہے کہ قرآن مجید نبص قرآنی تذکیر ہے۔ قال تعالیٰ ان هو الاذکر ای للعلمین تو چاہیے اس کو بھی نماز میں حاضرین کی زبان میں پڑھا کریں۔ پس جس طرح اس کا عربی زبان میں پڑھنا امر تعبدی ہے اسی طرح خطبہ کا عربی زبان میں پڑھنا۔

(۲) اور بڑی بنا نقلی دعویٰ مذکورہ کی یہ ہے کہ امام صاحب نے نماز میں قرأت کو فارسی میں جائز فرمایا ہے اس کا ایک جواب نقلی ہے۔ ایک عقلی۔ نقلی جواب تو یہ ہے کہ امام صاحب نے اس قول سے رجوع فرمایا ہے، پس اس سے استدلال کہنا ایسا ہے جیسا آیت منسوخہ یا حدیث منسوخہ سے استدلال کہنا اور عقلی یہ ہے کہ امام صاحب کے اس قول میں جو عنہ کی بنا نہیں تھی کہ قرآن تذکیر ہے اس لئے غیر عربی میں پڑھنا جائز ہے اگر یہ بنا ہوتی تو جوئیہ کفایت تسبیح یا تحمید کا اس سے تعارض ہوتا وہو باطل۔ پس اس سے اس کا استدلال کہنا

تاویل القول بالایرضی بہ القائل کی قبیل سے ہے۔

(۳) رسالہ میں عیدین کے خطبہ عربی کے بعد اس کے ترجمہ وغیرہ کی اجازت دی ہے اس میں بھی ہیئت اوفتق بالسنتہ یہ ہے کہ خطبہ سے فارغ ہو کر منبر سے نیچے اوتر کر بیان کر دے اس کی دلیل اپنے ایک رسالہ سے بلفظہا نقل کرتا ہوں وہ ہونذا تقریر المرام۔ انہ روى مسلم عن جابر فی قصة یوم الفطر ثم خطب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلما فرغ نزل فاتی النساء فذا صرهن الحدیث۔

وروى البخاری عن ابن عباس بعد وعظ النساء ثم انطلق هو وبلال الی بیتہ فقوله فرغ ونزل وانطلق الی بیتہ نص فی کون هذا التذکیر بعد الخطبة وانہ لم یکن علی المنبر وانہ لم یعد الی المنبر ولما کان هذا الکلام غیر الخطبة لخلوة عن الخطاب العام الذی هو من خواص الخطبة ثبت بہ ان غیر الخطبة لا ینبغی ان یکون فی اثناء الخطبة ولا علی ہیئۃ الخطبة ولا شک ان التذکیر بالہندیۃ لیس من الخطبة المستنونة فی شئ لان من خواصها المقصود کونها بالعربیۃ لعدم نقل خلافتها عن صاحب الوحی او السلف فلما لم یکن هذا التذکیر الہندی خطبة المستنونة کان الاوفق بالسنتہ کونها بعد الفراغ عن الخطبة و تحت المنبر وهو المرام۔

کتبہ

اشرف علی التہانوی

عفی عنہ ذنبہ الجلی والحنفی

المتصف من شوال المکرم ۱۳۵۰ھ

قنوت نازلہ

دُعا کا طریقہ اور متعلقہ مسائل

احادیث صحیحہ میں ہے کہ جب مسلمانوں پر کوئی شدید حادثہ پیش آتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں مسلمانوں کی حفاظت اور دشمنوں پر فتح کے لئے دعائے قنوت پڑھا کرتے تھے، شرح منیہ میں ہے کہ یہ قنوت نازلہ اب بھی مسنون ہے، درمختار دمشقی میں ہے "قنوت نازلہ" ہر مصیبت عامہ اور جنگ و جہاد کے لئے اب بھی مستحب ہے، مسلمان ایسے مواقع پر دعائے قنوت پڑھا کریں۔ صبح کی نماز کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد امام باواند بلندیہ دعا پڑھے اور مقتدی آمین کہتے رہیں۔ اس دعا کے لئے نہ تکبیر کہی جائے نہ ہاتھ اٹھائے جائیں۔ دعا کے بعد تکبیر کہہ کر امام کے ساتھ سجدے میں جائیں۔

اللَّهُمَّ اهْدِنَا فِيمَنْ هَدَيْتَ ۝ وَعَافِنَا فِيمَنْ

يا الله راه دکھا ہم کو ان لوگوں میں جن کو تو نے راہ دکھائی اور عافیت دے ہم کو ان لوگوں میں جن کو

عَافَيْتَ ۝ وَتَوَلَّنَا فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ ۝ وَبَارِكْ لَنَا

تُو نے عافیت بخشی اور کار سازی کر ہماری ان لوگوں میں جن کو اپنا سازیں اور برکت دے اس چیز میں

۱۵ مقتدی آمین جہرا کہیں یا سراً، اس کی کوئی تصریح فقہاء کے کلام میں نہیں ملی، البتہ کبیری شرح

منیہ قنوت وتر کے بارے میں لکھا ہے کہ وان قنت المقتدی او امن لا یرفع صوته

بالاتفاق لئلا یشوش غیرہ ولان الاصل فی الدعاء الاخفاء ص ۴۰۳ اس سے رجحان اس طرف ہوتا

ہے کہ مقتدی آمین سراً کہیں، جہرا نہ کہیں۔

فِيمَا أُعْطِيَتْ ○ وَقِنَا شَرَّ مَا قَضَيْتَ ○

جو آپ نے ہم کو عطا فرمائی اور بچا ہم کو اس چیز کے شر سے جو آپ نے مقرر فرمایا

فَانَّكَ تَقْضِي وَلَا يُقْضَى عَلَيْكَ ○ إِنَّهُ لَا يَعْرِضُ

کیونکہ فیصلہ کرنے والے آپ ہی ہیں آپ کے خلاف فیصلہ نہیں کیا جاسکتا بے شک آپ کا دشمن عورت

عَادَيْتَ ○ وَلَا يَذِلُّ مَنْ وَالَيْتَ ○ تَبَارَكْتَ

نہیں پاسکتا اور آپ کا دوست ذلیل نہیں ہو سکتا برکت والے

رَبِّنَا وَتَعَالَيْتَ ○ اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِينَ

ہیں آپ اے ہمارے پروردگار اور بلند و بالا ہیں یا اللہ مغفرت فرما مومن مردوں اور

وَالْمُؤْمِنَاتِ ○ وَالْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ ○

عورتوں کی اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتوں کے گناہ معاف فرما

وَأَصْلِحْهُمْ وَأَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِهِمْ ○ وَالْفُتَيْنِ

اور ان کے حالات کی اصلاح فرما اور ان کے باہمی تعلقات کو درست فرما اور ان کے دلوں میں الفت

قُلُوبِهِمْ ○ وَاجْعَلْ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَالْحِكْمَةَ

باہمی اور محبت پیدا کر اور ان کے دلوں میں ایمان و حکمت کو قائم فرما دے

وَتَثْبِيْتَهُمْ عَلَىٰ مِلَّةِ رَسُولِكَ ○ وَأَوْزِعْهُمْ أَنْ

اور ان کو اپنے رسول کے دین پر ثابت قدم فرما اور تو ضیق دے انہیں کہ شکر

لِيَشْكُرُوا نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ○ وَأَنْ يُوَفُّوا

کریں تیری اس نعمت کا جو تو نے انہیں دی ہے اور یہ کہ وہ پورا کریں

بِعَهْدِكَ الَّذِي عَاهَدْتَهُمْ عَلَيْهِ ۝ وَانصُرْهُمْ عَلَى

تیسرا وہ عہد جو تو نے ان سے لیا ہے اور غلبہ عطا کر ان کو اپنے

عَدُوِّكَ وَعَدُوِّهِمْ ۝ إِلَهَ الْحَقِّ سُبْحَانَكَ لَا إِلَهَ

دشمن پر اور ان کے دشمن پر اے معبودِ برحق تیری ذات پاک ہے اور تیرے

غَيْرُكَ ۝ اللَّهُمَّ انصُرْ عَسَاكِرَ الْمُسْلِمِينَ ۝ وَ

سوا کوئی معبود نہیں یا اللہ مسلم افواج کی مدد فرما اور

الْعَنِ الْكُفْرَةَ وَالْمُشْرِكِينَ ۝ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ

کفار و مشرکین پر اپنی لعنت فرما جو آپ کے رسولوں کی تکذیب

رُسُلِكَ وَيَقَاتِلُونَ أَوْلِيَاءِكَ ۝ اللَّهُمَّ خَالَفُ بَيْنَ

کرتے ہیں اور آپ کے دوستوں سے مقابلہ کرتے ہیں یا اللہ ان کے آپس میں اختلاف

كَلِمَتِهِمْ ۝ وَفَرِّقْ جَمْعَهُمْ ۝ وَشَتِّتْ شَمْلَهُمْ ۝

ڈال دے اور ان کی جماعت کو متفرق کر دے اور ان کی طاقت کو پارہ پارہ کر دے

وَزَلْزِلْ أقدامَهُمْ ۝ وَأَلْقِ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ ۝

اور ان کے قدم اکھاڑ دے اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دے

وَخَذُّهُمْ أَخْذًا عَزِيمًا مُّقْتَدِرٍ ۝ وَأَنْزِلْ بِهِمُ بَأْسَكَ

ان کو ایسے عذاب میں پکڑ لے جس میں قوت و قدرت والا پکڑا کرتا ہے اور ان پر وہ عذاب نازل فرما

الَّذِي لَا تَرُدُّهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ۝

جس کو آپ مجرم قوموں سے اٹھایا نہیں کرتے ۔

پانچوں نمازوں کے بعد

امام و مقتدی سب دعا مانگا کریں

اللَّهُمَّ مَنزِلَ الْكِتَابِ سَرِيعَ الْحِسَابِ ۝ اللَّهُمَّ

یا اللہ اے کتاب نازل کرنے والے جلد حساب لینے والے یا اللہ

اهْتَرِمِ الْأَحْزَابَ ۝ اللَّهُمَّ اهْتَرِمْهُمْ وَزَلِّمْ لَهُمْ ۝

ان طاقتوں کو شکست دیدے یا اللہ انہیں شکست دے اور انکے قدم اکھاڑ دے

اللَّهُمَّ انصُرْ عَسَاكِرَ بَالِيسْتَانَ وَالْمُجَاهِدِينَ فِي سَبِيلِكَ ۝

یا اللہ پاکستان کی افواج اور مجاہدین پاکستان کی مدد فرما

اللَّهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا ۝ وَامِنْ رَوْعَاتِنَا ۝ وَالنَّفَا

یا اللہ ہماری کمزوریوں پر پردہ ڈال دے اور خوف کی چیزوں سے ہم کو امن عطا فرما اور ہمیں اپنی

بِرْكِنِكَ الَّذِي لَا يَرَامُ ۝ وَاعِنَّا وَلَا تَعِنِ عَلَيْنَا ۝

اس طاقت کی پناہ میں جس کا دشمن کی طرف ارادہ نہیں کیا جاسکتا اور ہماری مدد فرما اور ہمارے مقابل کی مدد نہ فرما

وَانصُرْنَا وَلَا تَنْصُرْ عَلَيْنَا ۝ وَامْكُرْ لَنَا وَلَا تَمْكُرْ

اور ہم کو فتح دے ہمارے مقابل کو فتح نہ دے اور ہمارے لئے تدبیر فرما اور ہمارے مخالف

عَلَيْنَا ۝ وَاهْدِنَا وَكَيْسِرِ الْهُدَى لَنَا ۝

کے لئے نہ فرما اور ہم کو ہدایت فرما اور ہمارے لئے ہدایت کو آسان فرما

اللَّهُمَّ إِلَيْكَ نَشْكُو ضَعْفَ قُوَّتِنَا ۝ وَقِلَّةَ جِبَلَتِنَا

یا اللہ ہم آپ ہی کے سامنے اپنی کمزوری بے سامانی اور لوگوں

وَهُوَ أَنْتَ عَلَى النَّاسِ ۝ إِنَّهُ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَاءَ

کی نظروں میں بے وقعتی کی شکایت پیش کرتے ہیں کیوں کہ آپ کے عذاب سے نجات و پناہ

مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ ۝

بجز آپ کے کوئی نہیں دے سکتا۔

بندہ محمد شفیع

خادم دارالعلوم کراچی

۶/شوال ۱۳۹۱ھ

احکام رمضان المبارک و مسائل زکوٰۃ

مقام تالیف : _____ کراچی
اشاعت اول : _____ شعبہ نشر و اشاعت دارالعلوم کراچی

”یہ مختصر رسالہ دارالعلوم کی طرف سے مفت تقسیم
کے لئے ہر سال رمضان المبارک میں شائع ہوتا ہے“



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

رمضان المبارک کے روزے رکھنا اسلام کا تیسرا فرض ہے جو اس کے فرض ہونے کا انکار کرے مسلمان نہیں رہتا اور جو اس فرض کو ادا نہ کرے وہ سخت گناہگار فاسق ہے۔

روزہ کی نیت | نیت کہتے ہیں دل کے قصد و ارادہ کو، زبان سے کچھ کہے یا نہ کہے۔

روزہ کے لئے نیت شرط ہے۔ اگر روزہ کا ارادہ نہ کیا اور تمام دن کچھ کھایا پیا نہیں تو روزہ نہ ہوگا۔

مسئلہ: رمضان کے روزے کی نیت رات سے کر لینا بہتر ہے اور رات کو نہ کی ہو تو دن کو بھی زوال سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے تک کر سکتا ہے بشرطیکہ کچھ کھایا پیا نہ ہو۔

جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے | ۱۔ کان اور ناک میں دوا

ڈالنا۔ ۲۔ قصداً منہ بھرتے کرنا۔ ۳۔ کلی کرتے ہوئے حلق میں

پانی چلا جانا۔ ۴۔ عورت کو چھونے وغیرہ سے انزال ہو جانا۔ ۵۔ کوئی

ایسی چیز نکل جانا جو عادتاً کھائی نہیں جاتی جیسے لکڑی، لوبہ، کچا گیسوں کا دانہ وغیرہ۔

۶۔ لوبان یا عود وغیرہ کا دھواں قصداً ناک یا حلق میں پہنچانا، بیڑی، سگریٹ

حقہ پینا اسی حکم میں ہیں۔ ۷۔ بھول کر کھاپی لیا اور یہ خیال کیا کہ اس سے

روزہ ٹوٹ گیا ہوگا پھر قصداً کھاپی لیا۔ ۸۔ رات سمجھ کر صبح صادق کے بعد

سحری کھالی۔ ۹۔ دن باقی تھا مگر غلطی سے یہ سمجھ کر کہ آفتاب غروب ہو گیا ہے روزہ

افطار کر لیا (تنبیہ) ان سب چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، مگر صرف قضا واجب ہوتی ہے، کفارہ لازم نہیں ہوتا۔ ۱۰۔ جان بوجھ کر بدون بھولنے کے بی بی سے صحبت کرنے یا کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور قضا بھی لازم ہوتی ہے اور کفارہ بھی۔ کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے ورنہ ساٹھ روزے متواتر رکھے زیچ میں ناعذہ نہ ہو ورنہ پھر شروع سے ساٹھ روزے پورے کرنے پڑیں گے اور اگر روزہ کی بھی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلاوے۔ آج کل شرعی غلام یا باندی کہیں نہیں ملتے اس لئے آخری دو صورتیں متعین ہیں۔

وہ چیزیں جن سے روزہ ٹوٹتا | ۱۔ بلا ضرورت کسی چیز کو چبانا یا ناک نہیں مگر مکروہ ہو جاتا ہے وغیرہ چکھ کر تھوک دینا، ٹوٹھ پیسٹ یا منجن یا کولہ سے دانت صاف کرنا بھی روزہ میں مکروہ ہیں۔ ۲۔ تمام دن حالت جنابت میں بغیر غسل کئے رہنا۔ ۳۔ فصد کرانا، کسی مریض کے لئے اپنا خون دینا جو آج کل ڈاکٹروں میں رائج ہے یہ بھی اس میں داخل ہے۔ ۴۔ غنبت یعنی کسی کی بیٹھ بچھے اس کی برائی کرنا یہ ہر حال میں حرام ہے۔ روزہ میں اس کا گناہ اور بڑھ جاتا ہے۔ ۵۔ روزہ میں لڑنا جھگڑنا، گالی دینا خواہ انسان کو ہو یا کسی بے جان چیز کو یا جاندار کو، ان سے بھی روزہ مکروہ ہو جاتا ہے۔

وہ چیزیں جن سے روزہ نہیں ٹوٹتا | ۱۔ مسواک کرنا۔ ۲۔ سر اور مکروہ بھی نہیں ہوتا۔! یا مونچھوں پر تیل لگانا۔ ۳۔ آنکھوں میں دوا، یا سرمہ ڈالنا۔ ۴۔ خوشبو سونگھنا۔ ۵۔ گرمی اور پیاس کی وجہ سے غسل کرنا۔ ۶۔ کسی قسم کا انجکشن یا ٹیکہ لگوانا۔ ۷۔ بھول کر کھانا پینا۔ ۸۔ حلق میں بلا اختیار دھواں یا گرد و غبار یا مکھی وغیرہ کا چلا جانا۔ ۹۔ کان میں پانی ڈالنا یا باقاعدہ چلا جانا۔ ۱۰۔ خود بخود تھے آجانا۔ ۱۱۔ سوتے ہوئے احتلام (غسل کی حاجت) ہو جانا۔

۱۲ — دانتوں میں سے خون نکلے، مگر حلق میں نہ جائے تو روزہ میں خلل نہیں آیا۔

۱۳ — اگر خواب میں یا صحبت سے غسل کی حاجت ہوگئی اور صبح صادق ہونے سے پہلے غسل نہیں کیا اور اسی حالت میں روزہ کی نیت کر لی تو روزہ میں خلل نہیں آیا۔

وہ غدر جن سے رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہوتی ہے | ۱ — بیماری کی وجہ سے روزہ کی طاقت نہ ہو، یا مرض بڑھنے کا شدید خطرہ

ہو تو روزہ نہ رکھنا جائز ہے، بعد رمضان اس کی قضا لازم ہے۔ ۲ — جو

عورت حمل سے ہو اور روزہ میں بچہ کو یا اپنی جان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو روزہ نہ رکھے، بعد میں قضا کرے۔ ۳ — جو عورت اپنے یا کسی غیر کے بچہ کو دودھ

پلاتی ہے، اگر روزہ سے بچہ کو دودھ نہیں ملتا، تکلیف پہنچتی ہے تو روزہ نہ رکھے پھر

قضا کرے۔ ۴ — مسافر شرعی (جو کم از کم اڑتالیس میل کے سفر کی نیت پر گھر

سے نکلا ہو) اس کے لئے اجازت ہے کہ روزہ نہ رکھے پھر اگر کچھ تکلیف و وقت نہ ہو

تو افضل یہ ہے کہ سفر ہی میں روزہ رکھ لے اگر خود اپنے آپ کو یا اپنے ساتھیوں کو

اس سے تکلیف ہو تو روزہ نہ رکھنا ہی افضل ہے۔ ۵ — بحالت روزہ سفر

شروع کیا تو اس روزہ کا پورا کرنا ضروری ہے اور اگر کچھ کھانے پینے کے بعد سفر سے

وطن واپس آ گیا تو باقی دن کھانے پینے سے احتراز کرے۔ اور اگر ابھی کچھ کھا یا پیا

نہیں تھا کہ وطن میں ایسے وقت واپس آ گیا جب کہ روزہ کی نیت ہو یعنی زوال

سے ڈیرٹھ گھنٹہ قبل تو اس پر لازم ہے کہ روزہ کی نیت کر لے۔ ۶ — کسی کو قتل

کی دھمکی دے کر روزہ توڑنے پر مجبور کیا جائے تو اس کے لئے توڑ دینا جائز ہے

پھر قضا کر لے۔ ۷ — کسی بیماری یا بھوک پیاس کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ کسی

مسلمان و بیدار ماہر طبیب یا ڈاکٹر کے نزدیک جان کا خطرہ لاحق ہو تو روزہ توڑ دینا

جائز بلکہ واجب ہے اور پھر اس کی قضا لازم ہوگی۔ ۸ — عورت کے

لئے آیام حیض میں اور بچہ کی پیدائش کے بعد جو خون آتا ہے یعنی نفاس اس کے دوران میں

روزہ رکھنا جائز نہیں۔ ان ایام میں روزہ نہ رکھے بعد میں قضا کرے۔ بیمار، مسافر، حیض و

نفاس والی عورت جن کے لئے رمضان میں روزہ رکھنا اور کھانا پینا جائز ہے ان کو بھی لازم ہے کہ رمضان کا احترام کریں، سب کے سامنے کھاتے پیتے نہ پھریں۔
روزہ کی قضا ۱۔ کسی عذر سے روزہ قضا ہو گیا تو جب عذر جاتا ہے جلد ادا کر لینا چاہیے۔ زندگی اور طاقت کا بھروسہ نہیں۔ قضا روزوں میں اختیار ہے کہ متواتر رکھے یا ایک ایک دو دو کر کے رکھے۔ ۲۔ اگر مسافر سفر سے لوٹنے کے بعد یا مریض تندرست ہونے کے بعد اتنا وقت نہ پائے کہ جس میں قضا شدہ روز ادا کرے تو قضا اس کے ذمہ لازم نہیں۔ سفر سے لوٹنے اور بیماری سے تندرست ہونے کے بعد جتنے دن ملیں اتنے ہی کی قضا لازم ہوگی۔

سحری | روزہ دار کو آخر رات میں صبح صادق سے پہلے سحری کھانا منگوانا اور باعث برکت و ثواب ہے۔ نصف شب کے بعد جس وقت بھی کھائیں سحری کی سنت ادا ہو جائے گی، لیکن بالکل آخر شب میں کھانا افضل ہے۔ اگر مؤذن نے صبح سے پہلے اذان دے دی تو سحری کھانے کی ممانعت نہیں جب تک صبح صادق نہ ہو جائے سحری سے فارغ ہو کر روزہ کی نیت دل میں کر لینا کافی ہے اور زبان سے بھی یہ الفاظ کہ لے تو اچھا ہے بِصَوْمٍ عَدِلٍ تَوَيْتُ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ۔

افطاری | آفتاب کے غروب ہونے کا یقین ہو جانے کے بعد افطار میں دیر کرنا مکروہ ہے۔ ہاں جب آبر وغیرہ کی وجہ سے اشتباہ ہو تو دو چار منٹ انتظار کر لینا بہتر ہے اور تین منٹ کی احتیاط بہر حال کرنا چاہیے۔

کھجور اور خرما سے افطار کرنا افضل ہے اور کسی دوسری چیز سے افطار کریں تو اس میں بھی کوئی کراہت نہیں، افطار کے وقت یہ دعا مسنون ہے اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلَىٰ رِزْقِكَ افطرت اور افطار کے بعد یہ دعا پڑھے ذَهَبَ الظَّمَاءُ وَابْتَلَّتِ العُرُوْقُ وَتَبَّتْ اَلْاَجْدَانُ شَاءَ اللّٰهُ۔

تراویح | ۱۔ رمضان المبارک میں عشاء کے فرض اور سنت کے بعد بیس رکعت سنت مؤکدہ ہے۔ ۲۔ تراویح کی جماعت سنت علی الکفایت

ہے۔ محلہ کی مسجد میں جماعت ہوتی ہو اور کوئی شخص علیحدہ اپنے گھر میں اپنی تراویح پڑھ لے تو سنت ادا ہو گئی، اگرچہ مسجد اور جماعت کے ثواب سے محروم رہا اور اگر محلہ ہی میں جماعت نہ ہوئی تو سب کے سب ترک سنت کے گنہگار ہوں گے۔ ۳۔ تراویح میں پورا قرآن مجید ختم کرنا بھی سنت ہے۔ کسی جگہ حافظ قرآن سنانے والا نلے یا ملے مگر سنانے پر اجرت و معاوضہ طلب کرے تو چھوٹی سورتوں سے نماز تراویح ادا کریں، اجرت دے کر قرآن نہ سنیں کیونکہ قرآن سنانے پر اجرت لینا اور دینا حرام ہے۔ ۴۔ اگر ایک حافظ ایک مسجد میں بیس رکعت پڑھ چکا ہے اس کو دوسری مسجد میں اسی رات تراویح پڑھنا درست نہیں۔ ۵۔ جس شخص کی دو چار رکعت تراویح کی رہ گئی ہوں تو جب امام و ترک کی جماعت کرائے اس کو بھی جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے، اپنی باقی ماندہ تراویح بعد میں پوری کرے۔ ۶۔ قرآن کو اس قدر جلد پڑھنا کہ حروف کٹ جائیں بڑا گناہ ہے، اس صورت میں نہ امام کو ثواب ہوگا، نہ مقتدی کو۔ ۷۔ جمہور علماء کا فتویٰ یہ ہے کہ نابالغ کو تراویح میں امام بنانا جائز نہیں۔

اعتکاف

۱۔ اعتکاف اس کہتے ہیں کہ اعتکاف کی نیت کر کے مسجد میں رہے اور سوائے ایسی حاجات ضروریہ کے جو مسجد میں پوری نہ ہو سکیں (جیسے پیشاب، پاخانہ کی ضرورت یا غسل واجب اور وضو کی ضرورت) مسجد سے باہر نہ جائے۔ ۲۔ رمضان کے عشرہ اخیر میں اعتکاف کرنا سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے۔ یعنی اگر بڑے شہروں کے محلہ میں اور چھوٹے دیہات کی پوری بستی میں کوئی بھی اعتکاف نہ کرے تو سب کے اوپر ترک سنت کا وبال رہتا ہے اور کوئی ایک بھی محلہ میں اعتکاف کرے تو سب کی طرف سے سنت ادا ہو جاتی ہے۔ ۳۔ بالکل خاموش رہنا اعتکاف میں ضروری نہیں بلکہ مکروہ ہے۔ البتہ نیک کلام کرنا اور رطائی جھگڑے اور فضول باتوں سے بچنا چاہیے۔ ۴۔ اعتکاف میں کوئی خاص عبادت شرط نہیں، نماز، تلاوت یا دین کی کتابوں کا پڑھنا پڑھانا یا جو عبادت

دل چاہے کرتا رہے۔ ۵۔ جس مسجد میں اعتکاف کیا گیا ہے، اگر اس میں جمعہ نہیں ہوتا، تو نماز جمعہ کے لئے اندازہ کر کے ایسے وقت مسجد سے نکلے جس میں وہاں پہنچ کر سنتیں ادا کرنے کے بعد خطبہ سن سکے۔ اگر کچھ زیادہ دیر جامع مسجد میں لگ جائے، جب بھی اعتکاف میں خلل نہیں آتا۔ ۶۔ اگر بلا ضرورت طبعی شرعی تھوڑی دیر کو بھی مسجد سے باہر چلا جائے گا تو اعتکاف جاتا رہے گا خواہ عمداً نکلے یا بھول کر۔ اس صورت میں اعتکاف کی قضا کرنا چاہیے۔ ۷۔ اگر آخر عشرہ کا اعتکاف کرنا ہو تو ۲۰ تا یسع کو غروب آفتاب سے پہلے مسجد میں چلا جائے اور جب عید کا چاند نظر آجائے تب اعتکاف سے باہر ہو۔ ۸۔ غسل جمعہ یا محض ٹنڈک کے لئے غسل کے واسطے مسجد سے باہر نکلنا معتکف کو جائز نہیں۔

شب قدر | چونکہ اس امت کی عمریں بہ نسبت پہلی امتوں کے چھوٹی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایک رات ایسی مقرر فرمادی ہے کہ جس میں عبادت کرنے کا ثواب ایک ہزار مہینہ کی عبادت سے بھی زیادہ ہے، لیکن اس کو پوشیدہ رکھتا کہ لوگ اس کی تلاش میں کوشش کریں اور ثواب بے حساب پائیں۔ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں شب قدر ہونے کا زیادہ احتمال ہے یعنی ۲۱ ویں، ۲۳ ویں، ۲۵ ویں، ۲۷ ویں، ۲۹ ویں شب۔ اور ۲۷ ویں شب میں سب سے زیادہ احتمال ہے۔ ان راتوں میں بہت محنت سے عبادت اور توبہ و استغفار اور دعائیں مشغول رہنا چاہیے۔ اگر تمام رات جاگنے کی طاقت یا فرصت نہ ہو تو جس قدر ہو سکے جاگے اور نفل نماز یا تلاوت قرآن یا ذکر و تسبیح میں مشغول رہے اور کچھ نہ ہو سکے تو عشاء اور صبح کی نماز جماعت سے ادا کرنے کا اہتمام کرے، حدیث میں آیا ہے کہ یہ بھی رات بھر جاگنے کے حکم میں ہو جاتا ہے، ان راتوں کو صرف جلسوں تقریروں میں صرف کر کے سو جانا بڑی محرومی ہے، تقریریں ہر رات ہو سکتی ہیں، عبادت کا یہ وقت پھر ہاتھ نہ آئے گا۔

البتہ جو لوگ رات بھر عبادت میں جاگنے کی بہت کریں وہ شروع میں کچھ دغلا

سُن لیں، پھر نوافل اور دعائیں لگ جائیں تو درست ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
عَفَا اللّٰهُ عَنْهُ

دارالعلوم کراچی ۱۲

ترکیب نمازِ عید

اول زبان یا دل سے نیت کرو کہ دو رکعت نمازِ عید واجب مع چھ زائد تکبیروں کے پیچھے اس امام کے۔ پھر اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لو اور سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ پر ٹھو پھر دوسری اور تیسری تکبیر میں ہاتھ کانوں تک اٹھا کر چھوڑ دو اور چوتھی میں باندھ لو اور جس طرح ہمیشہ نماز پڑھتے ہو پڑھو۔ دوسری رکعت میں سورت کے بعد جب امام تکبیر کہے تم بھی تکبیر کہہ کر پہلی، دوسری اور تیسری دفعہ میں ہاتھ کانوں تک اٹھا کر چھوڑ دو اور چوتھی تکبیر کہہ کر بلا ہاتھ اٹھائے رکوع میں چلے جاؤ۔ باقی نماز حسب دستور تمام کرو خطبہ سُن کر واپس جاؤ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ

مسائل زکوٰۃ

وَاقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ

مسئلہ :- اگر کسی کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا ہے یا اس میں سے کسی ایک کی قیمت کے برابر روپیہ یا نوٹ ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ نقد روپیہ بھی سونے چاندی کے حکم میں ہے (شامی) اور سامان تجارت اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہے تو اس پر بھی زکوٰۃ فرض ہے۔

مسئلہ :- کارخانے اور مل وغیرہ کی مشینوں پر زکوٰۃ فرض نہیں ہو سکتی ان میں جو مال تیار ہوتا ہے اس پر زکوٰۃ فرض ہے، اسی طرح جو خام مال کارخانہ میں سامان تیار کرنے کے لئے رکھا ہے اس پر بھی زکوٰۃ فرض ہے (درمختار و شامی)

مسئلہ :- سونے چاندی کی ہر چیز پر زکوٰۃ واجب ہے، زیور، برتن، حتیٰ کہ سچا گوٹہ، ٹھپہ، اصلی زرّی، سونے چاندی کے ٹن، ان سب پر زکوٰۃ فرض ہے، اگرچہ ٹھپہ گوٹہ اور زرّی کپڑے میں لگے ہوئے ہوں۔

مسئلہ :- کسی کے پاس کچھ روپیہ، کچھ سونا یا چاندی اور کچھ مال تجارت ہے لیکن علیحدہ علیحدہ بقدر نصاب ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہے تو سب کو ملا کر دیکھیں اگر اس مجموعہ کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہو جائے تو زکوٰۃ فرض ہوگی اور اگر اس سے کم رہے تو زکوٰۃ فرض نہیں۔ (ہدایہ)

مسئلہ :- بلوں اور کمپنیوں کے شیرز پر بھی زکوٰۃ فرض ہے بشرطیکہ شیرز کی قیمت بقدر نصاب ہو یا اس کے علاوہ دیگر مال مل کر شیر ہولڈر مالک نصاب بن جاتا ہو۔ البتہ کمپنیوں کے شیرز کی قیمت میں چونکہ مشینری اور مکان اور فرنیچر وغیرہ کی لاگت بھی شامل ہوتی ہے جو درحقیقت زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے، اس لئے اگر کوئی شخص کمپنی سے دریافت کر کے جس قدر رقم اس کی مشینری اور مکان اور فرنیچر وغیرہ میں لگی ہوئی ہے اس کو اپنے حصّے کے مطابق شیرز کی قیمت میں سے کم کر کے باقی کی زکوٰۃ دے تو یہ بھی جائز اور درست ہے۔ سال کے ختم پر جب زکوٰۃ دینے لگے اس وقت جو شیرز کی قیمت ہوگی وہی لگے گی (درمختار و شامی)

مسئلہ :- پراویڈنٹ فنڈ جو ابھی وصول نہیں ہوا اس پر بھی زکوٰۃ فرض ہے لیکن ملازمت چھوڑنے کے بعد جب اس فنڈ کا روپیہ وصول ہوگا، اس وقت اس روپیہ پر زکوٰۃ فرض ہوگی، بشرطیکہ یہ رقم بقدر نصاب ہو یا دیگر مال کے ساتھ مل کر بقدر نصاب ہو جاتی ہو وصولیابی سے قبل کی زکوٰۃ پراویڈنٹ کی رقم پر واجب نہیں، یعنی پچھلے سالوں کی زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی۔

مسئلہ :- صاحب نصاب اگر کسی سال کی زکوٰۃ پیشگی دے دے تو یہ بھی جائز ہے، البتہ اگر بعد میں سال پورا ہونے کے اندر مال بڑھ گیا تو اس بڑھے ہوئے مال کی زکوٰۃ علیحدہ دینا ہوگی (درمختار و شامی)

جس قدر مال ہے اس کا چالیسواں حصہ (چلم) دینا فرض ہے یعنی ڈھائی فیصد مال دیا جائے گا۔ سونے، چاندی اور مال تجارت کی ذات پر زکوٰۃ فرض ہے اس کا چلم دے کر قیمت دے تو یہ بھی جائز ہے مگر قیمت خرید نہ لگے گی، زکوٰۃ واجب ہونے کے وقت جو قیمت ہوگی اس کا چلم دینا ہوگا (درمختار ج ۲)

مسئلہ :- ایک ہی فقیر کو اتنا مال دے دینا کہ جتنے مال پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے مکروہ ہے لیکن اگر دے دیا تو زکوٰۃ ادا ہوگئی اور اس سے کم دینا بغیر کراہت کے جائز ہے (ہدایہ ج ۱)

مسئلہ :- زکوٰۃ ادا ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ جو رقم کسی مستحق زکوٰۃ کو دی جائے وہ اس کی کسی خدمت کے معاوضہ میں نہ ہو۔

مسئلہ :- ادائیگی زکوٰۃ کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کسی مستحق زکوٰۃ کو مالکانہ طور پر دے دی جائے جس میں اس کو ہر طرح کا اختیار ہو، اس کے مالکانہ قبضہ کے بغیر زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

تتمتہً بِالْخَيْرِ

—————

حکمُ الإِسْقَاطِ

حَبْلَةُ الإِسْقَاطِ

حَبْلَةُ اسْقَاطِ كِى شَرعى حَبْلِيْتِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَّمَ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰهُمُ

میت کی فوت شدہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے واجبات و فرائض کی ادائیگی یا کفارہ کس طرح کیا جاسکتا ہے، جس سے وہ گناہ سے سبکدوش ہو جائے، اس کا بیان کتب فقہ میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے، جس کا کچھ خلاصہ فائدہ عوام کے لئے اس رسالہ کے آخر میں لکھ دیا جائے گا۔

لیکن آج کل بہت سے شہروں اور دیہات میں لوگوں نے ایک رسم نکالی ہے جس کو دُور یا اسْقَاط کہتے ہیں، اور جاٹوں کو یہ بتلایا جاتا ہے کہ اس رسم کے ذریعہ تمام عمر کی نماز، روزوں اور زکوٰۃ و حج اور تمام فرائض و واجبات سے سبکدوشی ہو جاتی ہے اور اس رسم کو ایسی سخت پابندی کے ساتھ کیا جاتا ہے جیسے تمہیز و تکفین کا کوئی اہم فرض ہو، جو کوئی نہیں کرتا اس کو طرح طرح کے طعنے دیتے ہیں۔

بلاشبہ فقہاء کے کلام میں دُور و اسْقَاط کی صورتیں مذکور ہیں، لیکن وہ جن شرائط کے ساتھ مذکور ہیں، عوام نہ ان شرائط کو جانتے ہیں، نہ ان کی کوئی رعایت کی جاتی ہے، بلکہ فوت شدہ فرائض و واجبات سے متعلقہ تمام احکام شرعیہ کو نظر انداز کر کے اس رسم کو تمام فرائض و واجبات سے سبکدوشی کا ایک آسان نسخہ بنا لیا گیا ہے جو چند پیسوں میں حاصل ہو جاتا ہے، پھر کسی کو کیا ضرورت رہی کہ عمر بھر نماز، روزہ کی محنت اٹھائے۔

اس مسئلہ کے متعلق کچھ عرصہ ہو کہ ایک سوال مخدوم محترم حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب دامت برکاتہم مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور کے پاس آیا تھا، آپ نے جواب لکھنے کے لئے میرے سپرد فرمایا، یہ جواب کسی قدر مفصل اور کافی ہو گیا، اس لئے اس رسم میں ابتداء عام کے پیش نظر مناسب معلوم ہوا کہ اس کو بصورت رسالہ شائع کر دیا جائے، خدا کرے کہ یہ مسلمانوں کو جاننا رسوم سے بچانے میں مفید ثابت ہو۔ واللہ الموفق والمعين۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اندر اس مسئلہ کہ ہمارے علاقہ میں ایک حیلہ مروج ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ جنازہ کے بعد کچھ لوگ دائرہ بتاتے ہیں، میت کے وارث ایک قرآن شریف اور اس کے ساتھ کچھ نقد باندھتے ہیں، اور دائرہ میں لاتے ہیں، امام مسجد جو دائرہ میں ہوتا ہے وہ لیتا ہے، اور یہ الفاظ اس پر پڑھتا ہے کل حق من حقوق اللہ من القرائن والواجبات والكفارات والمنذورات بعضها ادیت و بعضها لم تود الان عاجز عن ادا ثنائها واعطيتك هذه المنحة الشريفة على هذا النفودات في حيلة الاسقاط رجاء من اللہ تعالیٰ ان یغفر لہ اور ایک دوسرے کی ملک کرتا ہے۔ تین دفعہ اس کو پھیرا جاتا ہے، بعدہ نصف امام کو اور نصف غرباء کو تقسیم کیا جاتا ہے، زید ایک امام مسجد ہے، اس نے اس مروجہ حیلہ کو چھوڑ دیا ہے اور کہتا ہے کہ اس مروجہ حیلہ کا ثبوت اولہ شرعیہ سے کوئی نہیں، لہذا یہ بات بدعت ہے۔ زید کے ترک پر زید کو لوگ ملامت کرتے ہیں، اور زید باوجود حنفی الذہب ہونے کے اس کو دہانی کہتے ہیں اور اس حیلہ کے جواز پر آباد و اجداد کی دلیل لاتے ہیں، کیا زید حق پر ہے یا باطل پر، اس مروجہ حیلہ کا کیا حکم ہے زید اس رواج اور اس التزام و اصرار کو ختم کرنے کا شرعاً حق دار اور مصیب ہو گا یا نہیں نیز بعض صورتوں میں مشرک ترکہ میں سے روپیہ لایا جاتا ہے، جس میں بعض وارث موجود نہیں ہوتے نیز بعض دفعہ تمیم بچے رہ جاتے ہیں کیا یہ مال حیلہ میں لایا جاسکتا ہے یا نہیں اور دائرہ والے لے سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا بالدر لائل الشریعة۔

الجواب

حیلہ اسقاط یا دور بعض فقہاء کرام نے ایسے شخص کے لئے تجویز فرمایا تھا جس کے کچھ ناز روزے وغیرہ اتفاقاً فوت ہو گئے، قضاء کرنے کا موقع نہیں ملا، اور موت کے وقت وصیت کی، لیکن اس کے ترکہ میں اتنا مال نہیں جس سے تمام فوت شدہ ناز روزہ وغیرہ کا فدیہ ادا کیا جاسکے، یہ نہیں کہ اس کے ترکہ میں مال موجود ہو اس کو تو وارث بانٹ کھائیں، اور تھوڑے سے پیسے لے کر یہ حیلہ حوالہ کر کے خدا و خلق کو فریب دیں، در مختار، شامی وغیرہ کتب فقہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اور ساتھ ہی اس حیلہ کی شرائط میں اس کی تصریحات واضح طور پر فرمائی ہیں کہ جو رقم کسی کو صدقہ کے طور پر دی جائے اس کو اس رقم کا حقیقی طور پر مالک و مختار بنا دیا جائے کہ جو چاہے کرے، ایسا نہ ہو کہ ایک ہاتھ سے دوسرے کے ہاتھ میں دینے کا محض ایک کھیل کیا جائے، جیسا کہ آج کل اس حیلہ میں کیا جاتا ہے، کہ نہ دینے والے کا یہ قصد ہوتا ہے کہ جس کو وہ دے رہے ہیں وہ صحیح معنی میں اس کا مالک و مختار ہے اور نہ لینے والے کو یہ تصور و خیال ہو سکتا ہے کہ جو رقم میرے ہاتھ میں دی گئی ہے میں اس کا مالک و مختار ہوں۔

دو تین آدمی بیٹھتے ہیں اور ایک رقم کو باہمی ہیرا پھیری کا ایک ٹولہ کا سا کر کے اٹھ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے میت کا حق ادا کر دیا، اور وہ تمام ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو گیا حالانکہ اس نحو حرکت سے میت کو نہ تو کوئی ثواب پہنچا، نہ اس کے ذرائع کا کفارہ ادا ہوا، کرنے والے مفت میں گناہ گار ہوئے۔

رسائل ابن عابدین میں اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ منۃ الجلیل کے نام سے شامل ہے اس میں تحریر ہے:-

وَجِبَ الْاحْتِزَامُ مِنْ اَنْ يَدِيرَهَا جَنِي الْاِبْوَالَةَ كَمَا ذَكَرْنَا وَاَنْ يَكُونَ الْوَصِي
اَوْ الْوَارِثُ كَمَا عَلِمْتَ، وَجِبَ الْاحْتِزَامُ مِنْ اَنْ يَلْاحِظَ الْوَصِي عِنْدَ دَفْنِ الصَّوْرَةِ
لِلْفَقِيرِ الْهَتَلِ اَوْ الْحَيْلَةِ بَلْ يَجِبُ اَنْ يَدْفَعَهَا عَازِمًا عَلَيَّ تَسْلِيكًا مِمَّنْ حَقِيقَةً لَا تَحْيِلًا
مَلَا حِظَانَ الْفَقِيرِ اِذَا ابْنِي عَنْ هَبْتَهَا اِلَى الْوَصِي كَانَ لَهُ ذَلِكُ وَلَا يَجِبُ عَلَيَّ الْمَهِيَةِ رَمْتًا لِحَيْسِلِ فِي اسْقَاطِ

۱۲۵
۱۲۶
۱۲۷
۱۲۸
۱۲۹
۱۳۰
۱۳۱
۱۳۲
۱۳۳
۱۳۴
۱۳۵
۱۳۶
۱۳۷
۱۳۸
۱۳۹
۱۴۰
۱۴۱
۱۴۲
۱۴۳
۱۴۴
۱۴۵
۱۴۶
۱۴۷
۱۴۸
۱۴۹
۱۵۰
۱۵۱
۱۵۲
۱۵۳
۱۵۴
۱۵۵
۱۵۶
۱۵۷
۱۵۸
۱۵۹
۱۶۰
۱۶۱
۱۶۲
۱۶۳
۱۶۴
۱۶۵
۱۶۶
۱۶۷
۱۶۸
۱۶۹
۱۷۰
۱۷۱
۱۷۲
۱۷۳
۱۷۴
۱۷۵
۱۷۶
۱۷۷
۱۷۸
۱۷۹
۱۸۰
۱۸۱
۱۸۲
۱۸۳
۱۸۴
۱۸۵
۱۸۶
۱۸۷
۱۸۸
۱۸۹
۱۹۰
۱۹۱
۱۹۲
۱۹۳
۱۹۴
۱۹۵
۱۹۶
۱۹۷
۱۹۸
۱۹۹
۲۰۰

الغرض اس حیلہ کی ابتدائی بنیاد ممکن ہے کہ کچھ صحیح اور قواعد شرعیہ کے مطابق ہو لیکن جس طرح کارروایاں اور التزام آج کل چل گیا ہے، وہ بلاشبہ ناجائز اور بہت سے مفاسد پر مشتمل قابل ترک ہے، چند مفاسد اجمالی طور پر لکھے جاتے ہیں۔

(۱) بہت مواقع میں اس کے لئے جو قرآن مجید اور فقہ رکھا جاتا ہے وہ میت کے متروکہ مال میں سے ہوتا ہے اور اس کے حق وارث لبعض موجود نہیں ہوتے یا نابالغ ہوتے ہیں تو ان کے مشترکہ سرمایہ کو بغیر ان کی اجازت کے اس کام میں استعمال کرنا حرام ہے، حدیث میں ہے لا یجیل مال امرء مسلم الا بطیب نفس منہ اور نابالغ تو اگر اجازت بھی دیدے تو وہ شرعاً نامعتبر ہے اور ولی نابالغ کو ایسے تبرعات میں اس کی طرف سے اجازت دینے کا اختیار نہیں بلکہ ایسے کام میں اس مال کا خرچ کرنا حرام ہے نبص قرآن شریف آیت کریمہ ان الدین یا کلون اموال الیتمی ظلما انما یا کلون فی بطونھم ناراً (ترجمہ) جو لوگ یتیموں کے مال ظلماً خرچ کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں“ سے ثابت ہے کہ ایسے مال کا دینا اور لینا دونوں حرام ہیں۔

(۲) اگر بالفرض مال مشترک نہ ہو یا سب وارث بالغ ہوں، اور سب کے اجازت بھی لی جاوے تو تجربہ شاد ہے کہ ایسے حالات میں یہ معلوم کرنا آسان نہیں ہوتا کہ ان سب نے بطیب خاطر اجازت دی ہے یا برادری اور کنبہ کے طعنوں کے خوف سے اجازت دی ہے، اور اس قسم کی اجازت حسب تصریح حدیث مذکورہ کالعدم ہے۔

(۳) اور اگر بالفرض یہ سب باتیں بھی نہ ہوں سب بالغ ورثانے بالکل خوش دلی کے ساتھ اجازت دے دی ہو یا کسی ایک ہی شخص وارث یا غیر وارث نے اپنی ملک خاص سے اس کا انتظام کیا ہے تو مفاسد ذیل سے وہ بھی خالی نہیں۔ مثلاً اس حیلہ کی فقہی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جس شخص کو اول یہ قرآن اور نقد دیا جاتا ہے اس کی ملک کر دیا جائے اور پوری وضاحت کے اس کو بتلا دیا جائے کہ اہم مالک و مختار ہو چکا ہو کر و پھر وہ اپنی خوشی سے بلا کسی رسمی دباؤ یا لحاظ و مروت کے میت کی طرف سے کسی دوسرے شخص کو اسی طرح دیدے اور مالک بناوے اور پھر وہ شخص اسی طرح کسی تیسرے چوتھے کو دے دے لیکن مروجہ رسم میں اس کا کوئی لحاظ

نہیں ہوتا، اول تو جس کو دیا جاتا ہے، نہ دینے والا یہ سمجھتا ہے کہ اس کی ملک ہو گیا، اور وہ اس میں مختار ہے نہ لینے والے کو اس کا کوئی خطرہ پیدا ہوتا ہے جس کی کھلی علامت یہ ہے کہ اگر یہ شخص اس وقت یہ نقد لے کر چل دے اور دوسرے کو نہ دے تو دینے والے حضرات ہرگز اس کو برداشت نہ کریں، اور ظاہر ہے اس صورت میں تلیک صحیح نہیں ہوتی، اور بدون تلیک کے کوئی قضا یا کفارہ یا فدیہ معاف نہیں ہوتا، اسی لئے یہ حرکت بے کار ہو جاتی ہے۔

(۴) مذکورہ صورت میں یہ بھی ضروری ہے کہ جس شخص کو مالک بنایا جائے وہ صرف صدقہ ہو۔ صاحبِ نصاب نہ ہو مگر عام طور پر اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا عموماً ائمہ مساجد جو صاحبِ نصاب ہوتے ہیں، انہی کے ذریعہ یہ کام کیا جاتا ہے اس لئے بھی یہ سارا کاروبار لغو و بطل ہو جاتا ہے، میت کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

(۵) اور اگر بالفرض صرف صدقہ کا بھی صحیح انتخاب کر لیا جائے اور ان کو پورا مسئلہ بھی معلوم ہو کہ وہ قبضہ کرنے کے بعد اپنے آپ کو مالک و مختار سمجھے پھر میت کی خیر خواہی کے پیش نظر وہ دوسرے کو اور اسی طرح دوسرے کو دیتا چلا جائے تو آخر میں وہ جس شخص کے پاس پہنچتا ہے وہ اس کا مالک و مختار ہے، اس سے واپس لے کر ادھا امام کو اور ادھا دوسرے فقراء کو تقسیم کرنا بلکہ غیر میں بلا اس کی اجازت کے تصرف کرنا ہے، جو ظلم اور حرام ہے، حسب تصریح حدیث مذکور۔

(۶) اور بالفرض یہ آخری شخص اس کی تقسیم اور حصے بخرے لگانے پر آمادہ بھی ہو جائے اور فرض کرے کہ اس میں دباؤ سے نہیں دل سے ہی راضی ہو جائے تو پھر بھی اس طرح کے حیلہ کا ہر میت کے لئے التزام کرنا اور جیسے تجمیز و تکفین جیسے واجبات شرعیہ ہیں، اسی طرح اسی درجہ میں اس کو اعتقاداً و اضرواً سمجھنا یا عملاً ضروری درجہ میں التزام کرنا یہی احداثِ فسادِ الدین ہے، جس کو اصطلاح شریعت میں بدعت کہتے ہیں، اور جو اپنی معنوی حیثیت سے شریعت میں ترمیم و اضافہ ہے نفوذ باطل۔

نیز اس حیلہ کے التزام سے عوام الناس اور جہلاء کی یہ جرات بھی بڑھ سکتی ہے کہ تمام عمر بھی نہ نماز پڑھیں، نہ روزہ رکھیں نہ حج کریں نہ زکوٰۃ دیں، مرنے کے بعد چند بیسیوں کے خرچ

سے یہ سارے مفاد حاصل ہو جائیں گے، جو سارے دین کی بنیاد مہندم کر دینے کے مترادف ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو دین کے صحیح راستے پر چلنے اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔

مذکورہ الصدا اجمالی مفاسد کو دیکھ کر بھی یہ فیصلہ کر لینا کسی مسلمان کے لئے دشوار نہیں کہ یہ حیلے حوالے اور اس کی مروجہ رسوم سب ناواقفیت پر مبنی ہیں میت کو اس سے کوئی فائدہ نہیں، اور کرنے والے بہت سے گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
رَبِیْعِ الْاَوَّلِ ۱۳۷۰ھ

کو مسائلِ قدیمہ نماز و روزہ وغیرہ

مسئلہ جس شخص نے نماز روزہ یا حج زکوٰۃ وغیرہ کی کوئی وصیت کی تو یہ وصیت اس کے ترکہ کے صرف ایک تہائی حصہ میں جاری کرنا وارثوں پر لازم ہوگا، ایک تہائی ترکہ سے زائد کی وصیت ہو تو وہ سب وارثوں کی اجازت و رضامندی پر موقوف ہے اگر وہ سب یا ان میں کوئی اجازت نہ دے تو مشترکہ ترکہ سے وصیت پوری نہیں کی جاسکتی، اور اگر وارثوں میں کوئی نابالغ ہے تو اس کی اجازت بھی معتبر نہیں، اس کے حصہ پر ایک تہائی سے زائد کی وصیت کا کوئی اثر نہ پڑنا چاہئے ہدایہ عالمگیری، شامی وغیرہ۔ **مسئلہ** جس شخص نے وصیت کی ہو اور مال بھی اتنا چھوڑا ہو کہ اس کے ایک تہائی میں ساری وصیتیں پوری ہو سکیں تو وصی اور وارثوں کے ذمہ واجب ہے کہ اس وصیت کو پورا کریں، اس میں کوتاہی کریں یا میت کا مال موجود ہوتے ہوئے اس کے نماز روزہ کے فدیہ میں حیلہ حوالہ پر اعتماد کر کے مال کو خود تقسیم کر لیں تو گناہ ان کے ذمہ رہے گا **مسئلہ** وصیت کرنے کی صورت میں واجبات و فرائض کی ادائیگی کی یہ صورت ہوگی۔

- ۱- ہر روز کی نمازیں و ترسمیت چھ لگائی جائیں گی اور ہر نماز کا فدیہ پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ہوگی یعنی ایک دن کی نمازوں کا فدیہ ساڑھے دس سیر گندم یا اس کی قیمت ہوگی۔
- ۲- ہر روزہ کا فدیہ پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ہوگی، رمضان کے روزوں کے

- علاوہ اگر کوئی نذر (منت) مافی ہوئی ہے تو اس کا بھی فدیہ دینا ہوگا۔
- ۳۔ زکوٰۃ جتنے سال کی اور جتنی مقدار مال کی رہی ہے اس کا حساب کر کے ادا کرنا ہوگا۔
- ۴۔ حج فرض اگر ادا نہیں کر سکا تو میت کے مکان سے کسی کوچ بدل کے لئے بھیجا جائے گا اور اس کا پورا کرایہ وغیرہ تمام مصارف ضروریہ ادا کرنے ہوں گے۔
- ۵۔ کسی انسان کا قرض ہے تو اس کو حق کے مطابق ادا کرنا ہوگا۔
- ۶۔ جتنے صدقہ لفظ رہے ہوں ہر ایک کے پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ادا کی جائے۔
- ۷۔ قربانی کوئی رہ گئی ہو تو اس سال میں ایک بکرے یا ایک حصّہ گائے کی قیمت کا اندازہ کر کے صدقہ کیا جائے (منۃ الجلیل)
- ۸۔ سجدہ تلاوت رہ گئے ہوں تو احتیاط اس میں ہے کہ ہر سجدہ کے بدلے پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت کا صدقہ کیا جائے۔
- ۹۔ اگر فوت شدہ نمازیاروزوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو تو تخمینہ سے حساب کیا جائے گا۔
- یہ سب احکام اس صورت کے ہیں جس میں مرنے والے نے وصیت کر دی ہو اور بقدر وصیت مال چھوڑا ہو اور اگر وصیت ہی نہیں کی یا ادائے وصیت کے مطابق کافی ترکہ نہیں ہے تو وارثوں پر اس کے فرائض و واجبات کا فدیہ ادا کرنا لازم نہیں، ہاں وہ اپنی خوشی سے ہمدردی کرنا چاہیں تو موجب ثواب ہے۔

مشفق غفرلہ عنہ
بندہ ضعیف علیہ السلام - کراچی

الجواب صحیح - ابو احمد عزیز الدین

خطیب جامع مسجد راولپنڈی

الجواب صواب - محمد حسن

خادم جامعہ اشرفیہ - لاہور

یہ رسم نہایت تسبیح اور واجب ترک ہے

بندہ احتشام الحق تھانوی

لشہ در الجیب اتی بتحقیق عجیب

محمّد ضیاء الحق مدرسہ اشرفیہ لاہور

الجواب صحیح - خیر محمد جالندھری

خیر المدارس ملتان شہرہ

رُویۃ ہلال

کے

شرعی احکام



تاریخ تالیف _____ ۱۰ شوال ۱۳۸۶ھ
 مقام تالیف _____ دارالعلوم کراچی
 اشاعت اول _____ ابلاغ ذیقعدہ ۱۳۹۳ھ



رویت ہلال کے احکام سے ناواقفیت کی وجہ سے عید کے موقع پر متعدد دفعہ
 خلیفہ ہوا۔ زیر نظر مضمون ہجرت ہلال کے متعلق وہ احکام اور تجاویز
 مذکور ہیں جن پر عمل کر کے انتشار کو ختم کیا جاسکتا ہے۔
 اس سلسلہ پر حضرت مفتی صاحب مظلم کا ایک مستقل رسالہ ”رویت ہلال“ کے نام
 سے الگ ہے جو زیادہ مفصل ہے اور کئی بار شائع ہو چکا ہے۔



☆☆ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی

☆☆ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

☆☆ مولانا محمد یوسف بنوری صاحب

☆☆ مولانا مفتی رشید احمد صاحب

رُویتِ ہلال کے شرعی احکام

اور اس مسئلہ میں ملک کو انتشار سے بچانے کی تجاویز

کئی سال سے عید الفطر کے موقع پر پورے پاکستان میں عجیب طرح کا انتشار و افتراق پھیلتا ہے، مرکزی ہلال کمیٹی کے اعلان کا مقصد تو یہ تھا کہ سارے ملک میں ایک دن عید ہو اور واقع یہ ہونے لگا کہ ہر ہر شہر اور ہر ہر قصبہ میں دو دو عیدیں ہونے لگیں عین عید کے دن جو اظہارِ محبت و مسرت کا دن ہے اس میں باہمی اختلاف اور جھگڑوں کے مظاہرے ہونے لگے جس کو کوئی سمجھ دار انسان کسی ملک کے لئے پسند نہیں کر سکتا۔ اس سے زیادہ مضرت رساں وہ بحثیں ہیں جو عید کے بعد مہفتوں تک اخباروں میں چلتی ہیں، سرکاری حلقوں سے علماء کو مطعون کیا جاتا ہے کہ وہ سیاسی مقاصد کے لئے بالقصد انتشار پھیلاتے ہیں، دوسری طرف سے حکومت پر یہ الزام لگائے جاتے ہیں کہ حکومت جان بوجھ کر مسلمانوں کی عبادات کو مختل اور دینی معاملات کے ساتھ مذاق کرتی ہے، لیکن ذرا بھی غور اور انصاف سے کام لیا جائے تو یہ دونوں الزام غلط اور بالکل بے جا ہیں، علماء میں بہت بڑی تعداد ایسے علماء کی ہے جن کا سیاست سے کوئی

دور کا بھی علاقہ نہیں اور نہ ان کی کسی ذاتی غرض کا کوئی شبہ ہو سکتا ہے، اسی طرح حکومت کے ارکان و افراد میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو خود روزے رکھتے اور دینی اقدار کا احترام کرتے ہیں۔ ان پر کیسے یہ بدگمانی کی جاسکتی ہے کہ وہ جان بوجھ کر خلق خدا کے روزوں کا وبال اپنے سر لینے کو تیار ہو جائیں۔

حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں، وجہ شاید یہ ہے کہ سرکاری حلقوں کے حضرات اس کو ایک خاص تہوار اور انتظامی معاملہ سمجھتے ہیں جس میں علماء کی کوئی مداخلت ان کو گوارا نہیں، دوسرے یہ کہ وہ اس معاملہ میں صرف خبر صادق جس پر سننے والوں کو یقین ہو جائے اعلان کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور اس فترق کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اپنے یقین کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لئے صرف خبر صادق کافی نہیں ہوتی بلکہ شرعی شہادت ضروری ہے جس کے لئے خاص شرائط اور قواعد ہیں اور علماء یہ جانتے ہیں کہ ہماری عید عام قوموں کے تہواروں کی طرح ایک تہوار نہیں بلکہ ایک عبادت کا ختم اور دوسری عبادت کا شروع کرنا ہے جس میں شریعت کے بتلائے ہوئے اصول سے مختلف کوئی صورت جائز نہیں اور کوئی چیز کتنی ہی سچی اور قابل اعتماد ہو اور سننے والوں کو اس پر پورا یقین ہو مگر وہ اپنے اس یقین کو پورے ملک پر اس وقت تک مسلط اور لازم نہیں کر سکتا جب تک حجت شرعیہ اور باقاعدہ شہادت نہ ہو اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور شرعی اصول کے مطابق روایت ہلال کے اعلان کے لئے ملک کے ماہرین مستوی علماء کے مشورے سے ایسا ضابطہ کار بنایا جائے جس پر تمام علماء اور عوام کو اطمینان ہو سکے اور پھر اس ضابطہ کا سب کو پابند بنایا جائے اور اسی ضابطہ کے تحت ریڈیو پر اعلان کیا جائے، مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ایسا کر لیا گیا تو ملک کے کسی گوشہ سے سرکاری اعلان کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھے گی۔ ہر طبقہ کے علماء اس کی موافقت کریں گے اور ملک میں عیش و مسرت اور وحدت و اتفاق کے ساتھ ایک ہی دن عید ہوا کرے گی۔ اگرچہ شرعی حیثیت سے اس کی کوئی

اہمیت نہیں کہ پورے ملک میں عید ایک ہی دن ہو۔ اسلام کے قرون اولیٰ میں اس وقت کے موجودہ ذرائع مواصلات کو بھی اس کام میں استعمال کرنے اور عید ایک ہی دن منانے کا کوئی اہتمام نہیں ہوا اور ملک کے وسیع و عریض ہونے کی صورت میں شدید اختلاف مطالع کی مشکلات بھی اس میں پیش آسکتی ہیں۔

لیکن پاکستان کے عوام اور حکومت کی اگر یہی خواہش ہے کہ عید پورے پاکستان میں ایک ہی دن ہو تو شرعی اعتبار سے اس کی بھی گنجائش ہے۔ شرط یہ ہے کہ عید کا اعلان پوری طرح شرعی ضابطہ شہادت کے تابع ہو۔

رویت ہلال کے لئے شرعی ضابطہ شہادت جس پر تقریباً امت کے چاروں مذہب حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور جمہور علمائے سلف و خلف کا اتفاق رہا ہے ذیل میں لکھا جاتا ہے جس کا مقصد ایک تو یہ ہے کہ اوصاف پسند طبقہ یہ محسوس کرے کہ ہلال کیسی طے کے حالیہ اعلان سے علماء کا اختلاف و درحقیقت کسی ضد یا سیاسی غرض کے لئے نہیں بلکہ اصول شرعیہ کی مجبوری سے عمل میں آیا۔ دوسرے یہ کہ حکومت کے ذمہ دار حضرات توجہ فرما کر ملک کے ہر مکین و مسکن کے مستند علماء کے مشورہ سے اس ضابطہ کے تحت مرکزی ہلال کیسی طے کا ایسا ضابطہ کار بنا دیں جس پر ملک کے علماء اور عوام مطمئن ہو کر عمل کر سکیں۔ اس ضابطہ شرعیہ کی تفصیل لکھنے سے پہلے ایک امر کی وضاحت ضروری ہے جو شہادت کی اصل بنیاد ہے۔

خبر صادق اور شہادت میں مشرق

کسی معاملہ کے متعلق ایک ثقہ معتبر آدمی زبانی خبر دے یا ٹیلیفون پر بتلائے اور اس کی آواز پہچانی جائے یا خط میں لکھے اور خط پہچانا جائے تو مخاطب کو اس خبر کے سچے ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا، بجائے خود اس کو یقین کامل ہو جاتا ہے اور اس کے منطقی پر عمل کرنا اپنی حد تک اس کے لئے جائز بھی ہے اور عام معاملات میں ساری دنیا اس پر عمل بھی کرتی ہے، لیکن اگر وہ اپنے اس یقین کو دوسروں پر لازم

اور مسلط کرنا چاہیے اور چاہیے کہ سب اس کو تسلیم کریں تو شریعت اور موجودہ قانون میں اس کے لئے ضابطہ شہادت قائم ہونا ضروری ہے اس کے بغیر کوئی قاضی یا حاکم اپنے یقین کو دوسروں پر مسلط نہیں کر سکتا۔

ایک جج کو ذاتی طور پر کسی مقدمہ کے متعلق ایک امر پر کتنا بھی یقین بلکہ مشاہدہ ہو مگر وہ اپنے یقین کی بنا پر مقدمہ کا فیصلہ نہیں کر سکتا جب تک یا قاعدہ شہادت کی شرائط پوری کر کے اسے ثابت نہ کرے اور اس شہادت میں کسی عدالت کے نزدیک ٹیلیفون کا بیان کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ گواہ کا عدالت میں حاضر ہونا شرط ہے دنیا کی عدالتوں کا موجودہ ضابطہ شہادت اس معاملہ میں بالکل متراستی اور اسلامی ضابطہ کے مطابق ہے کہ شاہدوں کا قاضی یا حاکم کے سامنے حاضر ہونا ضروری ہے ٹیلیفون پر کسی خبر کا بیان کرنا کتنا ہی قابل اعتماد ہو شہادت کے لئے کافی نہیں۔

حالیہ واقعہ میں مرکزی ہلال کمیٹی کا فیصلہ علماء کے نزدیک اسی لئے تھا قابل قبول ٹھہرا کہ ہلال عید کے لئے باتفاق اُمت شہادت شرط ہے محض خبر صادق کافی نہیں اور مرکزی کمیٹی نے صرف ٹیلیفون کی خبر پر اعتماد کر کے اعلان کر دیا اس کی کوشش نہیں کی کہ گواہ کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر گواہی دیتے یا کمیٹی کا کوئی معتد عالم وہاں جا کر ان سے رو برد گواہی لیتا اور پھر شہادت کی بنیاد پر فیصلہ کر لیتا اگر ایسا کر لیا جاتا تو کسی عالم کو اس سے اختلاف نہ ہوتا۔

ضابطہ شہادت کی یہ باریکیاں موجودہ عدالتیں بھی جانتی ہیں اور مانتی ہیں مگر عوام کو ان میں فرق محسوس کرنا آسان نہیں اس لئے طرح طرح کی پیرامی گوٹیاں شروع ہو گئیں۔

ہلال عید کے متعلق شرعی ضابطہ شہادت

جب چاند کی رویت عام نہ ہو سکے صرف دو چار آدمیوں نے دیکھا ہو تو یہ صورت حال اگر ایسی نفا میں ہو کہ مطلع بالکل صاف ہو، چاند دیکھنے سے کوئی بادل یا دھواں بخار وغیرہ مانع نہ ہو تو ایسی صورت میں صرف دو تین آدمیوں کی رویت اور شہادت شرعاً

قابل اعتماد نہیں ہوگی جب تک مسلمانوں کی بڑی جماعت اپنے دیکھنے کی شہادت نہ دے چاند کی رویت تسلیم نہ کی جائے گی جو دیکھنے کی شہادت دے رہے ہیں اس کو ان کا مقابلہ لٹریا جھوٹ و تراسر دیا جائے گا۔

ہاں اگر مطلع صاف نہیں تھا، غبار، دھواں بادل وغیرہ افق پر ایسا تھا جو چاند دیکھنے میں مانع ہو سکتا ہے ایسی حالت میں رمضان کے لئے ایک ثقہ کی اور عیدین وغیرہ کے لئے دو ثقہ مسلمانوں کی شہادت کا اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

مگر حکومت کے لئے ایسی شہادت کا اعتبار کر کے ملک میں اعلان کرنے کے واسطے تین صورتوں میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ان صورتوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو ایسی شہادت کی بنیاد پر عید کا اعلان کرنا حکومت کے لئے باکسی ذمہ دار جماعت کے لئے جائز نہیں۔ وہ تین صورتیں اصطلاح شریعت میں یہ ہیں۔

۱۔ شہادت علی الرویۃ

۲۔ شہادت علی شہادۃ الرویۃ

۳۔ شہادت علی القضاء

شہادت علی الرویۃ:

شہادت علی الرویۃ یہ ہے کہ ایسے عالم یا جماعت علماء کے سامنے یہ شہادت دینے والے بذات خود پیش ہوں جن کی احکام شرعیہ، فقہیہ اور اسلام کے ضابطہ شہادت میں مہارت پر پورے ملک میں اعتماد و یقین کیا جاتا ہو اور یہ عالم یا علماء متفقہ طور پر اس شہادت کو قبول کرنے کا فیصلہ کرے۔

شہادت علی الشہادۃ:

شہادت علی الشہادۃ یہ ہے کہ اگر یہ گواہ خود حاضر نہیں ہوئے یا نہیں ہو سکے تو ہر ایک کی گواہی پر دو گواہ ہوں اور وہ گواہ عالم یا علماء کے سامنے یہ شہادت دیں کہ ہمارے سامنے فلاں شخص نے بیان کیا ہے کہ میں نے فلاں رات میں فلاں جگہ اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا ہے۔

۱۲۔ شہادت علی الرویۃ
۱۲۔ شہادت علی شہادۃ الرویۃ
۱۲۔ شہادت علی القضاء
۱۲۔ شہادت علی الرویۃ
۱۲۔ شہادت علی الشہادۃ

شہادت علی القضاہ:

شہادت علی القضاہ یہ ہے کہ جس مقام پر چاند دیکھا گیا، اگر وہاں حکومت کی طرف سے کوئی ذیلی کمیٹی قائم ہے اور اس میں کچھ ایسے علماء موجود ہیں جن کے فتویٰ پر علماء اور عوام اعتماد کرتے ہیں اور چاند دیکھنے والے ان کے پاس پہنچ کر اپنی معنی شہادت پیش کریں اور وہ علماء ان کی شہادت قبول کریں تو ان علماء کا فیصلہ اس حلقے کے لئے تو کافی ہے جس میں شہادت پیش ہوئی ہے مگر پورے ملک میں اس کے اعلان کے لئے ضروری ہے کہ حکومت کی نامزد کردہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے سامنے ان علماء کا فیصلہ بشرائط ذیل پیش ہو۔

یہ سب علماء یا ان کا امیر یہ تحریر کریں کہ فلاں وقت ہمارے سامنے دو یا زائد شاہدوں نے بچشم خود چاند دیکھنے کی گواہی دی اور ہمارے نزدیک یہ گواہ ثقہ اور قابل اعتماد ہیں اس لئے ان کی شہادت پر چاند ہونے کا فیصلہ دے دیا۔ یہ تحریر دو گواہوں کے سامنے لکھ کر سرمہر کی جائے اور یہ گواہ یہ تحریر لے کر مرکزی کمیٹی کے علماء کے سامنے اپنی اس شہادت کے ساتھ پیش کریں کہ فلاں علماء نے یہ تحریر ہمارے سامنے لکھی ہے۔

مرکزی کمیٹی کے نزدیک اگر ان علماء کا فیصلہ شرعی قواعد کے مطابق ہے تو اب یہ کمیٹی پورے ملک میں مرکزی حکومت کے دیئے ہوئے اختیارات کے ماتحت اعلان کر سکتی ہے اور یہ اعلان سب مسلمانوں کے لئے واجب القبول ہوگا وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ یہ اعلان عام خبروں کی طرح نہ کیا جائے بلکہ مرکزی ہلال کمیٹی کے سرکردہ کوئی عالم خود ریڈیو پر اس امر کا اعلان کریں کہ ہمارے پاس شہادت علی الرویتہ یا شہادت علی شہادۃ الرویتہ یا شہادت علی القضاہ کی تین صورتوں میں سے فلاں صورت پیش ہوئی ہے۔ ہم نے تحقیقات ہونے کے بعد اس پر چاند ہونے کا فیصلہ کیا اور مرکزی حکومت کے دیئے ہوئے اختیارات کی بنا پر ہم یہ اعلان پورے پاکستان کے لئے کر رہے ہیں یہ چند اصولی باتیں ہیں جن کا رویت ہلال اور اس کے معاملے میں پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

یہ صورت درحقیقت کتاب القاضی القضاہ کی ہے، جو کہ شہادت علی القضاہ کی نسبت بہ صورت زیادہ پہلے ہے اور زیادہ قابل اعتماد ہے اس لئے تصنیف کیا گیا۔ ۱۲ شعبہ امام

اس ضابطہ شہادت میں عملی اور انتظامی طور پر اگر کوئی مشکل پیش آسکتی ہے -
تو وہ صرف آخری صورت یعنی شہادت علی القضاہ میں ہے کہ اس میں ایک شہر کی ذیلی کمیٹی
کے فیصلہ کو مرکزی کمیٹی تک پہنچانے کے لئے دو گواہوں کا وہاں جانا ضروری ہے جو
اگرچہ ہوائی جہاز کے دور میں کچھ مشکل نہیں تاہم ایک مشقت سے خالی نہیں۔

اس دشواری کا حل تلاش کرنے کے لئے مندرجہ ذیل علماء کے اجتماع میں غور
کیا گیا یہ شہادت علی القضاہ کس حد تک ضروری ہے اور آپا اس میں کوئی سہولت نکل
سکتی ہے یا نہیں۔

مذہب اربعہ اور جمہور علماء کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے یہ علماء اس نتیجے
پر پہنچے کہ اصولی طور پر تو ذیلی ہلال کمیٹی کا فیصلہ مرکزی ہلال کمیٹی کے لئے اسی وقت قابل
تمقید ہو سکتا ہے جب کہ وہ فیصلہ دوسرے قاضی کے پاس شرعی شہادت کے
ساتھ دو گواہ لے کر پہنچیں، صرف ٹیلیفون وغیرہ پر اس کی خبر دے دینا کافی نہیں۔
جمہور فقہاء امت حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنبلیہ کا اصل مذہب یہی ہے، ہدایت
کتاب الامام شافعی رحمہ، معنی ابن قدامہ حنبلی وغیرہ میں اس کی تصریحات درج ہیں
اس لئے بہتر تو یہی ہے کہ حکومت اس اصول کے مطابق کوئی انتظام کرے لیکن علماء
کے اس اجتماع میں اس پر غور کیا گیا کہ اگر حکومت اس میں دشواریاں محسوس کرے تو کوئی
دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ غور و فکر کے بعد متفقہ طور پر اس کا ایک
ایک حل یہ نکالا گیا کہ:

حکومت ہر بڑے شہر میں ذیلی کمیٹیاں قائم کرے ان میں سے ہر ایک میں کچھ
ایسے مستند علماء کو ضرور لیا جائے جو شرعی ضابطہ شہادت کا تجربہ رکھتے ہیں اور ہر
ذیلی کمیٹی کا کام صرف شہادت مہیا کرنا نہ ہو بلکہ اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے
یہ ذیلی کمیٹی اگر باقاعدہ شہادتیں لے کر کوئی فیصلہ کر دیتی ہے تو فیصلہ شہادت کی بنیاد
پر جو چکا، اب صرف اعلان کا کام باقی ہے اس کے لئے شہادت ضروری نہیں
بلکہ ذیلی کمیٹی کا کوئی ذمہ دار آدمی مرکزی کمیٹی کو ذیلی فون پر محتاط طور پر جس میں کسی مداخلت

کا خطرہ نہ رہے ذیلی کمیٹی کے اس فیصلہ کی اطلاع دے دے اور مرکزی کمیٹی اس صورت میں اس کو اپنا فیصلہ کہہ کر نہیں بلکہ ذیلی کمیٹی کا فیصلہ تیار کر اس طرح نشر کرے کہ مرکزی کمیٹی کے سامنے اگرچہ کوئی شہادت نہیں آئی بلکہ فلاں ذیلی کمیٹی نے جس میں فلاں فلاں علماء شریک ہیں شہادت کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا ہے ہم اس فیصلہ پر اعتماد کر کے اعلان کر رہے ہیں۔ اس صورت میں مرکزی کمیٹی کا یہ اعلان ٹیلی فون سے آئی ہوئی اطلاع پر درست ہو سکتا ہے۔

نظر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۳ شوال ۱۳۸۶ھ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۰/۸۶ھ

رشید احمد عفی عنہ

۱۳ شوال ۱۳۸۶ھ

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ

۱۳ شوال ۱۳۸۶ھ

—————

ارْجِحِ الْاِقْتَاوِئِيلَ

فِي
صَحْرِ الْمَوَازِينِ وَالْمَكَايِيلِ

اوزانِ شَرِيْعَةٍ

مقامِ تالیف	_____	دیوبند
تاریخِ تالیف	_____	ذیقعدہ ۱۳۶۱ھ
اشاعتِ اول	_____	دارالاشاعت دیوبند ۱۳۶۱ھ
اشاعتِ دوم	_____	دیوبند ۱۳۶۴ھ
اشاعتِ سوم	_____	ادارۃ المعارف کراچی ۱۳۸۲ھ
اشاعتِ چہارم	_____	، ، ، ۱۳۹۱ھ

”اس مقالہ میں درہم ، دینار ، صاع ، مد ،
 ذراع ، میل وغیرہ کی مکمل تحقیق اور مرد و جہ اوزان
 و پیمانوں کے مطابق ان کی تشریح و توضیح
 کی گئی ہے نیز حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ
 کی تحقیق پر مفصل تنقید ہے“

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَّمَ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ وَلَا سِيَّامَا
 عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ الْمُصْطَفَى وَمَنْ يَهْدِيهِ اهْتَدَى

شریعت کے بہت سے احکام ناپ تول سے متعلق ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے اوزان اور پیمانوں کے مطابق ارشاد فرمایا ہے۔ مثلاً
 صاع، مد، اوقیہ، درہم، دینار، مثقال وغیرہ
 بلاد ہند و پاکستان میں دوسری طرح کے اوزان اور پیمانے رائج ہیں اس لئے ان احکام کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ شرعی اوزان اور پیمانوں کی مقداریں ہند و پاکستان کے مروجہ اوزان اور پیمانوں سے بتلائی جائیں

چاندی کا نصاب = باون تولہ چھ ماشہ

سونے کا نصاب = سات تولہ چھ ماشہ

ایک صاع = اسی تولہ کے سیر سے ساڑھے تین سیر

نصف صاع = ۱۱ ۱/۲ تولہ دو سیر

لیکن حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دیگر علماء لکھنؤ کی تحقیق اس بارہ میں متفاوت ہے اور تفاوت بھی معمولی نہیں کیونکہ چاندی کا نصاب ان کے نزدیک صرف پچیس تولہ ساڑھے پانچ ماشہ اور سونے کا پانچ تولہ اڑھائی ماشہ اور نصف صاع تقریباً ایک سیر بندرہ تولہ ہے۔

اوزن ظاہر ہے کہ اس تفاوتِ عظیم کا اثر اموال سے متعلقہ تمام احکام شرعیہ پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ اسی بنا پر عام مسلمانوں میں یہ سوال مدت سے دائر ہے پھر ۱۳۶۱ھ ہجری میں خصوصاً دارالافتاء دارالعلوم (دیوبند) میں بیک وقت اس کے متعلق بہت سے سوالات جمع ہو گئے۔ نیز رمضان المبارک میں رہبرِ دکن کے ایک پرچے سے معلوم ہوا ہے کہ حیدرآباد میں علماء

کی ایک جماعت نے اس مسئلہ پر غور کیا اور حضرت مولانا لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کے مطابق نصاب زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر وغیرہ کی مقدار کا فیصلہ شائع فرما دیا۔ اس کی بناء پر اور بھی سوالات کا ہجوم ہو گیا۔

اس لئے ضرورت ہوئی کہ فقہاء کی تصریحات کے ماتحت اوزان ہندیہ میں ان مقادیر شرعیہ کی پوری تحقیق کی جاوے۔ احقر نے اپنی قدرت و وسعت کے موافق ان سب کی تفتیش و تحقیق میں امکانی کوشش پوری کی۔ اس کا جو کچھ نتیجہ احقر کے سامنے آیا وہ لکھ کر سیدی حضرت حکیم الامت تھانوی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضرت قدس سرہ نے اس کو پسند فرما کر اس کا نام ارجح الاقوال فی اصح الموازین والمکابیل تجویز فرما دیا۔ واللہ تعالیٰ المستول الصواب والسادد والیہ المرجع المبدأ والمعاد۔

اوزان شرعیہ کے مسلمہ اصول

اوزان شرعیہ کو اوزان ہندیہ میں منتقل کرنے اور حساب لگانے میں جن اصول سے کام لیا جاسکتا ہے وہ تقریباً سب علماء ہند کے نزدیک مسلم ہیں اور عرب و عجم کے سب فقہار متقدمین و متاخرین ان پر متفق ہیں اور ہماری معروف کتب فقہ مجمع الانہد، مد مختار، شامی، عالمگیری، البحر الرائق، شرح وقایہ، جامع الروایا، کتاب الاموال ابو عبید وغیرہ میں صراحت کے ساتھ منقول ہیں وہ یہ ہیں:

نام وزن عربی	مقدار بوزن عربی	نام وزن عربی	مقدار بوزن عربی
قیراط	پانچ جو	رطل بحساب درہم	۱۳۰ درہم
درہم	ستر جو	رطل بحساب مثقال	۹۰ مثقال
مثقال	تو جو	رطل بحساب مد	نصف مد
ایک جو	تین چاول	رطل بحساب استار	بیس استار
ایک چاول	دو دانہ رانی (خردل)	استار بحساب درہم	ساڑھے چھ درہم
صاع بغدادی	۸ رطل	استار بحساب مثقال	ساڑھے چار مثقال

مقدار بو وزن عربی	نام وزن عربی
ایک ہزار چالیس درہم	صاع بحساب درہم
سات سو بیس مثقال	صاع بحساب مثقال
چار مد	صاع بحساب مد
ایک سواٹھارہ استار	صاع بحساب استار

فقہاء کی تصریحات میں سے چند حوالے ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں :-

(۱) فی فتح القدير ذكوة المال قال ابو عبيد في الاموال و لم يزل المتقال في اباد الداهر محدودا لا يزيد ولا ينقص وكلام السجاء و ندى في قسمة التركات خلافه قال الدينار بسنجة اهل الحجاز عشرون قيراطا والقيراط خمس شعيرات فالدينار عنداهم مائة شعيرة وعند اهل سمرقند ستة وتسعون شعيرة (الى قوله) فلا حاجة الى الاشتغال بتقدير ذلك وهو تعريف الدينار على عرف سمرقند وتعريف دينار الحجاز هو المقصود .

۱- فتح القدير میں ہے کہ ابو عبید نے کتاب الاموال میں سرمایہ کو دینار ہمیشہ سے محدود و متعین چلا آتا ہے۔ اس میں کبھی کمی بیشی نہیں ہوئی اور قسمت ترکات کی بحث میں سجاوندی کا کلام اس کے خلاف ہے۔ کیونکہ انھوں نے کہا ہے کہ دینار اہل حجاز کے وزن سے بیس قیراط اور قیراط پانچ جو کا ہے۔ اس لئے ایک دینار ان کے نزدیک تنو جو کا ہے اور اہل سمرقند کے نزدیک ۶۶ جو کا (پھر سرمایہ) مگر اہل سمرقند کے وزن کی تحقیق میں پڑنا فضول ہے کیونکہ مقصود اس جگہ حجازی وزن ہے کیونکہ حکم زکوٰۃ وہیں سے نکلا ہے۔

اور آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پیاناہ مدینہ طیبہ کا اور وزن مکہ مکرمہ کا معتبر ہے۔ نسائی نے اس حدیث کو بروایت احمد بن سلیمان روایت کیا ہے۔ اور اس کی توثیق فرمائی ہے۔

اذ الحكم قد خرج من هناك ويظهر ذلك قوله صلى الله عليه وسلم المكيال مكيال اهل المدينة والوزن وزن مكة لفظ النسائي عن احمد بن سليمان ووثقه (فتح القدير ص ۵۲۳ ج ۱)

۲۔ در مختار میں ہے کہ دینار بیس قیراط اور درہم چودہ قیراط کا ہے اور قیراط پانچ جوکا۔ پس درہم شرعی سترہ جو اور مثقال سو جوکا ہو گیا۔

علامہ شامی نے اس قول کی شرح میں فرمایا کہ یہ جو معتدل اور میانہ ہوتے چاہئیں جن کا پھلکانہ اتارا گیا ہو اور اس کے دونوں طرف سے جو بنا تنکا دم کی طرح ہوتا ہے وہ قطع کر دیا گیا ہے۔

اور یہی مضمون بحسب الرائق، شرح وقایہ مجمع الانر، جامع الرموز میں بھی مذکور ہے۔

۳۔ اور در مختار میں ہے کہ وہ صاع جو احکام شرعیہ میں معتبر ہے وہ پیمانہ ہے جس میں ایک نزار ۴۰ درہم کے برابر ماش یا مسور سما جائے علامہ شامی نے اس قول کی شرح میں لکھا کہ صاع چار مد کا اور مد دو رطل اور رطل نصف من رہا اصطلاح مجازی، اور ایک من درہم کے حساب سے ایک سو ساٹھ درہم ہے اور استار کے حساب سے ۱۶۰ استار اور استار کبیر ہمزہ بحساب درہم ساڑھے چھ درہم کی برابر اور بحساب مثقال ساڑھے چار مثقال کی برابر (کنزانی در البحار) پس مد اور من برابر ہیں ہر ایک ان میں چوتھائی صاع کی برابر ہے جو دو رطل عراقی کے برابر ہے اور رطل ایک سو ساٹھ درہم کی برابر اور صاع کے وزن میں اختلاف ہے امام ابوحنیفہ اور امام محمد

(۲) فی الدار المختار الدینار عشرون قیراطاً والدرہم اربعة عشر قیراطاً والقیراط خمس شعیرات فیکون الدرہم الشرعی سبعین شعیرة والمثقال مائة شعیرة اھ قال الشامی تحتہ شعیرة معتدلة لم تقشر وقطع من طرفہا مادق و طال در مختار مع الشامی ص ۳۰ ج ۲، ومثلہ فی بحر الرائق ص ۲۲ ج ۲، و مثلہ فی شرح الوقایہ ومجمع اللفظ وجامع الرموز۔

(۳) وفي الدار المختار الصاع المعتبر ما یسع القا و اربعین درہماً من ماش او عدس اھ۔ قال الشامی اعلم ان الصاع اربعة امداد والمدان رطلان والرطل نصف من والمن بالدرہم مائة وستون درہماً وبالاستار اربعون۔ والاستار کسر الهمزة بالدرہم ستة ونصف وبالمثقال اربعة ونصف کذا فی درر البحار فالمد والمن سواء کل منهما ربع صاع رطلان بالعراقی والرطل مائة وستون درہماً واختلف

فرماتے ہیں کہ آٹھ رطل عراقی اور امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ پانچ رطل اور تہائی رطل کا ایک صاع ہوتا ہے اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے (کہ ائمہ حنفیہ کا) صاع کے متعلق کوئی اختلاف نہیں بلکہ بالاتفاق آٹھ رطل کا صاع ہوتا ہے اور یہی بات (یعنی اختلاف نہ ہونا ہی) زیادہ اقرب ہے کیونکہ امام محمد نے اس میں ابو یوسف کا کوئی خلاف نقل نہیں فرمایا اور اگر اختلاف ہوتا تو وہ ضرور ذکر کرتے کیونکہ وہ ان کے مذہب سے زیادہ واقف ہیں۔

۴ اور شرح وقایہ میں ہے کہ نصف صاع عراقی دو من کا ہے۔ اس طرح پر کہ ایک من ۴۰ اوتار کا اور اوتار ساڑھے چار مثقال ہیں ایک من ایک سو اسی مثقال کا ہو گیا۔

۵۔ علامہ محمد بن صالح ساکن مدینہ نے نتائج النظر حاشیہ در میں فرمایا ہے کہ ایک جو تین چاول کے برابر ہوتا ہے اور یہ چھ رائی کے دانوں کے برابر

۶۔ دینار بیس قیراط کا اور قیراط بارہ چاول کا اور چاول دو رائی کے دانوں کی برابر ہوتا ہے رائی نسی جنگلی ہونی چاہئے۔

فی الصاع فقال الطرفان ثمانية ارطال بالعراقی وقال الشافعی خمسة ارطال وثلث وقیل لا خلاف رالی قوله) وهذا الاشبه لان محمداً لم یذکر خلاف ابی یوسف ولو کان لذکره لانه اعرف بهذا هبه (شامی ص ۷۹ ج ۲)

(۴) وفي شرح الوقایہ ونصف صاع من العراقی فهو منوان علی ان المن اربعون اوتاراً والاسار اربعة مثاقیل ونصف مثقال فالمن مائة وثمانون مثقالاً ۵

(۵) قال العلامة محمد بن صالح العرو بقا فی زاده ساکن المدینة فی نتائج النظر حاشیة الدرر الشعيرة ثلاث جات من الارض فی المتانہ وستة خردول (مصباح)

اور غایت البیان میں ہے:-

(۶) الدینار عشرون قیراطا کل قیراط اثنا عشر اوتاراً والارتما خردولتان حدیثان من الخردول الیری (مصباح)

فقہاء رحمہم اللہ کی تصریحات مذکورہ بالا جمہور علماء ہندوستان اور حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ کے نزدیک متفق علیہ اور مسلمات میں سے ہیں اور انھیں تصریحات پر سب اپنے اپنے حساب کی بنیاد رکھی ہے۔

لیکن اختلاف یہاں سے پیدا ہوا کہ مولانا لکھنوی نے ستر جو جو مقدار درہم ہے اس کو دو ماشہ ڈیڑھ رتی قرار دیا ہے اور جمہور علماء ہند نے تین ماشہ ایک رتی اور پانچواں حصہ رتی کا قرار دیا۔ اسی طرح مشقال مولانا لکھنوی کی تحقیق پر تین ماشہ ایک رتی کا ہوتا ہے اور جمہور کی تحقیق پر ساڑھے چار ماشہ کا۔ پھر چونکہ صاع کا وزن بھی مالاً درہم اور مشقال ہی سے لیا جاتا ہے تو اسی کے حساب سے صاع کے وزن میں بھی تفاوت ہو گیا۔ اور ظاہر ہے کہ جب ایک درہم کے وزن میں ایک ماشہ سے بھی زائد کا فرق آ گیا تو دو سو درہم (نصاب زکوٰۃ) میں کتنا عظیم الشان تفاوت ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک مشقال میں ڈیڑھ ماشہ کا فرق بڑھ گیا تو بیس مشقال میں تین ماشہ کا فرق ہو جاتا لازمی نتیجہ ہے۔ اسی طرح صاع کا تفاوت سمجھ لیا جائے۔ اب ہمارے لئے غور طلب صرف یہ چیز رہ گئی کہ ستر جو جو اور تنو جو جو کا وزن بحساب ماشہ کس قدر ہے تاکہ درہم اور مشقال کا صحیح وزن معلوم ہو سکے پھر اُس سے سونے چاندی کا صحیح نصاب اور صدقہ الفطر کی صحیح مقدار معلوم کرنا آسان ہے۔

احقر نے ستر جو علیحدہ اور تنو جو علیحدہ پوری احتیاط کے ساتھ وزن کئے۔ کہ حسب تصریح فقہاء جو بھی متوسط لئے جو سب دم بڑیدہ غیر مقشورہ تھے پھر خود بھی چند بار وزن کیا اور متعدد صرفوں سے وزن کرایا۔ اول راجع الوقت ماشہ کے ساتھ وزن کرایا تو ستر جو تین ماشہ پانچ رتی کے ہوئے اور تنو جو پانچ ماشہ دو رتی کے ہوئے لیکن راجع الوقت ماشہ تولہ اصل تولہ ماشہ سے کسی قدر کم ہے کیونکہ اس وقت بازار میں سکہ انگریزی روپیہ کو ایک تولہ قرار دے دیا گیا ہے جو حقیقہً ساڑھے گیارہ ماشہ کا ہے اور اصل تولہ سے ۴ رتی کم ہے اسی حساب سے ماشہ ۱۶ رتی کم ہوا۔ تین ماشہ پر ایک رتی اور پانچ ماشہ پر پونے دو (۱۶/۳) رتی کم ہو گئے تو گویا اس وزن کے حساب سے ستر جو تین ماشہ چار رتی یعنی کل اٹھائیس رتی تقریباً ہوئے۔ اور تنو جو تقریباً چالیس رتی یا پانچ ماشہ کے ہوئے۔ پھر مزید احتیاط کے لئے

یہ ارادہ کیا کہ رتیوں کے ساتھ وزن کیا جائے چنانچہ بازار سے سُرخ گنگچیاں جو فی دانہ ایک رتی ہوتی ہیں جمع کر کے وزن کیا گیا۔ مگر یہ گنگچیاں بہت متفاوت نظر آئیں۔ بعض سے شرّجہ کا وزن اٹھائیس رتی اور تنو جو کا وزن اکتالیس رتی نکلا۔ اور بعض سے شرّجہ کا وزن ستائیس رتی ہوا، بعض سے پھبیس بعض سے پچیس۔

اسی طرح تنو جو کا وزن بھی گنگچیوں سے چالیس رتی بعض سے اکتالیس بعض سے اڑتیس اور بعض سے پھتیس رتی نکلا۔

تفاوت وزن کی وجہ سے غور و تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس میں زیادہ تر گنگچیوں کے تفاوت کو دخل ہے کیونکہ گنگچیاں جس قدر سُناروں اور صرافوں سے جمع کی گئیں وہ اس قدر متفاوت تھیں کہ نظر میں بھی چھوٹی بڑی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن ہمیں صحیح وزن معلوم کرنے کے لئے جس طرح جو متوسط لینے تھے اسی طرح گنگچیاں بھی متوسط لینے کی ضرورت تھی۔ اس لئے امکانی تلاش و تحقیق سے متوسط درجہ کی گنگچیاں جمع کی گئیں جو نظر میں بھی متفاوت معلوم نہ ہوتی تھیں اُن سے از سر نو وزن کیا تو شرّجہ پچیس رتی کی برابر اور تنو جو پوری پھتیس رتی کی برابر نکلے پھر اس وزن میں بھی مختلف طریقوں سے تولّا اور دوسروں سے تولّوایا گیا تو یہی وزن برابر اتارنا۔ جس سے معلوم ہوا کہ درہم (جس کی مقدار شرعی شرّجہ ہے) تین ماشہ ایک رتی کا اور مثقال (جس کی مقدار تنو جو ہے) پورے ساڑھے چار ماشہ کا ہے۔

اور یہ وہی وزن ہے جو جمہور علماء ہندوستان اور اکابر وہلی نے مقرر فرمایا ہے صرف درہم کے وزن میں ایک کے پانچویں حصہ کی کمی ہمارے حساب میں رہی سمون ظاہر ہے کہ یہ کمی غیر محسوس ہو سکتی ہے۔

اس تمام تحقیق و تفتیش اور مختلف قسم کی گنگچیوں اور ماشوں وغیرہ سے بار بار وزن کرنے سے یہ بات تو بالکل متعین اور متیقن ہو گئی کہ درہم کا وزن دو ماشہ و پڑھ رتی اور مثقال کا تین ماشہ ایک رتی جو حضرت لکھنوی کی تحریر ہے کسی طرح اور کسی حساب سے صحیح نہیں ہوتا۔ کیونکہ اُن کی تحقیق پر درہم ساڑھے سترہ رتی اور مثقال پچیس رتی کا ہے

اور اس تمام تحقیق و تفتیش اور بار بار کے وزن میں نستر جو یعنی درہم کا وزن پچیس رتی ہے اور نثر جو یعنی مثقال کا وزن پچتیس رتی سے کم کسی طرح نہیں نکلتا۔

اب اس پر حیرت ہوئی کہ مولانا عبدالحی صاحب جیسے محقق اور ماہر عالم کے حساب میں اتنا عظیم الشان فرق کیسے آیا۔ سو غور کرنے سے خیال آیا کہ شاید موصوف نے صرف چار جو اور ایک رتی کا باہم وزن ہی فرمایا ہے اس میں تفاوت نامعلوم ہونے کی بنا پر محسوس نہ ہوا پھر اسی پر نستر اور نثر جو کا حساب لگا کر درہم و مثقال کے وزن قائم فرما دیئے۔ نثر جو اور نثر جو مجموعی طور پر وزن نہیں فرمایا اور نہ یہ مغالطہ ہرگز نہ رہتا۔ چنانچہ اس خیال کے امتحان کے لئے چار جو اور ایک رتی کا وزن کیا تو اس خیال کی پوری تصدیق ہو گئی۔ کہ ظاہر نظر میں بالکل مساوی معلوم ہوئے۔ پھر اس کی مزید تقویت کے لئے صرف تین جو اور ایک رتی کا وزن کیا تو وہ بھی اسی طرح ظاہر نظر میں برابر محسوس ہوئے۔ دونوں وزن میں فرق اس قدر خفی تھا کہ محسوس کرنا دشوار تھا جس سے ثابت ہوا کہ دراصل ایک رتی کا وزن نہ پورے چار جو ہیں نہ پورے تین جو۔ بلکہ تین سے کسی قدر کم ہے اور یہ کمی صرف ایک رتی کے تولنے میں ظاہر نہیں ہوئی۔ جی حضرات نے ایک رتی کی مقدار چار جو یا بعض نے تین جو لکھی ہے وہ یا تو تقریبی ہے اور یا اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے صرف ایک رتی کا وزن دیکھا ہے اور قلیل وزن میں قلیل فرق محسوس نہیں ہوتا۔

الحاصل اس تدقیق و کاوش کے بعد یہ تو یقین ہو گیا کہ درہم کا وزن دو ماشہ ڈیڑھ رتی اور مثقال کا تین ماشہ ایک رتی ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اب صرف اتنی بات باقی رہ گئی کہ احقر نے جو مختلف قسم کی گنگلیوں سے یا بازاری ماشہ سے وزن کیا اور ہر قسم میں کچھ نہ کچھ فرق نکلا۔ ان میں سے کس وزن کو ترجیح دی جاوے سوا اول تو احقر کی اپنی تفتیش کے اعتبار سے بھی وہی وزن راجح اور صحیح ہے جو جمہور علماء ہندوستان کی تحقیق کے بالکل مطابق ہے یعنی نثر جو = پچیس رتی اور نثر جو = پچتیس رتی کے برابر ہیں۔ کیونکہ یہ وزن متوسط جو اور متوسط گنگلیوں سے کیا گیا ہے۔ دوسرے

ع تذکرۃ الرشید میں حضرت گنگوہی رح سے بھی نقل کیا گیا ہے ۱۲ منہ

جمہور علماء کی تحقیق کے مطابق ہو جانا خود اس وزن کی ترجیح کے لئے کافی ہے کیونکہ ان اکابر علماء نے ساتویں صدی ہجری سے بارہویں تیرہویں صدی ہجری تک مختلف زمانوں اور مختلف بلاد میں اپنی اپنی تحقیق ضبط فرمائی ہے۔ جیسا کہ عنقریب اس کی تفصیل آتی ہے۔ اور سب کی تحقیقات مطابق ہیں۔ عادتاً یہ بات ناممکن ہے کہ یہ سب کے سب ایک ہی غلطی پر مجتمع ہو جائیں۔

قدیم علماء ہندوستان کی تحقیقات

مولانا ابوالفتح رکن دین بن حسام مفتی ناگوری جو قاضی القضاة شیخ حماد الدین احمد کی طرف سے بلاد نہروالہ (صوبہ گجرات) میں منجانب حکومت اسلامیہ مفتی مقرر تھے اور اسی زمانہ میں بڑی تفتیش سے فتاویٰ حمادیہ تصنیف فرمایا تھا۔ اس میں اکابر علمائے ہندوستان کی تحقیقات اوزان شرعیہ کے بارہ میں نقل فرمائی ہیں۔ اس میں بحوالہ حاشیہ مولانا معین الدین از شرح کنز نقل کیا ہے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ شرح کنز کونسی اور کس زمانہ کی تصنیف ہے مگر اتنا ظاہر ہے کہ یہ بزرگ قدیم علمائے ہندوستان میں سے ہیں اور بوزن بلادنا جو ان کی عبارات مندرجہ ذیل میں آتا ہے اس سے مراد دہلی اور اس کے مضافات ہیں جیسا کہ اس عبارت سے پہلے اسی کتاب میں درہم بلینا اعمتی حفرة دہلی مذکور ہے۔

اور قیراط ایک جبہ رقی، اور ایک جبہ رقی،	والقیراط حبة واربعة اخصاس
کے پانچ حصوں میں سے چار حصے ہیں اس لئے	حبة فیکون وزن اللآھ خمسة
وزن درہم کا پچیس رقی اور پانچواں حصہ رقی	وعشرون حبة
کا ہو گیا اور ہر تولہ تین درہم اور بیس رقی اور	وخمسة حبة وکل تولجة
دو خمس رقی کا ہو گیا۔	ثلاثة دراهم وعشرون حبة ونمسا

کیونکہ تولہ آج کل چھیا نوے رقی کا ہے	حبة لان تولجة ستة وتسعون
اس لئے کہ تولہ ہماری اصطلاح میں بارہ ماشر	حبة لان کل تولجة فی اصطلاحنا

کا ہے — اور ہر ماشہ آٹھ رتی کا۔
پس اس بنا پر چاندی کا نصاب ہمارے بلاد
کے وزن کے اعتبار سے ساڑھے باون تولہ
ہوا اور مقدار زکوٰۃ واجبہ کی اس میں سے ایک
تولہ تین ماشہ چھ رتی ہوتی۔

اور نصاب سونے کا ہمارے بلاد کے
وزن سے ساڑھے سات تولہ ہو گیا اور مقدار
واجب اُس میں سے سوا دو ماشہ ہوگی اس
بارہ میں یہی تحقیق ہے۔

(فتاویٰ حمادیہ)

اثنا عشر ماہجة وكل ما هجة ثمانية
حبة فعلى هذا يكون نصاب الفضة
بوزن بلادنا اثنين وخمسين تولجة
ونصف تولجة فالواجب تولجة و
ربع تولجة دست حبات ونصاب
الذهب بوزن بلادنا سبع تولجات
ونصف تولجة والواجب ثمن تولجة
ونصف ثمن تولجة وذلك بالمال
ما هجتان وربع ما هجة وهذا هو
التحقيق في هذا الباب .

(فتاویٰ حمادیہ ص ۴۳ ج ۱)

مولانا معین الدین کی مذکورہ بالا تحقیق بعینہ وہ ہے جو حضرت دہلی نے اور جمہور علمائے
ہندوستان نے بیان کی ہے۔ نیز اسی فتویٰ حمادیہ میں ایک واقعہ ۶۹۲ھ کا شیخ
یہاؤ الدین ابراہیم بن عبد اللہ تاجر ملتان کا نقل کیا ہے جنہوں نے ہندوستانی اوزان
میں درہم و دینار اور صاع و مد کی مکمل تحقیق فرمائی ہے اور مکہ معظمہ سے درہم شرعی
اور دینار اور مد اور صاع کے معتبر و مستند پیمانے ہندوستان لا کر دہلی کے دار الضرب
(دکسال) میں اُن کو وزن کرایا اور محفوظ کرادیا۔ ان کی بعینہ عبارت یہ ہے۔

شرح ہدایہ میں ہے کہ ابراہیم بن عبد اللہ تاجر

ملتان جب سن چھ سو چورانوے ہجری میں مکہ معظمہ
حاضر ہوئے تو درہم بوزن سبعة (جو احکام شرعیہ
میں معتبر ہے) اور مثقال اور صاع اور مد کی
تحقیق میں بڑی کوشش کی اور مکہ معظمہ سے ایک

من شرح الهدایة وحكى ان

ابراهیم بن عبد اللہ التاجر الملتانی
لما دخل مكة سنة اربع وتسعين
وست مائة بالغ في تحقیق
الدرهم بوزن سبعة والمثقال

عہ یہ واقعہ مصباح المنیر میں شیخ محمد قایم سندھی نے بھی نقل کیا ہے ۱۲ منہ

ایک درہم اور مثقال اور صاع اور مدے
کر آئے پھر ان کا وزن کیا اور دہلی کی ٹکسال
میں ان کو محفوظ کرادیا۔

چنانچہ درہم شرعی تین ماشہ اور سو اچار
جو کی برابر اور مثقال شرعی دہلی کے مروجہ
درہم سے ایک درہم اور پانچواں حصہ درہم
اور نصف جو اور دسواں حصہ جو کا ہوا اور
مد تین استار اور ایک تہائی استار ہمارے
بلدہ (دہلی) کے استار کے حساب سے
مگر یہ (صاع و مد کا وزن) قابل اعتماد نہیں اگرچہ
بعض علماء نے اس پر بھی اعتماد کیا ہے
وجہ بے اعتمادی کی یہ ہے کہ حجاج کے زمانہ
میں حضرت عمرؓ کا صاع مشتبہ ہو گیا تھا حالانکہ
یہ زمانہ عہد نبوت سے بالکل قریب تھا تو
آج اُس صاع پر کیسے اعتماد ہو سکتا ہے جو
اس قدر زمانہ طویل کے بعد وہاں سے لایا
گیا۔ اس مدت میں معلوم نہیں وہاں کے
کیل اور صاع میں کیا کیا تغیرات ہوئے
ہوں گے۔

(فتاویٰ حمادیدہ ص ۲۲ ج ۱)

اس میں حمادیدہ کا یہ کہنا تو صحیح ہے کہ ان اوزان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عہد نبوی
سے بعد کی وجہ سے تغیر و تبدل کے امکانات بہت ہیں لیکن یہاں صرف یہی بنیاد نہیں

والصاع والمد والی
بدرہم مکتہ
ومتقالہا وصاعہا ومدہا و
وزنہا و حوزہا بدارالضرب
فی حفرة دہلی اجلتھا اللہ تعالیٰ
فصار الدرہم الشرعی ثلث
ماہجۃ واربعة شعیرات وربع
شعیر و المثقال الشرعی درہمًا
من دراہم بلدنا و خمس درہم
ونصف شعیر و عشرہا والمد
ثلثۃ اساتیر و ثلث استار بآستار
بلدنا و الصاع ثلثۃ عشر استارًا
و ثلث استار بآستار بلدنا و هذا
لا یصلح للاعتماد و التعمیل علیہ
وان اعول بعض علماء عصرنا لانا
اشتبه صاع عمر رضی فی زمن
الحجاج و قد قرب ذلك الزمان
من عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم
فکیف یعتمد علی صاع اتی بہ فی هذا
العصر و قد تطاول الزمان
وتغیر المکائیل والصیغان

بلکہ فقہاء سابقین کی شہادات موجود ہیں۔ اس لئے تاہید کے درجہ میں اس کو بھی لیا جائے تو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

شیخ ابراہیم تاجر ملتان کی تحقیق جو ساتویں ہجری میں بڑے اہتمام سے کی گئی ہے یہ بھی درہم و مثقال کے وزن میں بعینہ وہ ہے جو حضرات دہلی اور جمہور علماء ہند کی تحقیق ہے۔ کیونکہ اس میں درہم کا وزن تین ماشہ اور سو اچار جو بیان کیا ہے اور جمہور نے تین ماشہ ایک رقی اور خمس رقی لکھا ہے سو ۴۴ جو کی ایک رقی اور خمس رقی ہونا ظاہر ہے۔ اسی طرح مثقال کا وزن دہلی کا ایک درہم پورا اور پانچواں حصہ درہم اور ایک نصف اور ایک عشر جو لکھا ہے اور دہلی کا درہم اُس وقت چار ماشہ کا تھا جیسا کہ فتویٰ حمادیہ میں عبارت مذکور سے پہلے اس کی تصریح بالفاظ ذیل موجود ہے:

ودرہم بلدنا اعی حضرت
دہلی اربعۃ و ستون شعیراً
لانہ اربع ماہجۃ و کل ماہجۃ ستہ
عشر شعیراً (ص ۴۲)

(حمادیہ)

اس سے معلوم ہوا کہ مثقال کا وزن ماشہ رقی کے حساب سے چار ماشہ اور چھ رقی تقریباً ہوتا ہے اس میں متاخرین دہلی کی تحقیق سے صرف دو رقی زائد ہیں اور علماء لکھنؤ کی تحقیق سے یہ اور بھی زیادہ بعد ہے اور یہی وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی قدس سرہ جن کی وفات ۱۲۱۵ ہجری کی ہے اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلی قدس سرہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور حضرت شاہ صاحب نے ہی ان کو یہی وقت کا خطاب دیا ہے۔ اپنے زمانہ میں حکومت کی طرف سے قاضی بھی رہے ہیں ان کی کتاب مالابد منہ میں ہے۔

”نصاب زر بست مثقال است کہ مہفت و نیم قولہ باشد و نصاب یکم دو صد درہم است کہ پنجاہ و شش سکہ دہلی وزن آن می شود“

(مالابد منہ ص ۹۱)

اور حضرت نواب قطب الدین صاحب دہلوی شارح مشکوٰۃ ۱۲۵۲ھ میں اپنی کتاب مظاہر حق میں تحریر فرماتے ہیں :-

” درہم تین ماشہ ایک رقی اور پانچواں حصہ رقی کا ہوتا ہے پس دو سو درہم میں چاندی چھ سو تیس ماشہ ہوتی ہے اور ان پر زکوٰۃ کے پانچ درہم ہیں اور پانچ درہم میں چاندی ہے پندرہ ماشہ چھ رقی پس اگر روپیہ میں بارہ بارہ ماشہ کے جیسے کلدار سیدی کل کے اور ڈیل اور پتلی دار تو چھ سو تین ماشہ کے ساڑھے باون روپیہ ہوئے۔ اس پر زکوٰۃ کا ہوا ایک روپیہ بارہ ماشہ کا۔ اور پانچ آنہ اور اگر روپیہ میں ساڑھے گیارہ ماشہ کے مثلاً لکھنؤ وغیرہ کے تو چون روپیہ بارہ آنہ چھ پائی اور چھ جزو تیس پائی کے میں سے ہوئے ان پر ایک روپیہ ساڑھے گیارہ ماشہ کا اور پانچ آنہ دس پائی اور بائیس جزو تیس جزو پائی کے میں سے زکوٰۃ ہوئی حسب ذیل تفصیل :

شمار درہم تعیین زکوٰۃ - وزن چاندی - تعیین زکوٰۃ - سکہ بارہ ماشہ کا - زکوٰۃ سکہ
 ۱۱ درہم صد درہم ۶۳۰ ماشہ ۱۵ ماشہ سرخ $\frac{۱۱}{۸}$ $\frac{۱۱}{۵}$

۱۱ پکا - زکوٰۃ (الی قولہ) اور نصاب اس کی یعنی سونے کی

$\frac{۱۱}{۸}$ $\frac{۱۱}{۵}$ ۱۱ پائی بیس متقال یہاں کے حساب ساڑھے سات

قولہ بھر ہوتے ہیں (مظاہر حق ص ۱۰۸ ج ۲)

اور شیخ محمد قائم سندھی کے رسالہ مصباح منیر میں شیخ عیسیٰ سندھی برہان پوری شطاری کے رسالہ مفتاح الصلوٰۃ سے نقل کیا ہے :

” مقدار صدقہ فطر نصف صاع است کہ عبارت از چہار رطل باشد و اں دو سیر شاہ جہانی می شود چون از گندم یا آرد یا سا تو باشد و یک صاع بدہد اگر از خرما یا جو باشد و واجب اں بر صاحب نصاب است یعنی ہر کہ پنجاہ و دویم قولہ نقرہ یا ہائے اں سوائی مسکن بودن و پارچہ پوشیدن داشته

”باشد انتہی“

نیز علامہ ہدایتی نے حاشیہ ہدایہ میں شرح کنز کے حوالہ سے نقل کیا ہے :-

لان التولجة فی اصطلاحنا
عشر ما هجة وكل ما هجة ثمان جات
فعلی هذا یكون نصاب الفضة بوزن
بلاونا اثین وخمسين تولجة ودیع
تولجة وست جبات ونصاب الذهب
یوزن بلاونا سبع تولجات ونصف
تولجة هذا هو التحقیق فی هذا الباب
اس لئے کہ تولہ ہماری اصطلاح میں بارہ ماشہ
کا اور ماشہ آٹھ رتی کا ہے۔ اس بنا پر چاندی
کا نصاب ہمارے بلاد ہندوستان وغیرہ
میں سوا باون تولہ چھ رتی ہے اور سونے کا نصاب
ہمارے بلاد کے وزن میں ساڑھے سات
تولہ ہے۔ اس معاملہ میں تحقیق سے یہی ثابت
ہوتا ہے۔

اور مصباح منیر میں یہی تحقیق مولانا معین الدین عمرانی کی حاشیہ کنز سے نقل کی ہے
نیز شرح صراط مستقیم فصل زکوٰۃ سے نقل کیا ہے :-

”درہم مبلغ آن بحساب تولہ۔ پنجاہ و دو تولہ باشد۔ و بست مثقال زر بوزن

ایں دیار ہفت و نیم تولہ بود انتہی۔ اقول الصواب ان یقول فی نصاب

الفضة پنجاہ و دو نیم تولہ باشد آہ“

نیز مصباح منیر فصل سادس میں ہے کہ ہمارے ملک میں غیر مسلموں سے جو درہم بطور
بطور جزیہ لئے جاتے تھے اور ان پر درہم شرعی لکھا ہوا تھا۔ ہم نے ان کا وزن کیا تو
تین ماشہ اور آٹھواں حصہ ماشہ کا اور پانچواں حصہ رتی کا پایا جس سے اس قول کی تائید
ہوئی کہ مثقال ۴ پڑ ماشہ کا ہوتا ہے۔

اطباء ہندوستان کی تحقیق

اشرف الحکماء جناب حکیم محمد شریف خاں دہلوی جو تیرھویں صدی کے اوائل میں
ہندوستان کے نامور امام طب مانے گئے ہیں۔ ان کی کتاب علاج الامراض فارسی
کے آئینے اوزان کی بحث پر ایک مستقل فصل ہے جس کے آخر میں وہ تحریر فرماتے ہیں :-

”اوزانے کہ دریں بلاد متعارف است بدیں طریق است کہ از چہار خردہ یک
برنج اعتبار می کنند و از چہار برنج یک جوہ از دو جوہ یک رتی و از ہشت رتی یک ماشہ
و از سونیم ماشہ یک درہم و از چہار نیم ماشہ یک مشقال و از دو وزدہ
ماشہ یک تولہ و از چہار دہ ماشہ یک دام عالمگیری و از بست و یک ماشہ
یک دام پختہ و از سی دام پختہ یک سیر اکبری و از چہل دام پختہ یک سیر
شاہجہانی و از چہل و چار دام پختہ یک سیر عالمگیری و از چہل و ہشت دام پختہ یک سیر فرخ
شاہی کہ شاہی مروج است۔ واللہ اعلم بالصواب (علاج الامراض فارسی ص ۳۷۲)

اس تحقیق میں بھی درہم و مشقال تقریباً وہی اوزان ہیں جو قدیم علماء ہندوستان کی
تحقیق ہے۔ اگرچہ رتی کا وزن دو جوہ بتلایا گیا ہے مگر یہ ممکن ہے کہ اس وقت جو بڑے
ہوں یا تحقیق کرنے والوں کے سامنے بڑے آئے ہوں۔ علاوہ ازیں اس سے آٹنا
تو بدرجہ اولیٰ معلوم ہوا کہ ایک رتی چار جوہ کی نہیں ہے۔

(ف) اس تحقیق میں ہندوستانی سیر کے اوزان مختلفہ بھی ضبط میں آگئے جو بحساب
تولہ حسب ذیل نکلتے ہیں اس کے ساتھ موجودہ وقت کے سیر بھی کچھ لکھ دیے گئے:-
سیر اکبری سیر شاہجہانی سیر عالمگیری سیر فرخ شاہی سیر انگریزی
۵۲ ۱/۲ تولہ ۷ تولہ ۷ تولہ ۸۳ تولہ ۸۰ تولہ

مخزن میں درہم و مشقال کا وزن اس سے متفاوت لکھا ہے لیکن وہ تفاوت
غالباً اس پر مبنی ہے کہ تولہ دہلی اور بنگال کا متفاوت ہے دہلی کے بارہ ماشہ اور بنگال
کے دس برابر ہیں جیسا کہ خود مخزن میں اس کی تصریح موجود ہے۔ تولہ کا وزن متفاوت
ہونے سے ماشہ میں اس کے تفاوت سے درہم و مشقال میں فرق ہو جاتا ہے۔

اہل لغت کی تحقیق

ہفت قلم۔ جس کے مصنف ہندوستان کے مشہور علماء لغت میں سے
ہیں انہوں نے بھی درہم کا وزن سہ ماشہ و چار جوہ لکھا ہے۔

غیات اللغات - میں بھی درہم کا وزن سہ ماشہ و نیم ماشہ لکھا ہے اور مثقال کے متعلق لکھا ہے :-

”مثقال بالکسر نام وزن سست کہ چہار و نیم ماشہ باشد و قرابادین محمد شریف خاں شاہجہاں آبادی اگرچہ دریں اختلاف بسیار کردہ اند مگر اقوی ہمیں سست“

یہ تحقیق تو ہندوستان کے علماء لغت کی ہے۔ اور امام لغت محمد بن یوسف کاتب خوارزمی متوفی ۳۸۰ھ نے اپنی کتاب مفاتیح العلوم میں عرب کے اوزان و مکائیل کی مقداریں بیان فرمائی ہیں اُس کو بھی اس جگہ اہل علم کے فائدہ کے لئے عربی عبارات میں نقل کیا جاتا ہے و سہو ہذا۔

مکائیل العرب اوزانہا

القلۃ اناء للعرب قال اصحاب الحدیث القلتان خمس
قرب حبار، الرطل نصف من المن وزن مائتین و سبعة و خمسين
درهما و سبع درهم و بالمثاقیل مائة و ثمانون مثقالا و بالواقی
اربع و عشرون اوقیة المڈرطل و ثلث - الصاع اربعة امداد عند
اهل المدينة و ثمانية ابطال عند اهل الكوفة - القسط نصف صاع
الفرق ثلثة اصواع - الوسق ستون صاعا - قال الخلیل الوسق هو حمل
البعیر فاما الوقر فحمل البعل او الحمار - المثقال زنة درهم و ثلاثة
اسباع درهم الاوقیة علی وزن اثنیة و جمعها اواق زنة عشرة دراهم
و خمسة اسباع درهم و الاوقیة فی الدهن عشرة دراهم - الاطار
اربعہ عشر متا - و انعمت بال عراق بالكوفة و بغداد ستون قفیزا و کل
قفیز ثمانية مکایک - و کل مکوک ثلاث کبابج - و الکیلجة وزن ست
مائة درهم و بواسط و البصرة مائة و عشرون قفیزا و کل قفیز اربعة

مکایک -

وکل مكوں خمسة عشر رطلا و كل رطل مائة و ثمانیة و عشرون
درهما - انتہی

اس تمام بحث و تفتیش کا حاصل یہ تھا کہ درہم اور مثقال کا صحیح وزن تولہ اور
ماشر سے کیا ہے۔ اس کے بعد اصل مقصود کو دیکھنا چاہئے کہ چاندی سونے کا نصاب
کیا ہوا۔ اور صدقۃ الفطر کی مقدار کیا ہوئی جس کی تفصیل یہ ہے۔

چاندی، سونے کا صحیح نصاب

جب کہ یہ متفق علیہ ہے کہ چاندی کا نصاب دو سو درہم ہے اور تحقیق مذکور سے
ثابت ہو گیا کہ ایک درہم کا وزن تین ماشہ ایک رتی اور ایک پانچواں حصہ رتی کا ہے
تو حساب نکالنے سے واضح ہو گیا کہ چاندی کا نصاب باون تولہ چھ ماشہ ہے اور چونکہ رائج
الوقت روپیہ ہمارے زمانہ میں ساڑھے گیارہ ماشہ کا ہے تو روپیہ سے چوں روپیہ
بارہ آنے چھ صحیح چھ بڑے تیس پائی (۶۶ پائی) نصاب زکوٰۃ ہوا۔

اسی طرح یہ بھی مسلم ہے کہ سونے کا نصاب شرعی بیس مثقال میں اور تحقیق مذکور
سے ثابت ہو چکا ہے کہ مثقال کا وزن ساڑھے چار ماشہ ہے تو نصاب سونے کا تولہ
کے حساب سے ساڑھے سات تولہ ہو گیا جیسا کہ تیرھویں صدی کے بزرگانِ دہلی
نے تحریر فرمایا ہے اور شیخ بہاؤ الدین تاجر طنائی کی تحقیق کے موافق تقریباً چالیس
رتی یعنی پانچ ماشہ اور زائد ہو جاتی ہے یعنی سات تولہ گیارہ ماشہ سونا نصاب زکوٰۃ
ہوا۔ سوا احتیاط اسی میں ہے کہ ساڑھے سات تولہ کو نصاب سمجھ کر اس پر زکوٰۃ دی جاوے
اور جو شخص ساڑھے سات تولہ سونے کا مالک ہو اس کو مصرف زکوٰۃ نہ سمجھا جاوے۔

فائدہ :- درہم شرعی کا جو وزن اوپر بیان کیا گیا ہے تمام احکام و معاملات
شرعیہ میں جہاں کہیں درہم بولا گیا ہے۔ یہی درہم شرعی مراد ہوگا۔ اس لئے عورت کے
مہر کی کم سے کم مقدار جو حنفیہ کے نزدیک دس درہم ہے دو تولہ ساڑھے سات ماشہ

چاندی ہوئی اور مہر فاطمی جس کی مقدار منقول پانچ سو درہم (کافی عامتہ روایات الحدیث) اس کی مقدار موجودہ روپے سے ایک سو اکتیس تولہ تین ماشہ ہوئی۔

صاع کا وزن اور صدقۃ الفطر کی مقدار صحیح

یہ تو مسلم اور متفق علیہ ہے کہ صدقۃ الفطر کی مقدار گندم سے نصف صاع اور جو سے ایک صاع ہے اور یہ بھی حنفیہ کے نزدیک طے شدہ ہے کہ صاع سے صاع عراقی مراد ہے اور ایک صاع عراقی آٹھ رطل کا ہوتا ہے۔ پھر صاع اور رطل کا وزن تولہ ماشہ کے حساب سے معلوم کرنے کے لئے چند طریق ہیں۔

تو حسب تصریح فقہاء جس کا حوالہ ابتداء میں گزر چکا ہے

اول بذریعہ مثقال | ایک رطل نوے مثقال کا اور نوے کو آٹھ میں ضرب دی گئی تو سات سو بیس مثقال صاع کا وزن ہو گیا اور تحقیق مذکورہ سے ثابت ہو گیا کہ ایک مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہے تو پورا صاع (۳۲۴۰) ماشہ یعنی دو سو تتر تولہ کا اور نصف صاع (۱۶۲۰) ایک سو پینتیس تولہ کا ہو گیا۔ جو انٹی تولہ کے انگریزی سیر کے حساب سے تین سیر چھ چھٹانک کا پورا صاع اور دیرٹھ سیر تین چھٹانک کا نصف صاع ہوا۔

دوسرا طریقہ بذریعہ درہم | حسب تصریح در مختار وغیرہ کامل صاع ایک ہزار چالیس درہم کا ہے اور درہم حسب تحقیق مذکور تین ماشہ ایک رتی اور ۱/۲ رتی کا ہے تو پورا صاع دو سو تتر تولہ ہو گیا اور نصف صاع ۱۲۶ تولہ ۶ ماشہ کا ہوا یعنی انٹی تولہ کے انگریزی سیر سے پورا صاع تین سیر چھ چھٹانک تین تولہ ہو گیا اور نصف صاع ڈیرٹھ سیر تین چھٹانک ڈیرٹھ تولہ ہوا۔ ان دونوں حسابوں میں پورے صاع پر تین تولہ کا اور نصف صاع پر ڈیرٹھ تولہ کا فرق آتا ہے یہی وجہ ہے کہ جس نے صاحب در مختار کے موافق درہم سے حساب کیا تو دو سیر تتر تولہ کا صاع نکلا اور جس نے شارح وقایہ صدر الشریعہ کے موافق مثقال سے حساب

لگایا تو دو سو ستتر تولہ نکلا۔

تیسرا طریقہ بذریعہ مد مد یعنی المیم بھی ایک پیمانہ کا نام ہے اور حسب تصریح شامی وغیرہ ایک صاع چار مد کا ہوتا ہے۔ پھر مد کا وزن ہندوستانی اوزان کے حساب سے معلوم کرنے کے لئے چند صورتیں ہیں۔ اول اُن علماء کے اقوال جنہوں نے مد کو گندم وغیرہ سے بھر کر پھر وزن کیا اور اپنی تحقیق لکھی۔ اس میں ایک تو وہی قول ہے جو شیخ بہاؤ الدین تاجر ملتانی کے واقعہ میں بحوالہ حماد یہ گزر چکا ہے اس میں ایک مد تین استار اور ایک تہائی استار کا اور صاع کو تیرہ استار اور ایک تہائی استار کا بوزن دہلی قرار دیا ہے۔ لیکن چونکہ دہلی کے استار کا وزن معلوم نہیں اس لئے یہ صورت کافی نہیں ہوتی۔

دوسرے سیدی و سندی حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے رسالہ الطرائف والنظرائف حصہ دوم ص ۱۲ میں ہے۔

” ایک مد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب (نانو توی) اول صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کے پاس تھا جس کی مسلسل سند حضرت زید بن ثابتؓ کے مد تک (جو انہوں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مد سے ناپ کر بنایا تھا) پہنچتی ہے اُس کو حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ نے دو مرتبہ بھر کر وزن کیا (کیونکہ نصف صاع دو مد کا ہوتا ہے) تو ۸۸ تولہ کے سیر سے اُس سیر اُچھٹانک ہوا تھا۔ (الطرائف ص ۱۲)

اس حساب سے پورے صاع کا وزن دو سو ستتر تولہ چھ ماشہ اور نصف صاع کا ایک سو چالیس تولہ تین ماشہ ہوتا ہے۔ اور علامہ شامی نے بیان کیا ہے کہ ایک مد دو سو ساٹھ درہم کی برابر ہوتا ہے اور دو سو ساٹھ درہم کا وزن تحقیق مذکور کے موافق آٹھ سو انیس ماشہ یعنی اڑسٹھ تولہ تین ماشہ ہوتا ہے اور چونکہ پورے صاع چار مد کا ہے تو اُس کو چار میں ضرب دینے سے پورے دو سو ستتر تولہ وزن صاع کا نکل آیا اور نصف صاع ایک سو چھتیس تولہ چھ ماشہ کا ہوا۔ اور یہ بعینہ وہ حساب ہے جو اوپر بذریعہ درہم بیان کیا

گیا ہے۔

چوتھا طریق بذریعہ استار | اس کے متعلق بحوالہ شامی گزر چکا ہے کہ ایک مدیا

ایک من یا دو رطل رکیونکہ یہ تینوں چیزیں ہم وزن میں چالیس استار کے برابر ہیں اور ایک استار ساڑھے چھ درہم یا ساڑھے چار مثقال کی برابر ہے اب اگر درہم سے حساب استار کا لگایا جائے اور پھر اُس سے مد وغیرہ کا تو چالیس استار کے دونوں ساڑھے درہم ہوتے ہیں اور دونوں ساڑھے درہم کے اڑسٹھ تولہ تین ماشہ ہوتے ہیں جو ایک مد یا دو رطل کا وزن ہے اور جب پورا صاع معلوم کرنے کے لئے اُس کو چار میں ضرب دی گئی تو وہی دو سو تتر تولہ کا حساب آگیا اور اگر استار کا حساب مثقال سے کیا جاوے تو چالیس استار کے ایک سو اسی مثقال ہونے جس کے آٹھ سو دس ماشہ یعنی ساڑھے سرسٹھ تولہ ہو گئے اس کو پورا صاع بنانے کے لئے چار میں ضرب دی تو دو سو تتر تولہ ہو گئے یہ بعینہ وہی حساب ہے جو سب سے پہلے بذریعہ مثقال بیان کیا گیا۔

الغرض صاع کو اوزان ہندیہ تولہ ماشہ کی طرف منتقل کرنے کے چار طریقے جو اوپر مذکور ہوئے ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ جس حساب میں کسی جگہ مثقال سے حساب لگایا گیا تو دو سو تتر تولہ کا صاع آتا ہے اور جس جگہ درہم سے حساب لگایا تو دو سو تتر تولہ کا فقہاء کی تصریحات مذکورہ میں اُلٹ پلٹ کر یہی دو صورتیں بالآخر نکلتی ہیں جن میں پورا صاع پر صرف تین تولہ کا اور نصف صاع پر ڈیڑھ تولہ کا فرق آتا ہے۔ صرف وہ حساب جو بحوالہ طرائف دو مد کے وزن کا لکھا گیا ہے اُس سے دو سو اسی تولہ چھ ماشہ کا صاع معلوم ہوتا ہے جس میں ساڑھے دس تولہ کا پورے صاع پر اور سو پانچ تولہ کا نصف صاع پر فرق آتا ہے۔ اس طرح پر تین حساب تھوڑے تھوڑے فرق سے حاصل ہو گئے

اول۔ بذریعہ مثقال پورا صاع دو سو تتر تولہ نصف صاع ایک سو پینتیس تولہ۔
دوم۔ بذریعہ درہم۔ پورا صاع دو سو تتر تولہ نصف صاع ایک سو پچیس تولہ چھ ماشہ
سوم۔ بذریعہ مد۔ حضرت مولانا محمد یعقوب پورا صاع دو سو اسی تولہ چھ ماشہ
نصف صاع ایک سو چالیس تولہ تین ماشہ۔

ان میں سے جس حساب کو بھی اختیار کر لیا جاوے صدقہ فطر ادا ہو جاوے گا۔ لیکن آخری حساب میں چونکہ زیادتی ہے اس لئے اس کے موافق ادا کرنے میں زیادہ احتیاط ہے۔ اور جب تولہ ماشہ کے حساب سے صاع اور نصف صاع کا وزن معلوم ہو گیا تو اپنے اپنے شہروں کے سیر اور چھٹانک کا حساب لگا لینا سہل ہے۔ لیکن چونکہ عام طور پر انگریزی سیرانٹی تولہ کا رائج ہو گیا ہے اور ہمارے بلاد میں عموماً صدقہ الفطر گھیوں کے دیا جاتا ہے اس لئے اس کا حساب بالتصریح لکھ دینا مناسب ہوا۔

گندم سے صدقہ الفطر کی مقدار واجب نصف صاع ہے اور نصف صاع پہلے حساب سے انٹی تولہ کے سیر سے ڈیڑھ سیر تین چھٹانک کا ہوا۔ اور دوسرے حساب سے ڈیڑھ سیر تین چھٹانک ڈیڑھ تولہ اور تیسرے حساب کے پونے دو سیر تین ماشہ ہوا۔ جن میں زائد سے زائد سو پانچ تولہ کی زیادتی ہے۔ اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ انٹی تولہ کے سیر سے پونے دو سیر گندم ایک صدقہ الفطر میں نکالے جاویں۔

تنبیہ: مولانا لکھنوی نے جو وزن صاع کا ایک سیر پندرہ تولہ قرار دیا ہے۔ جہاں تک احقر نے تفتیش کی وہ کسی حساب سے درست نہیں نکلا

اور وجہ اس مغالطہ کی وہی معلوم ہوتی ہے جو وزن درہم کی تحقیق میں عرض کی گئی ہے کہ صرف ایک رتی کو جو کے ساتھ تو لایا گیا اس میں خفیف سافرق محسوس نہ ہوا۔

پھر چارہ جو کی رتی و تدرار دے کر محض حساب کے ذریعہ اس کو صاع تک پہنچایا گیا مگر جو کو ایک مرتبہ وزن کر لیا جاتا تو یہ مغالطہ باقی نہ رہتا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

اصل مقصود اس تحریر کا اتنا ہی تھا کہ سونے چاندی کے نصاب زکوٰۃ اور صدقہ الفطر کی مقدار کی تحقیق ہو جاوے۔ لیکن جب کہ درہم و مثقال کے وزن کی تحقیق ہو گئی اور عام طور سے جو اوزان کتب فقہ میں ذکر کیے جاتے ہیں وہ درہم و مثقال ہی کی طرف عود کرتے ہیں اس لیے مناسب ہوا کہ جس قدر الفاظ کتب فقہ میں

ع سے یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا نے دوسرے ائمہ کے موافق صاع عراقی کے بجائے صاع حجازی اختیار فرمایا ہو جو آٹھ کے بجائے پانچ رطل سے کچھ زائد کا ہوتا ہے مگر جمہور حنفیہ نے چونکہ صاع عراقی کو ہی ان معاملات میں اختیار کیا ہے اس لئے ہم نے حساب اسی کا لگایا ہے۔ واللہ اعلم محمد شفیع۔

خاتمہ

یہ رسالہ ۵ ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ کو تھانہ بھون میں شروع کیا تھا، ذی قعدہ کو وہاں سے واپسی ہو گئی۔ رسالہ درمیان میں رہ گیا اتفاقاً ۱۱ ذی قعدہ کو پھر قصبہ شاملی ضلع مظفرنگر میں مدرسہ اشرفیہ کے سالانہ جلسہ کی تقریب پر آنا پڑا اور یہاں کچھ وقت بل گیا تو چونکہ تعالیٰ رسالہ کی تکمیل ہو گئی۔ حق تعالیٰ مفید و نافع اور شبہات کیلئے واقع فرمائے اللہم آمین۔ وقد تمیوم السبت لاثنی عشر خلت من ذیقعدۃ سنۃ ۱۳۶۱ھ

اور شعبان ۱۳۶۹ھ ہجری میں نظر ثانی اور کچھ اضافات ہوئے والحمد للہ الذی بعزته وجلالہ تتم الصالحات و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

العبد الضعیف

محمد شفیع

الدیوبندی عفا اللہ عنہ

خادم دارالفتیاء دارالعلوم الدیوبندیہ سابقاً

ضمیمہ

مساحات شرعیہ در پیمانہ ہندیہ

ذراع :- عرب میں دو قسم کے ذراع مستعمل تھے ایک ذراع کہ باس دیکڑے ناپنے کا گز، دوسرا ذراع مساحت (زمین وغیرہ ناپنے کا گز)

ذراع مساحت حسب تصریح قاضی خاں وغیرہ سات مشنت (مٹھی) ہیں جن میں ہر ایک مٹھی کے ساتھ انگوٹھا کھڑا ہو (کذافی البحر الرائق ص ۱۸ بحث المیاء) اور یہ مٹھی جس پر انگوٹھا کھڑا ہو آج کل کی پیمائش کے حساب سے چھ انچ ہوتی ہے کیوں کہ اس طرح کی دو مٹھی کا فٹ قرار دیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ذراع مساحت ساڑھے تین فٹ یا بیالیس انچ کا ہوتا ہے جو انگریزی گز سے چھ انچ زیادہ ہے لیکن فقہاء کے کلام میں عموماً جس جگہ ذراع کا لفظ لیا گیا ہے ذراع مساحت مراد نہیں بلکہ ذراع کہ باس مراد ہوتا ہے۔ اور بعض مواضع میں فقہاء کا اختلاف بھی ہے کہ بعض نے اُس میں ذراع کہ باس مراد لیا ہے۔ بعض نے ذراع مساحت جیسا کہ ماہر پانی (کثیر کی بحث میں اور وہ درودہ کی تعین میں قاضی خاں نے ذراع مساحت کو اختیار کیا ہے لیکن جمہور فقہاء صاحب ہدایہ اور عامہ متون و شروح نے اس جگہ بھی ذراع کہ باس ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور ذراع کہ باس بھی دو قسم کا مشہور ہے۔ متقدمین میں ۳۲، انگشت کا ذراع معروف ہے اور متاخرین میں ۲۴، انگشت کا۔ انگشت سے مراد ہے کہ ۴، انگلیاں ملا کر رکھی جاویں۔ اور انگوٹھا ان کے ساتھ شامل نہ کیا جاوے۔ پھر چار ان کے برابر اور پھر اسی طرح ۴ بیاب تک کہ ۳۲ یا ۲۴ ہو جاویں۔ اور چونکہ ایک مشنت (مٹھی) بھی ۴، انگشت کی ہوتی ہے اس لئے متقدمین کا ذراع آٹھ مشنت (مٹھی) اور متاخرین کا چھ مشنت کا ہوگا۔ عامہ کتب مذہب متون و شروح اور فتاویٰ میں متاخرین کا ذراع مستعمل ہے اسی پر سب

حسابات شرعیہ قائم کئے گئے ہیں یعنی ۶ مشت یا ۲۲ انگشت کا ایک ذراع۔ و ذلك لما في تيمم الهندية بعد قوله اقرب لا قوال كل ذراع اربع وعشرون اصبعًا وعرض كل اصبع ست حبات شعير ملصقة ظهراً للبطن هكذا في التبيين (عالمگیری مصری ص ۲۸ ج ۱) وفي مياة البحر الرائق اختلف المشائخ في الذراع على ثلاثة اقوال ففي التجنیس المختار ذراع الكرباس واختلف فيه ففی كثير من الكتب انه ست قبضات ليس فوق كل قبضة اصبع قائمة فهو اربع وعشرون اصبعاً بعد د حروف لا اله الا الله محمد رسول الله والمراد بالاصبع القائمة ارتفاع الابهام كما في غاية البيان (بجر ص ۸۰ ج ۱) ومثله في تيمم البحر عن اليتا بيع وذكر انه ذراع العامة وفي حاشية البحر للشامی هناك انه هو المعول وعزاه الى الرملی صاحب الخيرية (بجر ص ۱۴۷ ج ۱)

عبارات مرقومہ بالا سے واضح ہو گیا کہ قول معتد فقہاء رحمہم اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ پانی کی مساحت کے متعلق وہ درودہ کے مسئلہ میں ذراع کہ باس معتبر ہے اور اس کی صحیح دراج پیمائش ۲۲ انگلیاں یا ۶ مشت ہے اور یہ بعینہ وہ مقدار ہے جس کو ہمارے عرف میں ایک ہاتھ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مغرب میں جس میں خاص فقہ ہی کے لغت جمع کئے گئے ہیں، والذراع من المرفق الى الاصابع ثم سمي بها الخشبة التي يزدع بها الرمي قوله، والذراع المكسرة ست قبضات وهي ذراع العامة واما وصف بذلك لانها نقصت عن ذراع الملك بقبضة وهو بعض الاكاسمة ولاة فارس وكانت ذراعه سبع قبضات (مغرب ص ۱۹۱ ج ۱) مغرب کی اس تحریر سے یہ معلوم ہو گیا کہ بحر الرائق بحث المياہ میں جو قول ولوالجی سے نقل کیا ہے کہ سات مشت کا ایک ذراع ہوتا ہے یہ اس قدیم ذراع کی پیمائش ہے جو آخری کسری ملک فارس کا ذراع ہے اور اسلام میں عام طور پر جو ذراع رائج ہوا وہ ایک مٹھی کم یعنی ۶ مٹھی یا ۲۲ انگلیوں کا ذراع ہے اور یہی معتبر و مستند ہے اور عرب

اور فقہاء کی سذاجت و سادگی کا بھی یہی مقتضی ہے کہ ان کے کلام میں ذراع سے مراد یہی ذراع ہو کیونکہ وہ ذراع طبعی (یعنی ایک ہاتھ) کی صحیح مقدار ہے اور یہ ذراع انگریزی گز سے نصف یعنی ڈیڑھ فٹ یا ۱۸-۱۹ انچ ہوتا ہے جیسا کہ عام طور پر حکم و رتی (م حساب) میں اس کی تصریحات الفاظ ذیل میں موجود ہیں۔

۹، ۱۰ انچ = ایک بالشت، ۲ بالشت یا ۱۸، ۱۹ انچ = ایک ہاتھ، ۲ ہاتھ = ایک گز
ایک گز = ۳ فٹ یا ۳۶ انچ۔

خلاصہ یہ کہ راجح الوقت انگریزی گز اور فٹ کے اعتبار سے

ذراع مساحت = ایک گز ۶-۷ انچ یا ساڑھے تین فٹ یا بیالیس انچ

ذراع کر باس = نصف گز یا ڈیڑھ فٹ یا اٹھارہ انچ

اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ پانی کے مسائل میں ذراع کر باس معتبر ہے نیز نمازی کے آگے سترہ جو ایک ذراع ہونا حسب تصریح فقہاء ضروری ہے اس میں بھی یہی ذراع کر باس معتبر ہے۔

میل: میل اصل لغت عرب میں منتہائے بصر کو کہا جاتا ہے۔ کما فی الصحاح

والمغرب و غیرہما اور اصطلاح فقہاء میں ایک تہائی فرسخ کو میل کہا جاتا ہے۔ پھر اس کی مقدار میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں۔

ادل چار ہزار گز اور یہی قول معتد و مختار ہے اور عام شروح و فتاویٰ میں اسی کو اختیار

کیا گیا ہے (کما سیاتی نقلہ)

دوسرے تین ہزار گز یہ قول متقدمین کا ہے اور درحقیقت اس کا مدار اس پر ہے

کہ متقدمین کا گز بہ نسبت متاخرین کے اسی قدر بڑا ہے کہ ان کے چار ہزار گز ان کے

تین ہزار کی برابر ہوتے ہیں جیسا کہ لفظ ذراع کی تحقیق میں گزر چکا ہے کہ متقدمین کا

ذراع بیس انگشت کا ہے اور متاخرین کا چوبیس انگشت کا جن کا حساب کرنے سے

ظاہر ہو جاتا ہے کہ جو مسافت چوبیس انگشت کے ذراع سے چار ہزار ذراع ہوگی وہ

بیس انگشت کے ذراع سے تین ہزار ہو جائے گی۔

تیسرا قول وہ ہے جو صاحب بحر الرائق نے بحوالہ ینا بیح نقل کیا ہے کہ ایک میل چار ہزار قدم کا ہے اور ایک قدم ڈیڑھ ذراع کا (بذراع عامہ) جس کے حساب سے ایک میل چھ ہزار ذراع کا ہو جاتا ہے لیکن علامہ شامی نے حاشیہ بحر کے اسی مقام پر بحوالہ زلیعی وغیرہ اس قول کو رد کر دیا ہے کہ معتمد علیہ وہی قول ہے جو زلیعی وغیرہ نے نقل کیا ہے یعنی چار ہزار گز۔

چوتھا قول وہ ہے جو صدر الشریعہ شارح وقایہ نے بلفظ قیل ذکر کیا ہے اور محشیوں نے اس کو ابن شجاع کی طرف منسوب کیا ہے۔ وہ یہ کہ میل ساڑھے تین ہزار گز سے چار ہزار گز تک ہے۔ مراد اس قول کی یہ ہے کہ ساڑھے تین ہزار سے زائد چار ہزار گز تک بھی ایک ہی میل کہا جائے گا۔ معمولی کمی بیشی کی وجہ سے احکام میں فرق نہ کیا جائے گا۔ یا یہ اشارہ متاخرین کے اختلاف کی طرف ہے اور بہر حال خود صدر الشریعہ نے اس قول کو بلفظ قیل ذکر کر کے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

الغرض ثابت ہوا کہ قول راجح اور مختار اور معتمد یہی ہے کہ میل چار ہزار گز کا ہے جس میں گز متاخرین کا اعتبار کر کے چوبیس انگشت کا قرار دیا گیا ہے جو انگریزی گز سے نصف یعنی اٹھارہ انچ ہے (وہذہ بعض تصریحات الفقہاء علی اختیارہ) فی تیمم الہندیۃ اقرب الاقوال ان المیل وهو ثلث الف و ستمائة و اربعۃ الاف ذراع کل ذراع اربعة و عشرون اصبعاً اھ (عالمگیری ص ۲۸ ج ۱ طبع مصر) و فی منحة الخالق علی البحر الرائق للشامی . عن الزیلعی و الجوهری ان قدر المیل اربعة الاف ذراع (الی آخرہ) و رأیت فی القلادة الجوهری ما صورته قال صاحبنا ابو العباس احمد شہاب الدین بن احمد رحمہ اللہ و الیہ یرجع فی هذا الباب البرید اربعة ذراعات و الف و ستمائة امیال و المیل الف باع و الباع اربعة اذرع و الذراع اربعة و عشرون اصبعاً و الاصبعة ست شعیرات موصوغة بالعرض و الشعیرست شعراً بشعر البرذون اھ - کلامہ و هو موافق لما فی الزیلعی و قد نظم ذلك

بعضہم فقال ۵

ان البرید من الفرس اربع
والیل القای من الباعات قل
ثم الذراع من الاصابع اربع
ست شعيرات فظہر شعيرة
ثم الشعيرة ست شعرات فقل
ولفرسخ ثلاث اميال صنعوا
والباع اربع اذرع تتببع
من بعدها العشرون ثم الاصبغ
متها الى بطن لاخرى توضع
من شعر بقل ليس فہا مدقع
اقول فتحصل من هذا اكله ان ما فقله الزيلعي هو المعول انتهى

کلام الرملی ملخصاً (حاشیہ بحوالہ رائق ص ۴۱ ج ۱)

و ذکر هذا اكله مولانا عبدالحی الکنہوی فی السعایة مفصلاً و
اختار ما ذکرنا فی تحقیق الدیل (سعایة ص ۲۹۲)

اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ میل کے بارہ میں قول مختار فقہائے کرام کا یہ ہے کہ چوبیس
انگشت کے گز سے چار ہزار گز کا ایک میل ہے تو انگریزی گز سے دو ہزار گز کا میل
شرعی ہوا۔ کیونکہ ۲۴ انگشت کا ذراع ایک ہاتھ یعنی ڈیڑھ فٹ یا اٹھارہ انچ کا ہے
جیسا کہ ذراع کی تحقیق میں بحوالہ چکر دتی گز رگیا ہے۔

انگریزی میل اور شرعی میل میں فرق

انگریزی میل حسب تصریح چکر دتی آٹھ فرلانگ کا ہوتا ہے اور ہر فرلانگ دو سو^{۲۲}
بیس گز تو انگریزی میل سترہ سو ساٹھ گز کا ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ شرعی میل انگریزی میل سے
دو سو چالیس گز بڑا ہے۔

فسرخ :- بفتح فار و سکون راء و فتح سین۔ عین میل کی مسافت کا نام ہے۔
جیسا کہ عبارات میں گز رگیا۔

برید :- چار فرسخ یا بارہ میل کی مسافت کو کہا جاتا ہے اور نہایت میں ابن اثیر
نے فرمایا ہے کہ یہ لفظ دراصل فارسی بریدہ دم کا مختصر ہے کیوں کہ ڈاک لے جانے

کے لئے بریدہ دم پھر استعمال کئے جاتے تھے۔ مختصر کر کے برید کہنے لگے۔ پھر اس کے سوار کو بھی برید کہا جانے لگا یہاں تک کہ ایک سوار کی مقررہ مسافت کا بھی برید نام ہو گیا۔

مسافتِ سفر کی تحقیق

سفر شرعی کی مسافت کی تعین میں صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے مذاہب مختلف ہیں جن کی تفصیل عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری وغیرہ میں مذکور ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کی بھی اس بارہ میں روایات مختلف ہیں مگر راجح اور صحیح مذہب امام اعظمؒ کا یہ ہے کہ کسی خاص مقدار کی تحدید میلوں وغیرہ سے نہ کی جاوے بلکہ تین دن اور تین رات میں جس قدر مسافت انسان پیدل چل کر یا سانی طے کر سکے یا اونٹ کی سواری پر یا سانی طے کرے وہ مقدار مسافت سفر شرعی ہے۔ اور حسب تصریح ابن ہمام بلوہ کی سواری کا بھی یہی حکم ہے۔ اور حسب تصریح بحر الرائق اونٹ سے بھی قافلہ کا اونٹ مراد ہے تیز رو سانڈنی مراد نہیں۔

اور تین دن تین رات کا یہ مطلب نہیں کہ دن رات چلے بلکہ مراد صرف دن میں چلنا ہے اور وہ بھی پورے دن چلنا نہیں بلکہ جس قدر عادتاً متوسط قوت کا آدمی یا سانی چل سکتا ہے جس کو بعض فقہاء نے صبح سے زوال آفتاب تک مقدر فرمایا ہے۔

(کا ذکرہ الشامی و مشکہ فی البحر ص ۱۴۰ ج ۱)

اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے سفر شرعی کی مسافت تین منزل قرار دی ہے۔ صاحب ہدایہ اس کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ اس روایت کا حاصل بھی تقریباً وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا یعنی تین دن کی مسافت اس کے بعد فرمایا۔

ولا معتبر بالفراسخ هو الصحیح
یعنی فرسخ اور میلوں کی تعین کا کوئی اعتبار
نہیں صحیح مذہب یہی ہے

اسی لئے عام متون و شروح میں جمہور مشائخ حنفیہ کا مختار یہی ہے کہ میلوں کی تعیین نہ کی جاوے۔

فتح القدير، عمدة القاری، البحر الرائق، شامی، در مختار وغیرہ سب کا اسی پر اتفاق ہے۔ اس کے خلاف بعض فقہاء نے فراسخ یا میلوں کی تعیین بھی فرمائی ہے۔ حضرت امام مالکؒ کا مذہب ہے کہ ۴۸ میل سے کم میں قصر نہ کرے اور یہی امام احمدؒ کا مذہب ہے۔ اور امام شافعی سے بھی ایک روایت یہی ہے (عمدة القاری ص ۵۳۱ ج ۳) اور مشائخ حنفیہ میں سے بعض نے اکیس فرسخ جس کے ترسیٹھ میل ہوتے ہیں بعض نے اٹھارہ فرسخ جس کے چوٹھن میل ہوتے ہیں۔ اور بعض نے پندرہ فرسخ جس کے پینتالیس میل ہوتے ہیں مسافت قصر قرار دی۔ عمدة القاری میں اٹھارہ فرسخ کے قول پر فتویٰ نقل کیا ہے۔ اور البحر الرائق میں بھی بحوالہ نہایت اسی قول پر فتویٰ نقل کیا ہے۔ اور شامی اور بحر نے بحوالہ مجتبیٰ اکثر ائمہ خوارج کا فتویٰ پندرہ فرسخ کی روایت پر ذکر کیا ہے (بحر ص ۴۴۰ ج ۱)

اور شیخ محقق ابن ہمام نے شرح ہدایہ میں میلوں کی تعیین معتبر نہ ہونے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ تین دن تین رات کی مسافت جو اصل مذہب ہے وہ راستوں کے اختلاف سے مختلف ہو سکتی ہے کیوں کہ صاف راستہ میں اگر انسان ایک دن میں سولہ میل چل سکتا ہے تو دشوار گزار راستہ میں بارہ میل مشکل طے ہوتے ہیں اور پہاڑی راستوں میں تو آٹھ دس میل بھی طے کرنا مشکل ہوتا ہے اس لئے میلوں کی تعیین مناسب نہیں بلکہ جیسا راستہ ہو اُس کے انداز سے جس قدر میل آسانی تین دن میں پیادہ طے ہو سکیں وہی مسافت قصر ہے (فتح القدير ص ۳۹۴ ج ۱)

لیکن ہندوستان کے عام بلاد میں چونکہ راستے تقریباً مساوی ہیں پہاڑی یا دشوار گزار نہیں ہیں اس لئے علماء ہندوستان نے میلوں کے ساتھ تعیین کر دی ہے۔ پھر جن حضرات فقہاء نے میلوں یا فراسخ کے ساتھ مسافت قصر کی تعیین فرمائی ہے ان میں مختلف اقوال ہیں جو اوپر مذکور ہوئے اس لئے محققین علماء ہندوستان نے

۴۸ میل انگریزی کو مسافت قصر قرار دے دیا ہے جو اقوال فقہاء مذکورین کے قریب قریب ہے۔ اور اصل مدار اس کا اسی پر ہے کہ اتنی ہی مسافت تین دن تین رات میں پیادہ مسافر باسانی طے کر سکتا ہے اور فقہاء حنفیہ کے مفتی بہ اقوال میں سے جو فتویٰ امڈ خوارزم کا پندرہ فرسخ کا نقل کیا گیا ہے وہ تقریباً اس کے بالکل مطابق ہے کیونکہ پندرہ فرسخ کے ۴۵ میل شرعی ہوتے ہیں اور شرعی میل انگریزی میل سے دو سو چالیس گز بڑا ہوتا ہے۔ تو ۴۵ میل شرعی ۴۸ میل انگریزی سے کچھ زیادہ متفاوت نہیں رہتے۔

اور ۴۸ میل کی تعیین پر ایک حدیث سے بھی استدلال کیا گیا ہے جو دارقطنی نے حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
یا اهل مكة لا تقصروا الصلاة
اے اہل مکہ چار برید سے کم میں نماز
فی ادق من اربعة بود من مكة الى
کا قصر مت کرو جیسے مکہ سے عسفان
عسفان رعمدة القاری ص ۵۲۱ ج ۱، تک۔

وذکرہ ابن اثیر فی التہایة

اس روایت کی سند میں اگرچہ ایک راوی ضعیف ہے (کہا ذکرہ یعنی تاہم چوں کہ مدار اصل مذہب کا تین دن کی مسافت پر ہے اس کو محض تائید کے لئے پیش کیا گیا ہے اور تائید میں ضعیف حدیث بھی کافی ہے اس لئے استدلال میں کوئی مضائقہ نہیں۔
امام العلماء حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ نے ایک استفتاء کے جواب میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کی بعینہ نقل یہ ہے۔

سوال :- کتنی مسافت سفر میں نماز قصر کرنا چاہئے حسب احادیث صحیحہ؟
الجواب :- چار برید جس کی سولہ سولہ میل کی تین منزل ہوتی ہیں۔ حدیث مؤطا، مالک سے ثابت ہوتی ہیں مگر مقدار میل کی مختلف ہے۔ لہذا تین منزل جامع سب اقوال کو ہو جاتی ہیں فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔
رشید احمد عفی عنہ

سوال :- فرسخ اور میل کی تحدید معتبر کیا ہے؟
الجواب :- فرسخ تین میل کا اور میل چار ہزار قدم کا لکھتے ہیں۔ مگر یہ سب تقریبی امور

ہیں۔ اصل میں اس مسافت کا نام ہے کہ نظر میسر کرے۔ اور یہ بھی مختلف ہے وقت اور محس اور رائی (دیکھنے والے) کے اعتبار سے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

رشید احمد عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ حصہ اول ص ۲۵)

الغرض مذہب مختار کے مطابق مسافت قصرین منزل یا ۴۸ میل انگریزی ہیں۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

خلاصہ اس تمام ضمیمہ کا بصورت جدول یہ ہے

کیفیت	پیمائش ہندی	نمایمانہ عربی
اصل میں ۱۰۲۴ انگشت یا ایک ہاتھ ہے جس کی پیمائش ڈیڑھ فٹ ہوتی ہے۔	ڈیڑھ فٹ یا اٹھارہ انچ	ذراع شرعی
کما مر تحقیق	ایک میل انگریزی اور ۲۴۰ گز	میل شرعی
کما مر	۳ میل انگریزی اور ۲۰ گز یا ۳ میل شرعی	فرسخ
	۱۲ میل انگریزی	برید

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین و بہ فی الاول و الآخر

نستعین و هو نعم الوکیل و نعم المعین۔

بندہ
محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۴ ذیقعدہ ۱۳۶۱ھ

تصدیقات علماء کرام

تقریظ و تصدیق از سیدی و سندی حضرت حکیم الامتہ مجدد الملتہ تھانوی قدس سرہ

بعد الحمد والصلوة - احقر اشرف علی عفی عنہ نے رسالہ اوزان شرعیہ کو بالاستیعاب دیکھا فقدان قوت و نقصان وقت کے سبب ماخذ و مبانی پر پوری تطبیق سے تو معذور رہا لیکن بقول شاعر عربی و عارف پارسی سے سبوح لہا منہا علیہا شواہد و آفتاب آمد دلیل آفتاب الخ - خود رسالہ اپنی صحت و صدق کی شہادت کا کفیل ہے جس کی بناء پر عین مطالعہ کے وقت بے ساختہ اس کا لقب ارجح الاقوال فی اصح الموازین و المکائیل قلب پر وارد ہوا حق تعالیٰ سے اس کی مقبولیت اور تاقیبت کی دعا کرتا ہوں فقط و هذا الثاني من ذي الحجة سنة ۱۳۱۶ھ فی الخاتمة الامدادیة من تہانہ بہون صینت ابد الزمن من الشرور الفتن -

تقریظ و تصدیق از شیخ التفسیر والحديث حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مدظلہم

سابق صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند

برادر محترم جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا یہ رسالہ میں نے پڑھا ہے حد مخطوطہ و مستفید ہوا۔ اس قدر تحقیق و کاوش آپ ہی کا حصہ تھا حق تعالیٰ جزائیں دے۔ مجھے اس کے مضمون سے اتفاق ہے۔
شبیر احمد عثمانی - ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۱۶ھ

تصدیقات علماء مظاہر علوم سہارنپور

الحمد و حمد و الصلوة والسلام علی من لا نبی بعدہ

میں بھی رسالہ ”ارجح الاقوال“ کے مطالعہ سے مشرف ہوا۔ مفتی صاحب کی تحقیق میرے نزدیک صحیح اور اکثر علماء ہندوستان کی تشریحات کے مطابق ہے۔

۱۳۵۶ ہجری میں حیدرآباد دکن سے ایک صاحب نے مفتی حیدرآباد دکن اور مفتی دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ کا خلاصہ تحقیق صاع کے متعلق لکھ کر بھیجا تھا اور ہم سے رائے طلب کی تھی۔ ہم نے اس وقت بھی مفتی دارالعلوم دیوبند کی تصویب کرتے ہوئے مفتی حیدرآباد کی تحقیق سے اختلاف کیا تھا۔ اب بھی ہمارے نزدیک "رسالہ" ازجہ الاقوال میں صاع و نصاب کی جو تحقیق کی گئی ہے علماء حیدرآباد کو اس مسئلہ پر دوبارہ غور کرنا چاہئے اور اپنی تحقیقات کو شائع کرنا چاہئے۔

سعید احمد غفرلہ

خادم دارالافتاء مظاہر علوم سہارن پور

۳ محرم الحرام ۱۳۶۲ھ

بندہ ضعیف عبد اللطیف ناظم و خادم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبند کی رائے اور تحقیق کو صحیح اور ارجح سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ مفتی صاحب موصوف کو جزائے خیر دے۔

۳ صفر ۱۳۶۲ ہجری

حامداً ومصلياً ومسلماً۔ اما بعد، احقر رسالہ البحر الاقوال فی أحكام الموازين المکاتیل (مولفہ محترم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) دیکھ کر بے حد مسرور ہوا۔ حضرت مؤلف دام مجده نے تحقیق و تدقیق محنت و تفتیش کے ساتھ اس رسالہ کی تصنیف سے مسلمانوں کی شدید ضرورت کو پورا کیا۔ بحمدہ اللہ تعالیٰ عنی وعن سائر المستفیدین احسن الجزاء اللہ تعالیٰ اس سعی و محنت کو قبول فرمائے۔

بندہ ناکارہ عبدالرحمن غفرلہ

خادم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور ۳ محرم ۱۳۶۲ھ

تقریب و تصدیق از حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی از دارالمصنفین اعظم گڑھ

رسالہ مقادیر شرعیہ نظر سے گزر ا بڑی ضروری تحقیق فرمائی۔ آپ اجازت دیں تو اس کی تلخیص

معارف میں شائع کر دوں۔ میں خود اس میں بہت متروک تھا مگر چونکہ حساب سے مجھے فطرہ لگاؤ نہیں۔ اس لئے کبھی ادھر اور کبھی ادھر میلان ہوتا تھا۔ مولانا سبحان صاحب مرحوم کی بھی تحقیق مولانا عبدالحی صاحب فرنی محل سے مختلف تھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے۔

والسلام !

سید سلیمان

۲۳ فروری ۱۹۴۳ء -

تقریظ از حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی دامت برکاتہم

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى وبعد فقد تشرفت بطالعة الرسالة المباركة الملقبة بارجح الاقاويل في اصم الموازين والمكائيل "لمجبي وحبیبى الفاضل المقدام الفقيه العلامة مولانا محمد شفيح الديوبندى المفتى باجل مدارس الاسلام فسرت بهامسة من رأى هلال العيد - ووجدت بها وجد من ادرك الفقيه - فله دره من محقق قداقى بما لا يحتمل المتزيد من تحقيق انيق - ومن مصيب قداوق لا يستغنى اج الدرد من لجة بحر عميق ، لا زال مشغولاً برعاية الحق واعانة التوفيق والله خير موفى له ومعين وصلى الله على سيد المرسلين خاتم النبيين سيدنا النبي محمد وعلى آله

واصحابه اجمعين -

وانا الفقير الى الله الصمد

عبد المذنب لطف احمد

العثمانى التهانوى عفا عن ربنا القوي

۳ محرم ۱۳۶۲ھ

مکتوب جناب عبدالرشید صاحب مدرس مدرسہ الہیہ مہوپال تقریراً

جناب مکرم و محترم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

”المفتی“ جلد ۸ کا نمبر ۸ پہنچا اس میں مقادیر شریعہ کی جو جواب تحقیق کی گئی ہے اس پر میں کہاں تک آپ کو دعائیں دوں۔

اللہ تعالیٰ آپ کی عمر و علم و عمل میں بہت ہی بہت برکت فرمائے۔ آمین ثم آمین ! میں مولانا قرنگی محلی مرحوم و مغفور سے بہت زیادہ حُسنِ ظن و حُسن و عقیدت رکھتا ہوں اس لئے عقیدۃً اُن کی تحقیق کو ارجح و اقوی سمجھے ہوئے تھا لیکن خدا جانے کیوں عمل ہمیشہ جمہور علماء کے فتویٰ و مسلک کے موافق رہا۔ مسئلہ ہمیشہ اُسی پرانے مسلک کے موافق بتاتا رہا۔ مرحوم و مغفور کی تحقیق پر اتنا اعتماد تھا کہ کبھی مزید تحقیق کی ضرورت ہی نہیں سمجھی، اب آپ کی اس تحقیق کو دیکھ کر آنکھیں کھلیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اُس نے غلطی سے زبردستی بچائے رکھا۔ اب اس وقت مجھے مولانا تھانوی و حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مدظلہما اور آپ پر بہت اعتماد ہے۔ ان میں سے آپ سے کسی قدر بے تکلف بھی ہو گیا ہوں اس لئے عرض کرتا ہوں کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کا رسالہ حقوق الزوجین بھی ملاحظہ فرما کر اُس پر بھی ایک بسیط تبصرہ تحریر فرمائیں۔ مجھے اُن کی رائے کچھ صحیح و درست معلوم ہوتی ہے۔ غالباً یہ رسالہ دیوبند میں دستیاب ہو جائے گا۔ ورنہ دفتر ترجمان القرآن سے منگوا لیجئے۔

المفتی کے بند ہونے کا رنج و قلق اس کے دوبارہ جاری ہونے تک باقی رہے گا۔ میں اگر کسی قابل ہوتا تو اس نقصان میں کوئی حصہ اپنے ذمہ لیتا مگر یہ تو مجھ سے کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ میں بقیہ چندہ کو فی الواقع باقی سمجھ کر اُس کی واپسی چاہوں میسر نہ دیک ہر خریدار پر آپ کا فاضل ہے اس لئے میری طرف سے تو آپ بالکل بے فکر و مطمئن رہیں۔ میں نہ نقدی چاہوں نہ کتاب۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو آنکھیں دے کہ وہ علماء کے اخلاص و دیانت کو دیکھیں اور اس سے
سبق لیں۔ فقط

اضعت العباد

مسکین عبد الرشید عقی عنہ

سابق، مدرس مدرسہ سلیمانہ حال مدرس مدرسہ الہیہ بھوپال

سہ شنبہ، ۲ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ، ۵ جنوری ۱۹۴۲ء

از مولانا عبد الماجد صاحب مدیر "صدق" لکھنؤ

ارجح الاقادیل فی اصح الموازین و المکائیل۔ از مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
دیوبندی۔ ۲۴ صفحے خود مصنف ہی کے پاس سے دیوبند ضلع سہارن پور کے پتے سے
غالباً ٹکٹ بھیجنے پر مل جائے۔

کتاب شریعت کے باب الاحکام میں حوالے مختلف مقداروں اور پیمانوں کے ملتے
ہیں۔ مثلاً زکوٰۃ میں سونے چاندی کا نصاب، صدقہ فطر میں صاع کا وزن، سفر شرعی میں مسافت
وغیرہ۔ اور اس باب میں فقہاء علماء ہند نے بڑی کوشش و کاوش سے ہندی وزن و پیمانے
درج کئے ہیں۔ لیکن بشری تحقیق مسامحت سے کہاں خالی رہ سکتی ہے۔ بعض اقوال میں باہم اختلاف
بھی ملتا ہے۔ اب مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی نے از برنوان مسائل کو اپنا موضوع تحقیق
بنایا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ سعی و کاوش کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کی تحقیق کی
تصدیق پر تو حضرت مولانا تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے جید علماء کی مہر ثبت
ہیں۔ باقی جہاں تک تدقیق و موثکافی کا تعلق ہے اس کا اندازہ تو ہم عامیوں کو بھی ہو سکتا
ہے اور اس کی داد دل سے بے ساختہ نکلتی ہے۔ رشک کے ساتھ حیرت ہوتی ہے کہ اس
دور میں بھی ایسے ایسے عنوانات پر اس درجہ تحقیق کر ڈالنے والے موجود ہیں۔

کتابت ہوئی ہے، اس کی تائید کے لئے اس کے ساتھ ایک اور کتاب لکھی گئی ہے۔
اس کتاب میں اس کے بارے میں مزید تفصیلات دی گئی ہیں۔

اس کتاب کی تائید کے لئے ایک اور کتاب لکھی گئی ہے۔

اس کتاب میں اس کے بارے میں مزید تفصیلات دی گئی ہیں۔

اس کتاب کی تائید کے لئے ایک اور کتاب لکھی گئی ہے۔

اس کتاب میں اس کے بارے میں مزید تفصیلات دی گئی ہیں۔

اس کتاب کی تائید کے لئے ایک اور کتاب لکھی گئی ہے۔

اس کتاب میں اس کے بارے میں مزید تفصیلات دی گئی ہیں۔

اس کتاب کی تائید کے لئے ایک اور کتاب لکھی گئی ہے۔

اس کتاب میں اس کے بارے میں مزید تفصیلات دی گئی ہیں۔

اس کتاب کی تائید کے لئے ایک اور کتاب لکھی گئی ہے۔

اس کتاب میں اس کے بارے میں مزید تفصیلات دی گئی ہیں۔

اس کتاب کی تائید کے لئے ایک اور کتاب لکھی گئی ہے۔

اس کتاب میں اس کے بارے میں مزید تفصیلات دی گئی ہیں۔

اس کتاب کی تائید کے لئے ایک اور کتاب لکھی گئی ہے۔

اس کتاب میں اس کے بارے میں مزید تفصیلات دی گئی ہیں۔

اس کتاب کی تائید کے لئے ایک اور کتاب لکھی گئی ہے۔

اس کتاب میں اس کے بارے میں مزید تفصیلات دی گئی ہیں۔

اس کتاب کی تائید کے لئے ایک اور کتاب لکھی گئی ہے۔

اس کتاب میں اس کے بارے میں مزید تفصیلات دی گئی ہیں۔

اس کتاب کی تائید کے لئے ایک اور کتاب لکھی گئی ہے۔

اس کتاب میں اس کے بارے میں مزید تفصیلات دی گئی ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عشرہ ذی الحجہ کے فضائل | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے عشرہ ذی الحجہ سے بہتر کوئی زمانہ نہیں۔ ان میں ایک دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر اور ایک رات میں عبادت کرنا شب قدر کی عبادت کے برابر ہے (ترمذی وابن ماجہ)

قرآن مجید سورہ والفجر میں اللہ تعالیٰ نے دس راتوں کی قسم کھائی ہے، وہ دس راتیں جمہور کے قول میں یہی عشرہ ذی الحجہ کی راتیں ہیں، خصوصاً نویں تاریخ یعنی عرفہ کا دن، اور عرفہ اور عید کی درمیانی رات ان تمام ایام میں بھی خاص فضیلت رکھتے ہیں، عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنا ایک سال گزشتہ اور ایک سال آئندہ کا کفارہ ہے اور عید کی رات میں بیدار رہ کر عبادت میں مشغول رہنا بہت بڑی فضیلت اور ثواب کا موجب ہے۔

تکبیر تشریح | اللّٰهُ اَكْبَرُ۔ اللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ
اللّٰهُ اَكْبَرُ وَبِاللّٰهِ الْحَمْدُ۔ عرفہ یعنی نویں تاریخ کی صبح سے تیرھویں تاریخ کی عصر تک ہر نماز کے بعد باواز بلند ایک مرتبہ یہ تکبیر پڑھنا واجب ہے۔ سنتویں اس پر ہے کہ باجماعت نماز پڑھنے والے اور تنہا پڑھنے والے اس میں برابر ہیں، اسی طرح مرد و عورت دونوں پر واجب ہے البتہ عورت باواز بلند تکبیر نہ کہے آہستہ کے (شامی)

تنبیہ | اس تکبیر کا متوسط بلند آواز سے کہنا ضروری ہے بہت سے لوگ اس میں غفلت کرتے ہیں، پڑھتے ہی نہیں؟ یا آہستہ پڑھ لیتے ہیں، اس کی اصلاح ضروری ہے۔

نمازِ عید | عید الاضحیٰ کے روز یہ چیزیں مسنون ہیں صبح کو سویرے اٹھنا، غسل و مسواک کرنا، پاک، صاف، عمدہ کپڑے پہننا، خوشبو لگانا، عید کی نماز سے پہلے کچھ نہ کھانا۔ عید گاہ کو جاتے ہوئے تکبیر مذکور الصدر باواز بلند پڑھنا۔ نماز عید دو رکعت ہیں، مثل دوسری نمازوں کے فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں ہر رکعت کے اندر تین تین تکبیریں زائد ہیں۔

پہلی رکعت میں **سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ** الخ پڑھنے کے بعد قرأت سے پہلے اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد رکوع سے پہلے ان زائد تکبیروں میں کانوں تک ہاتھ اٹھانا چاہیے۔ پہلی رکعت میں دو تکبیروں کے بعد ہاتھ چھوڑ دیں، تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لیں۔ دوسری رکعت میں تینوں تکبیروں کے بعد ہاتھ چھوڑ دینے جائیں، چوتھی تکبیر کے ساتھ رکوع میں چلے جائیں۔ نماز عید کے بعد خطبہ سننا سنت ہے۔

قربانی | قربانی ایک اہم عبادت ہے اور شعائر اسلام میں سے ہے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی اس کو عبادت سمجھا جاتا تھا، مگر بتوں کے نام پر قربانی کرتے تھے۔ اسی طرح آج تک بھی دوسرے مذاہب میں قربانی مذہبی رسم کے طور پر ادا کی جاتی ہے، بتوں کے نام پر یا مسیح کے نام پر قربانی کرتے ہیں۔ سورہ **إِنَّا عَطَيْنَاكَ** میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ جس طرح نماز اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی، قربانی بھی اسی کے نام پر ہونی چاہیے (**فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ**) کا یہی مفہوم ہے۔ دوسری ایک آیت میں اسی مفہوم کو دوسرے عنوان سے اس طرح بیان فرمایا ہے **إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ**۔ (تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد ہجرت دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا، ہر سال برابر قربانی کرتے تھے جس سے معلوم ہوا کہ قربانی صرف مکہ معظمہ کے لئے مخصوص نہیں، ہر شخص پر ہر شہر میں بعد تحقق شرائط واجب ہے (ترمذی) اور مسلمانوں کو اس کی

تاکید فرماتے تھے۔ اسی لئے جمہورِ اسلام کے نزدیک قربانی واجب ہے (شامی) قربانی کس پر واجب ہوتی ہے؟ | قربانی ہر مسلمان عاقل، بالغ مقیم پر واجب ہوتی ہے جس کی ملک میں ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کی قیمت کا مال اس کی حاجاتِ اصلیہ سے زائد موجود ہو۔ یہ مال خواہ سونا، چاندی یا اس کے زیورات ہوں یا مالِ تجارت یا ضرورت سے زائد گھریلو سامان یا مسکوٰۃ مکان سے زائد کوئی مکان وغیرہ ہو (شامی)

قربانی کے معاہدہ میں اس مال پر سال بھر گزارنا بھی شرط نہیں، بچہ اور مجنون کی ملک میں اگر اتنا مال ہو جو بھی اس پر اس کی طرف سے اس کے دلی پر قربانی واجب نہیں، اسی طرح جو شخص شرعی قاعدے کے موافق مسافر ہو اس پر بھی قربانی لازم نہیں (شامی)

مسئلہ: جس شخص پر قربانی واجب نہ تھی، اگر اس نے قربانی کی نیت سے کوئی جانور خرید لیا تو اس کی قربانی واجب ہوگئی (شامی) قربانی کے دن | قربانی کی عبادت صرف تین دن کے ساتھ مخصوص ہے دوسرے دنوں میں قربانی کی کوئی عبادت نہیں، قربانی کے دن ذی الحجہ کی دسویں، گیارھویں اور بارھویں تاریخیں ہیں، اس میں جب چاہے قربانی کر سکتا ہے، البتہ پہلے دن کرنا افضل ہے۔

قربانی کے بدلے میں صدقہ و خیرات | اگر قربانی کے دن گزر گئے، ناواقفیت یا غفلت یا کسی عذر سے قربانی نہیں کر سکا تو قربانی کی قیمت فقراء و مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے لیکن قربانی کے تین دنوں میں جانوروں کی قیمت صدقہ کر دینے سے یہ واجب ادا نہ ہوگا۔ ہمیشہ گناہگار رہے گا کیونکہ قربانی ایک مستقل عبادت ہے جیسے نماز پڑھنے سے روزہ اور روزہ رکھنے سے نماز ادا نہیں ہوتی، زکوٰۃ ادا کرنے سے حج ادا نہیں ہوتا، ایسے ہی صدقہ خیرات کرنے سے قربانی ادا نہیں ہوتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور تعامل اور پھر تعامل صحابہؓ شاہد ہیں۔

قربانی کا وقت | جن بستیوں یا شہروں میں نماز جمعہ و عیدین جائز ہے۔ وہاں نماز عید سے پہلے قربانی جائز نہیں، اگر کسی نے نماز سے پہلے قربانی کر دی تو اس پر دوبارہ قربانی لازم ہے، البتہ چھوٹے گاؤں جہاں جمعہ و عیدین کی نمازیں نہیں ہوتیں، یہ لوگ دسویں تاریخ کی صبح صادق کے بعد قربانی کر سکتے ہیں؛ ایسے ہی اگر کسی عذر کی وجہ سے نماز عید پہلے دن نہ ہو سکے تو نماز عید کا وقت گزر جانے کے بعد قربانی درست ہے۔
(در مختار)

مسئلہ :- قربانی رات کو بھی جائز ہے، مگر بہتر نہیں (شامی)
قربانی کے جانور | بکرا، دنبہ، بھیرٹ، ایک ہی شخص کی طرف سے قربانی کیا جاسکتا ہے، گائے، بیل، بھینس، اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے ایک کافی ہے بشرطیکہ سب کی نیت ثواب کی ہو، کسی کی نیت محض گوشت کھانے کی نہ ہو۔
مسئلہ :- بکرا، بکری ایک سال کا پورا ہونا ضروری ہے، بھیرٹ اور دنبہ اگر اتنا سر بہ اور تیار ہو کہ دیکھنے میں سال بھر کا معلوم ہو تو وہ بھی جائز ہے، گائے، بیل بھینس دو سال کی، اونٹ پانچ سال کا ہونا ضروری ہے، ان عمروں سے کم کے جانور قربانی کے لئے کافی نہیں۔

مسئلہ :- اگر جانوروں کا فروخت کرنے والا پوری عمر تبتا ہے اور ظاہری حالات سے اس کے بیان کی تکذیب نہیں ہوتی تو اس پر اعتماد کرنا جائز ہے۔
مسئلہ :- جس جانور کے سینگ پیدائشی طور پر نہ ہوں یا بچ میں سے ٹوٹ گیا ہو اس کی قربانی ہے، ہاں سینگ جڑ سے اکھر گیا ہو جس کا اثر دماغ پر ہونا لازم ہے تو اس کی قربانی درست نہیں (شامی)

مسئلہ :- خسی (بدھیا) بکرے کی قربانی جائز بلکہ افضل ہے (شامی)
مسئلہ :- اندھے، کانے، لنگڑے جانور کی قربانی درست نہیں، اسی طرح ایسا مریض اور لاغر جانور جو قربانی کی جگہ تک اپنے پیروں نہ جاسکے، اس کی قربانی بھی جائز نہیں ہے۔

مسئلہ :- جس جانور کا تہائی سے زیادہ کان یا دم وغیرہ کٹی ہوئی ہو اس کی قربانی جائز نہیں (شامی)

مسئلہ :- جس جانور کے دانت بالکل نہ ہوں، یا اکثر نہ ہوں اس کی قربانی جائز نہیں (شامی، درمختار) اسی طرح جس جانور کے کان پیدائشی طور پر بالکل نہ ہوں اس کی قربانی درست نہیں۔

مسئلہ :- اگر جانور صحیح سالم خرید اٹھا۔ پھر اس میں کوئی عیب مانع قربانی پیدا ہو گیا تو اگر خریدنے والا غنی صاحب نصاب نہیں ہے تو اس کے لئے اس عیب دار جانور کی قربانی جائز ہے اور اگر یہ شخص غنی صاحب نصاب ہے تو اس پر لازم ہے کہ اس جانور کے بدلے دوسرے جانور کی قربانی کرے (درمختار وغیرہ)

قربانی کا مستنون طریقہ اپنی و تبرانی کو خود اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا افضل ہے اگر خود ذبح کرنا نہیں جانتا تو دوسرے سے ذبح کرا سکتا ہے، مگر ذبح کے وقت وہاں خود بھی حاضر رہنا افضل ہے۔

مسئلہ :- قربانی کی نیت صرف دل سے کرنا کافی ہے، زبان سے کہنا ضروری

نہیں، البتہ ذبح کرنے کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہنا ضروری ہے سنت ہے کہ جب جانور کو ذبح کرنے کے لئے رو بہ قبلہ ٹٹائے تو یہ آیت پڑھے
اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ قَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَحَیٰاِیَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
اور ذبح کرنے کے بعد یہ دعا پڑھے اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْهُ مِنِّیْ کَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِیْبِكَ مُحَمَّدٍ وَحَلِیْلِکَ اِبْرٰهَیْمَ عَلَیْهِمَا السَّلَامُ

آداب قربانی | قربانی کے جانور کو چند روز پہلے سے پالنا افضل ہے۔

مسئلہ :- قربانی کے جانور کا دودھ نکالنا اس کے بال کاٹنا جائز نہیں اگر کسی نے ایسا کر لیا تو دودھ اور بال یا ان کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے (بدائع)

مسئلہ :- قربانی سے پہلے چھری کو خوب تیز کرے اور ایک جانور کو دوسرے

جانور کے سامنے ذبح نہ کرے، اور ذبح کے بعد کھال اتارنے اور گوشت کے ٹکڑے کرنے میں جلدی نہ کرے۔ جب تک پوری طرح جانور ٹھنڈا نہ ہو جائے۔

متفرق مسائل

عید کی نماز سے پہلے قربانی کرنا جائز نہیں لیکن جس شہر میں کسی جگہ نماز عید ہوتی ہو تو شہر میں کسی جگہ بھی نماز عید ہو گئی تو پورے شہر میں قربانی جائز ہو جاتی ہے (بدائع) مسئلہ :- قربانی کے جانور کے اگر ذبح سے پہلے سچے پیدا ہو گیا یا ذبح کے وقت اس کے پیٹ سے زندہ بچ نکل آیا تو اس کو بھی ذبح کر دینا چاہیے (بدائع) جس شخص پر قربانی واجب تھی اگر اس نے قربانی کا جانور خرید لیا، پھر وہ گم ہو گیا یا چوری ہو گیا یا مر گیا تو واجب ہے کہ اس کی جگہ دوسری قربانی کرے۔ اگر دوسری قربانی کے بعد پہلا جانور مل جائے تو بہتر یہ ہے کہ اس کی بھی قربانی کر دے لیکن اس کی قربانی اس پر واجب نہیں، اگر یہ شخص غریب ہے جس پر پہلے سے قربانی واجب نہ تھی، نقلی طور پر اس نے قربانی کے لئے جانور خرید لیا۔ پھر وہ مر گیا یا گم ہو گیا تو اس کے ذمہ دوسری قربانی واجب نہیں۔ ہاں اگر گم شدہ جانور قربانی کے دنوں میں مل جائے تو اس کی قربانی کرنا واجب ہے اور آیام قربانی کے بعد ملے تو اس جانور یا اس کی قیمت کا سدقہ کرنا واجب ہے (بدائع)

قربانی کا گوشت ۱۔ جس جانور میں کئی حصہ دار ہوں تو گوشت وزن کر کے تقسیم کیا جائے، اندازہ سے تقسیم نہ کریں۔

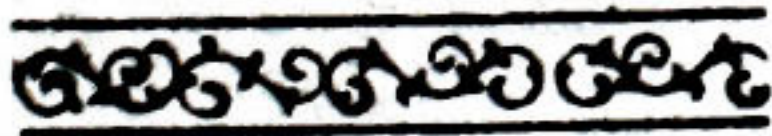
۲۔ افضل یہ ہے کہ قربانی کا گوشت تین حصے کر کے ایک حصہ اپنے اہل و عیال کے لئے رکھے، ایک حصہ اہل و عیال میں تقسیم کرے ایک حصہ فقراء و مساکین میں تقسیم کرے اور جس شخص کا عیال زیادہ ہو وہ تمام گوشت خود بھی رکھ سکتا ہے۔

- ۳ — قربانی کا گوشت فروخت کرنا حرام ہے۔
 ۴ — ذبح کرنے والے کی اجرت میں گوشت یا کھال دینا جائز نہیں۔
 اجرت علیحدہ دینی چاہیے۔

قربانی کی کھال | ۱ — قربانی کی کھال کو اپنے استعمال میں لانا، مثلاً مصلیٰ بنا لیا جائے، یا چمڑے کی کوئی چیز ڈول وغیرہ بنوایا جائے، یہ جائز ہے، لیکن اگر اس کو فروخت کیا تو اس کی قیمت اپنے خرچ میں لانا جائز نہیں۔ بلکہ صدقہ کرنا اس کا واجب ہے اور قربانی کی کھال کو فروخت کرنا بدو نیت صدقہ کے جائز بھی نہیں۔
 (عالمگیری)

- ۲ — قربانی کی کھال کسی خدمت کے معاوضے میں دینا جائز نہیں، اسی لئے مسجد کے مؤذن یا امام وغیرہ کے حق الخدمت کے طور پر ان کو کھال دینا درست نہیں۔
 ۳ — مدارس اسلامیہ کے غریب اور نادار طلباء ان کھالوں کا بہترین مصرف ہیں کہ اس میں صدقہ کا ثواب بھی ہے، اچھے علم وین کی خدمت بھی مگر مدرسین ملازمین کی تنخواہ اس سے دینا جائز نہیں۔

واللہ الموفق والمعين
 بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ کو اچھا



رَافِعُ الشَّارِحِي عَلَيْهِ جُلُودُ الْأَضْرَاحِي

چرم قربانی کے احکام

اشاعت اول - دارالاشاعت بیروت ۱۳۵۰ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ چرم قربانی کے متعلق بعض علماء بریلی فرماتے ہیں کہ قربانی کرنے والا یا بعینہ یا قیمت چرم کا ریشہ میں دینے کی نیت سے بیچ کر مہتمم مدرسہ یا متولی مسجد کو دیدے اور چرم قربانی وصول ہونے کی صورت میں مہتمم و متولی بیچ کر مدرسہ و مسجد میں عزاہ تنخواہ ہو یا غیر تنخواہ صرف کرے سب جائز ہے کیا یہ مسئلہ صحیح ہے اگر نہیں تو مدلل ارشاد فرمایا جاوے تاکہ مخالفت پر حجت قائم ہو سکے اور قوم گمراہی سے محفوظ رہے۔ بینوا توجروا فقط۔

الجواب

(۱) فی العالمگیریتہ یتصدق بجلدھا او یعمل منہ نحو غربال و جراب (الی قولہ) ولا یبیعه بالدرہم لیتفق الدرہم علی نفسہ و عیالہ واللحم بمنزلۃ الجلد فی الصحیح حتی لا یبیعه بما لا ینتفع بہ الا بعد استہلاکہ ولو باعہا بالدرہم لیتصدق بہا جائز لانتہ قریبۃ کا لیتصدق کذا فی

التبيين وهكذا في الهداية والكافي (عالمگیری کتاب الاضحية باب ۷، ص ۲۱۳ ج ۵)۔
 (۲) وفي الهداية لوباع الجلود واللحم بالدراهم او بما لا ينتفع به الا بعد
 استهلاكه تصدق بثمنه لان القرية انتقلت الى يده ص ۲۲۲ ج ۲ وفي حواشي
 الهداية من الكافي - انتقلت القرية اليه فوجب التصدق (۳) وفي
 الدر المختار فان بيع اللحم او الجلد به اي بمستهلك او بداراهم تصدق بثمنه
 ومقاده صحة البيع مع الكراهة واقررة الشامي ص ۲۲۸ ج ۵ (۴) وفي
 البدائع لا يحل بيع جلودها وشحمها ولحمها (الى قوله) من الدراهم والدنانير و
 المأكولات والمشروبات ولا ان يعطى اجر الجزار والذبح منها ما روى عن
 رسول الله صلى الله عليه وسلم انه قال من باع جلود اضحية فلا اضحية له
 (الى قوله) فان باع شيئا من ذلك نفذا يبيعه عند ابي حنيفة ومحمد وعنده
 ابي يوسف لا يتقد لها ذكرنا فيما قبل الذبح ويتصدق بثمنه لان القرية
 ذهبت عنه فيتصدق به ولانها استقادة بسبب محطوره هو البيع فلا يتلو
 عن حيث فكان سبيله التصدق بها الله ص ۲۸۱ ج ۵ (۵) وفي الخلاصة و
 لا باس ببيعه بالدراهم ليتصدقها وليس له ان يبيعه بالدراهم لينفقها
 على نفسه ولو فعل ذلك يتصدق بثمنه (خلاصة الفتاوى ص ۲۲۲ ج ۲) (۶)
 وفي البحر ويأكل من لحم الاضحية ويؤكل ويذبح (الى قوله) ولما جاز ان يأكل
 منه وهو غني فالاولى ان يجوز له الطعام غيره وان كان غنيا انتهى ثم قال ولا
 يبيعه بالدراهم لينفق الدراهم على نفسه وعياله (الى قوله) ولو باعها بالدراهم
 ليتصدقها جاز لان القرية كالتصدق بالجود واللحم وقوله عليه السلام من
 باع جلود اضحية فلا اضحية له يفيد كراهية البيع ولما البيع جائز لوجود
 الملك والقدارة على التسليم (بحر ص ۱۷۸ ج ۸)

عبارات مذکورہ بالا سے قربانی کے چمڑے اور گوشت کے متعلق احکام ذیل ثابت
 ہوئے۔

(الف) گوشت اور چمڑا جب تک خود موجود ہے اس میں قربانی کرنے والے کو تین قسم کے اختیار شرعاً حاصل ہیں۔

(۱) خود کھانا اور استعمال کرنا

(۲) دوسرے اجباب اغنیاء کو کھلانا اور استعمال کرانا۔

(۳) فقراء اور مساکین پر صدقہ کر دینا جیسا کہ عبارت بحر مندرجہ ۶ سے معلوم ہوا

نیز آیت تشرافی میں منصوص ہے فکلوا منها واطعموا البائس الفقیر۔

(ب) اور اگر قربانی کا چمڑا یا گوشت (علی القول المختار) نقد روپیہ کے عوض یا کسی ایسی چیز کے عوض فروخت کر دیا جس سے نفع اٹھانا اس کی اصل کے قائم رہتے ہوئے ممکن نہ ہو جیسے کھانے پینے کی چیزیں تو اس صورت میں صرف تیسری صورت متعین ہو جاتی ہے یعنی صدقہ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ خود کھانا یا اغنیاء کو کھلانا جائز نہیں رہتا۔ خواہ صدقہ کرنے ہی کی نیت سے فروخت کیا ہو یا اپنے کھانے پینے کے لئے۔ بہر حال صدقہ کرنا اس کا واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ تمام عبارات مذکورہ الصدر میں اس کی تصریح ہے بالخصوص عبارت خلاصہ مندرجہ ۵ و عبارت بحر ۶ میں بوضاحت مذکور ہے۔

(ج) یہ بھی معلوم ہوا کہ فروخت کرنا قربانی کے گوشت یا چمڑے کا اگر صدقہ کرنے

کی نیت سے ہو تو جائز ہے اور اگر اپنے کھانے پینے کی غرض سے ہو تو گناہ ہے لیکن بیع صحیح ہو جاتی ہے جیسا کہ ہدایہ اور بدائع میں اس کی تصریح ہے۔ رہا بعض کا یہ شبہ کہ جب گناہ اور ناجائز ہے تو بیع کیسے صحیح ہو جائے گی سو یہ محض عامیانہ شبہ ہے۔ جس شخص کو فقہ حنفی سے کوئی مناسبت ہے وہ ایسا شبہ نہیں کر سکتا کیونکہ فقہ حنفی میں سینکڑوں نظائر اس کے موجود ہیں کہ باوجود فعل ناجائز ہونے کے عقد جائز ہو جاتا ہے جیسے جمعہ کی اذان کے بعد بیع و شراہ ناجائز اور گناہ ہے لیکن اگر کسی نے کر لی باوجود گناہ گار ہونے کے بیع نافذ ہو جاتی ہے اور بیع اس کی ملک میں آجاتی ہے اس کے علاوہ اور سینکڑوں نظائر اس کے فقہ میں موجود ہیں ایسا شبہ وہی کر سکتا ہے جو یا تو فقہ سے بالکل ناواقف ہو یا منکر ہو خلاصہ یہ کہ اگر اپنے استعمال کی نیت سے فروخت کر دیا تو باوجود گناہ گار ہونے کے بیع

نافذ ہو گئی۔ اور صدقہ کرنا اس کی قیمت کا بہرہ و صورت واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ عبارت خلاصہ و بحر مندرجہ نمبر ۵ و نمبر ۶ سے واضح ہو چکا اور اس تفصیل کی بناء پر عبارات فقہار اور حدیث ممانعت بیع کا ظاہری تعارض بھی رفع ہو گیا۔ کیونکہ ممانعت حدیث اس شخص کے لئے ہے جو اپنے کھانے پینے کے لئے فروخت کرتا ہے اور جو فقرا پر صدقہ کرنے کے لئے فروخت کرے وہ اس میں داخل نہیں۔ اور جب عبارات مذکورہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جرم قربانی فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہو جاتا ہے خواہ بہ نیت صدقہ ہی فروخت کی ہو یا اپنی ہی ضرورت میں خرچ کرنے کے لئے۔ تو یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس کا مصرف صرف فقرا و مساکین وغیرہ ہیں اغنیاء نہیں۔ لہذا فی الخلاصة وقی مجموع النوازل قولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام لا تحل الصدقة لغنی ولا الفقیر بنی ہاشم محمول علی الصدقة الواجبة (الی قولہ) اما اذا اطلق لفظ الصدقة فہی صدقة واجبة (خلاصہ الفتاوی ص ۲۴۵ ج ۱) وقی ردالمحتار وهو ربیع مصرف الزکاة) مصرف ایضا صدقة القطر والكفارة والمنذر وغير ذلك من الصدقات الواجبة كما فی القہستانی (رشامی ص ۶۳ ج ۲)

تحریر مذکور سے یہ واضح ہو گیا کہ جرم قربانی کو اگر فروخت کر دیا جاوے تو اس کی قیمت کا صدقہ واجب ہو جاتا ہے اور مصرف اس کا صرف فقرا و مساکین ہوئے اغنیاء کو نہیں دیا جاسکتا اور اسی طرح مدرسین وغیرہ کی تنخواہوں میں بھی صرف نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ صدقہ کی حقیقت یہ ہے کہ کسی مسکین کو بدوں کسی معاوضہ کے دیا جاوے۔ اگر تنخواہوں میں دیا گیا تو اجرت ہو جاوے گی اور اگر غنی کو دیا گیا تو حقیقتاً یہ ہونگا کہ لفظاً صدقہ کہا جاوے گا ہاں گوشت و پوست جب کہ خود موجود ہوں تو ان کا خود کھانا اور استعمال کرنا یا کسی غنی کو دے دینا اس کو شریعت نے جائز رکھا ہے وہ بھی اس حیثیت سے کہ نبی حدیث یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی مہمانی ہے اور ظاہر ہے کہ مہمان کو کھانے پینے کی اجازت ہوتی ہے فروخت کر دینے کی نہیں اسی مضمون کو بدائع میں بالفاظ ذیل ذکر فرمایا ہے:-
ولاتھامن ضیافۃ اللہ تعالیٰ عز شانہ اللتی اضاف بہا عبادۃ و لیس

للضیف ان یبیع من طعام الضیاقۃ شیئاً ربداً ثم ص ۸۱ ج ۵)
 اور بریلوی سنتوی میں جس قدر عمارتیں پیش کی گئی ہیں اون میں سے کسی ایک لفظ سے
 بھی ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ چرم قربانی فروخت کر دینے کے بعد بھی اغنیاء کو دینا جائز
 ہے بلکہ ان سب عمارتوں سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کا گوشت اور چمڑا البعینہ
 اغنیاء کو بھی دینا جائز ہے جس میں کسی کو خلاف نہیں۔

اور حدیث ابو داؤد فکلو ادا دخروا و ائتجروا میں اگر (ائتجروا) باتنا المشدق
 کی روایت بھی تسلیم کی جاوے تو زیادہ سے زیادہ فروخت کرنے کی اجازت اس سے ثابت ہوگی
 پھر قیمت کا حکم اس میں مذکور نہیں تا نیا و ائتجروا کے معنی بھی علامہ ابن الاثیر نے نہایہ
 میں صدقہ دینا بیان کئے ہیں۔ و لفظ و حدیث الاصحی کلو ادا دخروا و ائتجروا
 ای تصدقوا طالبین الاجر۔ نیز دوسری روایت حدیث اسی معنی کی تائید کرتی ہے
 جو مسلم میں بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا مذکور ہے کلو ادا دخروا و تصدقوا ان تخریج
 ہدایہ ص ۲۷۸ ج ۲ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث ابی داؤد میں صحیح روایت و ائتجروا بالمرہ
 کی ہے۔

خلاصہ جواب

یہ ہے کہ چرم قربانی فروخت کرنے سے پہلے تو خود بھی استعمال کر سکتا ہے اور اغنیاء
 کو ہدیہ بھی دے سکتا ہے اور فقراء و مساکین پر صدقہ بھی کر سکتا ہے لیکن اگر روپیہ پیسوں
 کے عوض فروخت کر دیا تو خواہ کسی نیت سے فروخت کیا ہو۔ اس کا صدقہ کر دینا واجب ہو
 جاتا ہے۔ اور اس کا مصرف صرف فقراء و مساکین ہیں۔ اغنیاء کو دیتا یا طازمین و مدرسین
 کی تحواہوں میں دینا جائز نہیں۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

کتبہ

احقر محمد شفیق غفرلہ

خادم دارالافتاء و رالعلوم دیوبند ۱۳۵ھ

اليواقیت

احکام المواقیت

مواقیت ما حرام اور ان کے مسائل

مقامِ تالیف _____ کراچی
 زمانہ تالیف _____ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ
 اشاعت اول _____ ماہنامہ البسائر شوال
 و ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ

”اس مقالے کا اصل مقصد اس مسئلہ کی تحقیق ہے کہ ہندو پاک سے جانے والے عازمین حج کو کس جگہ سے احرام باندھنا چاہیے اور کیا ان کے لئے جدہ داخل میقات ہے؟ اس کے ضمن میں دوسرے متعلقہ احکام اور مسائل بھی جمع کر دیئے گئے۔“

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مواقیت احرام کا مسئلہ

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

اما بعد

حق تعالیٰ جل شانہ نے تمام عالم میں سے بیت اللہ کی زمین کج عزت و شرف کے لیے مخصوص فرما کر اس پر اپنا بیت بنایا جو دنیا میں سب سے زیادہ معظم و مکرم ہے۔ اس کی تعظیم و شرف کے اظہار کے لیے اس کے گرد یکے بعد دیگرے کئی حلقے قائم فرمائے اور ہر ایک حلقے کے ساتھ کچھ آداب و احکام مخصوص فرمائے۔

سب سے پہلا اور بیت اللہ سے متصل حلقہ مسجد حرام کا ہے جس کے اندر بیت اللہ واقع ہے۔ اس کے خاص آداب و احکام ہیں، جن میں کچھ تو وہ ہیں جن میں دنیا کی دوسری مساجد بھی شریک ہیں اور کچھ اس مسجد حرام کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً، اس میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ کے برابر ہوتا ہے۔ بیت اللہ کا طواف مسجد کے اندر ہوتا ہے۔ اور مسجد حرام سے باہر کوئی سات چکر لگائے، طواف ادا نہیں ہوگا (غنیۃ الناسک)۔

دوسرا حلقہ پہلے سے زیادہ وسیع شہر مکہ مکرمہ کا ہے۔ اس کے بھی خاص آداب و احکام اور پابندیاں ہیں۔ مثلاً یہ کہ پورا شہر مکہ بھی مسجد حرام کی طرح عام پناہ گاہ ہے۔ اس

میں کسی مجرم کو بھی جو حرم سے باہر جرم کر کے حرم میں داخل ہو گیا، وہاں قتل نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کو مجبور کیا جائے گا کہ حرم سے نکلے، نکلنے کے بعد سزا دی جائے گی۔ اس میں کسی جانور کا شکار جائز نہیں، اس کے درختوں کا اور عام گھاس کا کاٹنا بھی جائز نہیں مگر اس کی پابندیاں پہلے حلقے یعنی مسجد حرام سے کم ہیں۔

تیسرا بڑا حلقہ حرم کا ہے جو پہلے دونوں حلقوں پر مشتمل ہے، حرم شریف کے حدود مکہ مکرمہ کے چاروں طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زلمے سے متعین و محدود ہیں۔

جدہ کی طرف سے جانے والوں کے لیے حد حرم حدیبیہ کے قریب ہے۔ جہاں دو ستون علامت حرم کے لیے قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس تیسرے حلقے کے احکام و آداب اور شرعی پابندیاں بھی تقریباً وہی ہیں جو دوسرے حلقے کی بیان ہو چکی ہیں۔ البتہ شرف مکانی کے درجات بیت اللہ کے قرب و بعد کے اعتبار سے متفاوت ہوں گے۔

حدود حرم مکہ مکرمہ کے چاروں طرف متعین ہیں، کسی طرف کم اور کسی طرف زیادہ، سب سے زیادہ قریب حد حرم تنعیم ہے جو مکہ مکرمہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے اور سب سے بعید نومیل پر ہے۔

چوتھا حلقہ ان سب سے وسیع تر ہے، جس میں یہ پہلے تینوں حلقے سمائے ہوئے ہیں۔ وہ حدود مواقیت ہیں۔ مواقیت میقات کی جمع ہے، حرم محترم کے تمام اطراف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ مقامات متعین فرما دیے ہیں، جہاں سے مکہ مکرمہ میں آنے والے پر لازم کیا گیا ہے کہ بغیر احرام کے آگے نہ بڑھے، احرام خواہ حج کا ہو یا عمرہ کا، ان مقامات میں سے ہر ایک کو میقات کہتے ہیں۔ اور پورے حلقہ مواقیت کو فقہاء کی اصطلاح میں حل کہا جاتا ہے۔ اسی حلقے سے باہر تمام کو آفاق کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس حل صغیر کے بھی کچھ میقات ہیں آداب و احکام ہیں۔ مگر پہلے تینوں

لے آج کل اس جگہ کو شیبہ کہتے ہیں۔ مدیر

حلقوں سے کم ہیں۔ اس حلقے کی پابندی صرف اس قدر ہے کہ مکہ مکرمہ میں داخل ہونے والا اس حلقے میں بغیر احرام کے داخل نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی بغیر احرام کے داخل ہو جائے تو اس پر دم یعنی قربانی واجب ہو جاتی ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس مقالہ میں زیر بحث ہی چوتھا حلقہ ہے۔

اس کے احکام کی تفصیل معلوم کرنے سے پہلے کچھ اصطلاحی الفاظ کی تشریح بیان کر دینا ضروری ہے۔

اصطلاحی الفاظ کی تشریح

پہلے حلقہ کا اصطلاحی نام مسجد حرام ہے۔ دوسرے کو مکہ مکرمہ کہا جاتا ہے، تیسرے کا اصطلاحی نام حرم ہے۔ چوتھا حلقہ حدود حرم سے باہر مگر حدود مواقیت کے اندر ہے۔ اس کا اصطلاحی نام حل ہے۔ یعنی اس میں شکار وغیرہ حلال ہے۔ حدود مواقیت سے باہر سارا عالم آفاق کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ حرم کی پابندی شکار وغیرہ کی جیسے حل میں نہیں ہے، ایسے ہی حل سے باہر آفاق میں بھی نہیں، اس لیے حل کے مفہوم میں آفاق بھی داخل ہے۔ اسی لیے بعض علماء حلقہ مواقیت کے اندر حرم سے باہر کے حل کو حل صغیر کہتے ہیں اور حدود مواقیت سے باہر آفاق کو حل کبیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

مواقیت حج کی تعیین

صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ یہ حدیث منقول ہے:-

وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
لاہل للمدينة ذوالحلیفة ولا من
الشام الجحفة ولاہل نجد قرن المنازل
ولاہل یمن یلمم (بخاری کتاب الحج)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کے
لیے ذوالحلیفہ اور اہل شام کے لیے جحفہ اور اہل
نجد کے لیے قرن المنازل اور اہل یمن کے لیے
یللم میقات مقرر فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار میقات مقرر فرمائے۔
ذوالحلیفہ، جحفہ، قرن المنازل اور یلم، ان مواقیت کی تفصیلی تحقیق آگے آجائیگی۔
اور صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری حدیث میں بروایت ابن عمرؓ یہ بھی منقول ہے
کہ جب فاروق اعظمؓ کے زمانے میں عراق فتح ہونے کے بعد اس کے دو شہر، بصرہ
اور کوفہ بسائے گئے تو اہل عراق حضرت فاروق اعظمؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور
عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجد کے لیے میقات قرن المنازل کو
مقرر فرمایا ہے اور وہ ہمارے راستے سے بہت دور ہے۔ اگر ہم اس راستے کو اختیار
کریں تو ہماری مسافت اور مشقت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس پر حضرت فاروق اعظمؓ
نے ارشاد فرمایا:-

فانظروا حدوها من طریقکم
فخذ لہم ذات عرق۔
(صحیح البخاری، کتاب الحج)
اپنے راستے سے اس کی محاذات دیکھ لو۔ چنانچہ
(اس طریقہ سے) فاروق اعظمؓ نے ان لوگوں کے
لیے ذات عرق کو میقات مقرر فرمایا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ پانچواں میقات ذات عرق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے خود مقرر نہیں فرمایا تھا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے اجتہاد سے مقرر فرمایا۔
لیکن صحیح مسلم کی روایت میں شک و تردید کے ساتھ اور نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ
وغیرہ میں بغیر شک کے یہ بھی منقول ہے کہ اہل عراق کے لیے ذات عرق کی تعیین
خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی تھی۔۔۔۔۔ یہ روایتیں قوت و صحت
کے اعتبار سے اگرچہ بخاری کی روایت کے ہم پلہ نہیں ہیں مگر ان کو غیر معتبر بھی نہیں کہا
جاسکتا، اسی لیے شیخ ابن ہمامؒ نے فتح القدر میں تطبیق اس طرح فرمائی ہے کہ کوئی
بعید نہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو اس واقعہ سے پہلے وہ حدیث نہ پہنچی ہو جس میں
خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذات عرق کو اہل عراق کا میقات مقرر فرمانا مذکور ہے۔
اس لیے انہوں نے اپنے اجتہاد سے کام لے کر متعین فرمایا اور یہ حضرت فاروق اعظمؓ
کے خصوصی فضائل میں سے ہے کہ ان کا اجتہاد ٹھیک حدیث کے مطابق واقع ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل عراق کامیقات ذات عرق قرار پایا، خواہ اس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمایا ہو یا حضرت فاروق اعظمؓ نے، اس لیے کلی مواقیت پانچ ہو گئے، ان پانچوں مواقیت اور ان کے مقامات کی ضروری تشریح یہ ہے۔

مواقیت خمسہ کی ضروری تشریح

ذوالحلیفہ اہل مدینہ کامیقات ہے۔ مصر اور شام کے مسافر جو تہوک کے راستہ سے آتے ہیں، ان کامیقات بھی یہی ہے۔ یہ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانے والے راستہ پر مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک مقام کا نام ہے جس کو آبار علی یا بیر علی بھی کہا جاتا ہے اور آج کل یہی نام مشہور ہو گیا ہے (حاشیہ ارشاد الساری) اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ تک نو یا دس مرحلے ہیں (البحر الرائق)۔

اور مخدوم محمد ہاشم سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے حیات اقلوب میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے ایک سو اٹھانوے میل بتلایا ہے۔ اس مقام سے ذرا ہٹ کر ایک مسجد ہے جس کا نام مسجد شجرہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہاں ایک درخت تھا، اس کے نیچے آپ نے احرام باندھا تھا، پھر اس جگہ مسجد بنا دی گئی، افضل داوئی یہی ہے کہ سنت کے مطابق احرام اسی مسجد سے باندھا جائے، اگرچہ یہ ذوالحلیفہ کے ابتدائی حصہ کے بعد ہے اور عام مواقیت میں افضل یہ ہوتا ہے کہ میقات کے ابتدائی حصہ پر احرام باندھا جائے تاکہ پوری میقات پر اس کا گذر بحالت احرام ہو جائے مگر ذوالحلیفہ بوجہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہاں ابتداء ذوالحلیفہ کے بجائے مسجد شجرہ سے احرام افضل ہے۔

سید نور الدین سمہودی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ میں نے مسجد نبوی سے مسجد شجرہ تک ہاتھ سے پیمائش کی تو مسجد نبوی کے دروازے باب السلام سے مسجد شجرہ تک اونیس ہزار سات سو بتیس (۱۹۷۳۲) ہاتھ پایا۔ حاشیہ ارشاد الساری میں یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ اس لحاظ سے یہ فاصلہ پانچ میل سے کچھ کم ہوا۔ کیونکہ

میل ہمارے نزدیک چار ہزار ذراع کا ہوتا ہے۔ اس کو سہ کے ذراع سے جو آج کل مستعمل ہے۔ (حاشیہ ارشاد ص ۵۲)

جحفہ یہ رابع کے قریب ایک گاؤں تھا۔ جس کو مہیجہ بھی کہا جاتا ہے۔ مکہ مکرمہ سے اس کے فاصلہ میں شدید اختلاف ہے، ارشاد الساری میں طاعلی قاری نے بیس میل بتلایا ہے۔ اور حیات القلوب میں مخدوم ہاشم سندھی نے بحوالہ علامہ مرشدی بیاسی میل لکھا ہے۔ اس طرح مراحل کے اعتبار سے فتح الباری شرح البخاری میں بحوالہ شرح مہذب نووی اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تین مرحلے بتایا اور شیخ عبداللہ بن سالم نے شرح بخاری میں مکہ مکرمہ تک پانچ منزل کا فاصلہ لکھا ہے اور مدینہ منورہ تک سات منزل (حیات القلوب قلمی ص ۱۲) غالباً وجہ اس اختلاف کی یہ ہے کہ جحفہ سے مکہ مکرمہ کے لیے راستے مختلف ہیں، کسی راستہ سے مسافت کم ہے، کسی سے زیادہ، یہ گاؤں جحفہ یا مہیجہ عرصہ دراز سے ویران اور بے نشان ہو گیا ہے اس لیے اس طرف آنے والے رابع سے احرام باندھتے ہیں۔ کیونکہ رابع جحفہ سے کچھ پہلے ہے۔ یہاں سے احرام باندھنے والا گویا اصل میقات سے کچھ پہلے احرام باندھتا ہے جو سب کے نزدیک جائز ہے، اس لیے احتیاط اسی میں ہے۔

اور رابع ساحل سمندر پر مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانے والوں کے راستہ پر مشہور قصبہ ہے اور آجکل تو اچھا شہر بن گیا ہے، جس میں مسافروں کے قیام کے لیے بڑے بڑے ہوٹل اور قہوہ خانے وغیرہ ہیں۔

قرن المنازل یہ اہل نجد کا میقات ہے، جس میں نجد یمن، نجد حجاز و نجد تمام شامل ہیں۔ لغت فقہ المغرب میں ہے کہ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو میدان عرفات کے اوپر ہے اور شرح مصابیح میں ہے، بیضہ کی مانند ایک چکنا صاف اور مدور پہاڑ ہے۔ عرفات کے اوپر آیا ہوا ہے۔ اہل مکہ اور ان کے اطراف کے لوگ اس پہاڑ کو کرا بفتح الکاف کہتے ہیں اور قاموس میں ہے کہ قرن اس پہاڑ کا نام بھی ہے اور اس کے متصل وادی کو بھی قرن کہتے ہیں اور اس وادی کے اندر ایک گاؤں جو طائف

کے قریب ہے اس کو بھی قرن کہا جاتا ہے (حاشیہ ارشاد الساری ص ۵۵)
 البحر الرائق میں ہے کہ قرن کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ ہے اور حیات القلوب
 میں مخدوم ہاشم سندھی نے بھی بحوالہ نہایت شرح ہدایہ دو مرحلہ کا فاصلہ اور ہاتقانی
 شرح ملتقی الابحر کے حوالہ سے پچاس میل کا فاصلہ بتلایا ہے (حیات القلوب قلمی
 ص ۲۱)

یللم، اہل یمن تمامہ کامیقات ہے۔ مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ کے فاصلہ پر ایک
 پہاڑ کا نام ہے، اس زمانہ میں اس کو سعدیہ کہا جاتا ہے، علامہ عینی اور حافظ ابن
 حجر نے شرح بخاری میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تیس میل لکھا ہے (حیات القلوب)
 علامہ عینی نے لکھا ہے:-

قال ابن حزم هو جنوب مكة و
 منه الى مكة ثلاثون ميلا -
 ابن حزم کہتے ہیں کہ یلم مکہ مکرمہ کے جنوب میں
 ہے اور اس سے مکہ مکرمہ تک تیس میل کا فاصلہ
 ہے۔ (عمدہ ص ۱۲ ج ۵)

اور شیخ عبدالرحمن نجدی نے اپنی کتاب مفید الانام نور الظلام ص ۵۳ ج ۱ میں اس
 کا فاصلہ چالیس میل بتلایا ہے اور قسطلانی شرح بخاری، فتح القدير شرح ہدایہ، اور
 معجم البلدان وغیرہ میں میلوں کا فاصلہ بتلانے کے بجائے مرحلتین یا لیلتین کہا
 گیا ہے۔

ذات عرق اہل عراق کامیقات ہے، ایک گاؤں کا نام ہے جو عراق کی طرف
 سے عتیق کے بعد مکہ مکرمہ سے دو منزل کے فاصلہ پر تھا۔ آجکل ویران ہو گیا ہے اسی
 لیے اب اس کے بجائے عتیق سے احرام باندھا جاتا ہے کیونکہ ذات عرق کا صحیح
 تعین نہ رہا۔ عتیق سے احرام باندھنے میں اصل میقات سے کچھ پہلے احرام ہوگا۔
 اسی میں احتیاط ہے۔

علامہ عابد مالکی نے ہدایۃ الناسک میں فرمایا کہ ذات عرق مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ
 کے فاصلہ پر طائف کے راستہ پر ایک گاؤں تھا جو اب ویران ہو گیا ہے، اس کا

محل وقوع اس مقام کے قریب تھا، جس کو آجکل سیل کہا جاتا ہے (حاشیہ ارشاد الساری ص ۵۵) قسطلانی نے شرح بخاری میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے بیالیس^{۴۲} میل بتلایا ہے۔ اسی طرح فتح الباری شرح بخاری میں بیالیس^{۴۲} میل کا فاصلہ لکھا ہے نووی^{۱۰} ابن حجر مکی نے فرمایا کہ اس کا فاصلہ بھی مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ کا ہے جیسا کہ قرن اور یلم کا فاصلہ دو مرحلے ہیں (حیات القلوب) و مثلہ فی البحر۔

مواقیتِ خمسہ کے احکام

جو لوگ آفاق، یعنی اطراف عالم سے آنے والے ان میقاتوں کے راستے سے گذرتے ہیں، اگر وہ مکہ مکرمہ میں جانے کے مقصد سے ان مواقیت سے آگے، محلِ صغیر کی طرف جائیں جو مواقیت کے اندر اور حرم سے باہر کے علاقے کا نام ہے تو ان پر لازم ہے کہ ان مقامات سے حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر آگے بڑھیں۔ بغیر احرام کے آگے بڑھنا گناہ ہے اور جو ایسا کرے گا اس کے ذمہ دم (قربانی) دینا واجب ہوگا (ہدایہ۔ ارشاد الساری)

امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک آفاق یعنی محلِ کبیر سے آنے والا جو شخص مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا ارادہ کرے خواہ یہ ارادہ کسی دنیوی غرض تجارت یا عزیزوں سے ملاقات وغیرہ کی نیت سے کیا ہو، مگر بیت اللہ کی تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھی وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہو، میقات سے حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر داخل ہو اور بیت اللہ کا یہ حق ادا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص میقات سے آگے مکہ کی طرف بغیر احرام کے نہ بڑھے (ہدایہ)

امام شافعیؒ کے نزدیک یہ پابندی صرف اس شخص کے لیے ہے جو عبادت حج یا عمرہ کے قصد سے مکہ مکرمہ کا ارادہ کر رہا ہے کسی تجارتی غرض یا عزیزوں سے ملاقات یا تفریحی طور سے جانے والے پر احرام باندھ کر جانے اور کم از کم عمرہ ادا کرنے کی پابندی نہیں ہے۔ (فتح القدر شرح ہدایہ)

یہ حکم تو ان لوگوں کے لیے ہے جو آفاق کے کسی علاقے سے آئیں۔ مگر کسی میقات کے راستے سے مکہ مکرمہ جانے کے لیے حل صغیر میں داخل ہوتے ہیں، اب یہ دیکھنا ہے کہ جو لوگ پانچ میقاتوں میں سے کسی میقات پر نہیں گزرتے دوسرے راستوں سے حل صغیر پھر حرم میں داخل ہوتے ہیں، ان کا کیا حکم ہے، کیا وہ اس پابندی ہی سے آزاد ہیں اور بغیر احرام کے حرم میں داخل ہو سکتے ہیں اور اگر ان پر بھی یہ پابندی ہے تو ان کو کس جگہ سے احرام باندھنا واجب ہوگا۔ ملا علی قاری نے اپنے شرح مناسک میں اس کے متعلق فرمایا ہے:-

وعین هذه المواقیات لیست بشرط وللهذا یصم الاحرام
 قبلها بل الواجب عینها أو حدوها ای محاذاتها و
 مقابلتها فمن سلك غیر میقات ای طریقاً لیس فیہ
 میقات معین برأ أو بجرأ اجتهد وأحرم إذا حاذی
 میقاتاً منها ای من المواقیات المعروفة ومن حذوا لا بعد
 اولی فان الافضل ان یحرم من اول المیقات وهو الطرف
 الأبعد عن مكة حتى لا یمر بشئ مما یقال میقاتاً غیر
 محرم ولو أحرم من الطرف الاقرب إلى مكة جاز با تفاق
 الاربعة. وإن لم یعلم المحاذاة فانه لا یتصور عدم
 المحاذات. فعلى مرحلتین من مكة كجدة المحروسة من
 طرف البحر (ارشاد الساری ص ۵۶)

وقال فی حاشیئتم قولہ كجدة فانها علی مرحلتین عرفیتین
 من مكة وثلاث مراحل شرعیة ووجهه ان المرحلتین اوسط
 المسافات والافالاحتیاط الزیادة کذا فی شرح نظر الکنز
 واقول لعل وجهه ایضاً ان اقرب المواقیات إلى مكة علی
 مرحلتین عرفیتین من مكة فقدما بذلك (الارشاد الساری ص ۵۶)

یہی مضمون دوسری تمام کتب فقہ میں مختصراً یا مفصلاً مذکور ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ کسی میقات معین کے اوپر سے نہیں گزرتے بلکہ درمیانی راستوں میں سے کسی راستہ سے مکہ مکرمہ کی طرف آتے ہیں، احرام کی پابندی ان پر بھی لازم ہے اور طریقہ ان کے لیے یہ ہے کہ وہ جس راستہ سے حبل صغیر کے اندر داخل ہو رہے ہیں، اس راستہ کا جو حصہ کسی میقات کی محاذات میں ہو، اسی جگہ سے احرام باندھ لیں۔ اگر راستہ ایسا ہے کہ ایک سے زائد میقاتوں کی محاذات راستہ میں آتی ہے، تو افضل یہ ہے کہ میقات بعد کی محاذات سے احرام باندھیں اور اگر اس سے آگے بڑھ کر قریبی میقات کی محاذات سے احرام باندھ لیا تو یہ بھی جائز ہے۔ اور اصل بنیاد اس حکم کی صحیح بخاری کی وہ حدیث مذکور ہے جس میں اہل عراق نے یہی سوال حضرت فاروق اعظمؓ کے سامنے پیش کیا اور آپ نے ان کے جواب میں فرمایا:-

انظرو حذوہا من طریقکم اپنے راستہ سے ان کی محاذات دیکھو پھر فاروق
ثم حدّ لهم ذات عرق اعظمؓ نے (اس طریقے سے) ان کے لیے ذات
(بخاری) عرق کو میقات مقرر فرمایا۔

اس میں حضرت فاروق اعظمؓ نے دوسرے راستوں سے گزرنے والوں کے لیے ایک ضابطہ بنا دیا کہ ان کا راستہ جو حبل صغیر میں داخل ہونے کا ہے، اس راستہ پر جہاں کسی میقات کی محاذات آجائے وہی ان لوگوں کے لیے میقات کے حکم میں ہے۔ یہاں سے مکہ کی طرف آگے بڑھنا بغیر احرام کے جائز نہیں۔

پھر اس ضابطہ کی رو سے اہل عراق کے لیے ان کے راستہ کے اس حصہ کو میقات قرار دیا جو قرن المنازل کے محاذات میں ہے، یعنی ذات عرق۔

محاذات میقات کس طرح معلوم کی جائے؟

محاذات کے لغوی معنی مسامتت کے ہیں۔ جس کی تشریح شیخ ابن حجرؒ سیوطی نے

لہ خط کشیدہ عبارت کا مفہوم کلام فقہاء جمہم اللہ تعالیٰ میں نہیں ملتا۔

تحفة المحتاج شرح منہاج میں بالفاظ ذیل کی ہے:-

(ومن سلك طريقاً لا ينتهي الى
ميقات فان حاذى، بالمعجمة
(ميقاتاً) اى سامنته بان كان على
يمينه او يساره ولا عبرة بما امامه
او خلفه (احرم من محاذاته)
مخلفه على ايش الحواشى الشروانية ص ۴ ج ۲)

محاذات کا مطلب یہ ہے
کہ میقات اس کے دائیں
یا بائیں آ جائے۔ سامنے
اور پیچھے ہونے کا کوئی
اعتبار نہیں۔

مطلب ظاہر ہے کہ محاذات سے مراد یہ ہے کہ میقات مکہ مکرمہ کی طرف جانے
والے مسافر کی دائیں یا بائیں جانب آ جائے اور جب تک میقات اس کے آگے ہے
تو محاذات نہیں ہوئی اور جب اس کے پیچھے پڑ جائے تو محاذات سے تجاوز ہو گیا۔
مسائل نماز میں بھی محاذات کا یہی مطلب ہوتا ہے، اس کتاب میں اس کے بعد
فرمایا ہے:-

(لم تجز مجاوزته) الى جهة الحرم (بغير احرام) وخرج بقولنا
الى جهة الحرم ما لو جاوزه يمينه او يسرة فله ان يؤخر
احرامه لكن بشرط ان يحرم من محل مسافته الى مكة
مثل مسافة ذلك الميقات كما قاله الماوردي وجزم به
غيره وبه يعلم ان المجائى من اليمن فى البحر له ان يؤخر
احرامه الى جدة لان مسافتها الى مكة كمسافة يلملمه
انتهى۔

عبارت مرقومہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ مسافر جب راستہ میں کسی میقات
کی محاذات پر پہنچا، مگر اس کو کسی وجہ سے اس میقات کے راستہ سے مکہ مکرمہ کی
طرف جانا نہیں ہے، بلکہ اس کا راستہ کسی دوسری سمت سے ہے تو اس کے لیے
اس محاذات پر احرام باندھنا واجب نہیں ہے، بلکہ جس راستہ سے اس کو مکہ مکرمہ کی

طرف جانا ہے، اس راستہ پر محاذات کو دیکھا جائے گا۔ کیونکہ محاذات میقات سے بغیر احرام تجاوز کرنا جو شرعاً ممنوع ہے، اس تجاوز سے مراد تجاوز الی جہۃ الحرم ہے دوسری کسی سمت میں تجاوز ممنوع ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جیسا کہ تحفہ کی عبارت مذکورہ سے واضح ہو گیا۔

اور غنیۃ الناسک میں مواقیت کی تعریف ہی اس طرح کی ہے۔

ھی المواضع الستی لایجوز ان یتجاوزھا الی مکة والحرم
ولو لحاجة الا محرماً۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ بلا احرام تجاوز ممنوع وہ ہے جو تجاوز الی الحرم ہو۔ دوسری کسی جہت کی طرف تجاوز ممنوع نہیں۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اس دوسری محاذات میں یہ ضروری ہے، کہ اس محاذات سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ کم سے کم اتنا ہی ہو جتنا اصل میقات سے فاصلہ ہے مثلاً کوئی شخص یلمیم کی محاذات سے جدہ کی طرف بڑھا اور جدہ کے راستہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانے کا قصد کیا تو اس کو احرام اس جگہ سے باندھنا چاہیے جہاں سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ یلمیم کے فاصلہ کی برابر ہو۔ اور حسب تصریح فقہاء یلمیم کا فاصلہ بھی مکہ مکرمہ سے مرعیتین کا ہے اور جدہ کا فاصلہ بھی مرعیتین ہے تو دونوں فاصلے مساوی ہونے کی وجہ سے جدہ سے احرام باندھنا جائز ہوگا۔

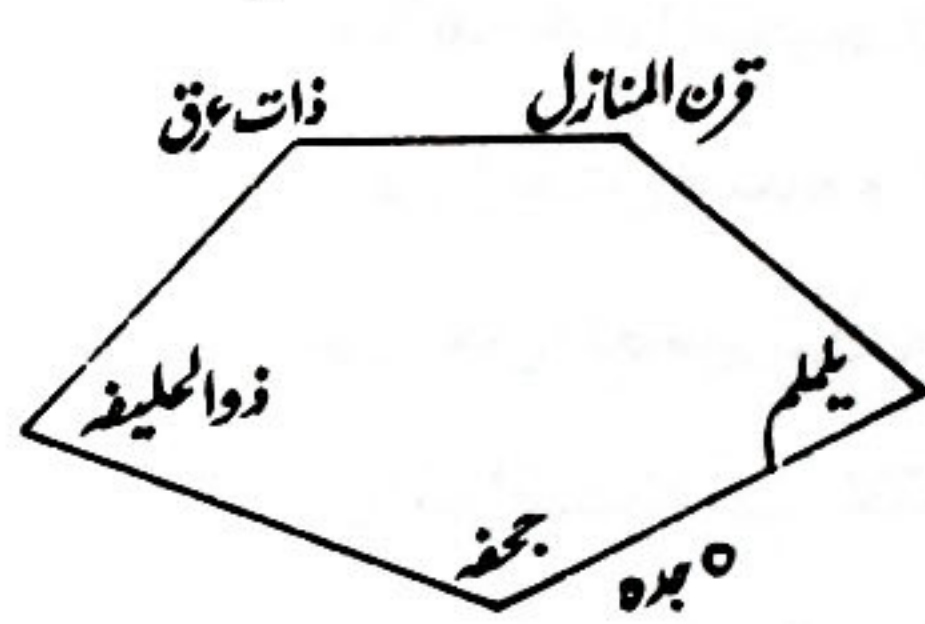
محاذات کی یہ تفسیر لغوی معنی کے لحاظ سے بھی اقرب ہے اور فقہاء کی تفسیر سے بھی اسی کی تریح ہوتی ہے۔ صاحب بدائع کی ایک عبارت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے :-

فاما اذا قصدھا من طریق غیر مسلوك فانه یحرم اذا بلغ
موضعا یحاذی میقاتا من هذه المواقیت لانه اذا حاذی
ذلك الموضع میقاتا من المواقیت صار فی حکم الذی یحاذیہ
فی القرب من مکة۔ (بدائع ص ۱۶۲ ج ۲)

علامہ واطلا خوندجان مرغینانی مہاجر مکی نے
مخازات کی ایک دوسری تفسیر | مواقیح حج کی تحقیق میں ایک مستقل رسالہ

لکھا ہے جس کی تاریخ تصنیف ۱۳۱۳ھ ہے اور ۱۳۲۳ھ میں تاشقند کے ایک پریس میں چھپا ہے۔ یہ رسالہ حضرت حاجی شیر محمد صاحب سندھی مہاجر مدنی نے احقر کو عطا فرمایا تھا۔ جو احقر کے پاس موجود ہے۔ اس رسالہ میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ جس طرح حدود حرم کے ذریعہ تمام حلقہ حرم کی تعیین کی جاتی ہے۔ کہ حد حرم سے دوسری حد تک ایک خط ملایا جائے، اسی طرح تیسری چوتھی حدود کے باہم خطوط ملا کر ان خطوط کے درمیان جو رقبہ زمین آتا ہے۔ وہ حرم کہلاتا ہے۔

اسی طرح مواقیح کے حلقے کو سمجھنا چاہیے۔ ایک میقات سے دوسرے میقات



تک خط ملا کر یہ خط مخازات ہوگا۔ خط سے باہر آفاق اور خط کے اندر حل کہا جائے گا اس خط مخازات سے بغیر احرام کے مکہ مکرمہ کی طرف تجاوز کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اس کی شکل بھی رسالہ کے ماشیہ پر ایک مخمس کی صورت میں یہ دی ہے۔

اس تفسیر مخازات کے مطابق یلیم سے جو خط جحفہ کے ساتھ ملایا جائے گا تو جبدہ اس خط سے باہر کافی فاصلہ پر رہتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شہر جبدہ سے بھی آگے بحرہ کے قریب تک بلا احرام جاسکیں۔ مخازات کی یہ تفسیر اگرچہ قواعد مخازات کی رو سے تو معقول ہے مگر فقہاء کے کلام میں اس کی تائید نہیں ملتی، بلکہ اس کے خلاف یہ تصریحات اوپر گزر چکی ہیں کہ اہل بین و بلاد مشرق کے باشندے جو جبدہ کی طرف سے داخل حل ہوں تو ان پر یہ پابندی لازم ہے کہ جس قدر مسافت یلیم کی مکہ مکرمہ سے ہے اسی قدر مسافت اس طرف سے بھی ہونی چاہیے۔ مثلاً وہ مرحلتیں ہیں تو ادھر سے بھی مرحلتیں کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے ضروری ہے اور وہ جبدہ پر ہی ہو سکتا ہے۔ جبدہ سے آگے نہیں۔

والا اخوندجان کی عبارت اس کے متعلق یہ ہے:-

ظاهر ان المسجد مشتمل علی البيت وحاوله من كل جهة
ومكة مشتمل بهما والحرم مشتمل بالثلاثة ممتد من
كل جهة الى الحبل الصغير المحيط بالحرم ولا شك ان الحرم
غير مختص بالعلامات الموضوعه في الطريق بل هو السطح
الممتد من كل جهة قريبا وبعدا ولا يتوهم احد ان
الحرم المکانات المتصلة بالعلامات فقط وكل عاقل
يفهم ان الاماکن بين العلامات من ارض الحرم مثلا
العلامة عند التنعيم الى العلامة عند حدیبیة كلها
حرم لا يقتل صيده ولا يقطع شجره-

ثم الحبل الصغير يتدء من اطراف الحرم من كل جهة
الى المواقیت كانتها محتسمة الشكل والحبل الصغير بين
الحرم والحبل الكبير الذي هو جميع الافاق والمواقیت
بعض اجزاء الحبل ولهذا يجوز لاهلها تاخير الاحرام
الى قريب حد الحرم كما يجوز لاهل الحبل الصغير الى
قوله) فتحصل من ذلك ان حرم الحرم اى المواقیت مثل
الحرم المحيط بما في جوفه مثل المخطوط الممتدة بين النقاط
فكما ان النقاط مواقیت فكذا المخطوط بينها واللاجاز
الدخول الى الحرم بلا احرام من بين المواقیت

(رساله اخوندجان ص ۱۶۳ طبع تاشقند)

آج کل ان ممالک مشرقیہ سے آنے والے
حجاج کے لیے رستے دو ہیں، ایک ہوائی
دوسرا بحری، ہوائی جہازوں کا راستہ عموماً

پاکستان، ہندوستان اور مشرقی ممالک
سے آنے والوں کا میقات !

خشکی کے اوپر سے براہ قرن المنازل ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز قرن منازل اور ذات عرق، دونوں میقاتوں کے اوپر سے گزرتے ہوئے اول حل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور پھر جدہ پہنچتے ہیں۔ اس لیے ہوائی سفر میں تو قرن المنازل کے اوپر آنے سے پہلے پہلے احرام باندھنا لازم و واجب ہے، اور چونکہ ہوائی جہازوں میں اس کا پتہ چلنا تقریباً ناممکن ہے کہ کس وقت اور کب یہ جہاز قرن المنازل کے اوپر سے گزرے گا، اس لیے اہل پاکستان اور ہندوستان کے لیے تو احتیاط اسی میں ہے کہ ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے وقت ہی احرام باندھ لیں۔ اگر بغیر احرام باندھے ہوئے ہوائی جہاز کے ذریعہ جدہ پہنچ گئے تو ان کے ذمہ دم یعنی قربانی ایک بکرے کی واجب ہو جائے گی اور گناہ اس کے علاوہ ہوگا، جس کی وجہ سے حج ناقص رہ جاتا ہے، مقبول نہیں ہوتا۔ بہت سے حجاج اس میں غفلت کرتے ہیں۔

چین، انڈونیشیا، جاوا وغیرہ کے ہوائی جہاز بھی اگر خشکی پر پرواز کریں تو ان کا بھی یہی حکم ہے۔ ہاں اگر ان کے جہاز خشکی کے بجائے سمندر کے اوپر سے پرواز کر کے جدہ پہنچیں تو ان کا حکم وہ ہوگا، جو بحری جہاز سے آنے والوں کا ابھی لکھا جائے گا۔ مشرقی ممالک کے لیے دوسرا راستہ بحری سفر کا ہے۔ اس راستہ سے جانے والے بحری جہاز قدیم زمانے میں تو یلم کے ساحل پر اترتے تھے جو یمن کا ایک حصہ ہے اور اہل یمن کی طرح وہ بھی میقات یلم سے گزر کر حل میں پھر حرم اور مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے تھے، اسی لیے عام فقہاء کی تصریحات بھی ہیں کہ ہندوستان، پاکستان اور تمام بلاد مشرق کا میقات یلم ہے۔ لیکن مدت دراز سے یہ ساحل متروک ہو گیا۔ اب بحری جہاز یہاں نہیں ٹھہرتے، بلکہ ساحل یلم سے پندرہ بیس میل کے فاصلہ پر محاذات یلم سے گزرتے ہوئے سمندر ہی میں آگے بڑھ جاتے ہیں اور ساحل جدہ پر قیام کرتے ہیں۔ جدہ ہی سے سب مسافر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔

اس سورت میں یہ تو ظاہر ہے کہ ان ممالک سے بحری جہازوں پر آنے والے مسافروں کے راستے میں عین میقات تو کوئی پڑتا نہیں البتہ محاذات میقات یلم سے

دو جگہ ہوتی ہے۔ ایک درمیان سفر یلم کے مقابل سے گزرتے ہوئے، دوسرے سفر کے اختتام پر جدہ میں، سابقہ تحریر میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ کسی میقات، یا اس کی محاذات سے بلا احرام تجاوز کرنا جو ممنوع و ناجائز اور موجب دم ہے، وہ اس وقت ہے جبکہ یہ ان کا تجاوز الی جہۃ الحرم ہو اور اگر اس محاذات سے سمندری میں آگے بڑھتا ہوا آفاق ہی کے اندر سفر کرے تو یہ تجاوز عن المیقات اور موجب دم نہیں ہوگا، جیسا کہ تحفہ شرح منہاج کے حوالہ سے اس کی تصریح پہلے آچکی ہے جس کے بعض الفاظ یہ ہیں:-

وخرج بقولنا الى جهة الحرم ما لو جاززه يمنة او يسرة
فله ان يؤخر احرامه لكن بشرط ان يحرم من محل
مسافته الى مكة مثل مسافة ذلك الميقات كما قاله
الماوردی وجزره به غيره و به يعلم ان الجائی من
اليمن في البحر له ان يؤخر احرامه من محاذاة يلمم
الى جدة لان مسافتها الى مكة كمسافة يلمم كما

صرحوا به (تحفہ علی ہامش الحواشی الشروانیۃ ص ۴۷۶ ج ۴)

اس کا حاصل یہ ہے کہ مشرقی ممالک سے بحری جہازوں پر آنے والوں کے لیے محاذات یلم پر احرام باندھنا واجب نہیں۔ ہاں کوئی یہیں پر احرام باندھے تو افضل ہونے میں شبہ نہیں۔ کیونکہ میقات سے جتنا پہلے کوئی احرام باندھے اتنا ہی ثواب زیادہ ہے۔

اب قابل غور سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جب ان لوگوں پر محاذات یلم سے احرام باندھنا واجب نہ ہو تو پھر کس جگہ سے احرام باندھنا واجب ہوگا۔ جہاں سے تجاوز بنا احرام جائز نہیں۔

جدہ سے احرام باندھنے کا مسئلہ | یہ بات اوپر واضح ہو چکی ہے کہ ہوائی جہاز کے ذریعہ خشکی کے اوپر سے جدہ پہنچنے کے

لیے میقات قرن المنازل اور میقات ذات عرق کے اوپر سے گزرنا ہوتا ہے اس لیے ہوائی جہاز کے مسافروں کو بلا احرام جانا جائز نہیں۔ پاکستان، ہندوستان والوں کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے وقت ہی احرام باندھ لیں۔ البتہ غور طلب مسئلہ بحری جہازوں کا اور ان کے مسافروں کا ہے کہ جب میقات یلم کی محاذات سے احرام واجب نہ ہو تو اب کہاں واجب ہوگا۔

داعیٰ انونڈ جان کی تحریک کے مطابق تو یہ مقام جدہ شہر سے بھی کچھ آگے چل کر آئے گا مگر فقہاء کی تصریحات اس سے مختلف ہیں۔ عام فقہاء کے نزدیک جدہ کی طرف سے جانے والے مشرقی مسافروں کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس مقام پر احرام باندھیں جس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے اس فاصلہ سے کم نہ ہو جو یلم اور مکہ مکرمہ کے درمیان ہے اب یہ مقام کونسا ہوگا، اس کے متعلق علامہ ابن حجر مکی کی کتاب تحفہ شرح منہاج کے حوالہ سے یہ تصریح ابھی گزر چکی ہے کہ یہ مقام جدہ ہے، کیونکہ مسافت جدہ کی مکہ مکرمہ سے اتنی ہی ہے جتنی یلم کی مکہ مکرمہ سے ہے۔

لہ ان یؤخرا حرامہ من محاذات یلم الی جدۃ لان

مسافتها الی مکة کمسافة یلم۔

علامہ ابن حجر مکی کی تصریحات بالا سے تو یہ معلوم ہوا کہ حقیقی محاذات اس طرف سے معلوم کرنے کا طریقہ ہی یہ ہے کہ مسافت مرحلتین کا اعتبار کیا جائے جس طرح یلم سے مکہ مکرمہ دو مرحلے پر ہے اسی طرح جدہ سے دو مرحلے ہیں۔ اس لیے مسافت برابر ہونے کی وجہ سے جدہ ہی محاذات یلم قرار دیا جائے گا۔

فقہاء حنفیہ میں حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کسی قدر فرق کے ساتھ اس کی موافقت فرمائی وہ یہ کہ اگر حقیقی محاذات کا علم نہ ہو تو پھر دو مرحلے کی مسافت کا اعتبار کر کے جدہ ہی کو حکم میقات سمجھا جائے گا، ان کے الفاظ مناسک ملا علی قاری میں یہ ہیں:-

وان لم یعلم المحاذاة، فعلى مرحلتین من مکة

كجدة المحروسة من طرف البحر (ارشاد الساری ص ۵۶)
اسی طرح غنیۃ الناسک میں بحوالہ طوابع لکھا ہے :-

وان لم یعلم المحاذاة. فعلى مرحلتین عرفیتین من
مكة كجدة من طرف البحر فانها على مرحلتین عرفیتین من
مكة وثلاث مراحل شرعیة طوابع (غنیۃ الناسک ص ۲۶)

اسی طرح فقیہ العصر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری مہاجر مدنی رحمۃ
اللہ علیہ نے بھی اب سے پچاس سال پہلے ۱۳۲۸ھ میں یہی فتویٰ دیا تھا کہ حقیقی
محاذات معلوم نہ ہونے کے سبب جدہ ہی کو میقات قرار دیا جائے گا۔
امداد الفتاویٰ تتمہ خامسہ طبع قدیم کے ص ۱۲۹ پر اور طبع جدید کی جلد دوم ص ۱۴
میں ان کا یہ ارشاد بالفاظ ذیل منقول ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے عرض کیا کہ مدینہ کا راستہ بند
ہونے کی صورت میں حج کا احرام کہاں سے باندھے گا، تو اس کے
جواب میں فرمایا کہ حج بدل کا احرام جدہ سے ہوگا۔

مناسک ملاحظی قاری میں عبارت موجود ہے۔ وان لم یعلم
المحاذاة. فعلى مرحلتین من مكة كجدة المحروسة من طرف
البحر۔ اور یہ ظاہر ہے، اہل ہند کے لیے یلمم کی محاذات کسی معتبر
طریقے سے نہیں ہوتی۔ لہذا جدہ ان کے لیے میقات ہے۔

۱۴ شعبان ۱۳۲۸ھ

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تقانوی دامت برکاتہم جو حضرت مولانا خلیل احمد
صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، ان سے زبانی بھی اس کی تصدیق ہوئی، کہ
حضرت مولانا موصوف اہل ہند کے لیے بحری جہاز سے آنے کی صورت میں جدہ
ہی کو ان کا میقات قرار دیتے تھے۔ یہ تمام اقوال سابقہ اس پر تو متفق ہیں، کہ مکہ
مکہ کی مسافت یلمم اور جدہ سے مساوی یعنی مرحلتین ہے۔ علامہ ابن حجر مکی اس

مرحلتین کو عین محاذات قرار دے کر جدہ سے احرام کو جائزہ لکھتے ہیں اور ملا علی قاری اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ اس بنا پر جدہ کو قائم مقام محاذات کا قرار دیتے ہیں کہ اصل محاذات کا علم نہیں، اس لیے مسافت کا اعتبار کر کے مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ پہلے احرام باندھنا واجب ہے اور جدہ چونکہ دو مرحلہ کی مسافت پر ہے۔ اس لیے جدہ سے احرام باندھنا صحیح ہو گیا۔

ان تمام عبارات مرقومہ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرات فقہاء نے اس مسافت کی تعین میں میلوں کی کمی بیشی کا اعتبار نہیں کیا بلکہ مراحل کا اعتبار کیا ہے، اور مراحل کی مسافت میلوں کے اعتبار سے کم و بیش ہو سکتی ہے، یہی وجہ ہے، کہ فتح الباری وعمدة القاری میں بحوالہ ابن حزم ملیم کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تیس میل لکھا ہے اور بعض علماء نے چالیس میل بھی فرمایا ہے اور آج کل کے پیمائش کرنے والوں نے باون تک بتلایا ہے۔ پھر اسی کو سب نے مرحلتین بھی فرمایا ہے اور قرن المنازل کا فاصلہ میلوں کے اعتبار سے مخدوم ہاشم سندھیؒ نے حیات القلوب میں بحوالہ باقانی شرح طتقی الابحر پچاس میل بتلایا ہے۔ اور اس کو بھی تمام فقہاء نے مرحلتین ہی فرمایا ہے کافی البحر الرائق۔

اسی طرح ذات عرق کو بھی مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ پر لکھا ہے، ارشاد الساری ص ۵۵ والنووی شرح مسلم، تحفہ ابن حجر مکی۔ اور میلوں میں اس کا فاصلہ قسطلانی اور فتح الباری شرح بخاری میں بیالیس میل بتلایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ میلوں کے اعتبار سے فاصلوں کی کمی بیشی کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے، تیس میل کو بھی دو مرحلے قرار دیا ہے پچاس میل کو بھی بیالیس میل کو بھی اور اعتبار مراحل کا کر کے ان کی مسافتوں کو مکہ مکرمہ سے مساوی قرار دیا گیا ہے۔

جدہ کو میقات اہل یمن و اہل مشرق قرار دینا اسی اصول پر مبنی ہے، کہ مسافت مرحلتین پر ہے۔ اب میلوں کے اعتبار سے کتنا ہے، اس کی تحقیق ضروری نہیں رہی۔ آج کل کی پیمائش کے اعتبار سے جدہ کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تقریباً چھیالیس میل ہے۔

میتقات یلمیم کے فاصلہ میں اختلاف کی وجہ سے | یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ فقہاء کے نزدیک اس جگہ مسافت میں مراحل کا اعتبار ہے۔ میلوں کی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تاہم میلوں کا فاصلہ بھی اکثر فقہاء و علماء لکھتے چلے آئے ہیں۔ شرح بخاری، عمدۃ القاری، فتح الباری وغیرہ میں تو بحوالہ ابن حزم یہ فاصلہ تیس میل بتلایا ہے اور شیخ عبداللہ بن عبدالرحمن نجدی نے اپنی کتاب مفید الانام و نور الظلام ص ۵۷ ج ۱ میں یہ فاصلہ چالیس میل لکھا ہے۔ اور آجکل بعض اہل فن نے یہ فاصلہ باون میل کا بتلایا ہے، اس اختلاف کا اصل منشاء موجود ہے جو تحفہ شرح منہاج کے حاشیہ میں شیخ عبدالحمید شروانی نزیل مکہ مکرمہ نے بتلایا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:-

وقد علمت ان یلملم جبل محاذ للسعدیة وسمعت ان
بحذاء السعدیة جبلین احدهما بین طرفها المحاذی لمكة
بینہ و بین مكة اكثر من مرحلتین والثانی ممتد
لجهة مكة بینہ و بین مكة باعتبار طرفه الذی
بجھتها مرحلتان فاقل۔ (حواشی شروانیہ ص ۴۶ ج ۲)

اس سے معلوم ہوا کہ یلمیم اس پہاڑ کو کہا جاتا ہے جو سعدیہ کے محاذ میں واقع ہے اور وہ دو پہاڑ ہیں، ایک کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے میلوں کے اعتبار سے دو مرحلے سے زیادہ ہے۔ دوسرے کا فاصلہ دو مرحلے سے بھی کم معلوم ہوتا ہے کہ ابن حزم نے اس دوسرے فاصلہ کا اعتبار کر کے تیس میل بتلایا ہے اور جنھوں نے پہلے فاصلہ کو لیا انھوں نے چالیس پچاس میل تک کا فاصلہ قرار دیا۔

میتقات جدہ کے متعلق علماء کا اختلاف | تحفہ شرح منہاج ابن حجر مکی کے حوالہ سے جو بات اوپر لکھی گئی ہے کہ جدہ کی مسافت بھی یلمیم کی مسافت کے مساوی ہے، اس لیے جدہ سے ۶۱ ذھنا صحیح ہے، اس کتاب کے حاشیہ میں شیخ عبدالحمید شروانی نزیل مکہ مکرمہ نے اس وقت کے

علماء کا اختلاف بھی نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ علامہ شبلی مفتی مکہ اور فقیہ احمد بلجاج اور ابن زیاد مینی وغیرہ علماء نے اسی پر فتویٰ دیا ہے جو تحفہ میں لکھا ہے، یعنی جدہ سے احرام باندھنے کو درست و جائز قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل یمن کے بعض علماء عبداللہ بن عمر بالخزم، محمد بن ابی بکر اشخز، شیخ عبدالرؤف کا اختلاف بھی نقل کیا ہے۔ ان حضرات کا قول یہ ہے کہ جدہ کی مسافت مکہ مکرمہ تک بہ نسبت مسافت یلمم کے کم ہے، اس لیے حجاج کو چاہیے کہ ساحل جدہ میں اترنے سے پہلے جس جگہ سے جہاز ساحل جدہ اور حرم کی طرف رخ موڑتا ہے وہاں سے احرام باندھ لیں۔ ساحل جدہ تک مؤخر نہ کریں۔ ان کے الفاظ بحوالہ وفائی یہ ہیں:-

عبارة الوفاي فلله ان يؤخر احرامه من محاذة يلمم الى
 رأس العلم المعروف قبل مرسى جدة وهو حال توجه
 السفينة الى جهة الحرم وليس له ان يؤخر الى جدة
 لانها اقرب من يلمم بنحو الربع وقولهم ان جدة و
 يلمم مرحلتان مرادهم ان كلا لا ينقص عن مرحلتين
 وان تفاوتت المسافتان كما حققه من سلك الطريق
 ۱/۲ (ص ۲۵ ج ۲)

دارالعلوم کراچی، مدرسہ اسلامیہ نیوٹاؤن

کراچی، مدرسہ اشرف المدارس کراچی

علماء عصر کی مجلس میں اس مسئلہ پر بحث

کے اہل علم و فتویٰ نے عرصہ سے ایک مجلس کی تشکیل کی ہوئی ہے جس کی غرض ایسے ہی جدید و قدیم مسائل پر بحث کر کے کوئی جہت متعین کرنا ہے۔ جس کا کوئی صریح حکم قرآن و سنت اور ائمہ فقہاء کے کلام میں موجود نہیں اور علماء عصر کی رائیں ان میں مختلف ہیں، اب تک اس مجلس میں بہت سے اہم مسائل پر بحث ہو کر متفقہ رائے سے احکام مع تفصیل دلائل لکھ دیے گئے جو مستقل رسالوں کی صورت میں یہاں ابدانشاء اللہ تعالیٰ عنقریب ان کی اشاعت کا انتظام کیا جائے گا۔

یہ مسئلہ بھی مجلس میں زیر بحث آیا۔ اور متعدد مجالس میں بحث و تمحیص کے باوجود سب کا اتفاق کسی جانب نہیں ہو سکا۔ کچھ رائیں مختلف رہیں۔ چونکہ ایسا اختلاف کوئی نئی چیز نہیں، ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ مگر آج کل اس طرح کے اختلاف کو عموماً ایک افتراق بنا لیا جاتا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس مختلف فیہ مسئلہ میں جن حضرات نے اختلاف کیا ہے ان کی رائے مع ان کے دلائل کے لکھ دی جائے۔ تاکہ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ علماء کا اختلاف کس طرح ہوا کرتا ہے اور اختلاف علماء کے وقت عوام کے لیے طریقہ کار کیا ہے۔

حضرت علامہ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کی رائے | بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وکفی و سلام علی

عبادہ الذین اصطفیٰ۔ رسالہ الیواقیت فی احکام المواقیت مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم وزیدت حسنا تم کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا اور کچھ حصہ حضرت مصنف سے زبانی سنا اور بحری حجاج مسافروں کے لیے جدہ سے جواز احرام کا مسئلہ ہماری مجلس فقہی کی متعدد مجالس میں زیر بحث آیا اور کافی غور و نوطن ہوا۔ اور تحفۃ المحتاج شرح المنہاج کی عبارت اور مخدوم ہاشم سندھی وغیرہ کی عبارات و آراء پر بھی غور ہوا اور بہت عرصہ پہلے انفرادی طور پر بھی بار بار غور کیا۔ کبھی التشریح صدر نہیں ہوا کہ جدہ سے احرام کی جواز کی صورت درست ہو سکتی ہے، جو کچھ فہم قاصر میں آیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

سرزمین حرم یا مکہ معظمہ میں آنے والوں کے لیے دنیا کے کسی گوشے سے آئیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود مقرر فرمادی ہیں۔ بلا احرام ان سے تجاوز کرنا جائز نہیں۔ بیت اللہ الحرام کے شمال سے آنے والوں کے لیے ذی الحلیفہ ہے، مغرب سے آنے والوں کے لیے جحفہ ہے (جدید نام رابغہ) جنوب سے آنے والوں کے لیے یمن کی سرزمین جبل بلیلم سے (جدید نام جبل سعدیہ) جنوب مشرق سے آنے والوں کے لیے قرن المنازل ہے اور شمال مشرق سے آنے والوں کے لیے ذات النطاقین سے۔

(جدید نام مقام عتیق)۔ اب یا تو انہی مقامات پر گزر ہوگا تاہم انہی مقامات سے احرام باندھنا ہوگا یا ان سے فاصلے سے گزرنا ہوگا تو دائیں یا بائیں یہ مقامات واقع ہوں گے۔ ان کی محاذات و مسابقت سے احرام باندھنا ہوگا۔

اگر محاذات کی جگہ متعین نہ ہو سکے اور علم یا ظن غالب سے تعین ممکن نہ ہو تو اس وقت ایسے مقام سے احرام باندھنا ہوگا جس کا فاصلہ کم از کم دو مرحلہ عرفیہ یا تین مراحل شرعیہ ہوں۔ کیونکہ قریب ترین مراقبت کا فاصلہ اتنا ہی ہے ظاہر ہے کہ میقات یا محاذات میقات سے تجاوز جائز ہونے کی صورت ہے کہ محاذات میقات مجہول ہو، نیز جہدہ تمام فقہاء حنفیہ کی تصریحات کے مطابق داخل میقات ہے اب جو شخص بحری سفر کر رہا ہو، محاذات میقات سے بلا احرام گزرے گا، اور داخل میقات کے مقام پر پہنچے گا۔ اس پر تجاوز عن المیقات بلا احرام کا حکم لگے گا، رہا کہ محاذات کا علم صحیح طریقہ سے ممکن نہیں، یہ بات صحیح نہیں۔ آج کل کے آلات اور نقشہ جات اور ہماز رانوں کی معلومات کے پیش نظر یہ محض خیال خام ہے۔ نیز آج کل پاکستان سے جو ہماز جاتے ہیں۔ ہماز ران تمام مسلمان ہوتے ہیں، اطلاع دینے والے کافر کا سوال بھی ختم ہو جاتا ہے۔

شیخ ابن حجر مکی کا یہ فرمانا کہ جب تجاوز یمینہ و یسرة یعنی دائیں بائیں ایسے حال میں ہو کہ مسافر کا رخ مکہ کے سمت میں نہ ہو اور جب رخ مکہ کی طرف ہو اس وقت محاذات میقات سے احرام باندھنا ہوگا۔ قابل اطمینان نہیں ہے جب مسافر کا قصد مکہ ہی ہے اور آگے چل کر صحیح تعین محاذات مشکل ہو پھر متعین محاذات کو چھوڑنا غیر معقول ہے۔ جبکہ میقات سے اور محاذات میقات سے احرام باندھنا زیادہ بہتر ہو۔ اور اسی وجہ سے ابن حجر مکی کے چند شارحین نے ان کی رائے کی مخالفت کی ہے۔ اگرچہ طارخلاف کچھ اور ہے۔ صرف اتنی بات تجاوز عن المیقات کے لیے کہ مسافت جہدہ اور ملیم۔ برابر ہے، جہدہ سے احرام باندھنے کے لیے کافی نہیں یہ تو صرف اسی وقت حکم ہے کہ محاذات میقات کا تعین نہ ہو سکے، بہر حال جو کچھ ابن حجر مکی

نے فرمایا ہے، وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے اور تعجب ہے کہ موصوف نے دعویٰ کی تائید یا تدلیل میں کوئی فقہی یا حدیثی دلیل پیش نہیں فرمائی۔ اس لیے موصوف کا دعویٰ بلا دلیل پر اتنی بڑی بنیاد قائم کرنا صحیح نہیں اور میرے نزدیک فقہی مسئلہ یہی ہے کہ بحری مسافر کو یلم کی محافات ہی سے احرام باندھنا ضروری ہے۔ ورنہ دم لازم آئے گا۔ اور توبہ بھی کرنا پڑے گی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط سُبْحٰنَكَ لَا
عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا انكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ
الْحَكِیْمُ ط بِنْدَه نَعْمُ سَلَامَاتٌ مِیْقَاتُ

مولانا مفتی رشید احمد صاحب
مدرسہ اشرف المدارس کی رائے!

پر قدیماً و حدیثاً، اجتماعاً و انفراداً جب بھی غور کیا تو ہر دفعہ یہی نتیجہ نکلا کہ محاذات بصورت دائرہ لی جائے گی۔ یعنی مکہ مکرمہ سے جس مقام کا فاصلہ میلوں کے اعتبار سے میقات کے فاصلے سے برابر ہوگا، وہ مقام محاذی میقات کہلائے گا، اس نظریہ پر مختصراً چند لائل عرض کرتا ہوں۔

۱۔ محاذات میقات کے اصل معنی یہ ہیں کہ مکہ مکرمہ کی طرف جاتے ہوئے میقات کے دائیں بائیں جانب برابر ہو جائے گا کافی التحفة الماسامة، بان کان علی یمنہ او یسارہ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ معنی اسی صورت میں متعین ہو سکتے ہیں کہ مسافت کی مساوات میلوں کے اعتبار سے لے لی جائے، البتہ میقات سے بہت دور سے گذر ہو تو دونوں میں تفاوت ہوگا۔

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے قول فانظروا حذوہا من طریقکم سے بھی ظاہر ہے کہ اصل اعتبار میقات کے دائیں یا بائیں جانب سے مسافت کا ہے جو کہ مساواة بعد بحسب الامیال کو مستلزم ہے۔ الایہ کہ میقات سے بہت دور سے گذر ہو بلکہ من طریقکم کا لفظ بتلار ہے کہ مسامتت انسان کی بجائے محاذات مقام یعنی مساواة مسافت کا اعتبار کیا جائے گا اور مسافت کی صحیح مساواة مراحل ترک کسور سے نہیں ہو سکتی۔

۲- وان لم يعلم المحاذاة فعلى مرحلتين من مكة كجدة المحروسة من طرف البحر (ارشاد الساری) اس سے ثابت ہوا کہ محاذاة میں مساواة مسافت کا اعتبار میلوں سے کیا جائے گا نہ کہ مراحل سے۔ کیونکہ اکثر مواقیات مرحلتیں پر ہیں پس اگر محاذاة میں بعد بحساب مراحل لیا جائے تو عبارت مذکور کا حاصل یہ نکلے گا۔ وان لم يعلم بعد المرحلتين فعلى مرحلتين، وهو بين البطلان۔

۳- عبارة الوفاي۔ فله ان يؤخر احرامه من محاذاة يللم الى راس العلم المعروف قبل مرسى جدة وهو حال توجه السفينة الى جهة الحرم و ليس له ان يؤخر الى جدة لانها اقرب من يللم بنحو الرابع وقولهم ان جدة و يللم مرحلتان مرادهم ان كلا لا ينقص عن مرحلتين وان تفاوتت المسافتان كما حقق من سلك الطريقين وهو عدد كادوا ان يتواتروا الخ (حاشیہ شروانی علی تحفہ) اس سے معلوم ہوا کہ جن حضرات نے مرحلتیں کا اعتبار کرتے ہوئے جدہ کو یلیم سے محاذی قرار دیا ہے، ان کا بھی یہ مقصد نہیں کہ میلوں کا فرق غیر معتبر ہے بلکہ ان کے نظریہ کی بنیاد اس پر ہے کہ انہوں نے مرحلتیں کے اطلاق سے دونوں کی مسافت کو مساوی سمجھ لیا، لہذا اس پر تنبیہ کی گئی کہ دونوں کی مسافت مساوی نہیں بلکہ یلیم بعد ہے۔

۴- قال الشروانی الاموال اول وهو ان مبنى المواقیات علی التقریب کلاماً التحفة والنهاية و يلزم صریح خلافہ (حاشیہ شروانی ص ۲۶) حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ مختلفۃ المسافت مواقیات کو دو مرحلے لکھتے ہیں اس پر کوئی دلیل نہیں کہ محاذاة میں میلوں کا فرق غیر معتبر ہے، اس سے تو صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مسافت کو شمار کرتے وقت مراحل کی کسور کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی مراحل کی خصوصیت نہیں، بلکہ ہر حساب میں ترک کسور کی عام عادت تھی، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان مواقیات کی مسافت کھرا بر قرار دیا ہے۔ ورنہ قرن المنازل کو آخر المواقیات قرار دینے کے کیا معنی؟ ڈھائی یا پونے تین مراحل

کو بحدف کسر و درجہ تک کہا جاسکتا ہے مگر دو اور پونے تین مراحل کی مسافت کو برابر کہنا معقول نہیں۔ جیسے کہ دو ہزار اور پونے تین ہزار کو برابر نہیں کہا جاسکتا۔ یہ امر ویسے بھی بدیہی ہے اور مسلم ہے کہ مساواة باہم بالکل برابری کو کہا جاتا ہے۔ البتہ اتنا قلیل فرق کہ جس کا حساب مشکل ہو، عرفاً بدرجہ ہوتا ہے، چونکہ احکام شرعیہ کا مدار ریسر پر ہے۔ لہذا مسافت کی مساواة معلوم کرنے میں فرلانگ وغیرہ کا حساب لگانا تو ضروری نہیں بلکہ ایک آدھ میل کا فرق بھی نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ مگر میلوں کا حساب تو سہل ہے، ہاں اگر کہیں میلوں کا حساب بھی مشکل ہو تو اسے بھی بدرجہ کیا جاسکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرن المنازل کی محاذاة میں ذات عرق کی تعیین اسی طرح فرمائی تھی۔ بعض حضرات کا جہہ اور ملیم کی مسافت کو برابر کہنا بھی اسی پر مبنی ہے۔

آگے یہ بحث رہ جاتی ہے کہ ملیم اور جہہ میں سے کسی کی مسافت زیادہ نہیں ہے سو جدید تحقیقات کے علاوہ متقدمین نے بھی ملیم کی مسافت زیادہ ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔ وان لم يعلم المحاذاة فعلی من حلتین من مکة کذا۔ اور حضرت عائشہ اور حضرت عائشہ اور حضرت سہارنپوری قدس سرہما کے فتاویٰ بھی اسی پر مبنی ہیں کہ ملیم کی محاذاة جہہ پہنچنے سے قبل ہو جاتی ہے۔ اگر کسی نے دونوں کو برابر کہا ہے تو دوسرے حضرات نے اسے عدم العلم پر مبنی قرار دیا ہے، ملیم کی البعدیت قول الاکثر اور احوط ہونے کے علاوہ ارجح بھی ہے۔ اس لیے کہ قول مساواة تو اندازاً بھی کیا جاسکتا ہے اور حکم تفاوت خصوصاً مقدار زیادہ کی تعیین اور دوسرے پر عدم علم کا حکم (کافی ماشیہ شروانی) بدون کامل تحقیق کے نہیں لگایا جاسکتا۔ بلکہ قول الوفاؤ وکما حقیقہ من سلك الطريقین و هم عدد کادوا ان یتواتروا۔ میں اس کی تصریح ہے کہ یہ فیصلہ جم غفیر نے کامل تحقیق کے بعد کیا ہے۔ شروانی نے وفائی اور عبدالرؤف تلمیذ شامی جو مقدار زیادہ کی تعیین نقل فرمائی ہے۔ تحقیقات جدیدہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ محاذاة ملیم کا علم ہوتے ہوئے (جو اس زمانہ میں مشکل نہیں) جہہ تک تجاوز

بدون احرام ناجائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

رشید احمد عفی عنہ، از اشرف المدارس ناظم آباد کراچی۔

۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ۔

مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کے علمی اور عملی کمالات مجھ پابریکاب ضعیف کے لیے قابل غبطہ ہیں، زادہم اللہ تعالیٰ علماً نافعاً و عملاً متقبلاً زیادات لا متناہی۔

لیکن جن وجوہ کی بنا پر ان حضرات نے بحری مسافروں کے لیے جدہ سے احرام باندھنے کو ناجائز موجب دم قرار دیا ہے۔ ان پر احقر کا قلب منشرح نہیں۔ احقر نے جہاں تک غور و فکر کیا، ترجیح اسی کی معلوم ہوئی کہ بحری مسافروں کے لیے جدہ تک احرام کو مؤخر کرنا اور جدہ سے باندھنا نہ کوئی گناہ ہے نہ اس سے دم لازم آتا ہے۔

اس کی تفصیلی وجوہ کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔ اجمالاً پھر اختصار کے ساتھ یہ ہے کہ ۱۔ یلیم کی محاذات سے جو تجاوز بحر میں ہوتا ہے وہ تجاوز آفاق کے اندر ہے، جل یا جہت حرم کی طرف نہیں ہے۔ اس کو موجب دم قرار دینا سمجھ میں نہیں آتا، جن لوگوں کا راستہ یلیم سے مکہ معظمہ کی طرف براہ راست جانے کا تھا یا اب ہے، وہ اگر یلیم کی محاذات سے جانب مکہ مکرمہ تجاوز کریں تو بے شک دم واجب ہوگا، لیکن آج کل بحری جہاز کے مسافر سمندر میں یلیم سے تقریباً بیس میل کے فاصلہ سے آفاق کے اندر سفر کرتے ہیں۔ ان کا یہ سفر تجاوز عن المیقات یا عن ذات المیقات نہیں کہلا سکتا۔

۲۔ جدہ کو فقہاء کا داخل میقات کہنا بھی اس کے منافی نہیں کہ جدہ سے احرام باندھنے کو جائز قرار دیا جائے، کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جتنے بھی مواقیت ہیں وہ سب اجزاء حل ہوتے ہیں۔ باہر سے بقصد مکہ مکرمہ آنے والا یہاں سے احرام باندھ سکتا ہے اور یہاں کا یا اس کے قرب و جوار کا رہنے والا حل کہلاتا ہے۔ اس کے لیے دخول مکہ بلا احرام جائز ہے، اسی لیے فقہاء نے ضرورت کے مواقع کے لیے یہ حیلہ لکھا ہے کہ جو شخص باہر سے بقصد جدہ، جدہ میں داخل ہو اس پر احرام لازم نہیں۔ پھر جدہ میں مقیم ہو کر اگر وہ مکہ مکرمہ میں بلا قصد حج و عمرہ جانا چاہے تو اس وقت بھی اس پر

احرام کی پابندی نہیں۔

۳۔ بحری جہاز یلملم کی محاذات سے آگے جو جدہ کی طرف سفر کرتا ہے، وہ تمام سفر آفاق میں ہے۔ جب جہاز بڑے سمندر سے ساحل جدہ کا رخ کرتا ہے اس وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب محاذات میقات کس جگہ ہوگی۔ اس کے متعلق عامہ فقہاء کا ارشاد یہ ہے کہ حقیقی محاذات کا علم ہونا مشکل ہے۔ اس لیے اقرب مواقیت کی مسافت کا اعتبار کر لیا جائے، یعنی جس جگہ سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ دو مرحلہ وہاں سے احرام باندھنا ضروری ہوگا اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جدہ سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ دو مرحلہ ہے۔ اسی لیے شیخ ابن حجر مکی، ملا علی قاری، مخدوم ہاشم سندھی، و املا اخوندجان وغیرہ اکابر علماء نے جدہ کو بحکم میقات قرار دیا۔

یہ معاملہ کہ آج کل حقیقی محاذات کا علم کچھ دشوار نہیں۔ کیونکہ فاصلوں کی پیمائش اور زاویوں کی تحقیق کے ایسے جدید آلات موجود ہیں، جن کی وجہ سے حقیقی محاذات معلوم کرنے کو مشکل کہنا بے معنی ہے۔ اس میں قابل نظر یہ بات ہے کہ بلاشبہ پیمائش کے آلات و ذرائع تو اس زمانے میں بہت موجود ہیں، سیاروں کے فاصلے اور زاویے ان سے صحیح لگائے جاسکتے ہیں، زمین کی مسافتوں کا تو کہنا کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مبداء و منتہی کا تعین تو آلات سے نہیں روایات سے ہوگا۔ منتہی تو متعین ہے کہ بیت اللہ ہے لیکن مبداء یعنی میقات جس کی محاذات دیکھنا ہو وہ کیا ہے، اس کا عرض و طول کتنا ہے۔ اس کے کس گوشہ سے محاذات دیکھی جائے گی یہ کام تو جدید آلات کا نہیں، اس میں تو قدیم فقہاء کا قول ہی مستند ہو سکتا ہے۔ تحفہ شرح منہاج کے حواشی سے یہ بات اوپر لکھی جا چکی ہے کہ یلملم جس کی محاذات کا یہاں اعتبار کرنا زیر بحث ہے وہ حسب تصریح فقہاء سعودیہ کے بالمقابل پہاڑ ہے اور یہ پہاڑ دو ہیں، ایک پہاڑ سے مکہ مکرمہ کی مسافت دو مرحلہ سے بھی زائد ہے اور دوسرے پہاڑ سے مسافت دو مرحلے سے بھی کم ہے۔

فتح الباری، عمدۃ القاری اور تمام کتب معتبرہ میں بحوالہ ابن حزم یلملم سے جو مسافت

مکہ مکرمہ کی بیان کی گئی ہے، وہی قابل اعتماد ہے۔ آج کل کے نئے پیمائش کرنیوالوں میں کسی نے تو خود سعدیہ ہی کو یلیم قرار دے کر وہاں سے مسافت لی ہے، کسی نے کسی دوسری جگہ سے، ان کے آلات اور پیمائش کے حسابات کتنے ہی صحیح ہوں، مگر مبداء کے تعین میں ان کا قول بمقابلہ علماء سابقین کے کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور ان حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ یلیم کی محاذات بھی مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ ہے۔ اور جدہ کی مسافت بھی۔ اب رہا میلوں کا فرق، سوا احکام شرعیہ کا مدار کسی جگہ بھی اسی طرح کی تدقیقات پر نہیں ہے۔ مواقیت کے مسائل و احکام پر نظر کرنے سے یہ بات بہت واضح ہو جاتی ہے کہ اس معاملہ میں اتنی تدقیق کا اعتبار نہیں کیا۔ یہ سطور اتفاق سے ایسے حال میں لکھ رہا ہوں جبکہ ایک شدید مرض کی وجہ سے اٹھنے بیٹھنے پر قدرت نہیں، لیٹے ہوئے لکھی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ آراء مختلفہ مع وجہ کے علماء کے سامنے آجائیں تاکہ ان میں غور کر کے وہ کوئی فیصلہ فرمادیں۔

ایسے حالات میں کہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف رائے عوام کے لیے | ہے۔ احتیاط اسی میں ہے کہ بحری جہاز میں یلیم ہی سے احرام باندھ لیں۔

یا سائل جدہ پر اترنے سے پہلے احرام باندھ لیں کیونکہ حسب تصریح فقہاء عمل اختلاف میں احتیاط کا پہلا اختیار کرنا بہتر ہے تاکہ اپنی عبادت کے جواز میں کسی کا اختلاف نہ رہے۔ اس کے علاوہ احرام کو میقات سے پہلے باندھنا سب ہی کے نزدیک افضل ہے، بلکہ بعض روایات حدیث میں اپنے گھر سے ہی احرام باندھ کر چلنے کی فضیلت آئی ہے۔ شرط یہ ہے کہ محظورات احرام میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو اور جس کو یہ خطرہ ہو کہ محظورات احرام سے بچنا اس تمام عرصہ میں، اس کے لیے مشکل ہوگا۔ اس کے لیے آخری حد تک مؤخر کرنا بہتر ہے۔ ایسے شخص کو آخری حد میں اتنی احتیاط کر لینا چاہیے کہ اس کا احرام علماء کے اختلاف سے نکل جائے۔

واللہ سبحانہ و تعالیٰ نسأل ان یهدینا لما اختلفت فیہ الی الحق باذنہ

وهو ولي التوفيق والسداد والى صواب وبه نستعين ولا حول ولا
قوة الا به۔

حدِ مواقیت کے اندر رہنے والے | اوپر جو احرام کے احکام کا بیان ہوا ہے
وہ اہل آفاق کے لیے ہے یعنی جو طوق

مواقیت سے باہر تمام دنیا میں کسی جگہ رہتے ہیں۔ اور وہاں سے بقصد مکہ مکرمہ حل صغیر
یعنی حدود مواقیت کے اندر داخل ہوتے ہیں، ان پر مواقیت یا ان کی محاذات سے احرام
باندھنا لازم ہے اور جو لوگ خود مواقیت اور یا ان کے اور حد حرم کے درمیان کے رہتے
والے ہیں جس کو حل کہا جاتا ہے، ان کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ حج یا عمرہ کے سوا کسی
دوسرے کام کے لیے مکہ مکرمہ جانا چاہیں تو ان پر احرام باندھنے اور حج یا عمرہ کرنے کی
کوئی پابندی باتفاق ائمہ نہیں ہے۔ وہ جیسا چاہیں بلا احرام مکہ مکرمہ جاسکتے ہیں۔
ہاں اگر حج یا عمرہ کے ارادے سے جائیں تو ان کے لیے افضل تو یہ ہے کہ اپنے
گھر سے ہی احرام باندھ لیں ورنہ حد حرم میں داخل ہونے سے پہلے احرام باندھنا لازم و
واجب ہوگا۔ بقصد حج و عمرہ اگر یہ لوگ حدود حرم میں بلا احرام داخل ہوں گے تو ان پر
بھی دم (قربانی) لازم ہوگی۔

مناسک ملا علی قاری میں ہے:-

الصف الثاني وهم الذين منازلهم في نفس الميقات
او داخل الميقات الى الحرم فوقتهم الحلال اي فيقاتهم
جميع المسافة من الميقات الى انتها الحلال للحج و
العمره وهم في سعة اي جواز و رخصة و عدم
لذوم كفارة ما لم يدخلوا ارض الحرم اي بلا احرام و
من دويقة اهلهم افضل و لهم دخول مكة بغير

احرام اذا لم يريدا نسكا۔ (ارشاد الساری ص ۵۷)

مسئلہ۔ اگر کوئی حدود میقات کے اندر یعنی حل صغیر میں رہتا ہے اور کسی ضرورت

سے آفاق یعنی حدود میقات سے باہر گیا تو وہ بھی آفاقی کے حکم میں ہوگا یعنی اگر وہ بھی بقصد دخول مکہ مکرمہ یا حرم حد میقات کے اندر آئے گا تو اس پر بھی احرام حج یا عمرہ کا لازم ہو جائے گا۔ اب بغیر احرام کے اس کو مکہ مکرمہ یا حرم میں داخل ہونا جائز نہیں ہوگا ہاں آفاق سے واپس اپنے گھر آنے کا قصد ہو، مکہ مکرمہ یا حرم کا اس وقت ارادہ نہ ہو تو اپنے گھر میں بلا احرام آسکتا ہے اور جب یہاں بلا احرام پہنچ گیا، اب اگر یہاں سے مکہ معظمہ جانے کی کوئی ضرورت پیش آئے تو بغیر احرام کے جاسکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں اس کا جانا بقصد حج و عمرہ نہ ہو، کسی اور ضرورت کے لیے ہو۔

مسئلہ یہ جو اوپر لکھا گیا ہے کہ جو لوگ عین میقات پر یا داخل میقات رہتے ہیں ابھی سے مراد یہ ہے کہ تمام مواقت کے اندر رہتے ہیں، ان کا وہ حکم ہے جو ابھی لکھا گیا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو کسی ایک میقات کے اندر ہیں۔ مگر دوسرے میقات سے باہر جیسے ذوالحلیفہ سے رابع تک کے وہ مقامات جو حد حل میں داخل ہیں ان کے رہنے والے میقات ذوالحلیفہ کے تو اندر ہیں مگر میقات جحفہ کے باہر، تو ایسے لوگوں کا حکم یہ ہے کہ وہ بھی آفاقی لوگوں کے حکم میں ہیں، ان کے لیے دخول مکہ مکرمہ یا حرم بغیر احرام کے جائز نہیں۔ (حاشیہ ارشاد الساری بحوالہ درالمنہار ص ۵۷)

مسئلہ۔ جبکہ مشرقی ممالک سے بحری راستہ پر آنے والوں کے لیے جدہ کو میقات قرار دیا گیا جیسا کہ پہلے بتلایا گیا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جدہ والے بھی مکہ مکرمہ میں بغیر احرام کے نہ جاسکیں، کیونکہ مواقت سبب اجزاء حل ہوتے ہیں۔ ان میں یا ان کے قرب و جوار میں رہنے والوں پر بدون حج و عمرہ کے احرام کی کوئی پابندی نہیں ہوتی، اسی لیے بعض فقہاء نے اس شخص کے لیے جو کسی وجہ سے احرام باندھنے پر مجبور ہو، حیلہ یہ لکھا ہے کہ وہ اپنے سفر میں جدہ یا خلیص کا قصد کر کے دائرہ مواقت یعنی حل صغیر میں داخل ہو جائے۔ اور جب وہ ان مقامات میں سے کسی جگہ جا کر اتر گیا تو وہ بھی میقاتی اور حلی لوگوں کے حکم میں ہو گیا۔ اب اگر وہ بلا قصد حج و عمرہ کسی ضرورت سے مکہ مکرمہ جانا چاہے تو وہ بھی بغیر احرام کے

جاسکتا ہے۔

حدود حرم کے اندر رہنے والے | جو لوگ حدود حرم کے اندر مثلاً مکہ مکرمہ یا منیٰ وغیرہ میں رہتے ہیں۔ اگر وہ حج کا

ارادہ کریں تو ان کا میقات حرم ہی ہے۔ حدود حرم میں جہاں سے چاہیں، احرام باندھ سکتے ہیں۔ اور بہتر یہ ہے کہ مسجد حرام سے یا اپنے گھر سے احرام باندھیں۔ اور اگر عمرہ کرنا چاہیں تو ان کا میقات حل ہے۔ جو حدود حرم سے باہر ہے وہ حدود حرم سے باہر تنعیم یا جعرآنہ وغیرہ میں جا کر عمرہ کا احرام باندھیں۔ پھر مکہ مکرمہ آکر افعال عمرہ ادا کریں۔

مسئلہ۔ جو لوگ آفاق کے رہنے والے مکہ مکرمہ یا حدود حرم میں داخل ہو نہیں ان کا بھی حکم وہی ہے جو اہل مکہ کا ہے۔ کہ اگر یہ عمرہ کرنا چاہیں تو حدود حرم سے باہر تنعیم یا جعرآنہ جا کر احرام باندھیں اور حج کا احرام حرم ہی سے باندھیں۔
مسئلہ۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آفاقی لوگ جو اشہرج میں جو شوال سے ذی الحجہ تک ہیں۔ احرام عمرہ باندھ کر داخل ہوئے اور عمرہ کر کے حلال ہو گئے ان کا یہ عمرہ تمتع کا ہوگا۔ اس عمرہ کے بعد حج سے پہلے کوئی دوسرا عمرہ یہ نہیں کر سکتے، حج سے فارغ ہونے کے بعد عمرہ کر سکتے ہیں۔

مسئلہ۔ جو آفاقی آدمی اشہرج سے پہلے یعنی شوال شروع ہونے سے پہلے پہلے مکہ مکرمہ میں عمرہ کا احرام باندھ کر آئے اور عمرہ کر کے حلال ہو گیا۔ اس کا یہ عمرہ تمتع کا نہیں ہے۔ اس لیے اس کو شوال شروع ہونے سے پہلے دوسرے عمرے کرنے کا بھی اختیار ہے۔

مسئلہ۔ کوئی مکہ مکرمہ یا حدود حرم کے اندر کارہنے والا اگر حدود میقات سے باہر آفاق میں کسی وجہ سے چلا جائے تو اب اس کا حکم بھی آفاقی کا حکم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ وہاں سے مکہ مکرمہ یا حدود حرم کے اندر جانے کے قصد سے حدود مواقیت کے اندر آئے گا۔ تو اس پر لازم ہے کہ میقات یا محاذات میقات سے احرام

باندھ کر آئے، بغیر احرام کے داخل ہونا آفاق میں جانے کے بعد اس کے لیے بھی جائز نہیں۔

والله سبحانه وتعالى اعلم - والحمد لله اوله
وآخره وعلانيته وسره - ربنا تقبل منا، انك

انت السميع العليم

ناکارۃ خلاق بندہ محمد شفیع

خادم دارالعلوم کماچی

۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ



منہج الخیر

الجزعین الغیر

حج بدل اور اس کے احکام

مقامِ تالیف _____ دارالعلوم کراچی ۱۴
 زمانہ تالیف _____ رجب ۱۳۹۲ھ
 اشاعتِ اول _____ ماہنامہ البلاغِ شجران ۹۲ھ

”اس مقالہ کا موضوع نام سے ظاہر ہے،
 اس کا اصل محرک اس مسئلہ کی تحقیق تھی کہ
 حج بدل کرنے والا قرآن یا تمتع کر سکتا ہے یا نہیں؟
 پھر ضمناً دوسرے مسائل بھی اس میں جمع کر دیے گئے“

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

منہج الخیر فی الحج عن الغیر

حج بدل اور اس کے احکام

حج بدل کے مسائل سے پہلے ایک اصولی سوال کا جواب سمجھ لیجیے۔ سوال یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کی طرف سے کوئی عبادت ادا کر سکتا ہے یا نہیں۔ اس میں یہ تفصیل ہے کہ عبادت کی تین قسمیں ہیں۔ ایک عبادت بدنی جیسے نماز روزہ، دوسرے عبادت مالی جیسے زکوٰۃ، صدقہ الفطر، تیسرے وہ عبادت جو بدنی اور مالی کا مجموعہ ہے، یعنی اس میں کچھ مال بھی خرچ ہوتا ہے۔ کچھ جسمانی محنت بھی اٹھانی پڑتی ہے۔ جیسے حج و عمرہ وغیرہ۔

ان تینوں قسم کے احکام یہ ہیں کہ عبادت بدنیہ میں تو ایک کا فرض کوئی دوسرا آدمی مطلقاً ادا نہیں کر سکتا، ایک کی نماز کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا۔ ایک کا روزہ دوسرا نہیں رکھ سکتا۔ اور عبادت مالیہ میں مطلقاً ایک کا فرض دوسرا ادا کر سکتا ہے۔ جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ کسی کو بھی اپنا وکیل بنا کر زکوٰۃ اس کے ذریعہ ادا کر سکتا ہے۔ اس کا مسلمان ہونا بھی شرط نہیں اور کوئی دوسرا آدمی اپنے مال سے دوسرے کی زکوٰۃ فرض اس کی اجازت کے ساتھ ادا کر سکتا ہے، اس میں کوئی شرط نہیں۔

تیسری قسم یعنی وہ عبادت جو مالی اور بدنی سے مرکب ہے اس کا حکم یہ ہے کہ خود ادائیگی پر قادر ہونے کی حالت میں تو کوئی دوسرا اس کی طرف سے ادا نہیں کر سکتا۔ البتہ

خود قدرت نہ ہو تو ضرورت کے وقت دوسرا آدمی اس کا فرض ادا کر سکتا ہے۔ حج اسی قسم میں داخل ہے کیونکہ اس میں مال بھی خرچ ہوتا ہے اور محنت بھی۔ اس تیسری قسم کے لیے کچھ شرائط ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

مسئلہ۔ یہ حکم ان فرض اور واجب عبادات کا ہے جو مالی اور بدنی دونوں عبادات پر مشتمل ہوں۔ کہ ایک کا فرض دوسرا آدمی ادا کر دے۔ لیکن نفل عبادات میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی عبادت کا ثواب جس کو چاہے بخش دے۔ خواہ عبادت بدنی نماز، روزہ ہو یا مالی صدقات ہوں۔ یا حج وغیرہ جو دونوں سے مرکب ہیں وہ ہوں، ہر قسم کی نفل عبادت کا ثواب ہر آدمی کو حق ہے کہ جس کو چاہے بخش کر سکتا ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ عبادت کرنے کے بعد دل سے نیت کر لے اور زبان سے کہہ دینا زیادہ بہتر ہے کہ اس عبادت کا ثواب فلاں شخص کو پہنچے۔ اس میں یہ بھی اختیار ہے کہ ایک عبادت کا ثواب چند آدمیوں کو پہنچا دے۔ اہل سنت والجماعت کا یہی مسلک ہے کہ جو شخص اپنی عبادت کا ثواب کسی کو بخش دے تو وہ اس کو پہنچتا ہے البتہ بعض ائمہ فقہاء کے نزدیک بدنی عبادت کا ثواب کسی دوسرے کو نہیں بخشا جا سکتا (ہدایہ) اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص نفل طور پر اپنے حج یا عمرہ کا ثواب دوسرے کو بخش دے تو یہ بھی جائز ہے اور اس کے لیے کوئی شرط نہیں، جبکہ یہ حج و عمرہ اپنے مال سے کیا ہو۔ اور اگر آمر اپنا مال اور خرچ دیکر اپنی طرف سے نفل حج یا عمرہ کرنے کے لیے کسی کو بھیجے تو اس میں چند شرائط.... ضروری ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

حج بدل فرض کے احکام | نفل حج بدل کے احکام بعد میں بیان کیے جائیں گے۔

مسئلہ۔ جس شخص پر حج فرض ہو گیا اور اس نے ادا نہ کیا ہو یا وہ حج کا زمانہ بھی پایا۔ مگر باوجود قدرت کے کسی وجہ سے حج ادا نہ کیا پھر وہ حج سے معذور اور عاجز ہو گیا تو اس پر فرض ہے کہ اپنی طرف سے کسی کو بھیج کر خود حج بدل کرائے یا وصیت کرے کہ میرے بعد میری طرف سے حج کرایا جائے۔

مسئلہ۔ اگر حج کی مالی استطاعت حاصل ہو جانے کے بعد زمانہ حج آنے

سے پہلے فوت ہو گیا تو وصیت کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ حج اس کے ذمہ سے ساقط ہو گیا، اسی طرح اگر یہ شخص پہلے ہی سال حج کے لیے روانہ ہو گیا پھر حج سے پہلے فوت ہو گیا تو اس کے ذمہ سے بھی حج ساقط ہو گیا، وصیت کی ضرورت نہیں۔ ہیناسک ملا علی قاری،

حج سے عاجز و معذور قرار دینے کی شرائط | حج سے عاجز اور معذور ہونے کی ایک صورت تو وہ ہے جو اوپر گزری، کہ

حج کا موقع پانے سے پہلے انتقال ہو گیا، اس میں توجہ سرے سے ساقط ہی ہو جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی نے اس کو قید کر لیا یا زبردستی مکہ معظمہ جانے سے روک دیا۔ تیسری یہ کہ کوئی ایسا مرض پیش آ گیا جس سے صحت کی امید نہیں۔ مثلاً اپانج یا نایینا یا ننگڑا ہو گیا یا بڑھاپے کا ضعف ایسا ہو گیا کہ خود سواری پر سوار نہیں ہو سکتا۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ راستہ مامون نہیں رہا۔ سفر کرنے میں جان و مال کا اندیشہ ہے۔ پانچویں صورت خاص خورتوں کے لیے یہ ہے کہ کوئی محرم ساتھ کے لیے نہ بلا۔ ان سب صورتوں میں اس کو معذور سمجھا جائے گا۔ بشرطیکہ یہ عذر موت تک مسلسل جاری رہا ہو اگر یہ اعذار قبل الموت رفع ہو جائیں، مگر پھر خود زمانہ حج پانے کی صورت میں حج کرنے کی نوبت نہ آئے تو حج بدل کرانا یا اس کی وصیت کرنا واجب ہے اور اگر مرنے تک یہ اعذار قائم رہے تو امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک مشہور روایت کے مطابق وصیت کرنا واجب نہیں بشرطیکہ عذر سے پہلے زمانہ حج نہ پایا ہو، کیونکہ شرط نہ پانے کی وجہ سے فرض ساقط ہو گیا۔ اور صاحبین کے نزدیک مالی استطاعت تو ایسی شرط ہے کہ اس کے نہ ہونے یا ایام حج آنے سے پہلے ختم ہو جانے کی وجہ سے فرض حج ساقط ہو جاتا ہے۔ باقی شرائط وجوب حج کے لیے نہیں بلکہ ادائے حج کے لیے ہیں۔ ان کے فوت ہو جانے کی وجہ سے فرض ساقط نہیں ہوتا۔ مگر جب خود ادا کرنے پر قدرت نہ رہے تو حج بدل کی وصیت کرنا واجب ہے، محقق ابن ہمام وغیرہ نے صاحبین کے مذہب کو ترجیح دی ہے، اس لیے احتیاطاً ان سب صورتوں میں یہ ہے کہ حج بدل

کی وصیت کر جائیں اور وارث حج بدل کرادیں۔ (مناسک ملا علی قاری)

حج بدل کی شرائط | یہ شرائط کتب فقہ میں مذکور ہیں، یہاں ملا علی قاری کے مناسک سے لکھی جاتی ہیں، لیکن ترتیب کچھ بغیرورت بدل گئی ہے۔ جس شخص کے ذمہ حج فرض ہو یا اس نے بذریعہ نذر (منت) اپنے اوپر حج یا عمرہ کو لازم کر لیا ہو۔ پھر خود ادا کرنے کی قدرت نہ رہی جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے تو ایسے شخص کا حج یا عمرہ بطور بدل ادا کرنے کے لیے بیس شرطیں ہیں۔ ان شرائط میں دو لفظ بار بار آئیں گے۔ ان کے معنی سمجھ لیجیے، ایک امر دوسرا امور، حج کرانے والے کو امر کہتے ہیں اور جو دوسرے کے حکم سے حج بدل کرتا ہے اس کو امور کہتے ہیں۔

پہلی شرط: یہ ہے کہ جس شخص کی طرف سے حج بدل کیا جا رہا ہو اس پر حج بدل کرانے کے وقت حج فرض ہو۔ اگر اس وقت اس پر حج فرض نہیں تھا، اس حالت میں اپنی طرف سے حج بدل کرادیا تو یہ نفلی حج ہوا، اگر اس کے بعد اس کو حج کی استطاعت ہو تو حج فرض ہو گیا اب دوبارہ حج خود کرنا پڑے گا۔ خود نہ کر سکا تو حج بدل دوبارہ کرنا پڑے گا۔

دوسری اور تیسری شرط: دائمی عجز اور حج بدل کرانے سے پہلے عاجز ہونا ہے یعنی جن اعذار کی وجہ سے انسان کو حج سے عاجز قرار دیا گیا ہے جس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے، ان اعذار کا موت تک باقی رہنا۔ حج بدل کرانے سے پہلے موجود ہونا بھی فرض حج بدل کے لیے شرط ہے۔ اگر کسی معذور شخص کا حج بدل کرا دینے کے بعد عذر رفع ہو گیا اور حج پر قدرت ہو گئی، مثلاً بیمار تھا اچھا ہو گیا۔ عورت کو محرم مل گیا تو دوبارہ خود حج ادا کرنا ضروری ہو گا۔ اور جو حج بدل پہلے کرایا ہے، وہ نفلی حج ہو جائے گا۔ (مناسک ملا علی)

چوتھی شرط: یہ ہے کہ جس کا حج فرض ادا کرنا ہے، اس کی طرف سے حج بدل کرنے والے کو امر کیا گیا ہو۔ یا کم از کم اجازت دی گئی ہو، اگر اس کے امر و اجازت کے بغیر کسی شخص نے اس کی طرف سے حج بدل کر دیا تو اس کا فرض ادا نہ ہو گا۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جس پر حج فرض تھا اور اس نے ادا نہیں کیا اور ادا کرانے کے لیے وصیت بھی نہیں کی تو کوئی آدمی اگر اس پر احسان کر کے اس کی طرف سے حج بدل کر دے تو اس کا حج فرض ادا نہ ہوگا۔ لیکن امام اعظم ابو حنیفہؒ نے ایک حدیث کی بناء پر فرمایا کہ اگر کسی شخص نے اپنے والدین کی طرف سے یا کسی اور وارث یا اجنبی نے اپنے مرنے والے عزیز کی طرف سے بغیر اس کے امر اور وصیت کے ہی حج بدل ادا کر دیا تو انشاء اللہ اس کا فرض ادا ہو جائے گا انشاء اللہ علیہ کہا کہ کسی نص صریح سے اس کا ادا ہو جانا یقینی طور پر ثابت نہیں۔

پانچویں اچھی باتوں میں شرط: یہ ہے کہ مأمور یعنی حج بدل کرنے والا مسلمان ہو عاقل ہو۔ مجنون پاگل نہ ہو۔ اگر نابالغ ہو تو مؤتمیز ہو۔ یعنی احکام حج ادا کرنے اور سفر کے انتظام کی تمیز رکھتا ہو۔

مسئلہ۔ معلوم ہوا کہ مأمور کا بالغ ہونا شرط نہیں۔ نابالغ بھی حج بدل کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں اتنی تمیز اور صلاحیت ہو کہ احکام حج ادا کرنے کے لیے قریب البلوغ ہو۔ مگر اس میں بعض علماء کا اختلاف ہے اس لیے احتیاط یہ ہے کہ نابالغ سے حج نہ کرایا جائے (از مناسک طاعلی قاری)۔

آٹھویں شرط: یہ ہے کہ حج بدل کرنے پر کوئی اجرت و معاوضہ نہ لیا دیا جائے۔ اگر کسی نے باقاعدہ اجرت طے کر کے کسی سے حج بدل کرایا تو لینے اور دینے والے دونوں گناہگار ہوں گے۔ مگر حج آمر کا ادا ہو جائے گا۔ اور جو معاوضہ حج پر لیا ہے وہ واپس کرنا واجب ہوگا۔ البتہ بقدر اخراجات حج مأمور کو آمر کی طرف سے مال دلایا جائے گا۔

نویں، دسویں شرط: یہ ہے کہ جس شخص کی طرف سے حج بدل کیا جا رہا ہو، اس کے مال سے حج کرے۔ اور سواری پر کرے، پیادہ نہ ہو۔ اگر حج بدل کرنے والے نے اپنا مال خرچ کر کے اس کی طرف سے حج بدل کر دیا تو اس کا فرض ادا نہیں ہوگا۔ اور شرط یہ ہے اکثر حصہ مصارف حج کا اس کی طرف سے ہو، اگر کچھ تھوڑا مال خود

حج بدل کرنے والے نے اپنا بھی خرچ کر لیا تو مضائقہ نہیں، اسی طرح اگر پیادہ حج کیا تو امر یعنی حج کرنے والے کا حج فرض ادا نہیں ہوگا۔ اس میں بھی اکثر سفر کا سواری پر کرنا کافی ہے، کچھ حصہ سفر کا پیادہ بھی طے کر لیا تو حج نہیں۔

گیارہویں شرط: یہ ہے کہ امر یعنی حج کرنے والے کے وطن سے سفر حج شروع کیا جائے۔ اگر حج کرانے والے کے کئی وطن ہوں تو اس وطن کا اعتبار ہوگا جو بہ نسبت دوسرے کے مکہ مکرمہ کی طرف قریب ہو۔

مسئلہ۔ جو شخص ہندوستان میں فوت ہوا اور حج بدل کی وصیت کر گیا مگر بعد میں اس کے اہل و عیال یا جس کو وصیت کی تھی وہ ہجرت کر کے پاکستان آ گیا تو وصی پر لازم ہے کہ اس کا حج ہندوستان کے وطن سے کر لے، ہندوستان ہی سے کسی آدمی کو حج بدل کے لیے مامور کرے لیکن اگر وہاں سے کسی کو حج بدل کے لیے بھیجنے پر قدرت نہ ہو خواہ اس وجہ سے کہ رقم وہاں بھیجنا مشکل ہو جائے، یا وہاں سے کسی آدمی کا بھیجنا قدرت میں نہ ہو تو پاکستان ہی میں اس جگہ سے جہاں وصی ہجرت کر کے آیا ہے، کسی کو حج بدل کے لیے بھیج دے تو امید ہے کہ انشاء اللہ اس کا حج فرض ادا ہو جائے گا۔ یہ مسئلہ صراحۃً کتب فقہ میں موجود نہیں ہے مگر اس کی ایک نظیر یہ موجود ہے کہ میت کا مال اگر اس کے وطن سے حج کرانے کے لیے کافی نہ ہو تو جس جگہ سے کافی ہو، وہاں سے حج کر دینے کی اجازت ہے، اس صورت میں بھی امر کے وطن سے حج کرانے پر قدرت نہ رہی تو جہاں سے قدرت ہے، وہیں سے حج کر دینا انشاء اللہ کافی ہوگا۔

بارہویں شرط: یہ ہے کہ مامور یعنی حج بدل کرنے والا احرام باندھنے کے وقت حج کی نیت امر یعنی حج کرانے والے کی طرف سے کرے، اگر احرام کے وقت نیت نہیں کی تو امام اعظمؒ کے نزدیک افعال حج شروع کرنے سے پہلے پہلے نیت کرنے کے لیے بہتر یہ ہے کہ احرام کے وقت زبان سے کہے کہ میں فلاں شخص کی طرف سے حج کی نیت کرتا ہوں۔ اور پھر جب تلبیہ کہے تو اس میں یہ الفاظ کہے بتیک عن

فلاں، لفظ فلاں کی جگہ اس کا نام لے۔ اگر نام یاد نہ رہے تو صرف اتنا کہہ دے، کہ جس نے مجھے حج بدل کے لیے بھیجا ہے، اس کی طرف سے حج کی نیت کرتا ہوں۔ اور لبیک عن الأمر کہہ دے۔ اور اگر زبان سے کچھ بھی نہ کہے، صرف دل سے نیت امر کے حج کی کرے تو یہ بھی کافی ہے اگر احوال حرام باندھنے کے وقت مطلق حج کی نیت کر لی، اپنی یاد دوسرے کی کوئی نیت نہیں کی تو افعال حج شروع کرنے سے پہلے امر کی طرف سے نیت کر لینا کافی ہو جائے گا۔

تیرا ہویں اور چودہویں شرط: یہ ہے کہ مامور یعنی جس کو حج بدل کے لیے کہا گیا ہے وہ خود ہی اس کی طرف سے حج بدل کرے، کسی دوسرے سے بغیر اجازت امر کے کرانا جائز نہیں، اگر بغیر اجازت کے کسی کو بھیجا تو وہ حج مامور کا ہو جائے گا، امر کا نہیں ہوگا اور اس کو امر کی رقم واپس کرنا پڑے گی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ مامور کو اجازت عام دے دی جائے۔ کہ وہ کسی وجہ سے خود نہ کر سکے تو دوسرے سے کراوے۔

اسی طرح اگر مرنے والے نے حج بدل کی وصیت میں کسی خاص شخص کو معین کر کے کہہ دیا کہ اس کے سوا میرا حج بدل کوئی اور نہ کرے تو کسی دوسرے سے اس کا حج بدل کرانا جائز نہیں اور اگر معین تو کیا مگر دوسرے کی نفی نہیں کی یعنی صرف اتنا کہا کہ میرا حج بدل فلاں سے کراویں۔ اس صورت میں بہتر تو یہی ہے کہ اسی معین شخص سے حج کرائیں۔ ہاں اگر وہ انکار کر دے یا کسی وجہ سے معذور ہو جائے تو دوسرے سے کرا سکتے ہیں۔ اس کے انکار اور معذوری کے بغیر بھی اگر وصی نے کسی اور کو بھیج دیا، تو حج فرض امر کا ادا ہو جائے گا۔

مسئلہ۔ اگر وصیت کرنے والے نے صرف اتنا کہا کہ میری طرف سے حج بدل کرا دیا جائے اور کسی کو وصی مقرر نہیں کیا، تو سب وارث جمع ہو کر باہم مشورے سے کسی کو بھی حج بدل کے لیے بھیج سکتے ہیں۔ حج فرض امر کا ادا ہو جائے گا۔

(ملا علی)

پندرہویں صدی میں، بشرط، یہ ہے کہ مامور حج کو فاسد نہ کرے اور فوت بھی نہ کرے۔ فاسد ہونے کی صورت یہ ہے کہ وقوفِ عرفات سے پہلے جماع کر لے اور فوت کرنے کی صورت یہ ہے کہ احرام کے باوجود عرفات کا وقوف نہ کرے، اگر فاسد کر دیا یا فوت کر دیا تو امر کا حج ادا نہیں ہوا۔ اور فاسد کرنے والے پر واجب ہوگا کہ امر کی رقم جتنی اس نے حج بدل کے لیے دی تھی واپس کرے اور آئندہ سال اپنے مال سے حج کی قضا کرے۔ یہ قضا بھی اسی مامور کی طرف سے ہوگی، امر کی طرف سے نہیں ہوگی، امر کو اپنا حج بدل الگ کرانا ہوگا۔

اور فوت ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اپنی غفلت و کوتاہی سے ارکان حج ادا نہیں کئے، اس صورت میں اس کو بھی امر کی رقم کا ضمان دینا پڑے گا اور اپنے فوت شدہ حج کی قضا اپنے مال سے الگ کرنا ہوگی۔ اس قضا سے بھی امر کا حج فرض ساقط نہیں ہوگا اور خود مامور کا بھی حج فرض اس سے ادا نہیں ہوگا، اگر بعد میں اس کو حج پر قدرت ہوگئی تو اپنا فرض الگ ادا کرنا پڑے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی آسانی آفت بیماری یا قید ہو جائے، وغیرہ کے سبب ارکان حج کی ادائیگی سے معذور ہو گیا، اس صورت میں اس پر لازم ہے کہ اگلے سال اس کی قضا کر لے اور امر کو کوئی ضمان دینا نہیں پڑے گا۔ مگر اگلے سال جو قضا کرے گا اس سے امر کا حج ادا ہو سکتا ہے۔ اگر امر اس کو حکم کرے اور یہ قضا میں امر کی نیت کرے۔

سترہویں اور اٹھارہویں شرط: یہ ہے کہ مامور صرف ایک حج کا احرام باندھے ایسا نہ کرے کہ بیک وقت دو حج کی نیت کر کے احرام باندھے ایک اپنا ایک امر کا۔ اسی طرح یہ بھی شرط ہے کہ ایک ہی شخص کی طرف سے احرام باندھے، ایسا نہ کرے کہ دو آدمیوں کے حج کی نیت کرے اور دونوں کے لیے احرام باندھے۔

انیسویں شرط: یہ ہے کہ مامور یعنی حج بدل کرنے والا، امر یعنی حج کرانے والے کے میقات سے احرام باندھے۔ یعنی اس کے وطن سے مکہ معظمہ جاتے ہوئے جو میقات آتا ہے۔ اس سے احرام حج بدل کا باندھے، جیسے ہند، پاکستان والوں کے لیے

بحری جہاز سے سفر کرنے میں ملیم ہے۔ اگر مامور نے یہاں سے احرام عمرہ کا باندھا، عمرہ ادا کر کے مکہ معظمہ سے احرام حج کا باندھا جیسا کہ حج تمتع کا قاعدہ ہے، تو چونکہ حج میقاتِ امر سے نہیں ہوا۔ اس لیے امر کا حج ادا نہ ہوا۔ خود مامور کا ہو گیا، اس پر لازم ہے کہ امر کی دی ہوئی رقم اس کو واپس کرے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

بیسویں شرط: یہ ہے کہ مامور امر کی مخالفت نہ کرے مثلاً امر نے اس کو حج افراد کرنے کے لیے کہا تھا، اگر اس نے حج کے ساتھ عمرہ بھی ملا کر قرآن کریم لیا تو امر کا حج ادا نہ ہوگا۔ مامور پر ضمان آئے گا کہ امر کی رقم واپس کرے۔ یہ حکم اس صورت میں تو متفق علیہ ہے۔ جبکہ اس نے عمرہ کی نیت اپنی طرف سے اور حج کی نیت امر کی طرف سے کی ہو اور اگر عمرہ بھی امر کی طرف سے کیا، حج بھی، تو اس میں امام اعظم کا قول تو یہی ہے کہ مخالفت امر کی وجہ سے یہ حج امر کا نہیں مامور کا ہو گیا۔ اس پر ضمان لازم ہوگا مگر صاحبین کے نزدیک امر کا حج اس سے ادا ہو جائے گا۔ (مناسک طاعلی قاری)

امام اعظم کے نزدیک چونکہ اس حکم کا مدار مخالفت امر پر ہے اس لیے اگر امر نے خود ہی اجازت قرآن کی دے دی ہے تو مقتضائے کلام یہ ہے کہ بہ اتفاق حج امر کا ادا ہو جائے گا۔ یہ حکم قرآن کا ہے، اگر مامور نے عمرہ کا اضافہ بصورت تمتع کر لیا کہ میقاتِ امر سے صرف عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ کر لیا۔ پھر مکہ مکرمہ سے احرام حج کا باندھا تو امام صاحب اور صاحبین دونوں کے نزدیک امر کا حج ادا نہیں ہوا۔ مامور پر ضمان واجب ہے۔ (کتاب المنہج البحر والفتح) اس مسئلے کی تفصیل آگے آئے گی۔

خُلاصَةُ شَرَايِطِ

شرائط مذکورہ میں چار شرائط تو امر یعنی حج کرانے والے کی ذات سے متعلق ہیں۔ (۱) اس کا مسلمان ہونا اور اس پر حج فرض ہونا اور خود قادر نہ ہونا (۲) اس کے عجز کا دائمی ہونا۔ (۳) حج بدل کرانے سے پہلے عاجز ہونا۔ (۴) حج بدل کے لیے کسی کو خود مامور کرنا

یا اس کے لیے وصیت کرنا۔ اور چار شرائط مامور کی ذات سے متعلق ہیں (۵) مسلمان ہونا (۶) عاقل ہونا (۷) اگر نابالغ ہو تو مینز قریب بلوغ ہونا (۸) حج بدل کی کوئی اجرت و معاوضہ نہ لینا۔ باقی شرائط افعال حج سے متعلق ہیں کہ (۹) حج بدل کرنے میں اکثر مال حج کرانے والے امر کا خرچ کرے۔ کچھ تھوڑا اپنی طرف سے بھی خرچ کر دے۔ تو مضائقہ نہیں (۱۰) اکثر حصہ سفر کا سواری سے طے کرے، پیادہ حج کرے تو امر کا حج نہیں ہوگا۔ (۱۱) امر کے وطن سے سفر شروع کرے۔ (۱۲) حج کو فاسد نہ کرے (۱۳) امر ہی کی طرف سے نیت حج کی بوقت احرام کرے۔ (۱۴) فوت بھی نہ کرے (۱۵) امر کی مخالفت نہ کرے۔ باقی پانچ شرطوں کا تعلق اسی شرط مخالفت سے ہے وہ درحقیقت الگ شرط نہیں۔

یہ سب شرائط فرض حج بدل کے لیے ہیں | حج نفل اور عمرہ نفل کے لیے اگر مامور اپنے مال سے تبرعاً و احساناً کرتا ہے تو کوئی شرط نہیں اور مال امر کا خرچ کرتا ہے تو پہلی تین شرطیں جو امر کی ذات سے متعلق ہیں وہ نہیں رہیں گی، باقی شرائط بدستور رہیں گی (غنیۃ الناسک)

مسئلہ۔ شرائط مذکورہ کے مطابق حج فرض جس کی طرف سے کیا گیا، صحیح اور راجح فقہاء کے نزدیک بھی ہے کہ یہ حج و عمرہ امر یعنی حج کرانے والے کا ہوگا اور حج و عمرہ کرنے والے کو اس کی امداد کرنے کا ثواب ملے گا۔ اور حج کے بعد نادم عمرے یا طواف وغیرہ کرے گا تو وہ خود اس کے ہوں گے، عمرہ یا حج نفل میں بھی جبکہ امر کے خرچ سے کیا گیا ہو یہی حکم ہے کہ امر کا ہوگا، مامور کو اس کے عمل کا ثواب ملے گا (کذا فی کافی الحاکم، ارشاد الساری وغنیہ)

البتہ اگر نفل حج یا عمرہ کسی نے اپنے خرچ سے کیا اور کرنے کے بعد کسی کو ثواب پہنچا دیا تو یہ حج و عمرہ خود کرنے والے کا ہوگا۔ اور جس شخص کو ثواب پہنچایا ہے اس کو ثواب ملے گا۔ (غنیہ)

مسئلہ۔ جس شخص نے اپنا حج فرض ادا کر لیا ہے، اس کے لیے نفل حج کرنے

سے بہتر اور افضل یہ ہے کہ کسی دوسرے کی طرف سے فرض کا حج بدل کرے۔ حدیث میں ہے جو شخص کسی دوسرے کی طرف سے حج بدل کرتا ہے۔ اس کو سات حجوں کا ثواب ملتا ہے۔ (غنیہ)

جس نے اپنا حج نہیں کیا اس سے حج کرانا افضل اور بہتر تو سب کے نزدیک یہی ہے کہ حج فرض کا بدل اس شخص سے کرایا جائے جو اپنا حج فرض ادا کر چکا ہو اور جس نے اپنا حج ادا نہیں کیا اگر وہ ایسا ہے کہ اس پر حج فرض ہی نہیں تو اس کا حج بدل کے لیے امر کرنا جائز ہے۔ مگر مکروہ تنزیہی یعنی اختلاف اولیٰ ہے اور اگر اس شخص کے ذمہ خود حج فرض ہے اور وہ ابھی ادا نہیں کیا، اس حالت میں دوسرا کوئی اس کو اپنے حج بدل کے لیے بھیجے تو بھیجنے والے کے لیے تو مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ ہی ہے مگر اس حج بدل پر جانے والے کے لیے مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے کیونکہ اس کے ذمہ لازم ہے کہ جب اس کو حج کی سہولت میسر آجائے تو اپنا حج فرض ادا کرے (غنیہ)

مسئلہ۔ جس شخص پر پہلے سے حج فرض نہیں تھا اگر یہ کسی دوسرے کی طرف سے حج بدل پر چلا گیا اور اسی کی طرف سے احرام باندھ کر مکہ معظمہ میں داخل ہوا تو بیت اللہ کے پاس پہنچنے سے اس کے ذمہ اپنا حج فرض نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ اس حالت میں مکہ مکرمہ پہنچا ہے کہ دوسرے کی طرف سے احرام باندھنے کی بناء پر اپنا حج کرنے پر اس کو قدرت نہیں۔ اور واپسی کے بعد غریب ہونے کی بناء پر دوبارہ جانے کی قدرت نہیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اگرچہ اس کے ذمہ پہلے سے حج فرض نہیں تھا، مگر بیت اللہ کو دیکھنے سے اس پر حج فرض ہو گیا۔ اس لیے اس پر لازم ہے کہ سال بھر وہیں ٹھہرے اور اگلے سال اپنا حج کر کے واپس آئے۔ (غنیہ)

آج کل چونکہ نہ قیام طویل اختیار میں ہے، نہ اس کے وسائل اختیار میں، اس لیے پہلے قول پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ بحیثیت دلیل بھی وہ ہی راجح معلوم ہوتا ہے۔
آمر کے وطن سے حج بدل کرنے کا مسئلہ | جو اوپر شرائط میں مذکور ہے یہ اس وقت

عے جبکہ وصیت کرنے والے کے کل مال کا ایک تہائی اتنا ہو کہ اس کے وطن سے حج کرایا جاسکے۔ اور اگر تہائی مال میں یہ گنجائش نہ ہو اور وارث تہائی سے زائد خرچ کرنے کے لیے راضی نہیں تو ایک تہائی مال میں جس جگہ سے حج کرایا جاسکتا ہے، کرایا دیا جائے۔ (غنیہ، ملا علی)

مسئلہ۔ اسی طرح اگر مرنے والے نے خود اپنے وطن کے علاوہ کسی دوسری جگہ سے حج بدل کرنے کی وصیت کر دی تو وہی اسی جگہ سے حج کرائے۔

حج بدل میں قرآن اور تمتع

حج بدل کرنے والا اگر امر کی اجازت کے بغیر قرآن کرے، اس طرح کہ عمرہ اپنی طرف سے اور حج امر کی طرف سے کرے، تو باتفاق فقہاء یہ حج امر کا ادا نہیں ہوگا خود مامور کا ہو جائے گا، اور مامور پر نفقہ حج کا ضمان عائد ہوگا اور اگر عمرہ کی نیت بھی امر کے لیے کی اور حج کی بھی تو امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ بھی جائز نہیں اور اس صورت میں حج امر کا نہیں ہوگا، مامور پر ضمان واجب ہوگا۔ مگر صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک استحساناً حج امر کا ادا ہو جائے گا۔ یہ مسئلہ اور وجہ اختلاف کی بسوط شمس الائمہ سرخسی میں بعبارت ذیل مذکور ہیں :-

(۱) ولو قرن مع الحج عمرة كان مخالفاً منا للنفقة عند
ابی حنیفہؒ وعندہما لا یصیر مخالفاً استحساناً لانہ
اتی بالمامور بہ وزاد علیہ ما یجانسہ فلا یصیر مخالفاً
کالوکیل بالبیع اذا باع بأكثر مما سئلہ من جنسہ و
ابو حنیفہ یقول هو مامور بانفاق المال فی سفر مجرد
للحج وسفرہ هذا یفرد بل للحج والعمرة جیعا ھکان

مخالفاً كما لو تمتع - ولا ولاية عليه للحاج في أداء نسك
 عنه الا بقدر ما امره الا ترى انه لو لم يأمره بشئ لم
 يجز ادائه عنه فكذاك اذا لم يأمره بالعمره فاذا لم
 تكن عمرته عن الميت صار كانه نوى العمره عن نفسه
 وهناك يصير مخالفاً (ثم قال بعد ذلك) ثم دم القرآن
 عندهما على الحاج من مال نفسه وكذلك عند ابي
 حنيفه اذا كان مأموراً بالقرآن من جهة البيت
 حتى لم يصير مخالفاً لان دم القرآن للنسك وسائر
 المناسك عليه ثم قال بعد ذلك -

(۲) واذا كان امر بالهجر فبدأ واعتمر في اشهر الحج ثم
 حج من مكة كان مخالفاً في قولهم جميعاً لانه ما مور
 بان يحج عن الميت من الميقات والتمتع يحج من جوف
 مكة فكان هذا غير ما امر به ولانه ما مور بالانفاق في
 سفر يعمل فيه للميت وانما انفق في سفر كان عاقلاً فيه
 لنفسه لان سفره انما كان للعمره وهو في العمره
 عامل لنفسه -

بسوط کی عبارت مذکورہ سے چند امور ثابت ہوئے۔ اول یہ کہ حج بدل میں قرآن
 و تمتع دونوں کے ناجائز ہونے اور امر کا حج ادا نہ ہونے کی علت باتفاق ائمہ مخالفت
 حکم امر کی ہے۔ اور تمتع میں حج کا میقاتی نہ رہنا بھی فی نفسہ علت عدم جواز نہیں، بلکہ
 وہ بھی مخالفت امر ہی کی بنیاد پر ممنوع ہے۔ جیسا کہ عبارت نمبر ۱، ۲ سے واضح
 ہے۔

دوسرے یہ کہ صاحبین نے اس مخالفت کو قرآن کی حد تک تو استحساناً ناجائز قرار
 دے دیا۔ مگر تمتع میں مخالفت دوہری ہو گئی، ایک حج کے ساتھ بلا اجازت عمرہ کا

شامل کرنا۔ دوسرے امر حج کے میقاتی کرنے کا تھا، اس صورت میں وہ حج مکی ہو گیا۔ اس لیے اس مخالفت کو انہوں نے بھی جائز نہیں سمجھا اور حکم یہ دیا کہ امر کا حج اس سے ادا نہیں ہوا۔ مامور پر ضمان آئے گا۔

تیسری بات اس سے نکل آئی کہ جب عدم جواز کی علت مخالفت امر ہوئی، تو اجازت امر کے ساتھ قرآن اور تمتع دونوں جائز ہو جانے چاہئیں۔ چنانچہ باجائز امر قرآن جائز ہونے کی تصریح عبارت نمبر ۲ میں آئی ہے، اسی طرح ہدایہ میں بھی باجائز امر قرآن جائز ہونے کی تصریح ان الفاظ میں آئی ہے:-

فان امره غيبه ان يقربن عنه فالدمه على من احرم
فانه وجب شكرا لما وفقه الله تعالى من الجمع بين
النسكين والمامور هو المختص بهذه النعمة لان
حقيقة الفعل منه ۵۱۔

مبسوط اور ہدایہ کی دونوں تصریحات میں ذکر صرف قرآن کا کیا گیا ہے۔ حالانکہ مدار اجازت جب امر کی اجازت پر ٹھہرا تو مقتضا اس کا یہ ہے کہ قرآن ہو یا تمتع، جب باذن امر ہو تو دونوں جائز ہونے چاہئیں۔ اسی لیے مبسوط کی مذکور الصدر بحث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ و اراد بالقرآن الجمع بين النسكين قرآنا كان اذ تمتعا كما صرح به في غاية البيان لكن بالاذن المتقدم جس کا حاصل یہ ہے کہ جب امر کی طرف سے اجازت ہو تو قرآن و تمتع دونوں جائز ہیں اور حج و عمرہ امر ہی کی طرف سے ہوگا۔

فتاویٰ قاضی خان میں امام ابو بکر محمد بن الفضل سے بھی جو کلام نقل کیا ہے، اس کا ظاہر یہی ہے کہ امر کی اجازت سے حج کی تینوں قسمیں افراد، قرآن، تمتع سب جائز ہیں بلکہ ان کی ہدایت یہ ہے کہ امر کو چاہیے کہ مامور کو عام اجازت دے دے تاکہ اس کو عمل میں تنگی اور دشواری پیش نہ آئے، ان کے الفاظ یہ ہیں:-

قال الشيخ الامام ابو بكر محمد بن الفضل رحمه الله تعالى

اذا امر غيره بان يحج عنه فينبغي ان يفوض الامر الى
 المأمور فيقول حج عني بهذا المال كيف شئت ان
 شئت حجة وان شئت حجة وعمرة وان شئت قرآناً
 والباقي من المال لك وصيةً كيلاً يضيق الامر على
 الحاج ولا يجب رد ما فضل على الورثة (قاضي خان
 بر ماشيه عالمگیری طبع مصر ص ۳ ج ۱)

منک علامہ سندی مسمیٰ لباب میں قاضی خان کی مذکورہ عبارت کا یہی مفہوم
 قرار دے کر لکھا ہے۔

وينبغي للأمر ان يفوض الأمر الى المأمور فيقول حج عني
 كيف شئت مفرداً او متمتعاً۔ (ارشاد الساری، مناسک
 ملا علی قاری ص ۳۴)

لیکن ملا علی نے منک سندی کی شرح میں لباب کے اس قول کو سہو قرار دیا
 اور اس کے قول متمتعاً پر فرمایا۔

فيه ان هذا القيد سهو ظاهر اذ التفويض المذكور في
 كلام المشائخ مقيد بالافراد والقران لا غير (ثم قال)
 واما في قاضي خان من التخيير بحجة او عمرة وحجة
 او بالقران فلا دلالة له على جواز المتمتع اذ الواقع وحجة
 لا تقيد الترتيب فتحمل على حج وعمرة بان يحج اولاً
 ثم يأتي بعمره له ايضاً فتدبر فانه موضع خطر۔

مگر علامہ حسین بن محمد سعید عبدالغنی نے عبارت مذکورہ کے ماشیہ میں اس کو سہو قرار
 دینے کی تردید ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

قوله فيه ان هذا القيد سهو ظاهر: قال القاضي عبد
 في شرحه لهذا الكتاب (يعني اللباب) ولا يخفى ان هذا

سہومنه (یعنی علی القاری) لان المیت لو امره بالتمتع
فتمتع المامور صم ولا یكون مخالفاً بخلاف بین
الائمة الاسلاف کذا فی الحباب (ارشاد الساری ص ۳۴)

امام ابو بکر بن الفضل کے قول بروایت قاضی خان میں تخییر کے لیے تین لفظ استعمال
ہوئے، اول بحجة جس کے معنی افراد ہیں اور آخر میں قرآن ہے۔ اس سے پہلے بحجة
وعمرة ہے۔ اس میں غور کرنے سے یہ تو ظاہر ہے کہ اگر تخییر صرف افراد اور قرآن
کی مقصود ہوتی تو یہ تیسرا لفظ بحجة و عمرة فضول و بے معنی ہو جاتا ہے۔ مگر اس کو
جواز تمتع کی تصریح بھی اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ حجة کو مقدم، عمرة کو مؤخر کر کے لکھا
جے جو تمتع کی ترتیب کے خلاف ہے۔

لیکن غنیۃ الناسک جو درحقیقت علامہ سندھی کے متن لباب ہی کی تشریح و تلخیص
ہے۔ اس میں حجة و عمرة کے لفظ کی ایک دوسری تشریح کر کے باذن آمر اجازت
کو صرف قرآن کے لیے مخصوص فرمایا، اور تمتع کی اجازت کو تسلیم نہیں کیا۔ ان کی
عبارات حسب ذیل ہیں:-

فاذا وقع الاذن بخلافه كما لو امره بالقرآن جاز لانه
قد اتى بما امر به ولا يصير مخالفاً باحرامه من مكة
للاذن به دلالة وكذا لو امره بالتمتع على القول بجواز
النيابة فيه كما سياتى (ص ۱۷۹)

اس کے بعد فضل نفقہ میں فتاویٰ خانہ سے امام ابو بکر بن الفضل کا مذکور الصدر
نقل کر کے فرمایا:-

وقوله ان شئت حجة و عمرة بتقديم الحجة كما في النسخ
الصحيحة بان يحج عنه اولاً ثم يأتي بعمرة له ايضاً
فيكون افراداً بهما، وهكذا في الكبير لكنه قال فيقول
حج عني بهذا كيف شئت ان شئت حجة وان شئت

فاقرن والباقي الخ فالتقييد بهما مع ان التمتع اسهل
و النسب بالتفويض بدل على ان المتمع لا يجوز عن
الامر وان كان بامرہ - ثم سكتهم عن دم المتمع
حيث قالوا ودم القرآن على الامور يؤيد ذلك (الى
قوله) ولكن ما زاد في اللباب يوافقة ما في البحر
وغيره من جواز المتمع حق الامر اذا كان بامرہ كما
سيأتي عن قريب (وقال لقد ذلك) ودم الرض على الحاج
وان كان الحج يقع عن الامر في القرآن واما في المتمع
التمتع فلو امره بالتمتع فتمتع عنه فالحج يقع عن
الامور لا عن الامر على ما مر من المشائخ فاولى ان
يكون الدم عليه (غنية ص ۱۸۲ تا ۱۸۵)

خُلاصَةُ تَحْقِيقِ

حضرات فقہاء کی مذکورہ بالا بحث و تحقیق میں غور کرنے سے حاصل یہ معلوم ہوتا ہے
کہ آئمہ مذہب کی تصریحات مندرجہ بسوط وغیرہ سے حج بدل میں قرآن و تمتع دونوں
کے عدم جواز کی علت مخالفت امر کو قرار دیا ہے اور در صورت تمتع حج کا آفاق امر
کے بجائے مکہ مکرمہ سے ہو جانے کو بھی اسی علت پر مبنی کیا ہے کہ اس میں امر کی
مخالفت ہے۔

اس کا مفہوم ظاہر یہی نکلتا ہے کہ جب یہ علت ممانعت یعنی مخالفت امر نہ
رہے، امر اجازت دے دے تو قرآن و تمتع دونوں جائز ہونے چاہئیں۔
اور فی نفسہ نیابت کے معاملہ پر غور کیا جائے تو مقتضائے اصل یہی معلوم ہوتا
ہے کہ اصیل یعنی امر اگر خود اپنا حج ادا کرتا تو اس کو حج کی تینوں قسموں میں جس کو
چاہے اختیار کرنے کا حق تھا کہ افراد کرے یا قرآن یا تمتع، جب حالت عذر میں شریعت

نے اس کو اپنے نائب کے ذریعہ حج فرض ادا کرنے کی اجازت دے دی تو اس کو یہ حق مل گیا کہ جن تین قسموں کا اس کو اختیار حاصل تھا وہ اختیار اپنے نائب کو سپرد کر دے اور باذن آمر نائب یعنی مامور کے لیے بھی تینوں قسمیں جائز قرار دی جائیں اجازت آمر سے صرف قرآن جائز ہو سکے، تمتع جائز نہ ہو، اس کی کوئی فقہی وجہ باقی نہیں رہتی۔ قرآن و تمتع میں فرق کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی۔ کہ قرآن میں حج و عمرہ دونوں میقات آمر سے ہو رہے ہیں، تمتع میں حج میقات آمر سے نہیں رہتا۔ مگر اوپر مبسوط کی تصریح سے ثابت ہو چکا ہے کہ حج کا آفاقی ہونا کوئی اصلی شرط نہیں۔ اس کو شرط اس لیے کہا گیا ہے کہ عادتاً آمر مامور کو اپنے میقات سے احرام باندھنے کے لیے کہتا ہے، اس کے خلاف کرنے میں آمر کی مخالفت ہوتی ہے۔ جب یہ مخالفت آمر کی علت رفع ہو گئی تو تمتع میں حج کے میقاتی نہ ہونے کو علت عدم جواز نہیں کہا جاسکتا۔

خصوصاً جبکہ میقاتی ہونے کی شرط خود اصل یعنی آمر میں بھی عائد نہیں ہے، وہ اگر کسی ضرورت سے سفر کر کے مکہ مکرمہ پہنچ جائے اور وہیں سے اپنا حج فرض ادا کرے تو باتفاق جائز ہے۔ تو اس کے نائب پر حج کے میقاتی ہونے کی پابندی صرف آمر کی اتباع ہی کی بناء پر عائد ہو سکتی ہے۔ جب وہ خود حج کے مکی کرنے کی اجازت دے دے تو عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔

اشتباہ کی ایک وجہ یہ رہ جاتی ہے کہ فقہاء مذہب نے ایک طرف تو یہ واضح طور پر فرمایا کہ حج بدل میں قرآن و تمتع کی مانعت کی وجہ مخالفت آمر ہے۔ مگر دوسری طرف اس کے مفہوم مخالف کو اولاً تو قصداً اور نصاً ذکر نہیں فرمایا۔ ضمنی طور پر وجوب دم شکر کے مسئلہ میں فرمادیا کہ جب قرآن باذن آمر ہو تو بھی دم بدم مامور ہوگا۔ اس بیان میں صرف قرآن کا ذکر کیا ہے، تمتع کا ذکر نہیں کیا۔ اسی عدم ذکر کو صاحب غنیۃ نے اس کا قرینہ قرار دیا ہے کہ تمتع جائز نہیں، کیونکہ وہ بھی جائز ہوتا تو قرآن کے ساتھ اس کا ذکر بھی ہونا چاہیے تھا۔ مگر عدم ذکر کو ذکر عدم

کا قائم مقام بغیر کسی واضح دلیل کے نہیں کیا جاسکتا، اسی لیے صاحب بجر نے اس جگہ قرآن کو بمعنی جمع بین النکسین قرار دے کر تمتع کو بھی اس میں شامل کر دیا، اس توجیہ پر تمتع کا عدم ذکر بھی باقی نہیں رہتا۔ اور عدم ذکر کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بظاہر کوئی دلیل قرآن و تمتع میں فرق کرنے والی موجود نہیں۔ لیکن علماء متاخرین میں حضرت ملا علی قاری اور صاحب غنیہ اور ہمارے زمانے کے اکابر علماء خصوصاً فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ نے زبدۃ المناسک میں اور حضرت مولانا جلیل احمد صاحب نے ابوداؤد کی شرح بذل المحمود میں حج بدل میں قرآن و تمتع کے فرق اور قرآن کے جواز اور تمتع کے عدم جواز کو اختیار فرمایا ہے۔ اگرچہ باجائز امر ہو۔ اس کے ساتھ ائمہ فقہاء کے کلام میں بھی جواز تمتع باذن الامر کی تصریح باوجود تلاش کے نہیں ملی۔ اس لیے مسئلہ پھر محل غور و تامل ہو گیا۔

عبارات فقہاء میں غور کرنے سے قرآن و تمتع میں ایک وجہ فرق کی کھی جاسکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ فریضہ حج بدنی اور مالی دونوں قسم کی عبادت کا مجموعہ ہے۔ عذر کی حالت میں اس کی بدنی اور جسمانی حیثیت تو ساقط ہو گئی، اب صرف انفاق مال ہی اداٹے فرض کا طریق رہ گیا۔ اور تمتع کی صورت میں یہ مال حج پر خرچ نہیں ہوا بلکہ عمرہ پر خرچ ہو گیا، جو فرض نہیں۔ بخلاف قرآن کے کہ اس میں مال کا خرچ دونوں پر یکساں ہوا۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ امر کو قرآن کی اجازت دینے کا تو حق دیا جائے، تمتع کی اجازت دینے کا اس کو بھی حق نہ ہو، کیونکہ اداٹے فریضہ حج کے لیے اس صورت میں نہ اس کا کوئی عمل ہوتا ہے اور نہ حج پر اس کا مال خرچ ہوتا ہے۔ اس لیے تمتع کی صورت میں اس کا حج ادا نہیں ہونا چاہیے۔ ملا علی قاری وغیرہ جن حضرات فقہاء نے باذن امر بھی تمتع کے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے، مذکورہ تحریر سے ان کے کلام کی ایک وجہ ظاہر ہو گئی، مگر اس کو بھی کوئی قطعیت حاصل نہیں، دوسرے فقہاء صاحب لباب وغیرہ جو جواز تمتع کے قائل ہیں، وہ اس وجہ کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات ناقابل تسلیم نہیں کہ تمتع کی صورت میں انفاق حج پر نہیں ہوا کیونکہ

اس نے یہ خرچ کسی عمرہ مفردہ پر نہیں کیا، بلکہ حج کی تین قسموں میں سے ایک قسم پر کیا ہے جس میں عمرہ مقدم ہوتا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آیا کہ انفاق مال صرف عمرہ پر ہو گیا، حج انفاق مال سے خالی رہ گیا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

خُلاصۂ فتویٰ

اگرچہ من حیث الدلیل رجحان اس کا معلوم ہوتا ہے کہ حج بدل میں امر کی اجازت سے قرآن اور تمتع دونوں جائز ہوں اور فقہاء متاخرین میں صاحب لباب اور اس کے حاشیہ جناب وغیرہ میں اسی کو اختیار بھی کیا گیا ہے مگر طاعلی قاری اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ کا فتویٰ اس سے مختلف ہے۔ وہ تمتع کو باذن امر بھی جائز قرار نہیں دیتے، معاملہ ادائے فرض کا نازک ہے اس لیے احتیاط لازم ہے، جہاں تک ممکن ہو، حج بدل میں افراد یا قرآن کیا جائے، تمتع نہ کریں۔ لیکن اس زمانے میں حج و عمرہ کرنے میں عام آدمی آزاد نہیں کہ جب اور جس وقت چاہیں جاسکیں اور طول احرام سے بچنے کے لیے ایام حج کے بالکل قریب سفر کریں۔ ہر طرف حکومتوں کی پابندیاں شدید ہیں، اس لیے اگر کسی حج بدل کرنے والے کو وقت سے زیادہ پہلے جانے کی مجبوری ہو اور احرام طویل میں واجبات احرام کی پابندی مشکل نظر آئے تو اس کے لیے تمتع کر لینے کی بھی گنجائش ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

حج بدل کے لیے تمام ضروری مصارف سفر کی آمد و رفت اور بقدر ضرورت قیام اور ایام حج میں جن

حج بدل کے مصارف اور نفقہ

چیزوں کی عادتاً ضرورت ہوتی ہے۔ کھانے پینے کی ضروریات، کپڑوں کی دھلائی، بسنے کے لیے مکان یا خیمہ کا کرایا وغیرہ، وہ سب امر یعنی حج بدل کرانے والے کے ذمہ ہیں فقہار رحمہم اللہ نے ان تمام ضروری مصارف کی تفصیل لکھی ہے۔ مگر ہر زمانے کی ضروریات اس کے مناسب ہوتی ہیں، مامور کو چاہیے کہ احتیاط کے ساتھ ان ضروریات کا تعین کرے اور ان میں خرچ کرنے میں نہ اسراف و فضول، خرچی سے کام لے نہ بہت تنگی

سے بلکہ متوسط انداز سے خرچ کرے (خلاصہ از مناسک طاعلی) اور بعض مصارف ایسے بھی ہیں جن میں امر کے مال سے خرچ کرنا جائز نہیں، مامور کو خود اپنے مال سے کرنا لازم ہے۔ مثلاً وضو اور غسل کے پانی کی قیمت، بیمار ہو جائے تو دوا دارو کا خرچ مامور کو اپنے مال سے کرنا لازم ہے۔ اپنے کھانے پینے کی چیزوں میں کسی دوسرے کی تواضع کرنا، اس کو کھلانا امر کے مال سے جائز نہیں مگر یہ سب اس وقت ہے جبکہ امر نے اس کی اجازت اور وسعت نہ دی ہو۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ امر خرچ میں وسعت سے کام لے، مامور کو اجازت دے دے، تاکہ ہر قدم پر اس کو یہ سوچنا نہ پڑے کہ یہ خرچ امر کے مال سے کروں یا اپنے مال سے، کھانے کے وقت کوئی آجائے اور اس کو شریک کرنا پڑے تو اس میں حساب لگانا نہ پڑے کہ کتنا امر کے مال پر ڈالے کتنا خود ادا کرے اسی طرح کے معمولی مصارف میں امر کو چاہیے کہ مامور کو اجازت عام دے دے۔ اس صورت میں باتفاق مامور کو ان سب چیزوں میں امر کا مال خرچ کرنا جائز ہوگا (مناسک طاعلی) مسئلہ۔ احرام کے کپڑے اور سفر میں برتنے کی اشیاء امر کے مال سے خریدنا جائز ہے۔ گرج سے فراغت کے بعد یہ سب سامان اور جو کچھ نقد بچے وہ سب امر کو یا اس کے وارثوں کو واپس کرنا لازم ہے۔ اگر مامور نے یہ شرط کر لی ہو کہ یہ سامان اور جو کچھ نقد بچے وہ میرا ہے تو یہ شرط بھی باطل ہے کیونکہ یہ حج کرنے کا معاوضہ ہوگا جس کا لینا دینا حرام ہے۔ یہ چیزیں بہر حال اس کو واپس کرنا ضروری ہے۔

مسئلہ۔ البتہ اگر امر خود اس کو کہہ دے کہ یہ سامان اور جو کچھ نقد بچے وہ میری طرف سے آپ کے لیے ہدیہ ہے یا مرنے والا وصیت کر رہا ہے تو وہ کہہ دے کہ باقی میری طرف سے بطور وصیت مامور کا حق ہے۔ اس صورت میں مامور پر باقی ماندہ نقد اور اشیاء کا واپس کرنا ضروری نہیں۔ فتاویٰ قاضی خان میں امام ابو بکر بن الفضل سے نقل کیا ہے کہ امر کو ایسا کرنا بہتر ہے۔

مسئلہ۔ حج بدل کرنے والے کو راستہ میں کسی جگہ قیام کرنا پڑے یا حج سے پہلے اور بعد مکہ مکرمہ یا مدینہ طیبہ میں جہازوں کی روانگی اور ان میں جگہ ملنے کے انتظار میں جتنا

قیام کرنا پڑے۔ اس زمانہ قیام کے نفقات آمر کے مال سے لیے جائیں گے۔ خواہ یہ قیام پندرہ دن سے کم ہو یا زیادہ۔ البتہ اگر اپنی ضرورت سے زائد قیام کرے گا تو اس زائد قیام کے زمانے کا نفقہ خورد و نوش وغیرہ آمر کے مال سے لینا جائز نہیں، اس میں اپنا مال خرچ کرنا لازم ہے (یہ سب مسائل ارشاد الساری شرح مناسک ملا علی قاری سے ماخوذ ہیں،

مسئلہ۔ اگر آمر نے تیسرے درجے ڈیک میں سفر کرنے کا خرچ دیا اور مامور اس سے اوپر والے درجے سیکنڈ یا فست میں سفر کرے یا ہوائی جہاز سے سفر کیا تو زائد خرچ مامور کو اپنے مال سے دینا ہوگا۔

تنبیہ: مگر اس صورت میں اگر مجموعہ خرچ مامور کا آدھے مصارف حج کی برابر یا زیادہ ہو جائے تو قاعدہ کا تقاضا یہ ہے کہ آمر کا حج ادا نہ ہو، کیونکہ شرائط حج بدل میں اوپر آچکا ہے کہ حج بدل ادا ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ اکثر مال آمر کا خرچ ہو، اس صورت میں اکثر مال مامور کا خرچ ہو گیا، لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ زیادتی سفر حج کے لوازم میں نہیں۔ بلکہ اپنی راحت کے لیے ہے، اس لیے اس زیادتی کا اثر مامور پر نہیں پڑنا چاہیے۔ مگر فقہاء کے کلام میں باوجود تلاش کے یہ مسئلہ نہیں ملا اس لیے عمل کرنے والوں کو چاہیے کہ ایسی صورت پیش آئے تو دوسرے علماء سے بھی استصواب کر لیں۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

رجب ۱۳۹۲ھ



فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مکمل

معہ اضافات جدیدہ و ترتیب جدید

دارالعلوم دیوبند کی عالمگیر شہرت اور دینی مرکزیت جن اسباب پر قائم ہوئی ان میں سے ایک چیز وہاں کے فتاویٰ بھی ہیں جو ہر طبقہ کے علماء، عوام، عدالتوں اور پناہ گاہوں میں سند ملنے جاتے ہیں۔ اس کے عظیم الشان دفاتر کا ایک حصہ آٹھ جلدوں میں شائع ہوا تھا جس میں فتاویٰ کے دو سلسلے تھے، ایک دارالعلوم کے مفتی اول استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی محمد عزیز الرحمن صاحب کے تحریر فرمودہ فتاویٰ کا بنام عزیز القادری دوسرا مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، حال بانی و صدر دارالعلوم کراچی کے تحریر فرمودہ فتاویٰ کا بنام امداد المفتیین۔

لیکن اس کی طباعت اول میں نہ بتویب تھی، نہ ترتیب اور پھر یہ سلسلے مخلوط بھی تھے، کتابت کی اغلاط بھی بہت تھیں۔ حال ہی میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اس مکمل مجموعہ پر نظر فرمایا کہ اس کی تصحیح بھی کرائی اور دونوں سلسلوں کی علیحدہ علیحدہ بتویب کر کے ترتیب بھی قائم فرمائی۔

اب جدید طباعت میں پورے مجموعہ کی دو جلدیں کر دی گئیں ہیں، جلد اول میں عزیز الفتاویٰ مکمل ہے اور جلد دوم میں امداد المفتیین مکمل۔

علماء مفتیان کرام اور عوام سب کے لئے یکساں مفید اور ضروری !
قیمت ہر دو جلد کامل ۱۶ روپے۔ جلد اول - ۶۸ روپے۔ جلد دوم - ۹۲ روپے

ہر قسم کی مذہبی کتابیں ملنے کا بہتہ۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی شہرہ آفاق تفسیر

معارف القرآن

پہلی بار کتابی صورت میں منظر عام پر آرہی ہے

اردو میں اپنے طرز کی پہلی عام فہم تفسیر جس کا مطالعہ آپ کو قرآن کریم کی عظمتوں سے کچھ آشنا کرے گا۔ اور جس کے ذریعہ آپ زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن سے بہترین رہنمائی حاصل کر سکیں گے

توجیہ :- شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب۔

خلاصہ تفسیر :- حکیم الاقت حضرت قہار النوح۔

معارف و مسائل :- مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔

قرآن کریم کے حقائق و معارف سمجھنے کیلئے ایک ناگزیر کتاب جو زندگی بھر آپ کی رہنمائی کرے گی۔

جلد اول :- سورہ فاتحہ و بقرہ۔ صفحات ۶۳۶ قیمت ۲۷/-

" دوم :- سورہ آل عمران و نساء " ۶۴۰ " ۲۷/-

" سوم :- سورہ مائدہ تا النعام " ۶۴۰ " ۲۷/-

" چہارم :- سورہ اعراف تا سورہ ہود " ۶۸۰ " ۲۷/-

" پنجم :- سورہ یوسف تا سورہ کہف " ۶۵۲ " ۲۷/-

" ششم :- سورہ مریم تا سورہ روم " ۷۵۶ " ۵۱/-

" ہفتم :- لقمان تا محجرات " ۷۵۶ " ۵۱/-

" ہشتم :- ق تا الناس " ۷۵۰ " ۵۱/-

عمدہ کاغذ پر آفس کی دلاویز کتابت و طباعت اور دلکش جلد کیساتھ

مکتبہ دارالعلوم - کراچی

